

آشرف نگارش
اہلِ تسلیم کی ایک جماعت

زیرِ نظر
استاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ

جلد ۱۲

ترجمہ
حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

زیرِ نظر پرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضائستانی مدظلہ

مصباح القرآن ٹرسٹ





پیشکش: حوزہ علمیہ جامعہ المنتظر لاہور
جُملہ حقوق محفوظ ہیں

تفسیر نمونہ	_____	نام کتاب
۱۲	_____	جلد
آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی	_____	زیر نظر
حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی	_____	مترجم
مصباح القرآن ٹرسٹ۔ ۱۰، گنگارام بلڈنگ	_____	ناشر
شاہراہ قائد اعظم، لاہور	_____	مطبع
معراج دین پرنٹرز، لاہور	_____	تاریخ اشاعت
ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ	_____	ہدیہ
200/-	_____	

طنے کاپیٹہ:

قرآن سنٹر

۲۴، الفضل مارکیٹ اردو بازار، لاہور

فون: ۴۱۲۲۲۲۳-۴۳۱۴۳۱۱

عَرْضِ نَاشِرٍ

قارئین محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ -
الحمد للہ! مصباح القرآن ٹرسٹ — کلام حکیم اور عہدِ حاضر کی بعض عظیم تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے
ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی یہ شہرت حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور
آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

اس ٹرسٹ نے اپنے آغاز کار میں موجودہ دور کی شہرہ آفاق تفسیر — تفسیر نمونہ — کو فارسی سے اردو زبان
میں ترجمہ کروا کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور پھر محسن ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ،
کی غیر معمولی مساعی، مالی معاونت کی فراخ دلانہ اعانت اور کارکنان کی شبانہ روز محنت کی بدولت پانچ ہی سال کے
قلیل عرصے میں کم و بیش دس ہزار صفحات پر محیط یہ تفسیر صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ستائیس جلدوں میں
شائع کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔ شکر اللہ۔

اس ادارے نے نہ صرف تفسیر نمونہ کے عظیم منصوبے کو حیرت انگیز سرعت کے ساتھ پایا تکمیل تک پہنچایا بلکہ
اس کے ساتھ ساتھ بیسیوں علمی کتب کے علاوہ سید العلماء السید علی نقی النقیوی اعلیٰ اللہ مقامہ کی سات جلدوں پر
مشتمل تفسیر فصل الخطاب شائع کی۔ اردو زبان کو پہلی مرتبہ تفسیر قرآن کے جدید اسلوب سے روشناس کراتے ہوئے
تفسیر موضوعی کے دو طویل سلسلوں یعنی ”پیام قرآن“ از آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور ”قرآن کا دائمی منشور“
از آیت اللہ جعفر سبحانی کی اشاعت کو بھی تیزی سے آگے بڑھا رہا ہے۔

تفسیری حواشی پر مشتمل ایک جلدی قرآن پاک عہدِ حاضر کے مقبول اردو تراجم کے ساتھ زیر طباعت ہیں۔ اس
سلسلے میں روشن فکر اور جدید عالم دین حضرت علامہ ذیشان حیدر جوادی مدظلہ کا ترجمہ ”انوار القرآن“ حال ہی میں شائع
ہوا ہے۔

تفسیر نمونہ چونکہ بلا امتیاز پوری اُمتِ مسلمہ کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بیدار و تیار کرنے کے لیے لکھی گئی ہے،
لہذا سبھی مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود اس کی
طلب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ ادارہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا ہے۔ بعض باذوق اہل علم کی تجویز پر ہم تفسیر نمونہ کی طباعت کے ضمن میں ایک مفید تبدیلی کر رہے ہیں، چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسے موجودہ سائیس جلدوں کی بجائے پندرہ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا جائے تاکہ قارئین محترم کے لیے مزید آسانیاں پیدا کی جاسکیں۔

تفسیر نمونہ کی اس ترتیب نو کا ایک عام طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جلد میں دو دو پاروں کی تفسیر ہو اور یوں اس کی پندرہ جلدیں مکمل ہو جائیں لیکن اس میں یہ سقم رہ جاتا ہے کہ بہت سی قرآنی سورتوں کا کچھ حصہ ایک جلد میں اور بقایا حصہ اس سے اگلی جلد میں چلا جاتا ہے جس سے مطالعے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، لہذا ہم نے اپنے قارئین کو اس زحمت سے بچانے کی خاطر اس تفسیر کو سورتوں کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ اس طرح کوئی قرآنی سورت دو حصوں میں تقسیم نہیں ہونے پائی اور ہر جلد کسی نہ کسی سورت کی کامل تفسیر پر ختم ہو گئی۔ اس طرح پوری تفسیر نمونہ پندرہ جلدوں میں آگئی ہے۔

اس جدید اشاعت کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۱۲ اس وقت آپ کے زیر نظر ہے جس میں سابقہ جلد ۲۴ میں سے صفحہ ۱۹۳ تا ۲۱۵، جلد ۲۵ مکمل اور جلد ۲۶ میں سے صفحہ ۲۶ تا ۱۴۸ شامل کیے گئے ہیں، چنانچہ یہ جلد سورہ طلاق، سورہ تحریم، سورہ ملک، سورہ القلم، سورہ الحاقہ، سورہ معارج، سورہ نوح، سورہ جن، سورہ مزمل، سورہ مدثر، سورہ قیامت، سورہ دہر، سورہ مسلات، سورہ نباء، سورہ نازعات اور سورہ عبس کی تفسیر پر محیط ہے۔

ہم نے زیر نظر کتاب کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، تاہم اس بارے میں آپ کی آراء ہمارے لیے بہترین رہنما ہوا کرتی ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم اپنی مطبوعات کو مزید بہتر بنا کر پیش کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہماری اس پیشکش کا بغور مطالعہ فرمانے کے بعد اس کا معیار مزید بلند کرنے کے سلسلے میں اپنی قیمتی آراء سے نوازیں گے۔ ہم مفید تنقید اور آراء کے لیے منتظر رہتے ہیں۔

آخر میں ہم لاہور کے ایک مخلص و مخیر مرد مومن الحاج شیخ ظہور علی منگلا سے اظہار تشکر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جن کے تعاون سے تفسیر نمونہ کی یہ جدید اشاعت تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے، ہم دعا گو ہیں کہ خدا تعالیٰ بستی معصومین ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اِهْدَاءِ

”مرکز مطالعات اسلامی و نجات نسل جوان“

جو

تمام طبقات میں عموماً اور جوانوں میں خصوصاً اسلام کی حیات بخش
تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے
اس نفیس تالیف کو

ان اہل مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو

قرآن مجید کے متعلق بیشتر بہتر اور عمیق تر معلومات حاصل کرنا
چاہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ۔ قم



یہ تفسیر

حسب ذیل علماء و مجتہدین کی باہمی کاوش قلم کا نتیجہ ہے

- حجۃ الاسلام والسین آقائے محمد رضا آشتیانی
- حجۃ الاسلام والسین آقائے محمد جعفر امامی
- حجۃ الاسلام والسین آقائے داؤد السامی
- حجۃ الاسلام والسین آقائے اسد اللہ ایبانی
- حجۃ الاسلام والسین آقائے عبد الرسول حسنی
- حجۃ الاسلام والسین آقائے سید حسن شجاعی
- حجۃ الاسلام والسین آقائے سید نور اللہ طباطبائی
- حجۃ الاسلام والسین آقائے محمود عبد اللہی
- حجۃ الاسلام والسین آقائے محسن قرآتی
- حجۃ الاسلام والسین آقائے محمد محمدی

پندرہ تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

مشہور مفسر علامہ طبرسی	از	۱- تفسیر مجمع البیان
دانشمند فقید بزرگ شیخ طوسی	از	۲- تفسیر تبیان
علامہ طباطبائی	از	۳- تفسیر المیزان
علامہ محسن فیض کاشانی	از	۴- تفسیر صافی
مرحوم عبد علی بن جلعوت الحویزی	از	۵- تفسیر نور الثقلین
مرحوم سید ہاشم بحرینی	از	۶- تفسیر برہان
علامہ شہاب الدین محمود آلوسی	از	۷- تفسیر روح المعانی
محدث رشید رضا تقریرات درس تفسیر شیخ محمد عبد	از	۸- تفسیر المنار
سید قطب مصری	از	۹- تفسیر فی ظلال القرآن
محمد بن احمد انصاری قرطبی	از	۱۰- تفسیر قرطبی
محمد بن ابوالحسن علی بن مقویہ نیشاپوری	از	۱۱- اسباب النزول
احمد مصطفیٰ مراغی	از	۱۲- تفسیر مراغی
فخر رازی	از	۱۳- تفسیر مفاتیح الغیب
ابوالفتح رازی	از	۱۴- تفسیر روح الجنان



گزارش

تفسیر نمونہ (فارسی) ستائیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اردو ترجمے کے متعدد ایڈیشن بھی ستائیس جلدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ محسن ملت حضرت علامہ سیّد صفدر حسین نجفی اعلیٰ الشہ مقامہ کا اختتامی نوٹ اسی ترتیب کے مطابق جلد کے آخر میں تحریر کیا گیا تھا۔ نئی ترتیب میں بھی اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔ خداوند کریم مولانا مرحوم کو جوار معصومین میں بلند درجات عطا فرمائے۔

(ادارہ)

۹

اس تفسیر میں مد نظر اہداف

پوری دُنیا، جس کی نظریں اسلام کی طرف لگی ہیں، چاہتی ہے کہ اسلام کون سے سرے سے پہچانے۔ یہاں تک کہ خود مسلمان یہی چاہتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ جن میں سے ایک "ایران کا اسلامی انقلاب" اور "دُنیا کے مختلف خطوں میں اسلامی تحریکیں" ہیں۔ جنہوں نے تمام لوگوں کے افکار خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا پیاسا بنا دیا ہے۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام کی شناخت کے لیے نزدیک ترین راستہ اور مطمئن ترین وسیلہ و ذریعہ عظیم اسلامی کتاب قرآن مجید میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ ہے۔

دوسری جانب قرآن مجید جو ایک عظیم اور جامع ترین کتاب ہے، عام کتب کی مانند کسی ایک مسئلہ کی گہرائی پر مشتمل نہیں بلکہ اصطلاح کے مطابق اس میں کئی بطنوں ہیں اور ہر بطن میں دوسرا بطن مضمر ہے۔

بالفاظ دیگر ہر شخص اپنی فکری گہرائی، فہم و آگہی اور لیاقت کے مطابق قرآن سے استفادہ کرتا ہے اور یہ مسلم ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن کے چشمہ علم سے محروم نہیں لوٹتا۔

متذکرہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایسی تفاسیر کی ضرورت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو انکارِ علماء میں موجود رشتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کریں اور محققین اسلام کی محنتوں اور حاصل فکر سے استفادہ کر کے لکھی جائیں اور جو مختلف قرآنی اسرار کی گہری تھول سکیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تفسیر اور کونسا مفسر...؟ وہ تفسیر، کہ جو کچھ قرآن کتاب ہے اسے واضح کرے، نہ کہ جو کچھ مفسر چاہے اور پسند کرے اسے پیش کرے۔ اور وہ مفسر جو اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کر دے اور اسی سے درس لے، نہ وہ کہ جو نہ جانتے ہوتے یا جان بوجھ کر اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلوں اور نظریات کے مطابق جستجو کرے اور جو قرآن کا طالب علم بننے کی بجائے اس کا استاد بن جائے۔

البتہ عظیم مفسرین اور عالی قدر محققین اسلام نے آغاز اسلام سے آج تک اس سلسلہ میں قابلِ قدر کوششیں کی ہیں اور زحمات اٹھائی ہیں، انہوں نے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں کہ جن کے پُر تو میں اس عظیم اسلامی کتاب کے بعض حیران کن مطالب تک رسائی ہو سکتی ہے (شکر اللہ سعیم)۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی لوگوں کو

نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مکاتب فکر کے تضادات اور ٹکراؤ کے باعث اور بعض اوقات منافقین و مخالفین کے دوسوسوں کی وجہ سے، اور کبھی اس عظیم آسمانی کتاب کی تعلیمات کو ضروریاتِ زمانہ پر منطبق کرنے کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب موجودہ دور کی تفاسیر کو دینا ہوگا۔

دوسری جانب تمام تفاسیر کو عوام الناس کے لیے ناف تا بل ادراک گوناگوں اقوال اور پیچیدہ مباحث کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اس وقت ایسی تفاسیر کی ضرورت ہے جن سے خود قرآن کی طرح تمام طبقے استفادہ کر سکیں (اس کی وسعت اور اہمیت میں کمی کیے بغیر)۔

ان امور کے پیش نظر مختلف گروہوں نے ہم سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی خواہش کی جو ان ضروریات کو پورا کر سکے۔ چونکہ یہ کام خاصا مشکل تھا لہذا میں نے ان تمام فضلاء کو مدد و تعاون کی دعوت دی جو اس طویل اور نشیب و فراز کے حامل سفر میں اچھے ہمدرد اور ساتھی تھے اور ہیں تاکہ مشترکہ مساعی سے یہ مشکل حل ہو سکے۔ الحمد للہ! اس کام کے لیے توفیق شامل حال ہوئی اور ایسا ثمر و نتیجہ ملا کہ جس کا ہر طبقہ نے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ اکثر علاقوں کے لوگ مختلف سطحوں پر اس تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی نو جلدیں جو اس وقت تک منظر عام پر آچکی ہیں (اور یہ اس کی دسویں جلد ہے) بار بار چھپیں اور تقسیم ہوئیں۔ اس توفیق الہی کا میں از حد شکر گزار ہوں۔

یہاں یہ بات میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جلد کے مقدمہ میں اپنے قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراؤں۔

۱۔ بار بار یہ سوال ہوتا ہے کہ مجموعاً یہ تفسیر کتنی جلدوں پر مشتمل ہوگی؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً بیس جلدوں سے کم اور چوبیس جلدوں سے زیادہ نہ ہوگی۔

۲۔ اکثر یہ شکوہ بھی کیا جاتا ہے کہ تفسیر کی جلدیں تاخیر سے کیوں شائع ہوتی ہیں؟ عرض خدمت ہے کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کام جلد از جلد ہو، یہاں تک کہ سفر و حضر میں، بعض اوقات جلا وطنی کے مقام پر، حتیٰ کہ بستر بیماری پر بھی میں نے یہ کام جاری رکھا ہے۔

چونکہ مباحث کے نظم و نسق اور عمق و گہرائی کو جلد بازی پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا اس طرح سے کام کرنا چاہیے کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جائے۔ دوسری جانب طباعت و اشاعت کی مشکلات (خصوصاً جنگ کے زمانے میں) کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ جو تاخیر کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔

۳۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تفسیر مختلف افراد کے قلم سے تحریر ہو رہی ہے تو

اس میں ہم آہنگی نہیں ہوگی۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ابتدا میں معاملہ اسی طرح تھا۔ لیکن پھر اس صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ تفسیر میں قلم ہر جگہ میرا ہی ہو اور دوسرے دوست صرف مطالب کی جمع آوری میں مدد کریں۔ ان حضرات میں سے بھی ہر ایک اپنے کام کو پہلے انفرادی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور ضروری یادداشتیں جمع کرتے ہیں۔ بعد میں اجتماعی نشستوں میں ضروری ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تاکہ مختلف مباحث، گونا گوں مسائل اور تفسیر کی روانی میں بے ربطی پیدا نہ ہو اور ساری تفسیر ایک ہی طرز و روش پر ہو۔

انشاء اللہ امید ہے اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے اس کا نہ صرف عربی بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے گا تاکہ اور لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔
(یہ تجویز قارئین محترم کی جانب سے بھی آئی ہے)۔

خداوندا!

ہماری آنکھوں کو مینا، کانوں کو شنوا اور ہماری فکر کو صائب، کار ساز اور ارتقائی فرماتا کہ تیری کتاب کی تعلیمات کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں اور اپنے اور دوسروں کے لیے روشن چراغ فراہم کر سکیں۔
خداوندا!

جو آگ ہمارے انقلاب کے دشمنوں نے خصوصاً اور دشمنان اسلام نے عموماً ہمارے خلاف لگا رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ مسلسل ان کی طرف بٹی ہے، اس امت اسلامی کے مسلسل جہاد اور انتھک سعی و کوششوں کے نتیجے میں اسے خاموش کر دئے تاکہ ایک ہی جگہ تجھ سے دل لگالیں اور تیرے راستے اور تیرے مستضعف بندگان کی خدمت کے لیے قدم اٹھائیں۔

بارالہا!

ہمیں توفیق اور زندگی عطا فرما کہ اس تفسیر کو مکمل کر سکیں۔ اس ناچیز و حقیر خدمت کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں اور یحیٰ و محمود تیری بارگاہ میں پیش کر سکیں۔

اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (تو ہر چیز پر قادر ہے)۔

ناصر مکارم شیرازی
خوزہ علیہ قم۔ ایران

فہرست

۴۶	مطلقہ عورتوں کے احکام اور ان کے حقوق	۲۵	<u>سورہ طلاق</u>
	چند نکات	۲۶	سورہ طلاق کے مضامین
۵۲	۱۔ طلاقِ رجعی کے احکام	۲۶	سورہ طلاق کی تلاوت کی فضیلت
۵۳	۲۔ خدا طاعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا	۲۷	آیت ۱
۵۳	۳۔ گھرانے کے نظام کی اہمیت	۲۸	طلاق اور علیحدگی کی شرائط
۵۵	آیت ۸ تا ۱۱		چند نکات
۵۶	سرکشوں کا دردناک انجام		۱۔ طلاق حلال چیزوں میں سب سے
۶۱	آیت ۱۲	۳۱	زیادہ قابلِ نفرت ہے
۶۱	خلقتِ عالم کا مقصد معرفت ہے	۳۲	عاطفی مشکلات
	<u>سورہ تحریم</u>	۳۳	اجتماعی مشکلات
۶۵	سورہ تحریم کے مضامین	۳۳	اولاد کی مشکلات
۶۶	سورہ تحریم کی تلاوت کی فضیلت	۳۴	۲۔ اسبابِ طلاق
۶۸	آیت ۵ تا ۵	۳۵	۳۔ عدت کا فلسفہ
۷۰	شانِ نزول	۳۷	آیت ۲، ۳
۷۱	پیغمبر کی بعض ازواج کی شدید سزاؤں	۳۸	صلح یا پسندِ خدا علیحدگی
	چند نکات		چند نکات
	۱۔ اچھی بیوی کے اوصاف	۴۱	۱۔ مشکلات سے نجات اور تقویٰ
۷۵	۲۔ صالح مومنین سے کون مراد ہے؟	۴۳	۲۔ روحِ توکل
۷۶		۴۵	آیت ۲ تا ۷

۱۱۹	آیت ۱۵ تا ۱۸
	[کوئی مجرم اس کے عذاب و سزا سے امان میں نہیں ہے۔
۱۲۰	
۱۲۲	آیت ۱۹ تا ۲۱
۱۲۵	اپنے سر کے اوپر ان پرندوں کی طرف دیکھو
	ایک نکتہ
۱۲۸	انسان کی ناکامی کے چار عوامل
۱۲۹	آیت ۲۲ تا ۲۷
۱۳۰	شاہراہ توحید کے راست قامت افراد
۱۳۵	آیت ۲۸ تا ۳۰
۱۳۶	جاری پانی تمہارے اختیار میں کون دیتا ہے؟
	ایک نکتہ

سُورۃ قلم

۱۳۰	
۱۳۱	سُورۃ قلم کے مضامین
۱۳۲	سُورۃ قلم کی تلاوت کی فضیلت
۱۳۳	آیت ۷ تا ۷
۱۳۴	تیرے اخلاق کتنے عمدہ ہیں
	چند نکات
۱۳۸	۱۔ انسانی زندگی میں قلم کا نقش و اثر
۱۵۲	۲۔ پیغمبر کے اخلاق کا ایک نمونہ
۱۵۶	آیت ۸ تا ۱۶
۱۵۷	ایسی صفات والوں کی پیروی نہ کرو
	چند نکات

۷۸	۳۔ افشائے راز
۷۹	۴۔ حلال خدا کو اپنے اوپر حرام نہیں کرنا چاہیے
۸۰	آیت ۶ تا ۸
۸۱	اپنے گھروالوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ
	چند نکات
۸۶	۱۔ اہل خانہ کی تعلیم و تربیت
۸۸	۲۔ توبہ رحمت کا ایک دروازہ ہے
۹۰	آیت ۹ تا ۱۲
۹۱	مومن اور کافر عورتوں کے نمونے

سُورۃ ملک

۹۸	
۹۹	سُورۃ ملک کے مضامین
۱۰۰	اس سُورۃ کی تلاوت کی فضیلت
۱۰۱	آیت ۵ تا ۵
۱۰۲	تم عالم ہستی میں کسی قسم کا نقص نہیں دیکھو گے
	ایک نکتہ
۱۰۸	عالم آفرینش کی عظمت
۱۱۰	آیت ۶ تا ۱۱
	[اگر تم سننے والے کان اور بیدار فکر رکھتے تو
۱۱۱	دوزخ میں نہ ہوتے۔
	ایک نکتہ
۱۱۴	عقل و خرد کی اونچی قدر و قیمت
۱۱۶	آیت ۱۲ تا ۱۴
۱۱۶	کیا جہان کا خالق جہان کے اسرار سے آگاہ نہیں ہے؟

۱۹۶	اس سوره کی تلاوت کی فضیلت	۱۶۱	۱۔ اخلاقی ردائل
۱۹۷	آیت ۸ تا ۸	۱۶۲	۲۔ مہابہ اور سازگاری
۱۹۸	سرکشی کرنے والی قوم کے لیے سرکش عذاب	۱۶۳	آیت ۲۵ تا ۲۵
۲۰۲	آیت ۱۲ تا ۹	۱۶۵	باغ والوں کی عبرت انگیز داستان
۲۰۲	سننے والے کان کہاں ہیں؟	۱۶۹	آیت ۲۶ تا ۳۳
	چند نکات	۱۷۰	سرسبز باغ کے مالکوں کا دردناک انجام
۲۰۵	علیؑ کے فضائل میں سے ایک اور فضیلت		چند نکات
۲۰۵	گناہ اور سزا میں تناسب		۱۔ انحصار طلبی؛ ثروت مندوں کی بہت بڑی مصیبت۔
۲۰۷	آیت ۱۳ تا ۱۷	۱۷۲	۲۔ گناہ اور قطع رزق کے درمیان رابطہ
۲۰۸	وہ دن جس میں وہ عظیم واقعہ رونما ہوگا	۱۷۶	آیت ۳۲ تا ۴۱
۲۱۲	آیت ۱۸ تا ۱۴	۱۷۷	مکمل بازپرس
۲۱۳	اے اہل محشر میرا نامہ اعمال پڑھو	۱۸۰	آیت ۲۲ تا ۲۵
	چند نکات		اس دن سجدہ کرنا چاہیں گے، لیکن قادر نہ ہو سکیں گے۔
۲۱۵	۱۔ لفظ عرش کی ایک اور تفسیر	۱۸۱	
۲۱۶	۲۔ علیؑ اور ان کے شیعوں کا مقام	۱۸۵	آیت ۲۶ تا ۵۰
۲۱۶	۳۔ ایک سوال کا جواب	۱۸۶	عذاب کا تقاضا کرنے میں جلدی نہ کرو
۲۱۸	آیت ۲۵ تا ۲۹	۱۹۰	آیت ۵۱، ۵۲
۲۱۹	اے کاش مجھے موت آجاتی	۱۹۰	وہ تجھے نابود کرنا چاہتے ہیں لیکن نہیں کر سکتے
	ایک نکتہ		ایک نکتہ
۲۲۰	چند عبرت انگیز داستانیں	۱۹۲	کیا نظر بد کی کوئی حقیقت ہے
۲۲۳	آیت ۳۰ تا ۳۷		
۲۲۴	اسے پکڑ کر زنجیروں میں جکڑ دو		
	ایک نکتہ		
۲۲۷	حروف قرآن پر اعراب لگانے کی ابتدا	۱۹۵	
		۱۹۶	سورہ حاقہ کے مضامین

سورہ حاقہ

سورہ حاقہ کے مضامین

۲۶۷	کس مُنہ سے جنت کی طمع؟ ایک نکتہ	۲۲۹	آیت ۳۸ تا ۴۳
۲۷۰	'مشارق' و 'مغرب' خدا	۲۳۰	یہ قرآن یقیناً خدا کا کلام ہے
۲۷۱	آیت ۴۲ تا ۴۴	۲۳۲	آیت ۴۲ تا ۵۲
۲۷۱	گویا اپنے بُتوں کی طرف دوڑ رہے ہیں		اگر وہ ہم پر جھوٹ باندھتا تو ہم اسے [
		۲۳۵	مہلت نہ دیتے
		۲۳۹	ایک نکتہ
۲۷۴	<u>سُورہ نوح</u>		
۲۷۵	سُورہ نوح کے مطالب و مضامین	۲۴۰	<u>سُورہ معارج</u>
۲۷۶	اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت	۲۴۱	سُورہ معارج کے مطالب
۲۷۷	آیت ۱ تا ۴	۲۴۱	اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت
۲۷۸	نوح کا پہلا پیغام	۲۴۲	آیت ۱ تا ۳
۲۸۰	عمر کی زیادتی اور کمی کے معنوی اسباب	۲۴۵	فوری عذاب
۲۸۱	آیت ۵ تا ۹		ایک نکتہ
	ان کی ہدایت کے لیے ہر طرح سے [۲۴۶	ہمانہ تراشوں کے بیہودہ اعتراضات
۲۸۱	کوشش مگر.....	۲۴۹	آیت ۲ تا ۷
	چند نکات	۲۴۹	پچاس ہزار سال کے برابر دن
۲۸۲	۱۔ تبلیغ کے طریقے	۲۵۲	آیت ۸ تا ۱۸
۲۸۳	۲۔ حقیقت سے فرار کیوں؟		وہ دن کہ جس میں کوئی مخلص دوست اپنے
۲۸۶	آیت ۱۰ تا ۱۳	۲۵۳	دوست کی خبر گیری نہیں کرے گا
۲۸۶	ایمان کی دنیاوی جزا	۲۵۷	آیت ۱۹ تا ۲۸
	ایک نکتہ	۲۵۸	شائستہ انسانوں کے اوصاف
۲۸۸	تقویٰ اور عمران و آبادی میں ربط	۲۶۳	آیت ۲۹ تا ۳۵
۲۹۱	آیت ۱۵ تا ۲۰	۲۶۴	بہشتیوں کی خصوصیات کا ایک اور حصہ
۲۹۱	باغبان ہستی نے تمہیں ایک پھول کی طرح پالا ہے	۲۶۷	آیت ۳۶ تا ۴۱

چند نکات

- ۳۳۳ ۱۔ خدائی رہبروں کی صداقت
 ۳۳۵ ۲۔ جمعیت کے افراد کا زیادہ ہونا اہم نہیں
 ۳۳۶ آیت ۲۵ تا ۲۸
 ۳۳۶ عالم الغیب خدا ہے
 چند نکات

- ۳۳۹ [۱۔ علم غیب کے بارے میں ایک
 وسیع تحقیق
 ۳۳۵ [۲۔ آئمہ کے علم غیب کو ثابت کرنے کی
 ایک اور راہ
 ۳۳۶ ۳۔ جن کی خلقت کے بارے میں تحقیق

سورہ مزمل

- ۳۵۱
 ۳۵۲ سورہ مزمل کے مضامین و مطالب
 ۳۵۲ اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت
 ۳۵۵ آیت ۱ تا ۵
 ۳۵۵ اے اپنے اوپر کپڑا لپیٹنے والے کھڑا ہو جا
 چند نکات

- ۳۵۸ [۱۔ تلاوت قرآن اور دعا و عبادت کیلئے
 رات کو اٹھنا
 ۳۵۹ ۲۔ ترتیل کا معنی
 ۳۶۰ ۳۔ نماز شب کی فضیلت
 ۳۶۲ آیت ۶ تا ۱۰
 ۳۶۲ رات کے وقت کی عبادت کا اثر

- ۲۹۵ آیت ۲۱ تا ۲۵
 ۲۹۶ خدا کا لطف تجھے مدارات کہتا ہے
 ۳۰۰ آیت ۲۶ تا ۲۸
 ۳۰۰ اس فاسد و مفسد قوم کو چلے جانا چاہیے
 چند نکات
 ۳۰۳ نوح پہلے اولوالعزم پیغمبر

سورہ جن

- ۳۰۶
 ۳۰۷ سورہ جن کے مضامین و مطالب
 ۳۰۷ اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت
 ۳۰۹ آیت ۱ تا ۶
 ۳۱۰ شان نزول
 ۳۱۱ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے
 ۳۱۶ آیت ۷ تا ۱۰
 ۳۱۷ ہم پہلے چوری چھپے سن لیا کرتے تھے لیکن
 ۳۲۰ آیت ۱۱ تا ۱۵
 ۳۲۱ ہم نے حق کو سنا اور سر تسلیم خم کر لیا
 ۳۲۲ آیت ۱۶ تا ۱۹
 ہم تمہیں ان فرادان نعمتوں کے ذریعے
 ۳۲۴ آزمائیں گے۔
 ایک نکتہ
 ۳۲۸ ان المساجد اللہ کی تفسیر میں تحریف
 ۳۳۰ آیت ۲۰ تا ۲۳
 ۳۳۱ کہہ دیجیے: میں کسی کے سود و زیاں کا مالک نہیں ہوں

۴۰۷	آیت ۳۱
۴۰۷	دوزخ کے مامورین کی تعداد کس لیے ہے
	ایک نکتہ
۴۱۰	پروردگار کے لشکروں کی تعداد
۴۱۲	آیت ۳۲ تا ۳۷
۴۱۵	آیت ۳۸ تا ۳۸
۴۱۶	تم اہل دوزخ کیوں ہو گئے؟
	ایک نکتہ

۴۲۰	روزِ جزا کے شفاعت کرنے والے
۴۲۳	آیت ۴۹ تا ۵۶
	حق سے اس طرح بھاگتے ہیں جس طرح
۴۲۴	شیر سے گدھے

سُورہ قیامت

۴۲۸	
۴۲۹	سُورہ قیامت کے مضامین
۴۲۹	اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت
۴۳۱	آیت ۱ تا ۶
	قیامت کے دن اور ملامت کرنیوالے
۴۳۲	وجدان کی قسم -
	چند نکات
۴۳۶	۱- عدالت و جدان اور قیامتِ صغریٰ
۴۳۸	۲- قرآن مجید میں قیامت کے نام
۴۴۰	آیت ۷ تا ۱۵
۴۴۱	انسان خود اپنے لیے بہترین فیصلہ کرنے والا ہے

۴۶۸	آیت ۱۱ تا ۱۹
۴۶۹	ان مشکبرین کا معاملہ مجھ پر پھوڑ دے
	ایک نکتہ
۴۷۳	عذابِ الہی کے چار مرحلے
۴۷۵	آیت ۲۰
۴۷۶	جتنا تمہارے لیے ممکن ہے اتنا قرآن پڑھو
	چند نکات
۳۸۰	۱- عقیدت کے ساتھ عملی آمادگی کی ضرورت
۳۸۰	۲- غور و فکر کے ساتھ تلاوتِ قرآن
۳۸۱	۳- معاش کی تلاش، جہاد کی ہمدلیت

سُورہ مدثر

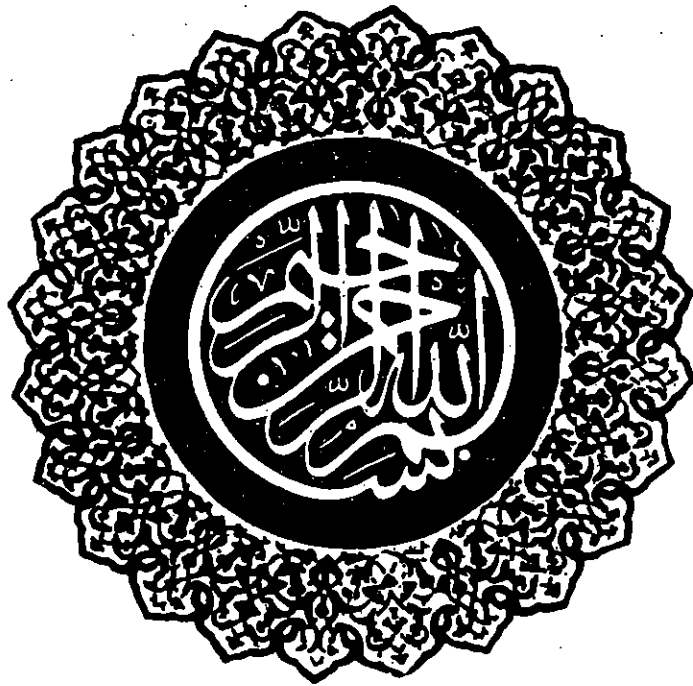
۳۸۲	
۳۸۳	سُورہ مدثر کے مضامین
۳۸۳	اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت
۳۸۵	آیت ۱۰ تا ۱۰
۳۸۶	اٹھ اور عالمین کو ڈرا
۳۹۳	آیت ۱۱ تا ۱۷
۳۹۳	شانِ نزول
۳۹۵	'ولید' ایک حق ناشناس مغرور ثروت مند
۳۹۹	آیت ۱۸ تا ۲۵
۴۰۰	ہلاک ہو جائے وہ، اس نے کتنا بُرا منصوبہ بنایا
۴۰۳	آیت ۲۶ تا ۳۰
۴۰۳	اس کی سرنوشتِ شوم
۴۰۶	انیس کا عذاب کے فرشتوں کا عذر ہے

۴۷۵	جنین کا پُر خوفا عالم
۴۷۸	آیت ۵ تا ۱۱
۴۷۹	[اہل بیت، پیغمبر کی فضیلت پر ایک عظیم سند۔
۴۸۲	اہل بیت کے لیے عظیم اجر ایک نکتہ
۴۸۸	بھوکوں کو سیر کرنا بہترین حسنت میں ہے
۴۹۱	آیت ۱۲ تا ۲۲
۴۹۳	بہشت کی عظیم جزائیں
۵۰۱	آیت ۲۳ تا ۲۶
۵۰۱	[خدا کے حکم کے اجراء پر موفق ہونے کیلئے پانچ احکام
۵۰۵	آیت ۲۷ تا ۳۱
۵۰۶	[یہ ایک تنبیہ ہے اور راستہ کا انتخاب کرنا تمہارے اختیار میں ہے
۵۰۹	<u>سورہ مرسلات</u>
۵۱۰	سورہ مرسلات کے مضامین
۵۱۰	اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت
۵۱۲	آیت ۱ تا ۱۵
۵۱۲	[خدا کے وعدے حق میں واٹے ہے تکذیب کرنے والوں کے لیے۔
۵۱۸	ایک نکتہ ان قسموں کا مطلب

۴۴۶	آیت ۱۶ تا ۱۹
۴۴۶	[قرآن کا جمع کرنا اور اس کی حفاظت ہمارے ذمہ ہے۔
۴۴۹	آیت ۲۰ تا ۲۵
۴۴۹	میدانِ محشر میں کچھ چہرے ہنستے ہوئے اور کچھ بگڑے ہوئے ہوں گے۔
۴۵۲	آیت ۲۶ تا ۳۰
۴۵۶	ایک نکتہ موت کا دردناک لمحہ
۴۵۹	آیت ۳۱ تا ۴۱
۴۶۰	وہ خدا جس نے انسان کو ایک ناچیز نطفہ سے پیدا کیا۔
۴۶۲	چند نکات
۴۶۲	۱۔ جنین کی تبدیلیاں یا بار بار کی رشتائیں
۴۶۲	۲۔ جہانِ بشریت میں نظامِ جنیت
۴۶۶	<u>سورہ انسان (دہر)</u>
۴۶۷	سورہ انسان (دہر) کے مضامین
۴۶۷	کیا یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا ہے؟
۴۶۹	سورہ انسان (دہر) کی فضیلت
۴۷۱	آیت ۱ تا ۴
۴۷۲	[ہم نے ناچیز نطفہ کو انسان بنا دیا اور ہدایت کے تمام ذرائع اس کے اختیار میں دیدیے۔
	ایک نکتہ

۵۶۱	آخر کار روز موعود اگر رہے گا	۵۲۰	آیت ۲۸ تا ۲۹
۵۶۶	آیت ۲۱ تا ۳۰		ان تمام مظاہر قدرت کے باوجود پھر بھی تم
۵۶۷	جہنم ایک عظیم کمین گاہ	۵۲۱	معاد میں شک رکھتے ہو؟
۵۷۲	آیت ۳۱ تا ۳۷	۵۲۷	آیت ۲۹ تا ۴۰
"	پرہیزگاروں کی عظیم جزا کا ایک حصہ	۵۲۸	نہ دفاع کرنے کی قدرت ہے نہ فرار کی راہ
۵۷۷	چند نکات	۵۳۳	آیت ۴۱ تا ۵۰
	۱- متقین کے لیے عطیات اور سرکشوں		گردہ قرآن پر ایمان نہیں لاتے تو پھر کس
۵۷۷	کے لیے عذاب	۵۳۵	بات پر ایمان لائیں گے؟
"	۲- جنت کے مشروب		
۵۷۹	آیت ۳۸ تا ۴۰	۵۴۰	<u>سورہ نباء</u>
"	کافر کہیں گے کہ کاش ہم مٹی ہوتے	۵۴۱	سورہ نباء کے مضامین اور اس کا دائرہ کار
۵۸۵	ایک نکتہ	"	اس سورہ کے مضامین کو چند حصوں میں
"	مسئلہ جبر و اختیار کے حل ہونے کا واضح راستہ	"	تقسیم کیا جا سکتا ہے
		۵۴۲	تلاوت کی فضیلت
		۵۴۳	آیت ۱ تا ۵
۵۸۸	<u>سورہ نازعات</u>	"	اہم خبر
	سورہ نازعات کے مضامین اور اس کا	"	چند نکات
۵۸۹	دائرہ فکر	۵۴۵	۱- مسئلہ ولایت اور نباء عظیم
"	تلاوت کی فضیلت	"	۲- معاد قیامت پر اتنا زور کیوں دیا
۵۹۱	آیت ۱ تا ۵	۵۴۷	گیاہے
"	انتھک فرشتوں کی قسم	۵۴۹	آیت ۶ تا ۱۶
۵۹۵	دو سوالوں کا جواب	۵۵۹	ایک نکتہ
۵۹۶	آیت ۶ تا ۱۳	"	ان آیات کا مسئلہ معاد سے تعلق
۵۹۷	معاد صرف ایک عظیم صبح سے رونما ہوگا	"	آیت ۱۷ تا ۲۰
۶۰۱	آیت ۱۵ تا ۲۶	۵۶۱	

۶۲۴	[اس سورہ کا نام اس کی مناسبت سے]	۶۰۲	فرعون کہتا تھا کہ میں تمہارا بہت بڑا خدا ہوں
۶۲۵	تلاوت کی فضیلت	۶۰۷	ایک نکتہ
۶۲۸	آیت ۱۰ تا ۱۰	۶۰۸	قرآن کی فضیلت کا ایک گوشہ
۶۳۰	[حق طلب نابینا سے بے اعتنائی برتنے پر]	۶۰۹	آیت ۲۷ تا ۳۳
۶۳۱	شدید عتاب	۶۱۳	تمہاری تخلیق زیادہ مشکل ہے یا آسمانوں کی
۶۳۹	آیت ۱۱ تا ۲۳	۶۱۴	(معاد پر ایک دوسری دلیل)
۶۴۰	[صرف پاک لوگوں کا ہاتھ قرآن کے دامن]	۶۱۶	آیت ۳۴ تا ۴۱
۶۴۶	سبک پہنچتا ہے	۶۱۷	وہ جو اپنے نفس کو ہوا دہوس سے باز رکھیں
۶۴۸	آیت ۲۴ تا ۳۲	۶۱۸	چند نکات
۶۴۹	انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی غذا کی طرف دیکھے	۶۱۹	۱۔ مقام رب کیا ہے
۶۵۲	ایک نکتہ	۶۲۳	۲۔ طغیان اور دنیا پرستی کے درمیان ربط
"	صحیح و سالم مواد غذائی	۶۲۴	۳۔ صرف دو گروہ
"	آیت ۳۳ تا ۴۲		آیت ۴۲ تا ۴۶
"	صیحہ قیامت		قیامت کی تاریخ صرف خدا جانتا ہے
"	ایک نکتہ		
"	تعمیر ذات کی راہ		
			<u>سورہ عبس</u>
			سورہ عبس کے مضامین



اللهم صل على محمد وآل محمد
وعلى علي بن أبي طالب
وآل علي بن أبي طالب
وآل محمد بن عبد الله

تفسیر نمونہ جلد ۱۲

اس میں مندرجہ ذیل سورتیں شامل ہیں۔

سُورَةُ طَلَق : مدنی سورت ہے اور اس کی ۱۲ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۸

سُورَةُ تَحْرِيم : مدنی سورت ہے اور اس کی ۱۲ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۸

سُورَةُ مَلِك : مکی سورت ہے اور اس کی ۳۰ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۹

سُورَةُ قَلَم : مکی سورت ہے اور اس کی ۵۲ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۹

سُورَةُ حَاقِمَا : مکی سورت ہے اور اس کی ۵۲ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۹

سُورَةُ مَعَارِج : مکی سورت ہے اور اس کی ۴۴ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۹

سُورَةُ نُوح : مکی سورت ہے اور اس کی ۲۸ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۹

سُورَةُ جِن : مکی سورت ہے اور اس کی ۲۸ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۹

سُورَةُ مَزْمَلٍ : مکی سورت ہے اور اس کی ۲۰ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۹

سُورَةُ مَدَّ ثَرٍ : مکی سورت ہے اور اس کی ۵۶ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۹

سُورَةُ قِيَامَتٍ : مکی سورت ہے اور اس کی ۴۰ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۹

سُورَةُ دَهْرٍ : مدنی سورت ہے اور اس کی ۳۱ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۹

سُورَةُ مَرْسَلَاتٍ : مکی سورت ہے اور اس کی ۵۰ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۹

سُورَةُ نَبَاٍ : مکی سورت ہے اور اس کی ۴۰ آیات ہیں۔

پارہ — ۳۰

سُورَةُ نَازِعَاتٍ : مکی سورت ہے اور اس کی ۴۶ آیات ہیں۔

پارہ — ۳۰

سُورَةُ عَبَسَ : مکی سورت ہے اور اس کی ۴۲ آیات ہیں۔

پارہ — ۳۰

سورہ
طلاق

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا اور اس کی ۱۲ آیات ہیں۔

آغاز ترجمہ
۲۲ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

سورۃ طلاق کے مضامین

اہم ترین مسئلہ جو اس سورہ میں پیش کیا گیا ہے، جیسا کہ اس سورہ کے نام سے ظاہر ہے، وہ مسئلہ طلاق، اس کے احکام و خصوصیات اور اس کے نتائج ہیں۔ اس کے بعد مبدء و معاد، پیغمبر کی نبوت اور بشارت و نذارت کے مباحث بیان کئے گئے ہیں۔

اس طرح اس سورہ کے مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

پہلا حصہ : اس سورہ کی پہلی سات آیات ہیں، جو طلاق اور اس سے مربوط مسائل کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں ان میں اس مسئلہ کی جزئیات کو مختصر اور پرمعنی عبارتوں میں دقیق اور لطیف انداز میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ انسان انہیں دیکھ کر خود کو اس موضوع میں پورے طور پر مستغنی سمجھتا ہے۔

دوسرا حصہ : جو حقیقت میں پہلے حصہ کے اجراء کا سبب ہے، خدا کی عظمت، اس کے رسول کے مقام عظمت صالحین کے اجر و ثواب اور بدکاروں کی سزا و عذاب کے بارے میں بحث کرتا ہے۔ نیز اس اہم اجتماعی مسئلہ کے اجراء کی ضمانت کے طور پر ایک منظم مجبوتہ قواعد پیش کرتا ہے۔ ضمناً یہ سورہ ایک دوسرا نام بھی رکھتا ہے اور وہ سورہ نساء قصری (بروزن و معنی مغربی) مشہور سورہ نساء کے مقابلہ میں ہے جو "نساء کبریٰ" ہے۔

❖ ❖ ❖

تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر اکرم سے آیا ہے :

"من قرأ سورۃ الطلاق مات علیٰ سنتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ"

"جو شخص سورہ طلاق کو پڑھے (اور اسے اپنی زندگی کے امور میں اپنائے اور اس پر گامبند رہے) وہ دنیا

سے سنت پیغمبر پر جائے گا" لے

❖ ❖ ❖

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱) یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعَدَّتِهِنَّ
وَ اَحْصُوا الْعِدَّةَ، وَ اتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّکُمْ لَا تَخْرِجُوهُنَّ مِنْ
بُیُوتِهِنَّ وَلَا یَخْرُجْنَ اِلَّا اَنْ یَّاتِیَنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبِیِّنَةٍ
وَ تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ وَمَنْ یَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ
نَفْسَهُ لَا تَدْرِی لَعَلَّ اللّٰهُ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۝

ترجمہ
رحمن ورحیم خدا کے نام سے۔

۱) اے پیغمبر! جب تم عورتوں کو طلاق دینا چاہو تو عدت کے زمانہ میں طلاق دو۔ (وہ زمانہ
جب وہ ماہانہ عادت سے پاک ہو گئی ہو اور مرد نے اپنی بیوی سے نزدیکی نہ کی ہو) اور
عدت کا حساب رکھو اور اس خدا سے ڈرتے رہو جو تمہارا پروردگار ہے۔ نہ تو تم انہیں ان
کے گھروں سے باہر نکالو اور نہ وہ (عدت کے دوران) باہر جائیں۔ سوائے اس صورت کے کہ وہ
ظاہر بظاہر کوئی برا کام انجام دیں۔ یہ اللہ کی حدود ہیں اور جو شخص حدود الہی سے تجاوز کرتا
ہے تو وہ خود اپنے ہی اوپر ظلم کرتا ہے۔ تو نہیں جانتا، شاید خدا اس کے بعد کوئی اور نئی
وضع (اور اصلاحی فریضہ) فراہم کر دے۔

طلاق اور علیحدگی کی شرائط

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سورہ کی اہم ترین بحث وہی طلاق کے بارے میں ہے کہ جو اس کی پہلی آیت سے شروع ہو رہی ہے۔ مسلمانوں کے عظیم پیشوا اور رہبر کے عنوان سے روئے سخن پیغمبر اسلام کی طرف کیا، اور اس کے بعد ایک عمومی حکم حج کے صیغہ کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اے پیغمبر! جب تم عورتوں کو طلاق دینا چاہو تو انھیں عدت کے زمانہ میں طلاق دو“ (یا ایہا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوهن لعدتھن)۔

یہ ان پانچ احکام میں سے پہلا حکم ہے جو اس آیت میں آئے ہیں جیسا کہ مفسرین نے اس سے استفادہ کیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ صیغہ طلاق ایسے زمانہ میں جاری کیا جائے جب عورت اپنی ماہانہ عادت سے پاک ہو گئی ہو اور اپنے شوہر سے اس کی نزدیکی نہ ہوئی ہو۔ کیونکہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۸ کے مطابق عدت طلاق ”ثلاثہ قروء“ (تین مرتبہ پاک ہونے) کی مقدار میں ہونی چاہیے۔ اب یہاں یہ تاکید کرتا ہے کہ طلاق عدت کے آغاز کے ساتھ ہو۔ اور یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ جب طلاق پاکیزگی کی حالت میں اختلاط جنسی کے بغیر مستحق ہو۔ اگر طلاق حیض کے زمانہ میں واقع ہو جائے تو عدت کے زمانہ کا آغاز، طلاق کے آغاز سے جدا ہو جائے گا۔ اور عدت کا آغاز پاک ہونے کے بعد ہوگا۔

اسی طرح سے اگر عورت ایسی طہارت کی حالت میں ہو کہ اس نے اپنے شوہر سے نزدیکی کی اور جدا ہونا مشکل ہوا ہو، کیونکہ اس قسم کی پاکیزگی اختلاط جنسی کی بناء پر رحم میں نطفہ کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ (غور کیجیے۔)

بہر حال یہ طلاق کی پہلی شرط ہے۔

متعدد روایات میں پیغمبر گرامی سے نقل ہوا ہے کہ:

”جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اس کی ماہانہ عادت میں طلاق دے تو اس طلاق کی پروا نہیں کرنی

چاہیے اور پلٹ آنا چاہیے، یہاں تک کہ عورت پاک ہو جائے“ اس کے بعد اگر وہ طلاق

دینا چاہتا ہے تو دے دے“ لے

یہی مطلب روایات اہل بیت میں بھی بارہا بیان ہوا۔ یہاں تک کہ آیت کی تفسیر کے عنوان سے بھی

ذکر ہوا ہے۔ لے

اس کے بعد دوسرے حکم کو جو عدت کا حساب رکھنے کا مسئلہ ہے، پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”عورت

لے یہ روایات کتاب ”الطلاق“ ص ۲ میں صفحہ ۱۹۰۲ کے بعد نقل ہوئی ہیں۔ لے وسائل الشیخہ جلد ۱۵ ص ۳۳۸ ”باب کینیۃ طلاق العتہ“

کا حساب رکھو“ (واحصوا العدة۔)

خود کے ساتھ ملاحظہ کیجیے کہ عورت تین مرتبہ اپنی پاکیزگی کے دن ختم کرے اور ماہانہ عادت دیکھے، جب تیسرا دور پاکیزگی ختم ہو اور تیسری ماہانہ عادت میں داخل ہو تو اس کے ایام عدت کی مدت آخر کو پہنچی اور ختم ہوئی۔ اگر اس امر میں غور نہ کیا جائے تو ممکن ہے کہ عدت کا دور ضروری مقدار سے زیادہ شمار ہو جائے، اور عورت کو کچھ ضرر اور نقصان پہنچے، کیونکہ یہ چیز اُسے نئے نکاح اور ازدواج سے مانع ہوگی۔ اگر یہ مدت کمتر ہو تو عدت کے اصلی ہدف کی رعایت نہیں ہوگی کہ جو پہلے ازدواج کے حریم کی حفاظت اور انعقاد لطفہ کا مسئلہ ہے۔ ”احصوا“، ”احصاء“ کے مادہ سے شمار کرنے کے معنی میں ہے، اور اصل میں ”حصی“ سے لیا گیا ہے جس کے معنی سنگریزہ کے ہیں۔ کیونکہ قدیم زمانہ میں بہت سے لوگ جبکہ وہ پڑھنے لکھنے سے آشنا نہیں تھے، مختلف موضوعات کا حساب کتاب سنگریزوں کے ذریعے رکھتے تھے۔

قابل توجہ بات یہ ہے: عدت کا حساب رکھنے کے مخاطب مرد ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ نفقہ اور مسکن کا مسئلہ ان کے ذمہ ہے۔ اسی طرح حق رجوع بھی انھیں کو حاصل ہے ورنہ عورتیں بھی غفلت ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری کے واضح ہونے کے لیے پورے خود کے ساتھ عدت کا حساب رکھیں۔

اس حکم کے بعد تمام لوگوں کو تقویٰ اور پرہیزگاری کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے: ”اس خدا سے ڈرو جو تمہارا پروردگار ہے اور تقویٰ اختیار کرو“ (واتقوا اللہ ربکم)۔

وہ تمہارا پروردگار اور مرنی ہے اور اس کے احکام تمہاری سعادت کے ضامن ہیں۔ اس بناء پر اس کے فرامین پر کاربند ہو جاؤ، اور اس کی نافرمانی سے پرہیز کرو۔ خصوصاً طلاق اور عدت کا حساب رکھنے میں دقت سے کام لو۔

اس کے بعد تیسرے اور چوتھے حکم کے بارے میں، جن میں سے ایک شوہروں اور دوسرا بیویوں سے مربوط ہے۔ فرماتا ہے: ”تم انھیں ان کے گھروں سے نہ نکالو، اور وہ بھی عدت کے دوران گھروں سے باہر نہ نکلیں“ (لا تخرجوهن من بیوتھن ولا ینخرجن)۔

اگرچہ بہت سے بے خبر اس حکم اسلامی کو طلاق کے وقت اصلاً جاری نہیں کرتے اور محض صیغہ طلاق کے جاری ہوتے ہی مرد بھی خود کو آمادہ کرتا ہے کہ عورت کو گھر سے باہر نکال دے اور عورت بھی اپنے آپ کو آزاد سمجھ لیتی ہے کہ شوہر کے گھر سے نکل کر اپنے عزیزوں کے گھر واپس چلی جائے۔ لیکن یہ اسلامی حکم بہت ہی اہم فلسفہ کا حامل ہے، کیونکہ یہ عورت کے احترام کے علاوہ عام طور پر شوہروں کی طلاق سے بازگشت اور رشتہ زنجیت کے استحکام کے لیے بھی اسباب فراہم کرتا ہے۔

اس اہم اسلامی حکم کو نظر انداز کر دینے سے، جو قرآن کے متن میں آیا ہے، بہت سی طلاقیں دائمی جدائی کا سبب بن جاتی ہیں۔ حالانکہ اگر اس حکم کا اجرا ہوتا تو یہ اکثر زوجین کی صلح اور نئے سرے سے بازگشت پر

منتهی ہوتا۔

لیکن بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ طلاق کے بعد عورتوں کو گھر میں رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہذا پانچویں حکم کا استثناء کی صورت میں اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ”سوائے اس صورت کے کہ وہ عورتیں کسی واضح بڑے کام کو انجام دیں۔“ (الآن یأتین بفاحشۃ مبینۃ)۔ مثلاً وہ شوہر اور اس کے رشتہ داروں کے ساتھ اس قدر ناسازگاری، بد خلقی اور بد زبانی کرے کہ اُسے گھر میں رکھنا زیادہ مشکلات کا باعث بن جائے۔

یہ بات کئی ایک روایات میں نظر آتی ہے، جو آئمہ اہل بیت سے نقل ہوئی ہیں۔ البتہ اس سے مراد ہر قسم کی مخالفت اور جہزی ناسازگاری نہیں ہے، کیونکہ لفظ فاحشہ کے مفہوم کا تقاضا ہے کہ کوئی بہت بڑا کام ہو گیا ہے، خاص طور پر جب کہ وہ ’مبینہ‘ کی صفت سے بھی موصوف ہوا ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ ”فاحشہ“ سے مراد عقمت اور پاکدامنی کے منافی عمل ہے، اور یہ ایک روایت میں امام جعفر صادقؑ سے بھی نقل ہوا ہے۔ اس صورت میں خارج کرنے سے مراد اجراء حد کے لیے باہر لے جانا اور واپس گھر میں لے آنا ہے۔

ان دونوں معانی کے درمیان جمع کرنا بھی ممکن ہے۔

ان احکام کے بیان کرنے کے بعد پھر تاکید کے عنوان سے مزید کہتا ہے: ”یہ خدائی حدود ہیں اور جو شخص حدود الہی سے تجاوز کرے تو اُس نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔“ (وَتَلَکَ حُدُودَ اللّٰهِ وَمَنْ یَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ)۔

کیونکہ یہ قوانین اور احکام الہی خود مکلفین کے مصالح کے ضامن ہیں اور ان سے تجاوز کرنے سے، چاہے وہ مرد کی طرف سے ہو یا عورت کی طرف سے، خود ان کی سعادت پر ضرب لگتی ہے۔

آیت کے آخر میں عدت کے فلسفہ اور عورت کے گھر اور اصلی اقامت گاہ سے باہر نہ نکلنے کی علت کی طرف ضمنی اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”تو نہیں جانتا کہ خدا اس واقعہ کے بعد نئی وضع اور اصلاح کا ذریعہ فراہم کر دے۔“ (لَا تَدْرٰی لَعَلَّ اللّٰهُ یَعْدُکَ بِحَدِّ ذٰلِکَ اٰمْرًا)۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غیظ و غضب کا وہ طوفان رُک جائے گا جو عام طور طلاق و جدائی کے معاملہ میں ناگہانی فیصلوں کا موجب بن جاتا ہے۔ چنانچہ عدت کی مدت میں عورت کا ہر وقت مرد کے ساتھ ہونا، نیز خصوصاً جہاں اولاد کا معاملہ بھی درمیان میں ہو ایسے میں ایک دوسرے سے محبت کا اظہار رجوع کرنے کا سبب بن جاتا ہے اور دشمنی و عداوت کے تیرہ و تار بادلوں کو ان کے آسمان زندگی سے ڈور کر دیتا ہے۔

یہاں قابل توجہ بات یہ ہے اور امام باقرؑ سے بھی مروی ہے :

”المطلقة تكتحل و تختضب و تطيب و تلبس ما شئت من الثياب لان الله عزوجل يقول لعل الله يحدث بعد ذلك امرا لعلها ان تقع في نفسه فيراجعها“

”مطلقة عورت اپنی عدت کے دوران آرائش کرے، آنکھ میں سرمہ لگائے، اپنے بالوں کو رنگین کرے، اپنے آپ کو معطر کرے اور ہر وہ لباس جو اُسے پسند ہو پہنے۔ کیونکہ خدا فرماتا ہے : شاید خدا اس واقعہ کے بعد کوئی نئی کیفیت فراہم کر دے اور ممکن ہے کہ اس طریقہ سے عورت دوبارہ شوہر کے دل کو مسخر کرے اور مرد رجوع کرے۔“

یہاں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ عام طور پر علیحدگی اور طلاق کا ارادہ جلد گزر جانے والے ہیجانوں کی وجہ سے ہوتا ہے، جو وقت کے گزرنے اور مرد و عورت کے ایک مدت تک جو نسبتاً طولانی (عدت) ہوتی ہے، مسلسل معاشرت کرنے اور انجام کار غور و فکر کرنے سے معاملہ کئی طور پر بدل جاتا ہے۔ اور بہت سی علیحدگیوں اور طلاقوں میں صلح ہو جاتی ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ مذکورہ اسلامی احکام عدت کے زمانہ میں عورت کے بنائے شوہر کے گھر میں رہنے پر وقت کے ساتھ عمل ہو۔ انشاء اللہ ہم بعد میں بتائیں گے کہ یہ سب امور ”طلاق“ رجعی کے بارے میں ہیں۔

جد نکات

۱۔ طلاق حلال چیزوں میں سب سے زیادہ قابل نفرت ہے۔

اس میں شک نہیں کہ زوجیت کی قرارداد ایک ایسی قرارداد ہے کہ جسے جدائی کے قابل ہونا چاہیے کیونکہ بعض اوقات ایسے علل و اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جو عورت اور مرد کی مشترکہ زندگی کو غیر ممکن یا مشکلات اور مناسد سے بھر دیتے ہیں۔ ایسے میں اگر ہم یہ اصرار کرتے رہیں کہ یہ قرارداد ابد تک باقی ہے تو یہ بات بہت زیادہ مشکلات کا سرچشمہ بن جاتی ہے، لہذا اسلام نے اصل طلاق کے ساتھ موافقت کی ہے۔ آج ہم عیسائی معاشرہ میں طلاق کے بالکل ممنوع ہونے کا نتیجہ دیکھ رہے ہیں کہ بہت سے مرد اور عورتیں ایسی ہیں جو عیسائی مذہب کے تعریف شدہ قانون کے حکم کے مطابق طلاق کو ممنوع شمار کرتے ہیں۔ قانونی طور پر وہ دونوں ایک دوسرے کے شوہر و زوجہ ہیں لیکن عملی طور پر ایک دوسرے

سے الگ زندگی بسر کرتے ہیں، یہاں تک کہ ہر ایک نے اپنے لیے ایک خیر سعی بیوی یا شوہر کا انتخاب کر رکھا ہے۔

اس بناء پر اصل مسئلہ طلاق ایک ضرورت ہے، لیکن ایک ایسی ضرورت جسے ایک ممکن حد تک کم ہونا چاہیے، اور جب تک زوجیت کو برقرار رکھنے کی راہ ہو کوئی اس پر عمل نہ کرے۔ اسی بناء پر اسلامی روایات میں شدت کے ساتھ طلاق کی مذمت کی گئی اور اسے (مبغوض ترین حلال) کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے، جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ سے ایک روایت میں آیا ہے:

”مَا مِنْ شَيْءٍ ابْغَضَ إِلَى اللَّهِ عَزَّوَجَلَّ مِنْ بَيْتٍ

يُخْرَبُ فِي الْإِسْلَامِ بِالْفُرْقَةِ يَعْنِي الطَّلَاقُ“

”خداوند تعالیٰ کے نزدیک کوئی عمل اس سے زیادہ قابل نفرت نہیں ہے کہ

اسلام میں کسی گھر کی بنیاد بُدائی (یعنی طلاق) کے ساتھ ویران ہو۔“

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے:

”مَا مِنْ شَيْءٍ مِمَّا أَحَلَّهُ اللَّهُ ابْغَضَ إِلَيْهِ مِنَ الصَّلَاقِ“

”حلال امور میں سے کوئی چیز خدا کی بارگاہ میں طلاق سے زیادہ مبغوض

نہیں ہے۔“

اس کے علاوہ ایک اور حدیث میں رسول اکرمؐ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

”تَزَوَّجُوا وَلَا تَطْلُقُوا، فَإِنَّ الطَّلَاقَ يَهْتَزُّ مِنْهُ الْعَرْشُ“

”نکاح کرو اور طلاق نہ دو۔ کیونکہ طلاق عرش خدا کو لرزادیتی ہے۔“

ایسا کیوں نہ ہو جبکہ طلاق، عورتوں، مردوں، خاندانوں اور خصوصاً اولاد کے لیے بہت سی مشکلات پیدا

کر دیتی ہے، جنہیں تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

اس میں شک نہیں کہ وہ مرد اور عورت جو کئی سالوں یا مہینوں سے ایک

دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے، طلاق کے بعد ایک دوسرے

سے الگ ہو جاتے ہیں۔ وہ عاطفی و جذباتی لحاظ سے مجروح ہوں گے اور آئندہ کے ازدواج میں (بہت)

اس کی تلخ یاد ہمیشہ پریشان کرے گی، یہاں تک کہ دوسری بیوی یا شوہر کو ایک قسم کی بدبینی اور سوچنے کے

ساتھ دیکھیں گے۔ اس چیز کے نقصان وہ آثار کسی پر مخفی نہیں ہیں۔ اسی لیے اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ کمال

قسم کی عورتیں اور مرد ہمیشہ کے لیے نکاح کرنے سے اعراض کرتے رہتے ہیں۔

۲: اجتماعی مشکلات
طلاق کے بعد بہت سی عورتوں کو شائستہ اور دلخواہ طور پر نئی شادی کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اس لحاظ سے وہ شدید پریشانی میں گرفتار ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ مردوں کو بھی اپنی بیویوں کو طلاق دینے کے بعد اپنے مطلب کی شادی کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ خصوصاً اگر درمیان میں بچوں کا معاملہ بھی ہو۔ تب وہ اکثر ایسی شادی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو انہیں امن و سکون نہیں پہنچاتی اور اس بنا پر آخر زندگی تک رنج و تکلیف میں مبتلا رہتے ہیں۔

۳: اولاد کی مشکلات
اولاد کی مشکل ان سب سے زیادہ اہم ہے اور بہت کم دیکھا گیا ہے کہ سوتیلی ماںیں سگی ماں کی طرح شفقت و مہربان ہوں یعنی وہ اس اولاد میں شفقت و محبت کے غلا کو پکڑ سکے جو ماں کی محبت بھری گود سے جدا ہوئی ہے۔ اسی طرح سے اگر عورت اپنے بچوں کو اپنے ساتھ لے جائے تو سوتیلے باپ کے بارے میں بھی یہی بات صادق آتی ہے، البتہ کچھ عورتیں اور مرد ایسے بھی ہوتے ہیں جو دوسروں کی اولاد کے لیے شفقت و مہربان اور وفادار ہوتے ہیں لیکن مسئلہ طور پر ان کی تعداد بہت ہی کم ہوتی ہے، اسی وجہ سے طلاق کے بعد بیماری اولاد بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ شاید ان میں سے اکثر بچے آخر عمر تک روحانی سکون سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

درحقیقت یہ ایک ایسا نقصان ہے جو نہ صرف اس گھرانے کے لیے بلکہ پورے معاشرے کے لیے ہے، کیونکہ اس قسم کے بچے جو ماں یا باپ یا دونوں کی محبت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات خطرناک افراد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ مناسب توجہ نہ ہونے کی وجہ سے انتقام جوئی کے جذبہ کے زیر اثر آجاتے ہیں اور اپنا انتقام پورے معاشرے سے لیتے ہیں۔

اگر اسلام نے طلاق کے بارے میں اس قدر سخت گیری کی ہے تو اس کی وجہ یہی نقصان و ہتساج ہیں جو مختلف جہات میں نمودار ہوتے ہیں۔

اسی بنا پر قرآن مجید بھی صراحت کے ساتھ حکم دیتا ہے کہ جس وقت عورت اور مرد کے درمیان کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو دونوں کے عزیز و اقارب ان میں اصلاح کی کوشش کریں۔ وہ لوگ ایک "خاندانی صلح کمیٹی" بنا کر دونوں مہیاں بیوی کو شرعی عدالت تک جانے اور طلاق و جدائی کے عمل سے روکیں۔

(ہم نے صلح کمیٹی کی تفصیل تفسیر نمونہ جلد ۲ میں سورہ نساء کی آیت ۳۵ کے ذیل میں بیان کی ہے۔)

اسی بنا پر جو چیز عورت اور مرد میں خوش بینی اور خاندانی تعلقات کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں مدد دے وہ اسلام کی نظر میں محبوب ہے اور جو اسے متزلزل کرے وہ بُری اور قابل نفرت ہے۔

۲ : اسباب طلاق

دوسرے اجتماعی امور میں پیدا ہونے والے اختلافات کی طرح طلاق کی بھی مختلف وجوہات ہوتی ہیں کہ جن کا دقیق مطالعہ اور مقابلہ کیے بغیر ایسے حادثہ کو روکنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے ہر چیز سے پہلے مزوری ہے کہ ہم طلاق کے عوامل کو معلوم کریں اور معاشرے میں اس کی جڑوں کو ختم کریں۔ اگرچہ یہ عوامل بہت زیادہ ہیں لیکن ان میں سے ذیل کے امور زیادہ اہم ہیں :

الف : عورت یا مرد کی غیر محدود توقعات ، جذباتی اور علیحدگی کے اہم ترین عوامل میں سے ایک ہے۔ اگر ان میں سے ہر ایک اپنی توقع کے دامن کو محدود کر دے ، خواب و خیال کی دنیا سے باہر نکل آئے ، طرف مقابل کو اچھی طرح سے سمجھ لے اور جتنی اس کی حدود میں ممکن ہو اتنی ہی توقع رکھے تو بہت سی طلاقوں کو روکا جاسکتا ہے۔

ب : بہت سے گھرانوں میں حسن پرستی اور اسراف و تبذیر کی روح کا کارفرما ہونا ایک اور اہم عامل ہے جو خاص طور پر عورتوں کو ہمیشہ کے لیے ناراضی کی حالت میں رکھتا اور طرح طرح کے بہانوں سے طلاق و جذباتی کی راہ ہموار کرتا ہے۔

ج : دونوں میاں بیوی کی خصوصی زندگی خصوصاً ان کے اختلافات میں عزیز و اقارب اور جان پہچان والوں کی بے جا مداخلتیں طلاق کا ایک اور اہم عامل شمار ہوتی ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ اگر وہ دونوں میاں بیوی کے درمیان اختلافات کے ظہور کے وقت انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دیں اور اس کی یا اس کے جانبداری میں اختلاف کی آگ کو ہوانہ دین تو زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ وہ آگ خاموش ہو جاتی ہے۔ لیکن دونوں طرف کے لوگوں کی مداخلت کہ جو اکثر تعصب اور ناروا محبتوں کے ساتھ ہوتی ہے ، وہ نمٹنے کو دن بدن مشکل اور پیچیدہ تر بناتی رہتی ہے۔

البتہ یہ بات اس معنی میں نہیں ہے کہ عزیز و اقارب ہمیشہ ہی اپنے آپ کو ان اختلافات سے دور رکھیں ، بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ انہیں معمولی اختلافات میں ان کی حالت پر چھوڑ دیں۔ لیکن جب اختلافات گلی صورت میں بڑھنے لگیں تو پھر طرفین کی مصاحمت پر توجہ رکھتے ہوئے اور ہر طرح کی تعصب آمیز جانبداری سے اجتناب اور پرہیز کرتے ہوئے مداخلت کریں اور فریقین کی صلح کے مقدمات فراہم کریں۔

د : عورت اور مرد کا ایک دوسرے کی خواہش کے بارے میں بے اعتنائی کرنا، خصوصاً ان چیزوں سے جو عاطفی اور جنسی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً ہر مرد یہ توقع رکھتا ہے کہ اس کی بیوی پاک و صاف اور چرکش رہے۔ اسی طرح ہر بیوی بھی اپنے شوہر سے یہی توقع رکھتی ہے۔ لیکن یہ ایسے امور ہیں جن

کے اظہار کے لیے وہ عام طور پر تیار نہیں ہوتے۔ یہ وہ مقام ہے کہ طرف مقابل کا بے اعتنائی پر اپنی ظاہری وضع قطع کا خیال نہ رکھنا، ضروری توہین کو ترک کر دینا، اور پریشان بال اور گندہ رہنا، بیوی یا شوہر کو اس قسم کی ازدواجی زندگی سے سیر کر دیتا ہے۔ خاص طور پر اگر ان کی زندگی کے ماحول میں ایسے افراد بھی رہتے ہوں جو ان امور کی رعایت کرتے ہوں، لیکن وہ اس مسئلہ سے بالکل بے اعتنائی کریں۔

اسی لیے اسلامی روایات میں اس مطلب کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے جیسا کہ ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے :

”لا ینبغی للمریئة ان تھطل نفسها“

”عورت کے لیے یہ بات سزاوار نہیں ہے کہ وہ اپنے شوہر کے لیے زینت و آرائش کیے بغیر رہے“

ایک اور حدیث سے امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا :

”ولقد خرجن نساء من العفاف الی الفجور ما اخرجهن

الاقلة تھیئة انرا واجهن“

”بہت سی عورتیں چادہ عفت سے خارج ہو گئیں اور اس کی وجہ اس کے

علاوہ کچھ نہیں تھی کہ ان کے شوہر اپنے آپ کو آمادہ نہیں کرتے تھے“

ہ : عورت اور مرد کے گھرانے کے تمدن اور رہنے سہنے کے طریقوں کا ایک دوسرے سے

مناسبت نہ رکھنا بھی طلاق کا ایک اہم عامل ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر بیوی یا شوہر کے

انتخاب سے پہلے بڑی دقت کے ساتھ توجہ کرنی چاہیے۔ انھیں ”کفو شرعی“ یعنی مسلمان ہونے کے علاوہ

”کفو فرعی“ بھی ہونا چاہیے۔ یعنی ان دونوں کے درمیان مختلف جہات سے ضروری مناسبتوں کی رعایت

ہونی چاہیے اس اہتمام کے بغیر اس قسم کی شادیوں کے ٹوٹ جانے پر تعجب نہیں کرنا چاہیے۔

۳ : عدت کا فلسفہ

اس میں شک نہیں ہے کہ عدت کی دو بنیادی وجوہات ہیں جن کی طرف قرآن مجید اور اسلامی

روایات میں اشارہ ہوا ہے :

اول : نسل کی حفاظت اور عورت کی وضع و حالت کا حاملہ ہونے یا نہ ہونے کے لحاظ سے مشخص ہونا۔

دوئم : پہلی زندگی کی طرف پلٹ آنے اور علیحدگی کے عوامل کو ختم کرنے کا وسیلہ ہونا کہ جس کی طرف اوپر والی آیت میں ایک لطیف اشارہ ہوا تھا۔ خاص طور پر یہ بات کہ اسلام اس مسئلہ میں یہ تاکید کرتا ہے کہ عورت عدت کے زمانہ میں اپنے شوہر کے گھر میں ہی رہے۔ اس طرح طبعی طور پر ان کے درمیان چند ماہ کی ایک مسلسل مباشرت رہے گی جو انھیں اس بات کا موقع فراہم کرے گی کہ وہ علیحدگی کے مسئلہ کا جلد گزر جانے والے ہیجانوں سے بالاتر ہو کر حالات کا نئے سرے سے جائزہ لیں۔

خصوصاً طلاق رجعی لے کے سلسلہ میں کہ جہاں زوجیت کی طرف لوٹنا کسی قسم کے تکلفات کا محتاج نہیں۔ اور نہر ایسا قول یا فعل، جو مرد کے بازگشت کی طرف مائل ہونے پر دلالت کرے، وہ رجوع شمار ہوگا۔ یہاں تک کہ اگر وہ عورت کے بدن پر شہوت کے ساتھ یا بغیر شہوت کے ہاتھ رکھ دے، چاہے رجوع کا ارادہ نہ ہو تو بھی وہ رجوع ہی شمار ہوگا۔

اس طرح سے اگر یہ مدت ان شرائط کے ساتھ گزر جائے جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں، اور وہ دونوں آپس میں صلح نہ کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ واقعتاً وہ مشترک زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ لہذا مصلحت اسی میں ہے کہ وہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔

اس سلسلہ میں ہم نے تفسیر نمونہ کی جلد اول میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۸ کے ذیل میں ایک اور تشریح بھی پیش کی ہے۔

لے "طلاق رجعی" سے مراد وہ طلاق ہے جو پہلی یا دوسری مرتبہ دی جاتی ہے اور جدائی کا ارادہ مرد کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس طرح سے عورت نے اپنے حق ہر کو اور نہ دوسرے مال کو خرچ کرتی ہے۔

② فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ
فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَأَشْهِدُوا ذَوِي عَدْلٍ مِّنكُمْ
وَاقْبِسُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ ۚ ذَٰلِكُمْ يُوعَظُ بِهِ مَن
كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ
يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ۗ

③ وَ يَرْزُقْهُ مِّن حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۗ وَمَن يَتَوَكَّلْ
عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ ۗ قَدْ جَعَلَ
اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۗ

ترجمہ

① جب ان کی عدت ختم ہو جائے تو پھر یا تو شائستہ طور پر انہیں روک لویا شائستہ طریقہ سے ان سے جدا ہو جاؤ اور اپنے میں سے دو عادل مردوں کو گواہ بنا لو، اور خدا کے لیے شہادت کو قائم کرو۔ یہ ایسی چیز ہے جس کی ان لوگوں کو نصیحت کی جاتی ہے جو خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور جو شخص تقوائے الہی اختیار کرتا ہے تو خدا اس کے لیے کوئی نہ کوئی نجات کی راہ فراہم کر دیتا ہے۔

② اور اسے ایسی جگہ سے روزی عطا فرماتا ہے جس کا اُسے گمان بھی نہیں ہوتا۔ اور جو

شخص خدا پر توکل کرے تو خدا اس کے امر کی کفایت کرتا ہے۔ خدا اپنے امر کو انجام تک پہنچا کر رہتا ہے۔ اور خدا نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے۔

تفسیر

صلح یا پسندِ خدا علیٰ حدگی

طلاق سے مربوط مباحث جو گزشتہ آیات میں آئے ہیں ان کو جاری رکھتے ہوئے پہلی زیر بحث آیت میں چند مزید احکام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پہلے فرماتا ہے: ”جب ان کی عدت کی مدت آفر کو پہنچ جائے تو انہیں شائستہ طور پر، رجوع کے طریق سے روک لو یا شائستہ طور پر ان سے الگ ہو جاؤ۔“ (فاذا بلغن اجلهن فامسکوهن بمعروف او فارقوهن بمعروف)۔

”بلوغ اہل“ (مدت کے آخر کو پہنچنے) سے مراد یہ نہیں ہے کہ عدت کی مدت پورے طور پر ختم ہو جائے بلکہ مراد مدت کا آخری دنوں تک پہنچنا ہے، ورنہ عدت کے ختم ہو جانے پر رجوع کرنا جائز ہی نہیں ہے۔ مگر یہ کہ انہیں روک رکھنا عقبہ جدید کے صیغہ کے ذریعہ ہو، لیکن یہ معنی آیت سے بہت بعید نظر آتا ہے۔

بہر حال اس آیت میں ازدواجی زندگی سے مربوط ایک اہم ترین اور مناسب ترین حکم پیش ہوا اور وہ یہ ہے کہ عورت اور مرد یا تو شائستہ طور پر آپس میں زندگی بسر کریں یا پھر شائستہ طریقے سے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ جس طرح مشترک زندگی کو صحیح اصول، انسانی طرز اور شائستہ اور مناسب طور پر ہونا چاہیے، اسی طرح سے جدائی بھی ہر قسم کے نزاع اور جھگڑے، بدگوئی اور ناسزا کہنے، ظلم و ستم اور حقوق ضائع کرنے سے خالی ہونی چاہیے۔ اہم بات یہ ہے کہ جس طرح تعلقات صلح صفائی کے ساتھ انجام پائیں اسی طرح علیحدگیوں بھی انجام و تفہیم کے ساتھ ہوں۔ کیونکہ ممکن ہے یہ مرد اور عورت مستقبل میں دوبارہ مشترک زندگی کی سوتھ لیں لیکن جدائی کے وقت بدسلوکیوں ان کی فکری فضا کو اس طرح سے تیرہ و تاریک بنا دیتی ہیں کہ بازگشت کی راہ ان کے لیے بند کر دیتی ہیں اور بالفرض اگر وہ نئے سرے سے ازدواج کرنا بھی چاہیں تو مناسب فکری اور عاطفی ذریعہ موجود نہیں ہوتا۔ دوسری طرف آخر وہ مسلمان ہیں اور ایک ہی ہی معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں، لہذا مخاصمت اور ناشائستہ طریقے سے جدائی نہ صرف انہیں میں اثر انداز ہوگی، بلکہ دونوں کے خاندانوں میں بھی نقصان دہ اثرات چھوڑے گی۔ اور بعض حالات میں آئندہ کے لیے بھی ان کی ہمدردی کا سلسلہ کلی طور پر برباد کر دے گی۔

واقعاً یہ کتنی اچھی بات ہے کہ نہ صرف ازدواجی زندگی میں بلکہ ہر قسم کی دوستی اور مشترک عمل میں بھی جہاں تک ہو

کے انسان شائستہ اور مناسب ہیکاری کو جاری رکھے۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر شائستہ طور پر جدا ہو جائے، کیونکہ شائستہ طور پر جدائی بھی طرفین کے لیے ایک قسم کی کامیابی اور موفقیت ہے۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہو گیا کہ "اساک مبعوف" اور "فران مبعوف" وسیع معنی رکھتے ہیں یہ ہر قسم کے واجب و مستحب شرائط اور اخلاقی کاموں کو اپنے اندر لیے ہوتے ہیں اور اسلامی و اخلاقی آداب کے ایک مجموعہ کو ذہن میں محکم کرتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے حکم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید لکھا ہے: "تم طلاق اور جدائی کے وقت اپنے (مسلمانوں) میں سے شاہد و گواہ بنا لو؛ (واشہدوا ذوی عدل منکم)۔ تاکہ اگر آئندہ کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو طرفین میں سے کوئی انکار نہ کر سکے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال دیا ہے کہ گواہ بنانا طلاق کے سلسلہ میں اور رجوع کرنے کے سلسلہ میں بھی ہے۔ لیکن چونکہ رجوع بلکہ ترویج کے وقت بھی گواہ بنانا قطعاً واجب نہیں ہے، لہذا اس بناء پر اگر ہم فرض کر بھی لیں کہ اوپر والی آیت رجوع کو بھی شامل ہے تو یہ اس سلسلے میں ایک مستحبی حکم ہو گا۔ تیسرے حکم میں گواہوں کی ذمہ داری کو اس طرح بیان کرتا ہے: "شہادت کو خدا کے لیے قائم کرو" (و اقموا الشہادۃ للہ)۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا دونوں میں سے کسی ایک طرف قلبی میلان، حق کی شہادت سے مانع ہو جائے۔ لہذا رضائے خدا اور حق کو قائم کرنے کے سوا اور کسی چیز کو اس میں راہ نہیں پانا چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ گواہوں کو عادل ہونا چاہیے، لیکن عدالت کے باوجود بھی گناہ کا صدور محال نہیں ہے۔ اس بناء پر انھیں خبردار کرتا ہے کہ وہ اپنے نگران ہوں اور جان بوجھ کر یا نادانستہ طور پر حق کی راہ سے منحرف نہ ہوں۔

ضمناً "ذوی عدل منکم" کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں گواہ مسلمان، عادل اور مرد ہونے چاہئیں۔ آیت کے آخر میں تاکید کے عنوان سے تمام گزشتہ احکام کے متعلق مزید لکھا ہے: "صرف وہ لوگ جو خدا اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں، اس وعظ و نصیحت سے سبق حاصل کرتے ہیں" (ذالکم یوعظ بہ من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر)۔

بعض ذالکم کو صرف خدا کی طرف توجہ کرنے اور گواہوں کی طرف سے عدالت کی رعایت کرنے کے مسئلہ کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ تعبیر ایک وسیع معنی رکھتی ہے اور طلاق کے بارے میں گزشتہ تمام مسائل کو اپنے اندر لیے ہوتے ہے۔

بہر صورت یہ تعبیر ان احکام کی حد سے زیادہ اہمیت کی دلیل ہے، اس طرح کہ اگر کوئی شخص ان کی رعایت نہیں کرتا تو ان سے وعظ و نصیحت حاصل نہیں کرتا تو گویا وہ خدا اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔

چونکہ بعض اوقات آئندہ کی معیشت اور زندگی سے مربوط مسائل یا دوسری گھریلو مجبوریاں، اس بات کا سبب بن جاتی ہیں کہ میاں بیوی طلاق کے وقت یا رجوع کے وقت یا دونوں گواہ شہادت دینے کے وقت حق و عدالت

کی راہ سے منحرف ہو جائیں۔ لہذا آیت کے آخر میں فرماتا ہے: ”جو شخص خدا سے ڈرے اور گناہ کو ترک کر دے تو خدا اس کے لیے سبقت کی راہ قرار دے دیتا ہے اور اس کی زندگی کی مشکلات کو حل کر دیتا ہے۔“ (و من یتق الله يجعل له مخرجاً)۔

”اور اس کو ایسی جگہ سے جس کا اُسے گمان بھی نہ ہو گا روزی دے گا۔“ (و یرزقہ من حیث لا یعتسب)۔ اور جو شخص خدا پر توکل کرے اور اپنا امر اس کے سپرد کر دے تو خدا اس کی کفایت کرتا ہے۔“ (و من یتوکل علی اللہ فہو حسبہ)۔

”کیونکہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کا فرمان ہر چیز میں نافذ ہے۔ اور جس کام کا وہ ارادہ کرے اُسے انجام دے دیتا ہے۔“ (ان اللہ بالغ امرہ)۔

”لیکن خدا نے ہر کام اور ہر چیز کے لیے ایک اندازہ اور حساب قرار دیا ہے۔“ (قد جعل اللہ لكل شیء قدراً)۔

اس طرح سے وہ مردوں، عورتوں اور گواہوں کو خبردار کرتا ہے کہ وہ حق کی مشکلات سے نہ گھبرائیں اور عدالت کو جاری کریں۔ پھر اپنے مشکل کاموں کی کشائش خدا سے چاہیں کہ خدا نے یہ ضمانت لی ہے کہ وہ پرہیزگاروں کی مشکل کو حل کرے گا اور انہیں ایسی جگہ سے روزی دے گا جہاں سے خود انہیں بھی گمان نہیں ہو گا۔ خدا نے ضمانت دی ہے کہ جو توکل کرے گا وہ مصیبت میں گرفتار نہیں رہے گا، اور خدا اس ضمانت کے ادا کرنے پر قادر ہے۔

یہ صحیح ہے کہ یہ آیات طلاق اور اس سے مربوط احکام کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں، لیکن ان کا مضمون وسیع ہے جو دیگر موارد کو بھی شامل ہے۔ یہ خدا کی طرف سے تمام پرہیزگاروں اور توکل کرنے والوں کے لیے ایک امید بخش وعدہ ہے کہ انجام کار لطف الہی انہیں اپنی پناہ میں لے لے گا، انہیں مشکلات کے پیچ و خم سے گزار دے گا، سعادت کے تانباک افق کی طرف ان کی رہنمائی کرے گا، معیشت کی سختیوں کو برطرف کر دے گا اور مشکلات کے تیرہ و تار یک بادلوں کو ان کی زندگی کے آسمان سے ہٹا دے گا۔

”قد جعل اللہ لكل شیء قدراً“ کا جملہ اس نظام کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے جو عالم تشریح و تکوین پر حاکم ہے۔ یعنی یہ احکام جو خدا نے طلاق وغیرہ کے بارے میں صادر فرمائے ہیں سب کے سب ایک حساب اور دقیق حکیمانہ اندازے کے مطابق ہیں۔

اسی طرح سے وہ مشکلات جو انسان کی زندگی میں ازدواجی مسئلہ میں یا کسی اور مسئلہ میں ڈونما ہوں، ان میں سے ہر ایک کا اندازہ و حساب اور مصلحت و اختتام ہوتا ہے۔ انہیں ان حوادث کے ظاہر ہونے پر گھبرانا نہیں چاہیے اور زبان پر گلہ اور شکوہ کے الفاظ نہیں لانے چاہئیں۔ نیز مشکلات کے حل کے لیے خلافت تقویٰ

سے متوتل نہیں ہونا چاہیے، بلکہ تقویٰ اور خودداری کے ساتھ ان سے جنگ کرنی چاہیے اور ان کا حل خدا سے طلب کرنا چاہیے۔

چند نکات

۱: مشکلات سے نجات اور تقویٰ

اوپر والی آیات قرآن مجید کی سب سے زیادہ امید دلانے والی آیات ہیں۔ ان کی تلاوت دل کو صفائی اور روح کو نور و روشنی بخشتی ہے۔ یہ تلاوت یاس و ناامیدی کے پردوں کو چاک کر دیتی ہے، دل میں امید کی حیات بخش شاعیں چمکاتی ہے اور تمام پرہیزگار اور با تقویٰ افراد کو نجات اور حل مشکلات کا وعدہ دیتی ہے۔

ایک حدیث میں ابوذر غفاری سے نقل ہوا ہے کہ پیغمبر نے فرمایا:

”انی لا علم ایۃ لو اخذ بہا الناس لکفہم و من یتق اللہ
یجعل لہ من حرجا... فسا نزال یقولہا ویبید ہا“

”میں ایک ایسی آیت کو پہچانتا ہوں کہ اگر تمام انسان اس کے دامن کو
تھام لیں تو وہ ان کی مشکلات کے حل کے لیے کافی ہے“ اس کے بعد آپ
نے آیت ”و من یتق اللہ“ کی تلاوت فرمائی اور اس کی بار بار تکرار فرماتے رہے۔

ایک اور حدیث میں رسول خداؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

”من شبہات الدنیا و من غمرات الموت و شد احد
یوم القیامۃ“

”خدا پرہیزگاروں کو دنیا کے شبہات، موت کی سختی اور روز قیامت کے
شدائد سے رہائی بختے گا“ لے

یہ تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ اہل تقویٰ کے لیے امور کی کشائش دنیا میں ہی منحصر نہیں بلکہ
قیامت کو بھی شامل ہے۔

ایک اور حدیث میں بھی آنحضرتؐ سے آیا ہے:

”من اکثر الاستغفار جعلہ اللہ لہ من کل ہم فرجاً و من
کل ضیق منرجاً“

”جو شخص کثرت سے استغفار کرے گا (اور لوحِ دل کو گناہوں کے زنگ سے دھوئے گا) تو خدا اس کے لیے ہر غم و اندوہ سے کشائش اور ہر تنگی سے نجات کی راہ قرار دے گا۔“

مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اوپر والی پہلی آیت عوف بن مالک کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اصحابِ پیغمبر میں سے تھا اور دشمنانِ اسلام نے اس کے بیٹے کو قید کر لیا تھا۔ وہ پیغمبر کی خدمت میں آیا، اس واقعے اور فقر و فاقہ، نیز تنگدستی کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا تقویٰ اختیار کرنا صبرِ بحر اور لاقوتہ الا باللہ کا بہت زیادہ ذکر کیا کر۔ اس نے اس کام کو انجام دیا تو اچانک جبکہ وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا اس کا بیٹا دروازے سے اندر آیا۔ معلوم ہوا کہ وہ دشمن کی غفلت کے ایک لمحہ سے فائدہ اٹھا کر بھاگ آیا ہے، یہاں تک کہ دشمن کا اونٹ بھی اپنے ساتھ لے آیا ہے۔ یہ وہ مقام تھا جس پر اوپر والی آیت نازل ہوئی اور اس بات تقویٰ شخص کی مشکل کی کشائش اور جہاں سے توقع نہیں تھی وہاں سے روزی کی خبر دی۔

اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ آیت کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہے کہ انسان سعی و کوشش کو بالکل ہی ترک کر دے اور یہ کہے کہ میں گھر میں بیٹھ جاؤں گا، تقویٰ اختیار کروں گا اور لاقوتہ الا باللہ کا ذکر کر دوں گا یہاں تک کہ جہاں سے مجھے گمان بھی نہیں ہے میری روزی پہنچ جائے گی۔ نہیں! آیت کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے۔ تقویٰ و پرہیزگاری کا مقصد سعی و کوشش کے ساتھ ہے۔ اگر اس حالت میں انسان پر دروانے بند ہوں گے تو خدا نے انکے کھولنے کی ضمانت لی ہے۔

اسی لیے ایک حدیث میں آیا ہے کہ امامِ جعفر صادق کا صحابی عمر بن مسلم ایک مدت تک آپ کی خدمت میں نہ آیا۔ حضرت نے اس کے حالات دریافت فرمائے تو لوگوں نے بتلایا کہ اس نے تجارت چھوڑ دی، اور عبادت کی طرف رُخ کر لیا ہے۔ آپ نے فرمایا: ”وائے جو اس پر:“

”اما علم ان تارك الطلب لا يستجاب له“

”کیا وہ یہ نہیں جانتا کہ جو شخص سعی و کوشش اور روزی طلب کرنے کو ترک کر دے تو اس کی دعا قبول نہیں ہوتی۔“

اس کے بعد مزید فرمایا:

لے نزلتین جلد ۵ ص ۳۵۷ حدیث ۴۵

لے مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۰۶، یہی اجرا ”تفسیر فخر رازی“ اور روح البیان میں بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ آیا ہے اور بعض نے ایک سوانح کی تعداد بھی ہے۔

”اصحاب رسول میں سے ایک جماعت نے جب آیت ”ومن یتق الله یجعل له مخرجاً ویرزقه من حیث لا یحسب“ نازل ہوئی تو اپنے دروازے بند کر لیے، عبادت میں مصروف ہو گئے، اور انھوں نے کہا: ”خدا نے ہماری روزی کا ذمہ لے لیا ہے۔“ اس واقعہ کی اطلاع پیغمبر کو ہوئی تو آپ نے کسی کو ان کے پاس بھیج کر بلوایا اور ان سے کہا: تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: یا رسول اللہ! چونکہ خدا ہماری روزی کا کفیل ہو گیا ہے لہذا ہم عبادت میں مشغول ہو گئے ہیں۔ پیغمبر نے فرمایا: ”انہ من فعل ذالک لیس یستجب لہ، علیکم بالطلب۔“ جو شخص ایسا کرے گا اس کی دعا قبول نہیں ہوگی۔ تم پر لازم ہے کہ سعی و کوشش اور جدوجہد کرو۔“

❖ ❖ ❖

۲: روح توکل

خدا پر توکل کرنے سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے کام کی سعی و کوشش کو اس کے سپرد کر دے اور اپنی مشکلات کا حل اسی سے چاہے۔ وہ خدا جو اس کی تمام احتیاجات سے آگاہ ہے، وہ خدا جو اس کے بارے میں رحیم و مہربان ہے، اور وہ خدا جو ہر مشکل کو حل کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اب جو شخص روح توکل کا حامل ہے، وہ ہرگز یاس و ناامیدی کو اپنے پاس پھینکنے نہیں دیتا۔ مشکلات کے مقابلہ میں ضعف و زبوں حالی کا احساس نہیں کرتا اور سخت حوادث کے مقابلے میں ڈٹا رہتا ہے۔ اس کا یہی علم و عقیدہ اسے ایسی روحانی طاقت دیتا ہے جس سے وہ مشکلات پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔ دوسری طرف سے غیبی امدادیں کہ توکل کرنے والوں کو جن کی خوشخبری دی گئی ہے، وہ اس کی مدد کو آجاتی ہیں اور اُسے شکست و ناتوانی سے نجات بخشتی ہیں۔

ایک حدیث میں پیغمبر گرامی سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا: میں نے خدا کی وحی پہنچانے والے فرشتے جبریل سے پوچھا: توکل کیا ہے؟ تو اس نے کہا:

العلم بان المخلوق لا یضر ولا ینفع، ولا یعطی ولا یمنع، واستعمال الیأس من الخلق، فاذا کان العبد کذلک لیس یمیل لاحد سوی اللہ و

ولم یزج ولم یخف سوی اللہ ولم یطمع فی احد سوی اللہ فہذا
هو التوکل۔“

”توکل کی حقیقت یہ ہے کہ انسان یہ جان لے کہ مخلوق نہ نقصان پہنچا سکتی ہے نہ ہی نفع، نہ کچھ
عطا کر سکتی ہے نہ روک سکتی ہے۔ مخلوق سے کوئی اُمید نہ رکھنا (اور خدا ہی سے لو لگانا) جس
وقت ایسا ہو جائے تو پھر انسان خدا کے علاوہ کسی کے لیے کام نہیں کرتا اور اس کے غیر سے
اُمید نہیں کرتا، نہ اس کے غیر سے ڈرتا ہے اور نہ ہی اس کے علاوہ کسی اور کے ساتھ دل
لگاتا ہے۔ یہ ہے توکل کی روح۔ لے

اس عین مضمون کے ساتھ، توکل انسان کو ایک نئی شخصیت بخشتی ہے اور اس کے تمام اعمال میں اثر
پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے شب معراج بارگاہ خداوندی میں سوال کیا

پروردگارا : ای الاعمال افضل ؟

”کون سا عمل سب سے افضل و برتر ہے ؟“

خداوند متعال نے فرمایا :

”لیس شیء عندی افضل من التوکل علیّ والرضا بما قسمت

”میرے نزدیک مجھ پر توکل کرنے اور جو کچھ میں نے تقسیم کیا ہے اس پر راضی رہنے

سے افضل و برتر کوئی چیز نہیں ہے۔“ لے

یہ بات واضح ہے کہ اس معنی میں توکل ہمیشہ جہاد اور سعی و کوشش کے ساتھ ہوتی ہے۔ سستی اور ذمہ داریوں

سے فرار کے ساتھ نہیں ہوتی۔

ہم نے اس سلسلہ میں تفسیر نمونہ کی جلد ۶ میں سورہ ابراہیم کی آیت ۱۲ کے ذیل میں ایک اور تشریح بھی پیش

کی ہے ۔

وَالَّذِي يَسْنَنَ مِنَ الْمَحِيضِ مِنْ نِسَائِكُمْ إِنْ
 أَرْتَبْتُمْ فِعْدَتُهُنَّ ثَلَاثَةَ أَشْهُرٍ وَالَّذِي لَمْ يَحِضْ
 وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ وَمَنْ
 يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا ۝
 ذَلِكَ أَمْرُ اللَّهِ أَنْزَلَهُ إِلَيْكُمْ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ
 يَكْفِرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ وَيُعْظِمْ لَهُ أَجْرًا ۝

أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُجُوهِكُمْ
 وَلَا تَضَارُّوهُنَّ لِيُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ ۖ وَإِنْ كُنَّ أُولَاتٍ
 حَمِلٌ فَأَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ فَإِنْ
 أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۚ وَأَتَمُّوا بَيْنَكُمْ
 بِمَعْرُوفٍ ۚ وَإِنْ تَعَاَسَرْتُمْ فَسَرِّضُوا لَهُ أُخْرَى ۝
 لِيُنْفِقَ ذُو سَعَةٍ مِنْ سَعَتِهِ ۖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ
 رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا
 إِلَّا مَا آتَاهَا ۚ سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا ۝

ترجمہ

- ۳) تمہاری عورتوں میں سے جو ماہانہ عادت سے ناامید ہیں، اگر تمہیں ان کی وضع میں (حاملہ) حاملہ ہونے کے لحاظ سے، شک ہو تو ان کی عدت تین ماہ ہے اور اسی طرح سے وہ عورتیں جنہوں نے ابھی ماہانہ عادت نہیں دیکھی ہے۔ اور حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ وضع حمل کریں۔ اور جو شخص تقوائے الہی اختیار کرے گا، خدا اس پر کام کو آسان کر دے گا۔
- ۴) یہ خدا کا فرمان ہے جو اُس نے تم پر نازل کیا ہے اور جو شخص خدائی تقویٰ اختیار کرے گا تو خدا اس کے گناہوں کو بخش دے گا اور اس کے اجر و ثواب کو بڑھا دے گا
- ۵) جہاں تم سکونت رکھتے ہو اور جو تمہارے اختیار میں ہے، وہاں ان (مطلقہ عورتوں) کو سکونت دو، اور انہیں ضرر نہ پہنچاؤ کہ معاملے کو ان پر تنگ نہ کر دو (اور وہ گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں) اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان کو نقتہ دو یہاں تک کہ وہ وضع حمل کریں اور اگر وہ تمہارے بچے کو دودھ پلائیں تو تم اس کی اجرت دو (اور بچوں کے بارے میں معاملے کو) شاکتہ مستور سے کے ذریعے انجام دو، اور اگر تم میں باہم موافقت نہ ہو تو بچے کو دودھ پلانے کا کام دوہری عورت اپنے ذمہ لے گی۔
- ۶) جن لوگوں کے پاس وسیع ذرائع و وسائل ہیں وہ تو اپنی وسعت کے مطابق خرچ کریں لیکن جو تنگ دست ہیں تو جو کچھ خدا نے انہیں دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کریں خدا کسی شخص کو اس توانائی سے زیادہ جو اس نے اُسے دی ہے تکلیف نہیں دیتا۔ خدا عنقریب سختی کے بعد آسانی قرار دے گا۔

تفسیر

مطلقہ عورتوں کے احکام اور ان کے حقوق

منجملہ ان احکام کے جو گذشتہ آیات سے معلوم ہوئے ہیں، طلاق کے بعد عدت پوری کرنے کا ضروری ہونا ہے۔ چونکہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۸ میں عدت کے مسئلہ میں ان عورتوں کا حکم واضح ہو گیا ہے جو ماہانہ عادت دیکھتی ہیں کہ انہیں تین بار پاکیزہ ہو کر ماہانہ عادت دیکھنی چاہیے۔ جب وہ تیسری مرتبہ ماہانہ عادت میں وارد ہوں تو ان کی عدت ختم ہو جائے گی، لیکن انہیں میں سے کچھ ایسی عورتیں بھی ہیں جو کئی اسباب کی بنا پر ماہانہ عادت نہیں دیکھتیں یا وہ حاملہ ہوتی ہیں، تو اوپر والی آیات ان عورتوں کے حکم کو واضح کرتے ہوئے عدت کی بحث کی تکمیل کر رہی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: ”تھاری عورتوں میں سے جو ماہانہ عادت سے ناامید ہو گئی ہیں اگر ان کی وضع و کیفیت میں (حاملہ ہونے کے لحاظ سے) شک کرو تو ان کی عدت تین ماہ ہے۔“ (واللأئي يئس من المحيض من نسائها ان ارتبته فعدتھن ثلاثة اشھر)۔

اور اسی طرح سے وہ عورتیں بھی جنہوں نے ماہانہ عادت دیکھی ہی نہیں وہ بھی تین ماہ عدت رکھیں۔ (واللأئي

لم يحضن)۔

اس کے بعد تیسرے گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: ”حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ وضع

حمل کریں۔“ (و اولات الاحمال اجلمن ان يضمن حملهن)۔

اس طرح سے اوپر والی آیت میں عورتوں کے دوسرے تین گروہوں کے لیے حکم مشخص ہو گیا ہے۔ یعنی

دو گروہوں کو تو تین ماہ تک عدت رکھنی چاہیے اور تیسرے گروہ، یعنی حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل کے ساتھ ہی

ختم ہو جاتی ہے چاہے وہ طلاق کے ایک لمحہ بعد یا آٹھ ماہ بعد وضع حمل کریں۔

”ان ارتبته“ (اگر تمہیں شک اور تردد ہو) کے جملہ سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں تین احتمال

بیان کیے گئے ہیں:

۱: اس سے مراد وجود ”حمل“ میں احتمال اور شک ہے، اس معنی میں کہ اگر سن یاس (عام عورتوں میں

سپاس سال کے سن اور قرشی عورتوں میں ساٹھ سال کے سن) کے بعد کبھی عورت میں وجود حمل کا

احتمال ہو تو اُسے عدت گزارنی چاہیے۔ اگرچہ اس بات کا بہت کم اتفاق ہوتا ہے، لیکن بعض

ایسا ہوا ہے (توجہ رہے کہ روایات اور کلمات فقہاء میں لفظ ”بیبۃ“ حمل میں شک کے معنی میں

بارہ آیا ہے) لہذا (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۲ : ایسی عورتیں مراد ہیں جن کے بارے میں ٹھیک طرح سے معلوم نہ ہو کہ سن یا س کو پہنچی ہیں کہ نہیں۔
 ۳ : اس مسئلہ کے حکم میں شک اور تردد مراد ہے۔ اس بناء پر آیت یہ کہتی ہے کہ اگر تم حکم خدا کو نہیں جانتے تو وہ یہ ہے کہ اس قسم کی عورتیں عدت گزاریں۔ لیکن ان تمام تفاسیر میں سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ والی میٹسن کے جملہ کا ظاہر یہ ہے کہ یہ عورتیں سن یا س کو پہنچ گئی ہیں۔
 عموماً جب عورتوں کی ماہانہ عادت بیماریوں یا دوسرے عوامل کی بناء پر منقطع ہو جائے تو وہ اس حکم کی مشمول ہیں یعنی انھیں چاہیے کہ تین ماہ تک عدت گزاریں۔ (اس حکم کو قاعدہ اولویت کے طریق سے یا لفظ آیت کے مشمول سے معلوم کیا جاسکتا ہے) ۱۷

واللائى لم یحصن“ (وہ عورتیں جنہوں نے ماہانہ عادت نہیں دیکھی) کا جملہ ممکن ہے اس معنی میں ہو کہ وہ سن بلوغ کو پہنچ گئی ہیں لیکن ابھی ماہانہ عادت شروع نہیں ہوئی۔ اس صورت میں بلاشک و شبہ انھیں تین ماہ تک عدت گزارنی چاہیے۔ ایک اور احتمال جو علماء نے آیت کی تفسیر میں دیا وہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ تمام عورتیں ہیں جو ماہانہ عادت نہیں دیکھتیں، چاہے وہ سن بلوغ تک پہنچی ہوں یا نہ پہنچی ہوں۔
 لیکن ہمارے فقہاء کے درمیان مشہور یہ ہے کہ اگر عورت سن بلوغ کو نہ پہنچی ہو تو طلاق کے بعد اس کی عدت نہیں ہے، لیکن اس مسئلہ کے مخالف بھی ہیں جنہوں نے اس سلسلے میں بعض روایات سے استدلال کیا اور اوپر والی آیت کا ظاہر بھی ان کے موافق ہے۔ (اس مسئلہ کی مزید تشریح کا بھی فقہ کی کتابوں میں مطالعہ کرنا چاہیے) ۱۸
 وہ شان نزول جو آخری جملوں کے لیے بیان کی گئی ہے۔ اس سے بھی اوپر والی تفسیر ہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔
 شان نزول یہ ہے کہ ابی بن کعب نے حضرت رسولؐ سے عرض کیا کہ بعض عورتوں کی عدت قرآن میں نہیں آئی ہے ان میں غیر بالغ لڑکیاں، کبیرہ (یا کسہ) عورتیں اور حاملہ عورتیں ہیں۔ تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور ان کے احکام بیان کیے گئے۔ ۱۹

عدت اس صورت میں ہے کہ اس بارے میں حمل کا احتمال ہو، کیونکہ اوپر والی آیت میں یا کہ عورتوں پر طلعہ ہوا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ دونوں کا حکم یکساں ہے۔ ۲۰

(حاشیہ فریاد) ۱۷ جواہر جلد ۳۲ ص ۲۲۹۔ ”مسائل الشیخ“ جلد ۱۵ باب ۴، از ابواب عدد، حدیث ۷
 ۱۸ البتہ فقہاء کے درمیان مشہور یہ ہے کہ عورت جب سن یا س کو پہنچ جائے تو اس کی عدت بالکل نہیں ہے، لیکن اس قول کے مقابلے میں علماء قدیم کی ایک تھوڑی سی تعداد عدت کی قائل ہے۔ اور بعض روایات بھی اس پر شاہد ہیں۔ اگرچہ دوسری روایات اس سے معارضہ کرتی ہیں جو بات اوپر والی آیت کے ظاہر سے موافق ہے وہ یہ ہے کہ احتمال حمل کی صورت میں وہ عدت رکھتی ہیں۔ اس موضوع کی مزید تشریح فقہی کتابوں میں دیکھنی چاہیے۔

۱۹ ”جواہر الکلام“ جلد ۳۲ ص ۲۳۲، اور فقہ کی دوسری کتابیں۔

۲۰ کنز العرفان جلد ۲ ص ۲۶۰

۲۱ مرحوم طبری مجمع البیان میں لکھتے ہیں: تفسیرہ واللائى لم یحصن ان امرتہم فعدتھن ایضاً ثلاثۃ اشھس!

پھر آیت کے آخر میں نئے سرے سے مسئلہ تقویٰ پر تکیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اور جو شخص تقوائے الہی اختیار کرنے کا، خدا معاملے کو اس پر آسان کر دے گا۔“ (ومن یتق الله يجعل له من امره يسرا)۔ وہ اس کی مشکلات کو اس جہان میں اور دوسرے جہان میں بھی چاہے وہ علیحدگی، مسئلہ طلاق اور اس کے احکام سے مربوط ہوں اور چاہے دوسرے مسائل سے تعلق رکھتی ہوں، اپنے لطف و کرم سے حل کر دے گا۔

✦ ✦ ✦

نیز بعد والی آیہ میں تاکید کے لیے ان احکام کے بارے میں جو طلاق اور عدت کے سلسلے میں گزشتہ آیات میں آئے ہیں، مزید کہتا ہے: ”یہ خدا کا حکم ہے جسے اس نے تم پر نازل کیا ہے۔“ (ذالك امر الله انزله اليكف)۔

”اور جو شخص تقوائے الہی اختیار کرے گا اور اس کے فرمان کی مخالفت سے پرہیز کرے گا خدا اس کے گناہوں کو بخش دے گا۔ اور اس کے اجر و ثواب کو بہت بڑھا دے گا۔“ (ومن یتق الله يكفر عنه سيئاته ويظهر له اجرا)۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں ’سینات‘ سے مراد گناہان صغیرہ ہیں اور تقویٰ سے مراد ’گناہان کبیرہ‘ سے پرہیز ہے۔ اور اس طرح گناہ سے پرہیز صغائر کے بخشے جانے کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ بات اس کے مشابہ ہے جو سورہ نساء کی آیت ۳۱ میں بیان ہوئی ہے، اس گفتگو کا لازمہ یہ ہے کہ طلاق اور عدت کے سلسلے میں گزشتہ احکام کی مخالفت گناہان کبیرہ میں شمار ہوتی ہے۔ لہ

البتہ یہ درست ہے کہ بعض اوقات ’سینات‘ صغیرہ گناہوں کے معنی میں بھی آیا ہے لیکن قرآن مجید کی بہت سی آیات میں تمام گناہوں کے لیے چاہے وہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ لفظ سینات کا اطلاق ہوا ہے۔ مثلاً سورہ مائدہ کنے آیت ۶۵ میں آیا ہے: ولو ان اهل الكتاب امنوا واتقوا لکفرنا عنهم ميثاقهم اگر اہل کتاب ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کریں تو ہم ان ہم ان کے تمام گزشتہ گناہوں کو بخش دیں گے۔“ (یہ معنی دوسری آیات میں بھی آیا ہے)۔

مسئلہ طود پر ایمان اور قبول اسلام تمام گزشتہ گناہوں کی بخشش کا سبب ہے۔

✦ ✦ ✦

بعد والی آیت طلاق کے بعد عورت کے حقوق کے بارے میں ’مسکن‘ اور ’نفقہ‘ کے لحاظ سے اور دوسرے جہات سے بھی وضاحت کرتی ہے۔

پہلے مطلقہ عورتوں کے مسکن کی کیفیت کے بارے میں فرماتا ہے: ”جہاں تم سکونت رکھتے ہو اور تمہارے

دسائل تقاضا کرتے ہیں انہیں بھی وہیں سکونت دو۔ (اسکوہن من حیث سکتھر من وجدکم)۔
 ”وجد“ (بروزن حکم) توانائی اور تمکن کے معنی میں ہے۔ بعض منسخرین نے اس کی اور تفسیر بھی بیان
 کی ہیں، جو نتیجہ میں اسی معنی کی طرف لوٹتی ہیں۔ ”راغب“ بھی مفردات میں یہی کہتا ہے کہ ”من وجدکم
 کی تعبیر کا مفہوم یہ ہے کہ مطلقہ عورتوں کو اپنی توانائی اور مقدر کے مطابق رہنے کے لیے مناسب مکان دو۔
 فطری طور پر جب مکان شوہر کے ذمہ ہے تو باقی اخراجات بھی اسی کے ذمہ ہوں گے۔ آیت کا آخری
 حصہ جو حاملہ عورتوں کے نفقہ کے بارے میں ہے، وہ اسی مدعا پر شاہد ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرے حکم کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: ”انہیں کوئی نقصان نہ پہنچاؤ کہ معاملے کو
 ان پر ایسا تنگ کر دو کہ وہ تمہارے مکان کو چھوڑنے اور نفقہ کو ترک کرنے پر مجبور ہو جائیں“ (ولا تضارواھن)
 لتضیقوا علیھن)۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ کینہ پروری، عداوت اور نفرت تھیں حق اور عدالت کے راستہ سے منحرف کر دے،
 تم انہیں ان کے مسلمہ حقوق مسکن و نفقہ سے محروم کر دو اور ان پر اتنا دباؤ پڑے کہ وہ ہر چیز کو چھوڑ کر نکلے
 کھڑی ہوں۔

تیسرے حکم میں حاملہ کے بارے میں کہتا ہے: ”اور اگر وہ حاملہ ہوں تو جب تک وہ وضع حمل نہ کر لیں ان
 کے اخراجات دیتے رہو“ (وان کن اولات حمل فانفقوا علیھن حتی یضعن حملھن)۔
 کیونکہ جب تک انہوں نے وضع حمل نہیں کیا وہ حالت عدت میں ہیں اور ان کا نفقہ اور مسکن شوہر
 پر واجب ہے۔

چوتھے حکم میں دودھ پلانے والی عورتوں کے حقوق کے بارے میں فرماتا ہے: ”اگر وہ علیحدگی کے بعد
 بچوں کو دودھ پلانے پر رضامند ہو جائیں تو ان کی اجرت انہیں دے دو“ (فان ارضعن لکم فأتوھن
 اجورھن)۔

اتنی اجرت جو عرف و عادت کے لحاظ سے دودھ پلانے کی مقدار اور وقت کے ساتھ مناسبت رکھتی ہو۔
 چونکہ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ طلاق کے بعد شوہر اور بیوی میں نوزاد بچے کے سلسلے میں مصالحت کرنے پر اختلاف
 پیدا ہو جاتے ہیں، لہذا پانچویں حکم میں اس سلسلے میں ایک قاطع حکم صادر فرماتے ہوئے کہتا ہے: ”اولاد کی نرشت
 کے سلسلے میں ایک دوسرے کے مشورے سے شائستہ فیصلہ کرو“ (وأتسروا بینکم بہمرون)۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ شوہر اور بیوی کے اختلافات بچوں کے منافع پر ایسی ضرب لگائیں کہ جس سے وہ جسمانی اور
 ظاہری لحاظ سے خسارے میں گرفتار ہو جائیں یا عاطفی لحاظ سے ضروری محبت اور شفقت سے محروم رہ جائیں۔ والدین
 کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ خدا کو نظر میں رکھیں اور دفاع نہ کر سکنے والے نونو لو کو اپنے اختلافات اور اغراض پر قربان
 نہ کر دیں۔

”وَأْتَسْرُوا“ کا جملہ ”ایتماس“ کے مادہ سے بعض اوقات تو کسی دستور کو قبول کرنے اور کبھی مشاورت کے معنی میں آتا ہے۔ اور یہاں دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے۔ نیز معرود کی تعبیر بڑی جامع ہے جو ہر قسم کے مشورے کو شامل ہے کہ جس میں خیر و صلاح ہو۔

چونکہ بعض اوقات طلاق کے بعد بچے کے مصالح اور اسے دودھ پلانے کے سلسلے میں بیوی اور شوہر میں ضروری اور لازمی موافقت پیدا نہیں ہوتی، لہذا چھٹے حکم میں فرماتا ہے: ”اور اگر تم ایک دوسرے کے لیے سخت ہو جاؤ اور موافقت نہ کرو، تو پھر کوئی دوسری عورت بچے کو دودھ پلانے کی ذمہ داری لے سکتی ہے۔ تاکہ کشمکش جاری نہ رہے۔“ (و ان تسانسوا فسترضع له اخیری)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر اختلافات طول پکڑ جائیں تو اپنے آپ کو معطل نہ رکھو اور بچے کو کسی دوسری عورت کے سپرد کر دو۔ پہلے درجہ میں تو ماں ہی کا حق تھا کہ وہ اس بچے کو دودھ پلائے، لیکن جب سخت گیری اور کشمکش کی بناء پر یہ امر امکان پذیر نہیں رہا تو بچے کے منافع کو فراموشی کے سپرد نہیں کرنا چاہیے، لہذا اس کی ذمہ داری کسی دایہ کے سپرد کر دو۔

بعد الی آیت اس سلسلہ میں ساتویں اور آخری حکم کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”وہ لوگ جو وسیع وسائل رکھتے ہیں وہ اپنے وسائل اور امکانات کے مطابق خرچ کریں، لیکن جو تنگ دست ہیں تو جو کچھ خدا نے انہیں دے رکھا ہے وہ اس میں سے خرچ کریں۔ خدا کسی شخص کو اس سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا کہ جو اس کو عطا کیا ہوا ہے۔“
(لینفق ذو سعة من سعته ومن قدر علیه رزقاً فلینفق مما آتاه الله لا یكلف الله نفساً الا ما آتاه)۔

کیا یہ حکم یعنی طاقت کے مطابق خرچ کرنا ان عورتوں سے مربوط ہے جو طلاق کے بعد بچوں کو دودھ پلانے کی ذمہ داری قبول کر لیتی ہیں یا عدت کے دنوں کے ساتھ مربوط ہے کہ جس کی طرف گزشتہ آیات میں اجمالی طور پر اشارہ ہوا یا یہ دونوں کے ساتھ مربوط ہے؟

آخری معنی سب سے مناسب ہے۔ اگرچہ مفسرین کی ایک جماعت اسے صرف دودھ پلانے والی عورتوں سے مربوط سمجھتی ہے۔ حالانکہ گزشتہ آیات میں اس بارے میں ’اجر‘ (اجرت) کی تعبیر آئی ہے، نفقہ اور انفاق کی تعبیر نہیں آئی۔

بہر حال جن لوگوں میں کافی طاقت اور توانائی ہے انہیں تنگ دلی اور سخت گیری نہیں کرنی چاہیے جن میں کچھ زیادہ مالی طاقت نہیں ہے وہ اپنی توانائی سے زیادہ پر مامور نہیں اور عورتیں ان پر اعتراض نہیں کر سکتیں۔ اسی طرح جو وسعت رکھتے ہیں انہیں بخل نہیں کرنا چاہیے، اور جو وسعت نہیں رکھتے وہ ملامت کے لائق نہیں ہیں۔

میشٹ کی تنگی لوگوں کے حق و عدالت کے راستے سے خارج ہونے کا سبب نہ بنے اور کوئی بھی شخص شکایت کے لیے زبان نہ کھولے۔ اس بناء پر آیت کے آخر میں فرماتا ہے: ”خدا عنقریب سختی کے بعد راحت اور آسانی قرار دے گا۔“ (سیجمل اللہ بعد عسر یسرا)۔

یعنی غم نہ کھاؤ، بیانی نہ کرو، دنیا ایک حالت پر باقی نہیں رہتی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ منقطع ہو جانے والی اور جلدی سے گزر جانے والی مشکلات تمہارے صبر و شکیبائی کے رشتہ کو توڑ کر پارہ پارہ نہ کر دیں۔

یہ تعبیر ہمیشہ کے لیے، خصوصاً ان آیات کے نزول کے وقت کہ جب مسلمان میشت کے لحاظ سے سخت تنگی میں تھے، صابریں کے مستقبل کی ایک اُمید بخش بشارت ہے، پھر اتفاق سے کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ خدا نے اپنی رحمت و برکت کے دروازے ان پر کھول دیئے۔

✦ ✦ ✦

چند نکات

۱: طلاقِ رجعی کے احکام

ہم بیان کر چکے ہیں کہ ”طلاقِ رجعی“ وہ ہے کہ جس میں شوہر عدت ختم ہونے سے پہلے پہلے جس وقت پاہے رجوع کر سکتا ہے اور میاں بیوی کے رشتہ کو بحال کر سکتا ہے۔ اور اس میں کسی نئے عقد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ رجوعِ کم سے کم بات اور عمل سے بھی حاصل ہو سکتا ہے کہ جو بازگشت کی علامت ہو۔

بعض احکام جو اوپر والی آیات میں بیان کیے گئے ہیں، جیسے نفقہ اور مسکن کے احکام، وہ طلاقِ رجعی کی عدت کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اسی طرح عدت کی حالت میں عورت کا اپنے شوہر کے گھر سے نہ نکلنے کا مسئلہ بھی ہے۔ لیکن طلاقِ بائن یعنی وہ طلاق جو قابلِ رجوع نہیں (مثلاً تیسری طلاق) تو اس میں اوپر والے احکام کا وجود نہیں ہے۔

صرف حاملہ عورت کے بارے میں وضعِ عمل کے وقت تک نان و نفقہ اور مسکن کا حق ثابت ہے۔ ”لا تدمری مسل اللہ یعدث بعد ذالک امرًا“ (تو نہیں جانتا شاید خدا کوئی نئی وضع و کیفیت پیدا کر دے) کی تعبیر بھی اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ سب یا اوپر والے احکام کا ایک حصہ طلاقِ رجعی کے ساتھ مربوط ہے۔

✦ ✦ ✦

۲: خدا طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا

صرف عقل کا حکم ہی ہے، بلکہ حکم شریعت بھی اسی مطلب کا گواہ ہے کہ انسانوں کی ذمہ داریاں ان کی طاقت کے مطابق ہونی چاہئیں: لا یكلف اللہ نفساً الا ما اٹاھا کا جملہ جو اوپر والی آیات کے ضمن میں آیا ہے اس میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن بعض روایات میں آیا ہے کہ ما اٹاھا سے مراد ما اعلمھا ہے۔ یعنی ہر شخص پر اتنی ہی ذمہ داری ڈالتا ہے جتنی اسے تعلیم دی ہے۔ اسی لیے علماء نے ”علم اصول“ میں ”اصل برأت“ کے مباحث میں، اس آیت کے ساتھ استدلال کیا ہے کہ اگر انسان کسی حکم کو نہیں جانتا تو وہ اس کے لیے جواب دہ نہیں ہے۔

لیکن چونکہ عدم آگاہی بعض اوقات عدم توانائی کا سبب بن جاتی ہے، لہذا ممکن ہے اس سے مراد وہ جہالت ہو جو مجز و ناتوانی کا سرچشمہ بنے۔ اس بنا پر ممکن ہے یہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہو کہ جو عدم قدرت کو اور اس جہالت کو بھی شامل ہو، جو کسی کام کے انجام دینے میں عدم قدرت کی موجب ہو۔

۳: گھرانے کے نظام کی اہمیت

وہ باریگی اور عمدگی جس سے مطلقہ عورتوں کے احکام اور ان کے حقوق بیان کرنے کے سلسلہ میں اوپر والی آیت میں کام لیا گیا ہے، یہاں تک کہ آیات قرآن میں اس مسئلہ کی بہت ساری جزئیات بیان ہوئی ہیں کہ جو حقیقت میں اسلام کا بنیادی قانون ہے، اس اہمیت کی ایک واضح دلیل ہے کہ گھر طبعی نظام نیز عورتوں اور بچوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے اسلام اس کا قائل ہے۔

جہاں تک ہو سکتا ہے اسلام طلاق سے روکتا ہے اور اس کی جڑوں کو کاٹتا ہے لیکن جب معاملہ یہاں تک پہنچ جائے کہ ہر طرف کے راستے بند ہو جائیں اور طلاق و علیحدگی کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ ہو تو پھر اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اس کشمکش میں اولاد یا عورتوں کے حقوق پامال ہو جائیں، یہاں تک کہ علیحدگی کا طریقہ کار بھی اس طرح سے پیش کرتا ہے کہ عام طور پر رجوع اور بازگشت کا امکان موجود رہے۔

معروف طریقہ سے روکے رکھنا اور معروف سے جدائی، عورتوں کو نقصان اور ضرر کا نہ پہنچانا اور تنگی اور سخت گیری نہ کرنا، نیز بچوں کی سرفروخت کو محفوظ کرنے کے لیے شائستہ اور مناسب مشورہ کرنا، اور اسی قسم کے دوسرے احکام جو اوپر والی آیات میں آئے ہیں، وہ سب اس بات کے گواہ ہیں۔

لیکن انہوں کی بات ہے کہ ان امور سے بہت سے مسلمانوں کی لاعلمی یا علم کے باوجود عمل نہ کرنا، اس بات

کا سبب ہوتا ہے کہ طلاق اور علیحدگی کے وقت گھرانوں اور خصوصاً اولاد کے لیے بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں۔ اس کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ مسلمان قرآن کے فیض بخش چشمہ سے دور ہو گئے ہیں۔ مثلاً اس بات کے باوجود کہ قرآن صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ عورتیں عدت کے دوران شوہر کے گھر سے باہر نہ جائیں، اور نہ ہی شوہر کو یہ حق ہے کہ وہ انہیں گھر سے نکالے۔ یہ ایسا عمل ہے کہ اگر اسی طرح انجام پا جائے تو اکثر عورتوں کے ازدواجی زندگی کی طرف لوٹ آنے کی بہت زیادہ امید ہے۔ لیکن آپ بہت کم مسلمان مرد اور مسلمان عورت کو دیکھیں گے، جو طلاق و جدائی کے بعد اس اسلامی حکم پر عمل کرتے ہوں۔ یہ امر واقعی طور پر قابل افسوس ہے۔

❖ ❖ ❖

⑧ وَكَائِنٍ مِّنْ قَرِيْبَةٍ عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا
وَرُسُلِهِ فَحَاسِبْنَهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۗ وَعَذِّبْنَهَا
عَذَابًا نُكْرًا ۝

⑨ فَذَاقَتْ وَبَالَ أَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ
أَمْرِهَا خُسْرًا ۝

⑩ أَعَدَّ اللهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۗ فَاتَّقُوا اللهَ
يَا أُولِي الْأَلْبَابِ ۗ الَّذِينَ آمَنُوا ۗ قَدْ أَنزَلَ اللهُ
إِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝

⑪ رَسُوْلًا يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ آيَاتِ اللهِ مُبَيِّنَاتٍ لِّيُخْرِجَ
الَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى
النُّوْرِ ۗ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُدْخِلْهُ
جَنَّتِ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا
أَبَدًا ۗ قَدْ أَحْسَنَ اللهُ لَكَ رِزْقًا ۝

ترجمہ
⑧ کتنے ہی شہر اور آبادیاں ایسی ہیں جن کے رہنے والوں نے خدا اور اس

کے رسولوں کے فرمان سے سرپیچی کی توہم نے بھی ان کا حساب شدت کے ساتھ چکایا اور انہیں بہت ہی بُرے عذاب میں گرفتار کر دیا۔

۹) انہوں نے اپنے کردار و عمل کا وبال چکھا اور ان کا انجام کار خسارہ اور نقصان تھا

۱۰) خُدا نے ان کے لیے شدید عذاب فراہم کیا، پس اے صاحبانِ ایمان و عقل! تم

خُدا کے حکم کی مخالفت سے پرہیز کرو، (کیونکہ) خُدا نے تم پر وہ چیز نازل کی ہے جو تمہارا لیے ایک نصیحت ہے۔

۱۱) تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے جو خدا کی واضح آیات کی تم پر تلاوت کرتا ہے

تاکہ ان لوگوں کی جو ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیتے ہیں، تاریکیوں سے نور کی طرف

ہدایت کرے۔ اور جو شخص خدا پر ایمان لاتا، اور عمل صالح انجام دیتا ہے، خدا اسے اس

جنت کے باغات میں وارد کرے گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ہمیشہ

ہمیشہ ان میں رہیں گے اور خدا نے ان کے لیے اچھی روزی قرار دی ہے۔



تفسیر

سرکشوں کا دردناک انجام

قرآن کا شیوہ یہ ہے کہ اکثر مواقع پر عملی احکام کے ایک سلسلے کو بیان کرنے کے بعد گذشتہ آیتوں کے حالات کی طرف اشارہ کرتا ہے، تاکہ مسلمان ان کی سرگذشت میں اطاعت و عصیان کا نتیجہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں اور یہ مسئلہ بلور خود ایک جی صورت اختیار کر لے۔ اسی لیے اس سورہ میں بھی طلاق و علیحدگی کے موقع پر مردوں اور عورتوں کے وظائف اور ذمہ داریاں بیان کرنے کے بعد اسی مطلب کو پیش کر کے گنہگاروں اور سرکشی کرنے والوں کو خبردار کرتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "کہتے ہی شہر اور آبادیاں ایسی تھیں جن کے رہنے والوں نے خُدا اور اس کے رسولوں کے فرمان سے سرپیچی کی توہم نے بھی ان کا حساب شدت کے ساتھ چکایا اور انہیں بہت ہی بُرے عذاب میں

گفتار کر دیا۔ (وکائین من قریۃ عت عن امر ربھا ورسله فحاسبناھا حساباً شدیداً وعتبناھا عذاباً نکرًا)۔
 ”قریۃ“ سے مراد، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے، انسانوں کے اجتماع کی جگہ ہے، چاہے وہ شہر ہو یا گاؤں۔ اور یہاں مراد اس میں رہنے والے ہیں۔

”عتت“، ”عتو“ (بروزن غلو) کے مادہ سے اطاعت سے روگردانی کرنے کے معنی میں ہے۔
 ”نکر“، (بروزن شکر) ایسی مشکل کے معنی میں ہے کہ جس کی مثال نہ ہو یا بہت کم پائی جاتی ہو۔
 ”حساباً شدیداً“ یا تو دقیق اور سخت گیری کے ساتھ حساب لینے کے معنی میں یا شدید عذاب کے معنی میں ہے کہ جو دقیق حساب کا نتیجہ ہے۔ بہر حال یہ ان سرکش اقوام کے اس دنیا میں عذاب کی طرف اشارہ ہے کہ کبھی قوم کی طوفان کے ساتھ، کبھی گروہ کی تباہ کرنے والے زلزلے کے ساتھ اور کسی گروہ کی صاعقہ یعنی بجلی اور اسی قسم کی چیزوں کے ساتھ بچ گئی، اور ان کے تباہ اور ویران شدہ شہر و دیار آنے والے لوگوں کے لیے درس عبرت کی صورت میں باقی رہ گئے۔

لہذا بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: ”انھوں نے اپنے کفر و گناہ کا عذاب چکھا اور ان کا انجام کار خاہ اور نقصان تھا۔“ (فذاقت وبال امرھا وکان عاقبۃ امرھا خسراً)۔
 اس سے بڑھ کر خسارہ اور کیا ہو گا کہ وہ خدا داد سرمایہ کو ہاتھ سے گنوا بیٹھے اور اس دنیا کے بازار تجارت سے نہ صرف یہ کہ انھوں نے کوئی مال و متاع نہیں خریدا بلکہ انجام کار عذاب الہی سے نابود ہو گئے۔
 بعض نے یہاں ”حساب شدید“ اور ”عذاب نکر“ کو عذاب قیامت کی طرف اشارہ سمجھا، اور فعل ماضی کو مستقبل کے معنی میں لیا ہے۔ لیکن ایسا کرنے کا کوئی سبب موجود نہیں ہے، بالخصوص جبکہ عذاب قیامت کے سلسلے میں بعد والی آیت میں بات کی جائے گی اور یہ بات خود ایک زندہ گواہ ہے کہ یہاں عذاب سے مراد عذاب دنیا ہی ہے۔

اس کے بعد ان کے آخری عذاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”خدا نے ان کے لیے شدید عذاب تیار کر رکھا ہے“ (اعد اللہ لہم عذاباً شدیداً)۔

لے ”کائین“ مشہور نامائے ادب کے نظریہ کے مطابق یہ ایک مرکب اسم ہے ”کاف“ تشبیہ اور ’ی‘ سے جو تینوں کے ساتھ توام ہے۔ چونکہ تینوں اس اسم کی بنا میں داخل ہے اس لیے حالت وقت میں بھی پڑھی جاتی ہے، اور قرآن کی کتابت میں بھی لکھی جاتی ہے۔ اور اس کا معنی ’کم‘ خبریہ کے مانند ہے، اگرچہ اس کے ساتھ کچھ فرق ہے، ایک غیر مشہور نظریہ یہ ہے کہ یہ ایک اسم بسیط ہے اور اس کا ’کاف‘ اور ’نون‘ جزو حکم ہے۔

ایک دردناک، شدید، وحشت انگیز، ذلیل کرنے والا اور رُسوا کرنے والا عذاب اور ان کے لیے دوزخ میں ہمیشہ رہنے کی جگہ ابھی سے فراہم ہے۔

جب یہ بات ہے تو اے صاحبان عقل و خرد اور اے ایمان لانے والو! خدا کے حکم کی مخالفت سے پرہیز کرو۔ (فاتقوا اللہ یا اولی الالیاب الذین امنوا)۔

ایک طرف سے غور و فکر اور دوسری طرف سے ایمان اور آیات الہی تمہیں خبردار کرتی ہیں کہ تم سرکش اور روگردانی کرنے والی قوموں کی سرنوشہ کو دیکھو اور اس سے عبرت حاصل کرو، تمہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی ان کی صف میں جا کھڑے ہو، پھر خدا تمہیں اس جہان میں بھی ہولناک اور بے سابقہ عذاب میں گرفتار کر دے گا اور آخرت کا شدید عذاب بھی تمہارے انتظار میں ہو گا۔

اس کے بعد غور و فکر کرنے والے مومنین کو مخاطب کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: ”خدا نے تم پر ایسی چیز نازل کی ہے جو تمہارے لیے باعث نصیحت ہے“ (قد انزل اللہ الیکم ذکراً)۔



”اور ایک رسول تمہاری طرف بھیجا ہے، جو خدا کی واضح آیات کی تمہارے سامنے تلاوت کرتا ہے تاکہ ایمان لانے والوں اور عمل صالح بجالانے والوں کی تاریکیوں سے نور کی طرف ہدایت کرے“ (رسولاً یتلوا علیکم آیات اللہ میتنات لیخرج الذین امنوا وعملوا الصالحات من الظلمات الی النور)۔ یہاں ذکر سے کیا مراد ہے؟ اور رسول سے کون مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

مفسرین کا ایک گروہ ”ذکر“ کو قرآن کے معنی میں لیتا ہے، جبکہ ایک جماعت نے اس کی رسول خدا کے ساتھ تفسیر کی ہے، کیونکہ آپ لوگوں کے لیے یاد آوری کا سبب ہیں۔ اس تفسیر کے مطابق اس کے بعد جو لفظ ”رسولاً“ آیا ہے اس سے پیغمبر کی ذات مراد ہے۔ (اور اس کلام میں کوئی محذوف نہیں ہے)۔ لیکن یہاں ”نازل کرنے سے مراد“ خدا کی طرف سے امت کو پیغمبر کے وجود کا عطا کرنا ہے۔

لیکن اگر ذکر کو قرآن مجید کے معنی میں لیں تو ”رسولاً“ اس کا بدل نہیں ہو سکتا۔ لہذا اس جملے میں ایک محذوف ہے۔ اور تقدیر میں اس طرح ہے: ”انزل اللہ الیکم ذکرًا وَاٰہِیٰہِمْ رَسُوْلًا“ خدا نے ایک نصیحت والے چیز نازل کی اور ایک رسول بھیجا۔

بعض نے ”رسول“ کی ”جبریل“ کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ اس صورت میں اس کا نزول نزول حقیقی ہو گا، کیونکہ وہ آسمان سے نازل ہوتا تھا۔ لیکن یہ تفسیر ”یتلوا علیکم آیات اللہ“ وہ خدا کی آیات تمہارے سامنے پڑھتا ہے کے جملہ کے ساتھ سازگار نہیں ہے، کیونکہ جبریل براہ راست مومنین کے سامنے نہیں پڑھتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ ان میں سے ہر ایک تفسیر میں ایک اضافہ اور ایک مشکل موجود ہے، لیکن مجموعی طور پر پہلی

تفسیر (یعنی ذکر کا معنی قرآن اور رسول کا معنی پیغمبر اکرمؐ ہیں) سب سے بہتر ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کی بہت سی آیات میں لفظ ذکر کا قرآن پر اطلاق ہوا ہے، خصوصاً جہاں لفظ 'انزال' کے ساتھ ہو، اس طرح سے کہ جب 'نزل' ذکر کہا جائے تو یہ قرآن کے معنی کا ہی ادا کرتا ہے۔

سورہ نمل کی آیت ۴۴ میں آیا ہے: **وَ اَنْزَلْنَا الْيَكُ الذِّكْرَ لَتَبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نَزَلَ الْيَهُودُ** ہم نے ذکر کو تجھ پر نازل کیا ہے، تاکہ تو لوگوں کے لیے اس چیز کو بیان کرے جو ان پر نازل ہوئی ہے۔
نیز سورہ حجر کی آیت ۶ میں آیا ہے: **وَ قَالُوا يَا اَيُّهَا الَّذِي نَزَّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرَ اَنْتَ لَمُجْنُونٌ** دشمنوں نے کہا: اے وہ شخص کہ جس پر ذکر نازل ہوا ہے تو ایک دیوانہ ہے۔

اگر آئمہ اہل بیتؑ سے بعض روایات میں آیا ہے کہ ذکر سے مراد حضرت رسولؐ ہیں اور ہم 'اہل ذکر' ہیں تو ممکن ہے کہ یہ آیت کے بطون کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ 'اہل ذکر' جو آیت فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون (اگر تم نہیں جانتے تو اہل ذکر سے پوچھ لو) (نمل ۴۴) میں آیا ہے یہ خاص طور پر اہل بیت کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس کی شان نزول میں علماء اہل کتاب آتے ہیں۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھتے ہوئے کہ 'ذکر' ایک وسیع معنی رکھتا ہے کہ جو پیغمبر اسلامؐ کو شامل ہے تو یہ بھی اس کا ایک مصداق ہو گا۔

بہر حال اس رسولؐ کے بھیجے اور اس کتاب آسمانی کے نازل کرنے کا اصلی مقصد یہ ہے کہ وہ انہیں آیات الہی کی تلاوت کے ذریعے کفر و جہالت، معصیت اور اخلاقی فساد کی تاریکیوں سے باہر نکالتے ہوئے ایمان، توحید اور تقویٰ کے نور کی رہنمائی کرے۔ جبکہ حقیقت میں بعثت پیغمبر اور نزول قرآن کے تمام اہداف و مقاصد کا خلاصہ اسی ایک جملہ میں آگیا ہے: یعنی تاریکیوں سے باہر نکال کر نور کی طرف لانا۔ اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ 'ظلمات' کا صیغہ جمع کے ساتھ اور نور کا صیغہ واحد کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ کیونکہ شرک و کفر و فساد، پر اگندگی و کثرت کے عامل ہیں، جبکہ ایمان و توحید و تقویٰ، وحدت و یگانگت کے عامل ہیں۔

آیت کے آخر میں ان لوگوں کے اجر و ثواب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو ایمان و عمل صالح رکھتے ہیں، مزید لکھا ہے: **”جو شخص خدا پر ایمان لائے، عمل صالح بجالائے اور اسی راستے پر چلتا رہے، تو خدا اُسے جنت کے ان باغات میں داخل کرے گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ وہیں پر رہے گا، اور خدا نے اس کے لیے اچھی روزی قرار دی ہے“** (ومن يؤمن بالله و يعمل صالحا يدخله جنات تجري من تحتها الانهار خالدین فیہا ابدًا قد احسن الله له رزقًا)۔

'یؤمن' اور 'يعمل' کی تفسیر فعل مضارع کی صورت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا ایمان اور عمل صالح کسی خاص زمانہ کے ساتھ محدود نہیں بلکہ استمرار و دوام رکھتا ہے۔

سے مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۶ سے رجوع کریں۔ سب سے توجہ رکھنی چاہیے کہ جو ضمیریں آیت میں استعمال ہوئی ہیں بعض توجہ کی صورت میں ہیں اور بعض مفرد کی صورت میں ہیں۔ یہ اس بنا پر ہے کہ جہاں مفرد کی صورت میں ہیں وہاں وہ جنس اور جمع کے معنی میں ہیں۔

خالدین کی تعبیر جنت کی ہمیشگی کی دلیل ہے۔ اس بناء پر اس کے بعد 'ابدًا' کے لفظ کا ذکر "خلود" کے لیے ایک تاکید شمار ہوتا ہے۔

"رِزْقًا" کی تعبیر "حکوہ" کی صورت میں ان اچھی اچھی روزیوں کی عظمت و اہمیت کی طرف اشارہ ہے جو خدا ان لوگوں کے لیے فراہم کرے گا یہ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو آخرت میں ہر قسم کی خدائی نعمت و یہاں تک کھانا و مہبت کو بھی اپنے اندر لیے ہوئے ہے، کیونکہ ایمان و تقویٰ کا نتیجہ صرف آخرت کے ساتھ مربوط نہیں بلکہ مومن و پرہیزگار لوگ اس دنیا میں بھی پاکیزہ تر، آرام دہ اور زیادہ لذت بخش زندگی رکھتے ہیں۔

✦ ✦ ✦

① اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ
مِثْلَهُنَّ يَنْزِلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۖ وَأَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ
عِلْمًا

ترجمہ

② خدا نے ہی ساتوں آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور اتنی ہی زمینیں (پیدا کی ہیں) اس
کا حکم ہمیشہ ان کے درمیان نازل ہوتا ہے تاکہ تم جان لو کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے، اور
اس کا علم ہر چیز پر احاطہ رکھتا ہے۔

تفسیر
خلقت عالم کا مقصد معرفت ہے

سورۃ طلاق کی یہ آخری آیت آسمانوں اور زمینوں کی خلقت میں اللہ کی قدرت کی عظمت اور اس خلقت کے
مقصد اصلی کی طرف ایک پُر معنی اور واضح اشارہ ہے۔ نیز یہ ان مباحث کی تکمیل کر رہا ہے جن میں پہیزگار
مومنین کے لیے ثوابِ عظیم کے وعدے کے سلسلے میں اور اسی طرح ان وعدوں کے سلسلے میں جو ان کے
مشکلات کی گرہ کھولنے کے بارے میں کیے تھے۔ یہ بات واضح ہے کہ وہ خدا جو اس عظیم خلقت پر قدرت
رکھتا ہے، وہ اس جہان میں بھی اور دوسرے جہان میں بھی ان وعدوں کو پورا کرنے کی طاقت اور قوت رکھتا ہے۔
پہلے فرماتا ہے: ”خدا وہی ہے جس نے ساتوں آسمان پیدا کیے“ (اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ

سملوات)۔

”اور اتنی ہی زمینیں پیدا کی ہیں“ (ومن الارض مثلهن)۔

یعنی جس طرح آسمان سات ہیں اسی طرح زمینیں بھی سات ہیں۔

یہ قرآن مجید کی واحد آیت ہے جو سات زمینوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان سات آسمانوں اور اتنی ہی زمینوں سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں ہم نے تفسیر نمونہ جلد اول میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۹ کے ذیل میں اور جلد ۱۱ میں سورہ حم سجدہ کی آیت ۱۳ کے ذیل میں تفصیلی بحث کی ہے۔ لہذا یہاں ایک مختصر سے اشارہ پر قناعت کرتے ہیں اور وہ یہ ہے:

ممکن ہے کہ سات کے عدد سے مراد وہی کثرت ہو، کیونکہ یہ تعبیر قرآن مجید میں اور اس کے علاوہ بھی کثرت کے معنی میں آتی ہے، جیسے ہم سمجھتے ہیں اگر تم سات سمندر بھی لے آؤ تو کافی نہیں ہوں گے۔ اس بناء پر سات آسمانوں اور سات زمینوں سے مراد آسمانی کواکب اور زمین سے مشابہ گزروں کی عظیم و کثیر تعداد ہے۔

لیکن اگر ہم سات کے عدد کو تعداد اور گنتی کے لیے سمجھیں تو اس کا مفہوم سات آسمانوں کا وجود ہو گا۔ چنانچہ سورہ صافات کی آیت ۶ کہتی ہے: "انا نرینا السماء الدنیا بزینتہ الکواکب : ہم نے نزدیک آسمان (پہلے آسمان) کو کواکب اور ستاروں سے زینت بخشی ہے" اس کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں اور انسانی علم و دانش جس پر احاطہ رکھتی ہے وہ سب کچھ پہلے آسمان سے مربوط ہے۔ لیکن ان ثوابت و اشارات کے علاوہ اور بھی کچھ عالم موجود ہیں جو ہمارے علم کی دسترس سے باہر ہیں۔

یہ بات تو سات آسمانوں کے بارے میں تھی۔ باقی رہا سات زمینوں کے بارے میں تو ممکن ہے کہ یہ کڑہ زمین کے مختلف طبقات کی طرف اشارہ ہو۔ کیونکہ اس وقت یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ زمین طرح طرح کے پردوں اور تہوں سے بنی ہے۔ یا یہ زمین کے سات براعظموں کی طرف اشارہ ہے۔ جیسا کہ آج کے زمانے میں اور گزشتہ زمانے میں بھی کڑہ زمین کو سات منطقوں میں تقسیم کرتے تھے۔ (البتہ گزشتہ اور موجودہ زمانے کے طرز تقسیم میں فرق ہے۔ موجودہ زمانہ میں دو منجمد منطقوں شمالی و جنوبی، دو معتدل منطقوں، دو گرم منطقوں اور ایک استوائی منطقہ میں تقسیم ہوتی ہے۔ لیکن گزشتہ زمانہ میں سات اقلیمیں (براعظموں) دوسری شکل میں تقسیم ہوتی تھیں)

لیکن ممکن ہے کہ یہاں بھی سات کا عدد جو متشخص کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے تکثیر کے لیے ہی ہو، اور یہ بھی متعدد زمینوں کی طرف اشارہ ہو کہ جو عالم ہستی میں موجود ہیں۔ یہاں تک کہ بعض ماہرین فلکیات سمجھتے ہیں کہ کڑہ زمین سے مشابہ وہ کڑے جو اس عظیم عالم میں مختلف آفتابوں کے گرد گردش کر رہے ہیں، ان کی کم از کم تعداد تین سو ملین ہے۔ لہ

اگرچہ منظومہ شمسی کے علاوہ اجرام کے بارے میں ہم جو معلومات رکھتے ہیں۔ ان کے ناکافی ہونے کے باعث

۱۔ "تفسیر مراغی" جلد ۲۸ ص ۱۵۱۔ ایک حدیث جو امیر المؤمنین حضرت علیؑ سے نقل ہوئی ہے، اس میں بھی آیا ہے: (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ان کی تعداد مقرر کرنا خاصا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن بہر حال دوسرے ماہرین فلکیات بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ اس ککشاں میں کہ منظومہ شمسی جس کا ایک جزو ہے، کئی ملین کرے موجود ہیں، جو کڑے زمین سے مشابہ اور حیات و زندگی کا مرکز ہیں۔

البتہ ممکن ہے کہ آگے چل کر علم و دانش میں انسان کی پیش رفت، اس قسم کی آیات کے بارے میں ہمیں مزید اطلاعات مہیا کر سکے۔

اس کے بعد خدا کے حکم و فرمان کے ذریعے اس عظیم عالم کی تدبیر کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اس کا حکم و فرمان ہمیشہ ان کے درمیان نازل ہوتا رہتا ہے“: (یتنزل الامر بینہن)۔

یہ بات واضح ہے کہ یہاں امر سے مراد وہی خدا کا حکم و امر نکوینی ہے جو وہ اس عالم بزرگ اور ساتوں آسمانوں اور زمینوں کی تدبیر کے سلسلے میں جاری کرتا ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے مخصوص حکم کے ساتھ ایک منظم طریقے سے ہدایت دہبری کرتا ہے۔ حقیقت میں یہ آیت سورہ سجدہ کی آیت ۴ کے مشابہ ہے جس میں فرماتا ہے: ”یدبر الامر من السماء الی الارض“: ”وہ آسمان سے لے کر زمین تک تدبیر امور کرتا ہے۔“

بہر حال اگر اس کی تدبیر ایک لمحہ کے لیے بھی اس عالم سے جدا ہو جائے تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے، اور سب کے سب فنا ہو جائیں۔

آخر میں اس عظیم خلقت کے ہدف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”یہ سب کچھ اس بناء پر ہے تاکہ تم جان لو کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے اور اس کا علم و آگہی ہر چیز پر محیط ہے“ (لتعلموا ان اللہ علی کل شیء قدید و ان اللہ قد احاط بكل شیء علماً)۔

گنتی عمدہ تعبیر ہے کہ وہ اس عظیم خلقت کا ہدف یہ قرار دیتا ہے کہ انسان خدا کے علم اور اس کی قدرت کی صفات سے آگاہ ہو جائے کیونکہ ان دو صفات سے آگاہی انسان کی تربیت کے لیے کافی ہے۔

انسان کو یہ جان لینا چاہیے کہ خدا اس کے وجود کے تمام اسرار پر احاطہ رکھتا ہے اور اس کے تمام اعمال سے باخبر ہے۔ نیز اسے یہ بھی جان لینا چاہیے کہ معاد و قیامت، جزا و سزا اور مومنین کی کامیابی کے بارے میں خدا کے وعدوں میں کسی تعلق کا شائبہ تک نہیں ہے۔

ہاں! وہ خدا جو اس قسم کا علم و قدرت رکھتا اور عالم ہستی کے نظام کا ادارہ کرتا ہے۔ اگر اس نے انسانوں کی زندگی کے بارے میں طلاق اور عورتوں کے حقوق سے مربوط کچھ احکام صادر فرمائے ہیں تو وہ سب کے سب دقیق اور نچتہ حساب پر مبنی ہیں۔

فرسابقہ) لہذا النجوم السخی فی السماء مدائن مثل المدائن السخی فی الارض: ”ان ستاروں میں بھی جو آسمان پر ہیں رتے زمین کے شہروں کی طرح سے شہر ہیں۔“ (تفسیر برہان جلد ۴ ص ۱۵)۔

”ہدف آفرینش“ کے سلسلے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی جلد ۱۲ سورہ ذاریت کی آیت ۵۶ کے ذیل میں ایک تفصیلی بحث کی ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کی مختلف آیات میں انسان کی خلقت کے ہدف کی طرف یا اس جہان کی خلقت کے ہدف کی طرف ایسے اشارے ہوئے ہیں جو ابتداء میں مختلف دکھائی دے سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم غور سے دیکھیں تو وہ سب ایک ہی حقیقت کی طرف لوٹتے ہیں۔

۱ : سورہ ذاریت کی آیت ۵۶ میں انسان اور جن کی خلقت کا مقصد ”عبادت“ کو قرار دیا ہے۔ ”وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون“

۲ : سورہ ہود کی آیت ۷ میں آسمانوں اور زمین کی عظیم خلقت کا ہدف و مقصد انسان کی آزمائش بتائی گئی ہے۔ ”وہو الذی خلق السماوات والارض فی ستة ایام وکان عرشہ علی الماء لیبوکم ایکم احسن عملاً“

۳ : سورہ ہود کی آیت ۱۱۴ میں ہدف و مقصد خدا کی رحمت کو قرار دیا ہے۔ ”ولذالک خلقہم“

۴ : آخر میں زیر بحث آیت میں خدا کی صفات کے علم و آگہی کو ہدف بتایا ہے۔ (لتعلموا...)

ان آیات میں تھوڑا سا غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں سے بعض بعض کے لیے مقدمہ ہیں۔ آگاہی معرفت، بندگی و عبادت کے لیے ایک مقدمہ ہے۔ وہ انسان کی آزمائش اور تربیت کے لیے ایک مقدمہ ہے اور خدا کی رحمت سے فیض یاب ہونے کے لیے ایک مقدمہ ہے (غور کیجئے)

✦ ✦ ✦

خداوند! اب جبکہ تو نے ہمیں اپنی عظیم خلقت کے ہدف سے آشنا کر دیا ہے اس عظیم ہدف تکس

پہنچنے کے سلسلے میں ہماری مدد فرما!

پروردگاہ! تیرا علم و قدرت بے پایاں ہے اور تیری رحمت بھی غیر متناہی ہے، ہمیں اس بے انتہا

رحمت کا ایک حصہ عنایت فرما!

ہاں الہا! تو نے قرآن و پیغمبر کو ظلمات سے نور کی طرف لانے والے بنا کر بھیجا ہے۔ ہمیں گناہ اور

ہوائے نفس کی ظلمت اور تاریکی سے باہر نکال لے اور ہمارے دلوں کو نور ایمان و تقویٰ سے منور کر دے!

آمین یا رب العالمین

سورہ طلاق کا اختتام : ۲۸ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

اختتام ترجمہ ۲ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ، مطابق ۲۹ جولائی ۱۹۸۷ء

بروز بدھ صبح ۵ بجکر ۴۱ منٹ، ۸۱، اسی ماڈل ٹاؤن، لاہور

سورہ ذی حجہ

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا اور اس کی ۱۲ آیات ہیں۔

آغاز

آخر رمضان المبارک ، ۱۳۰۶ھ

سورۃ تحریم کے مضامین

اس سورہ کے بنیادی طور پر چار حصے ہیں :

پہلا حصہ : یہ پہلی آیت سے پانچویں آیت تک ہے جو پیغمبرؐ اور ان کی بعض بیویوں کے ایک واقعہ سے مرہوط ہے۔ آنحضرتؐ نے حلال غذاؤں میں سے کسی چیز کو اپنے اوپر حرام قرار دے لیا تو مذکورہ آیات نازل ہوئیں اور پیغمبرؐ کی ان بیویوں کو ملامت ہوئی کہ جس کی تفصیل انشاء اللہ شان نزول میں بیان ہوگی۔

دوسرا حصہ : یہ آیت ۶ سے شروع ہو کر آیت ۸ تک جاتا ہے، اور تمام مومنین سے ایک کلی خطاب ہے۔ یہ گھر والوں کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں نگران رہنے اور گناہوں سے توبہ کے ضروری ہونے کے بارے میں ہے۔

تیسرا حصہ : یہ صرف ایک ہی آیت ہے جس میں پیغمبرؐ کو کفار و منافقین سے جنگ اور جہاد کرنے کے بارے میں خطاب ہوا ہے۔

چوتھا حصہ : یہ سورۃ کا آخری حصہ ہے جو آیت ۱۰ سے آیت ۱۲ تک ہے۔ اس میں خدا نے گزشتہ بحث کو واضح کرنے کے لیے دو صالح اور نیک خواتین (مریمؑ اور آسیہ زوجہ فرعون) اور دو غیر صالح خواتین (زوجہ نوحؑ اور زوجہ لوطؑ) کے حالات کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ اس میں درحقیقت تمام مسلمانوں کی بیویوں اور خصوصیت سے پیغمبرؐ کی بیویوں کو تنبیہ کرتا ہے کہ وہ خود کو پہلے گروہ (مریمؑ و آسیہ زوجہ فرعون) سے ہم آہنگ کریں، دوسرے گروہ کے ساتھ نہیں۔

❖ ❖ ❖

تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں رسول خداؐ سے اس طرح نقل ہوا ہے :

”جو شخص سورہ تحریم کو پڑھے گا۔ اعطاء اللہ توبۃ نصوحاً: تو خدا ۱۱ سے خالص توبہ کی توفیق عطا فرمائے گا۔“

ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے :

”جو شخص سورہ طلاق و تحريم کو واجب نماز میں پڑھے گا، خدا اُسے
 قیامت میں خوف و ہراس سے پناہ دے گا۔ جہنم کی آگ سے
 رہائی بخشنے گا، اور اُسے اس سورہ کی تلاوت اور اس پر مداومت
 کی بناء پر جنت میں داخل کرنے کا، کیونکہ یہ دونوں سورتیں پیغمبر
 کے ساتھ مخصوص ہیں۔“

✦ ✦ ✦

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

- ١ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ
أَزْوَاجِكَ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝
- ٢ قَدْ فَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ وَاللَّهُ مَوْلَاكُمْ
وَ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝
- ٣ وَإِذْ أَسْرَ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَّأَتْ
بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضُهُ وَأَعْرَضَ عَنْ
بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ هَذَا ۗ قَالَ نَبَّأَنِي
الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ ۝
- ٤ إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا ۗ وَإِنْ تَظَاهَرَا
عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ
وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَلِكَ ظَهِيرٌ ۝
- ٥ عَسَىٰ رَبُّهُ إِنْ طَلَّقَكُنَّ أَنْ يُبَدِّلَهُ أَزْوَاجًا خَيْرًا
مِّنْكَ مَسَلَتْ مُؤْمِنَاتٍ فَمِنْهُنَّ نَبِيَّتٌ عَجَبَتْ سَيِّحَتْ
نَبِيَّتٌ وَأَبْكَارًا ۝

ترجمہ

رحمن و رحیم خدا کے نام سے

- ① اے پیغمبر! جو چیز خدا نے تیرے لیے حلال کی ہے اُسے اپنی بیویوں کو خوش رکھنے کے لیے اپنے اُوپر حرام کیوں کرتے ہو اور خدا غفور و رحیم ہے۔
- ② خدا نے (ایسے موقعوں کے لیے) تمہاری قسموں کے کھولنے کی راہ کو واضح کر دیا ہے اور خدا ہی تمہارا مولا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے۔
- ③ اور اس وقت کو یاد کرو کہ جب پیغمبر نے اپنا ایک راز اپنی بیویوں میں سے بعض کو بتلایا، لیکن جب اس نے اس راز کو افشاء کر دیا تو خدا نے پیغمبر کو اس سے آگاہ کیا اور پیغمبر نے اس کا ایک حصہ تو اس سے بیان کیا اور ایک حصہ بیان نہ کیا۔ جب پیغمبر نے اپنی بیوی کو اس کی خبر دی تو اس نے کہا کہ آپ کو اس بات سے کس نے آگاہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ علیم و خبیر خدا نے مجھے اس بات سے آگاہ کیا ہے۔
- ④ اگر تم دونوں اپنے فعل سے توبہ کر لو (تو اس میں تمہارا نفع ہے) کیونکہ تمہارے دل حق سے پھر گئے ہیں، اور اگر تم دونوں اس کے برخلاف ایک دوسری کی مدد کرتی رہو گی (تب بھی تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گی) کیونکہ خدا اس کا مددگار ہے۔ اور اسی طرح جبرئیل اور صالح مومنین اور ان کے علاوہ تمام فرشتے اس کے پشتیبان ہیں۔
- ⑤ اگر وہ تمہیں طلاق دے دے تو قریب ہے کہ اس کا پروردگار تمہاری جگہ اس کے لیے تم سے اچھی بیویاں قرار دے جو مسلمان، مؤمن، متواضع، توبہ کرنے والیاں، عبادت گزار اور ہجرت کرنے والیاں ہوں گی اور بیوہ اور باکرہ ہوں گی۔

شان نزول

اوپر والی آیات کے شان نزول کے بارے میں شیعہ اور اہل سنت کی تفسیر و حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں عہت سی روایات نقل ہوئی ہیں ان میں سے جو زیادہ مشہور اور زیادہ مناسب نظر آتی ہیں وہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہیں :

پیغمبر بعض اوقات (اپنی ایک بیوی) زینب بنت جحش کے پاس جاتے تو زینب آپ کو بٹھالیتیں اور جو شہدائے کے پاس موجود ہوتا وہ آپ کی خدمت میں پیش کرتیں۔ یہ بات نبی عائشہ کے کانوں تک پہنچی تو ان پر بہت گراں گزری، وہ کہتی ہیں : میں نے حفصہ (پیغمبر کی دوسری بیوی) کے ساتھ یہ طے کیا کہ جب بھی پیغمبر ہمارے قریب آئیں تو ہم فوراً یہ کہیں : کیا آپ نے "مغایر" کھائی۔ (مغایر ایک گوند تھی جو حجاز کے ایک درخت "عرفط" (بروزن ہرمز) سے نکلتی تھی اور اس کی بو خوشگوار نہیں تھی) پیغمبر اس بات کے پابند تھے کہ آپ کے دہن مبارک یا لباس سے ہرگز کوئی نامناسب بو نہ آئے بلکہ اس کے برعکس آپ پابندی کے ساتھ خوشبو لگاتے اور معطر رہتے تھے۔

اس طرح ایک دن پیغمبر حفصہ کے پاس آئے تو اس نے پیغمبر سے یہی بات کہی۔ آنحضرت نے فرمایا : میں نے مغایر نہیں کھائی بلکہ زینب بنت جحش کے ہاں سے شہد نوش کیا ہے اور میں قسم کھاتا ہوں کہ اب اس کے بعد وہ شہد نہیں پیوں گا۔ (ممکن ہے کہ شہد کی مکھی کسی نامناسب نبات یا شاید مغایر پر ہی میٹھی ہو) لیکن تم یہ بات کسی سے نہ کہنا۔ (کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بات لوگوں کے کانوں تک پہنچے تو وہ کہیں کہ پیغمبر نے ایک حلال غذا کو اپنے اوپر حرام کیوں کر لیا ہے؟ یا وہ اس سلسلے میں یا اس سے مشابہ امور کے بارے میں پیغمبر کے اس عمل کی پیروی کرنے لگیں، یا یہ بات زینب کے کان تک پہنچ جائے تو وہ شکستہ دل ہو)

لیکن انجام کار یہ راز اس نے فاش کر دیا اور بعد میں معلوم ہو گیا کہ اصل میں یہ معاملہ تو ایک سازش تھی۔ اس پر پیغمبر کو بہت رنج ہوا تو اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور اس ماجرے کو اس طرح سے ختم کیا گیا کہ پھر پیغمبر کے گھر میں اس قسم کے امور کا تکرار نہ ہوا۔

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ پیغمبر اس ماجرے کے بعد ایک ماہ تک اپنی ازواج سے الگ رہے۔ یہاں تک کہ آنحضرت کی طرف سے ان کو طلاق دینے کے ارادہ کی خبر منتشر ہو گئی۔ اس طرح ازواج سخت پریشان اور وحشت زدہ ہو گئیں اور اپنے فعل پر پشیمان ہوئیں۔

اس اصل حدیث کو بخاری نے اپنی صحیح کی جلد ۶ ص ۱۹۶ میں نقل کیا ہے اور جو وضاحتیں ہم نے توہین میں لکھی ہیں وہ دوسری کتب سے معلوم ہوئی ہیں۔

تفسیر

پیغمبرؐ کی بعض ازواج کی شدید سزائیں

اس میں شک نہیں کہ پیغمبر اسلامؐ جیسے عظیم انسان صرف اپنی ذات سے ہی تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا تعلق پورے اسلامی معاشرے اور عالم انسانیت سے تھا۔ اس بناء پر اگر ان کے گھر کے اندر ان کے خلاف سازشیں ہوں، چاہے وہ کتنی ہی چھوٹی اور معمولی کیوں نہ ہوں، تو ان کے قریب سے آسانی کے ساتھ نہیں گزر جانا چاہیے۔ یعنی پیغمبرؐ کی حیثیت، مقام اور مرتبہ کو نوز بائد کسی کے بھی ہاتھ میں کھلونا نہیں بننا چاہیے۔ اگر اس قسم کا کوئی معاملہ پیش آئے تو قاطعیت کے ساتھ اس کا سامنا کرنا چاہیے۔

اوپر والی آیات حقیقت میں خدا کے بزرگ و برتر کی طرف سے اس قسم کے واقعہ کے مقابلے اور اپنے پیغمبرؐ کی حیثیت و مقام کی حفاظت کے لیے ایک قطعی اور دو ٹوک فیصلہ ہے۔

سب سے پہلے خود پیغمبرؐ کی طرف روتے سخن کرتے ہوئے کہتا ہے: ”اے پیغمبرؐ! جو چیز خدا نے تیرے لیے حلال کی ہے اسے اپنی بیویوں کو خوش رکھنے کے لیے اپنے اوپر حرام کیوں کرتے ہو؟“ (یا ایہا النبی لم تحرم ما احل الله لك تبغی مرضات ازواجك)۔

معلوم ہے کہ یہ شرعی تحریم نہیں تھی بلکہ جیسا کہ بعد والی آیات سے معلوم ہوتا ہے، پیغمبرؐ کی طرف سے قسم کھائی گئی تھی اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بعض مباح چیزوں کے ترک کرنے کی قسم کھانا کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس بناء پر ”لم تحرم“ (اپنے اوپر حرام کیوں کرتے ہو) کا جملہ عتاب اور سزائیں کے عنوان سے نہیں بلکہ ایک قسم کی ہمدردی اور شفقت کا اظہار ہے۔

ٹھیک اس طرح کہ جیسے ایک شخص جو اپنی معاش حاصل کرنے کے لیے بہت زیادہ زحمت اٹھاتا ہے لیکن خود اس سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں لیتا، ہم اس سے کہتے ہیں کہ تم اپنے آپ کو اتنی زحمت کیوں دیتے ہو، اور اس زحمت کے ثمرے سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے۔

بعد آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: ”خدا غفور و رحیم ہے“ (والله غفور رحیم)۔ یہ غفور و رحمت کی بات ان بیویوں کے بارے میں ہے جنہوں نے اس واقعہ کے اسباب فہمیا کیے ہیں۔ یعنی اگر واقعی وہ توبہ کر لیں تو وہ اس کی مشمول ہوں گی۔ یا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بہتر تھا پیغمبرؐ اس کی قسم نہ کھاتے، کیونکہ یہ ایک ایسا کام تھا جو احتمالاً آنحضرتؐ کی بعض بیویوں کی جرأت اور جسارت کا سبب بن جاتا۔

بعد والی آیت میں اضافہ کرتا ہے: ”خدا نے (ایسے موقعوں کے لیے) تمہاری قسموں کے کھولنے کی

راہ کو واضح کر دیا ہے۔ ”قد فرض الله لكم تحلة ايمانكم۔“

البتہ اگر قسم کسی ایسے امر کے لیے ہو جس میں کسی کام کا ترک کرنا برتری رکھتا ہو تو پھر قسم پر عمل کرنا چاہیے اس کا توڑنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ ہے۔ لیکن اگر وہ قسم کسی ایسی چیز کے لیے ہو جس کا ترک کرنا مناسب نہ ہو (ذیر بحث آیت کی مانند) تو پھر اس صورت میں اس کا توڑنا جائز ہے، لیکن اس قسم کے احترام کی حفاظت کے لیے بہتر ہے کہ کفارہ بھی دیا جائے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”خدا تمہارا مولا اور تمہارا محافظ و مددگار ہے اور وہ علیم و حکیم ہے“ (والله مولاکم و هو العلیم الحکیم)۔

اسی لیے اس نے اس قسم کی قسموں سے نجات کی راہ تمہارے لیے ہموار کر دی ہے اور اپنے علم و حکمت کے مطابق تمہارے لیے مشکل کشائی کی ہے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر نے اس آیت کے نزول کے بعد ایک غلام آزاد کیا، اور جو کچھ اپنے اوپر قسم کی وجہ سے حرام کیا ہوا تھا، اُسے حلال کر لیا۔

❖ ❖ ❖

بعد والی آیت میں اس واقعہ کے سلسلے میں مزید تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اُس وقت کو یاد کرو جب پیغمبر نے اپنا ایک راز اپنی بیویوں میں سے بعض کو بتلایا، لیکن اس نے راز داری نہ کی اور دوسری کو خبر دے دی، خدا نے پیغمبر کو اس افتائے راز سے آگاہ کیا تو پیغمبر نے اس کا ایک حصہ تو اس سے بیان کیا اور ایک حصہ بیان نہ کیا“ (واذا اسر النبی الی بعض امر واجه حدیثاً فلما تبأت به و اظہره الله علیہ عرف بعضہ و اعرض عن بعض)۔

یہ راز کیا تھا جو پیغمبر نے اپنی بیویوں میں سے بعض کو بتلایا تھا اور اس نے راز داری نہ کی۔ مذکورہ مشاں نزول کے مطابق یہ راز دو مطالب پر مشتمل تھا، ایک اپنی بیوی زینب بنت جحش کے پاس شہد کا پینا اور دوسرا آئندہ کے لیے اس کے پینے کو اپنے اوپر حرام کر لینا۔ اس آیت میں اس بیوی سے مراد بی بی حفصہ تھی جو راز داری نہ کر سکی اور اس نے یہ بات سن کر بی بی عائشہ سے بیان کر دی۔

پیغمبر چونکہ وحی کے ذریعے اس افتائے راز سے آگاہ ہو چکے تھے، لہذا آپ نے اس کا ایک حصہ

راغب ’مفردات‘ میں کہتا ہے: ”جان کہیں ’فرض‘ ’علی‘ کے ساتھ ہو وہاں ’وجوب‘ کے معنی دیتا ہے اور جہاں لام کے ساتھ ہو، وہاں عدم ممنوعیت کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر ذیر بحث آیت میں ’فرض‘ وجوب کے معنی میں نہیں بلکہ اجازت کے معنی میں ہے۔ تحلۃ (باب تفعیل کا مصدر ہے) حلال کرنے کے معنی میں ہے یا دوسرے لفظوں میں ایسا کام جو قسم کی گہرہ کو کھول دے یعنی کفارہ۔

جیسا کہ تفسیر نمونہ جلد ۳ سورہ مائدہ کی آیت ۸۹ کی تفسیر سے معلوم ہوتا ہے۔ قسم کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا دس افراد کو لباس پہنانا یا ایک غلام کو آزاد کرنا ہے۔ چنانچہ اس میں سے کوئی کام نہ کر سکتا ہو وہ تین روزے رکھے۔

بی بی حفصہ سے بیان کیا اور اس بنا پر کہ وہ زیادہ شرمندہ نہ ہو دوسرا حصہ بیان نہ کیا۔ (ممکن ہے پہلا حصہ اصل شہد کا پتلا ہو، اور دوسرا حصہ اسے اپنے اوپر حرام کرنا ہو۔)

بہر حال جب پیغمبر نے بی بی حفصہ کو اس افشائے راز کی خبر دی تو اس نے کہا: ”آپ کو اس بات سے کس نے آگاہ کیا؟“ (فلما نبأها به قالت من انبأك هذا)۔

آپ نے فرمایا: ”علیم ونبیر خدا نے مجھے اس بات سے آگاہ کیا ہے“ (قال نبأني العليم النبیر)۔ اس تمام آیت سے مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر کی بیویوں میں سے بعض نہ صرف انہیں اپنی باتوں سے ذک پہنچاتی تھیں، بلکہ رازداری کا مسئلہ جو ایک با دفا بیوی کی اہم ترین خوبیوں میں سے ہے، وہ بھی ان میں نہیں تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود، ان کے ساتھ پیغمبر کا سلوک ایسا فزا دلانہ تھا کہ آنحضرتؐ اس تمام راز کو جو اس نے فاش کیا تھا اس کے سزا پر کھنکھنے کے لیے تیار نہ ہوئے اور صرف اس کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا۔ اسی لیے ایک حدیث میں امیر المومنین علیؑ سے آیا ہے:

ما استقصى كرسيم قط، لان الله يقول عرف بعضه واعرض عن بعض۔

”شریف اور بڑے آدمی اپنے احقاق حق کے لیے آخری مرحلے تک آگے نہیں جاتے کیونکہ خدا اس تمام پر پیغمبر کے متعلق کہتا ہے، انھوں نے ایک حصے کی خبر دی اور ایک حصہ بیان نہ کیا۔“

‡ ‡ ‡

اس کے بعد ان دو بیویوں کی طرف، جو اوپر والی سازش میں شریک تھیں، روئے سخن کرتے ہوئے لکھا ہے: ”اگر تم اپنے فعل سے توبہ کر لو اور پیغمبر کو دکھ دینے اور آزار پہنچانے سے دستبردار ہو جاؤ تو یہ بات تمہارے فائدہ میں ہے، کیونکہ تمہارے دل اس عمل کی بنا پر حق سے منحرف اور گناہ سے آلودہ ہو چکے ہیں“ (ان توبوا الى الله فقد صفت قلوبكم)۔

ان دو بیویوں سے مراد بالاتفاق مفسرین شیعہ و اہل سنت بی بی حفصہ اور بی بی عائشہ ہیں جو بالترتیب عربین خطاب اور ابوبکر بن قحاذہ کی بیٹیاں تھیں۔

”صفت“ (صنو، کے مادہ سے) غصہ کے وزن پر، کسی چیز کی طرف متماثل ہونے کے معنی میں ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں: صفت النجوم یعنی ستارے مغرب کی طرف متماثل ہوئے۔ اور اسی لیے ’اصفاء‘ کسی دوسرے کی بات کان دھر کے سننے کے معنی میں آیا ہے۔

زیر بحث آیت میں ’صفت قلوبکم‘ سے مراد ان کے دلوں کا حق سے گناہ کی طرف انحراف تھا۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اگر تم دو وزن نے اس (پیغمبر) کے برخلاف اتفاق کر لیا تو بھی تم کچھ نہ کر سکو گی کیونکہ خدا اس کا مولا و یاورد و گار ہے، اسی طرح جبریل، صالح، موسیٰ اور ان کے علاوہ تمام فرشتے اس کے پشتیبان ہیں۔ (وان تظاہرا علیہ فان اللہ ہو مولاہ و جبریل و صالح المؤمنین و الملائکۃ بعد ذلک ظہیر) یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس ماجرے نے پیغمبر کے پاک دل اور عظیم روح میں کس حد تک منفی اثر چھوڑا تھا، یہاں تک کہ خود خدا کو ان کا دفاع کرنا پڑا۔ نیز باوجود اس کے کہ اس کی قدرت ہر لحاظ سے کافی ہے جبریل، صالح، المؤمنین اور دوسرے فرشتوں کی حمایت کا بھی اعلان کر رہا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ صحیح بخاری میں ابن عباس سے نقل ہوا ہے کہ انھوں نے فرمایا: میں نے عمر بن خطاب سے پوچھا: پیغمبر کی وہ دو بیویاں کون تھیں جنھوں نے آنحضرت کے خلاف اتفاق کر لیا تھا؟ انہوں نے جواب دیا وہ حفصہ اور عائشہ تھیں۔ اس کے بعد مزید کہا: خدا کی قسم! ہم جاہلیت کے زمانے میں عورتوں کے لیے کسی چیز کے قائل نہیں تھے۔ یہاں تک کہ خدا نے ان کے بارے میں آیات نازل کر دیں اور ان کے لیے کچھ حقوق مقرر کر دیئے (اور وہ جو رہ گئیں)۔

تفسیر 'در المنثور' میں بھی ابن عباس سے ایک مفصل حدیث میں ہے کہ عمر بن خطاب کھتے ہیں: "اس ماجرے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ پیغمبر نے سب بیویوں سے کنارہ کشی کر لی ہے اور مشرکہ اہم ابراہیم نامی مقام پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: "یا رسول اللہ! کیا آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے؟" آپ نے فرمایا: "نہیں! میں نے عرض کیا: اللہ اکبر! ہم جمعیت قریش حیشہ اپنی بیویوں پر مسلط رہتے تھے، لیکن جب سے ہم مدینہ میں آئے ہیں تو ہم نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ ان کی عورتیں ان پر مسلط ہیں اور بھاری عورتوں نے بھی ان سے یہ چیز سیکھ لی ہے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ میری بیوی مجھ سے جھگڑ رہی ہے تو میں نے اس عمل کو عجیب اور بُرا سمجھا۔ اس نے کہا کہ تجھے تعجب کیوں ہو رہا ہے؟ خدا کی قسم! پیغمبر کی بیویاں بھی ان کے ساتھ ایسا ہی کرتی ہیں۔ یہاں تک بعض اوقات ان سے زیادتی کرتی ہیں۔ تب میں نے اپنی بیٹی حفصہ کو فحیبت کی کہ وہ ایسا نہ کرے اور میں نے اس سے کہا کہ اگر تیری ہمسائی (مراد بی بی عائشہ ہے) ایسا کرے، تو بھی تو ایسا

(بقیہ سابقہ صفحہ) اور تقدیر میں اس طرح تھی: ان تقویا الی اللہ کانت خیر لکما (یا اسی معنی کے مشابہ کوئی اور دوسری تقدیر) لیکن بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ شاید آیت میں کوئی محذوف نہ ہو اور صفت قلوبیکما کا جملہ شرط کی جزاء ہو (اس قید کے ساتھ کہ جملہ کا منہم حق کی طرف تامل ہوئے کہ باطل کی طرف) لیکن یہ احتمال بہت ہی بعید ہے کیونکہ شرط تو فعل مضارع کی صورت میں ہے اور اکثر نحوویوں کے نظریہ کے مطابق یہ صحیح نہیں ہے۔

قلوبیکما کا ذکر جمع کے صیغہ کے ساتھ ذکر تشبیہ کے صیغہ کے ساتھ اس بناء پر ہوا ہے کہ دو متنیوں کا ایک ساتھ ہونا فصاحت کے لحاظ سے نامناسب اور ناپسندیدہ ہے۔ اس لیے جمع کی صورت میں ذکر ہوا اور اس کا معنی تشبیہ ہے۔

صحیح بخاری جلد ۶ ص ۱۹۵ (سورہ تحریم کے ذیل میں)

ذکرنا، کیونکہ اس کے حالات تجھ سے مختلف ہیں۔ لے
 ”صالح المؤمنین“ کے بارے میں بھی ایک بحث ہے جو اشارہ اللہ نکات کے بیان میں آئے گی۔

آخری زیر بحث آیت میں خدا تمام ازواج پیغمبر کی طرف زوئے سخن کرتے ہوئے تہدید آمیز لب و لہجہ میں فرماتا ہے: ”اگر وہ تمہیں طلاق دے دے تو اُمید ہے کہ پروردگار تمہاری جگہ اس کے لیے تم سے ابھی بیویاں قرار دے۔ ایسی بیویاں جو مسلمان، مومن، متواضع، توبہ کرنے والیاں، عبادت گزار، خدا کی اطاعت شعار، غیر باکرہ اور باکرہ عورتیں ہوں گی۔“ (عسلیٰ ربیہ ان طلقکن ان یبدلہن ازواجاً خیراً منکن مسلمات مؤمنات قانتات ثابتات عابدات ساجدات شیبات وابکارات)۔

اس طرح انہیں خبردار کرتا ہے کہ تم یہ خیال نہ کرنا کہ پیغمبر تمہیں ہرگز طلاق نہیں دے گا، اور یہ بھی تصور نہ کرنا کہ اگر وہ تمہیں طلاق دے دے تو تمہاری جگہ آنے والی بیویاں تم سے بہتر نہیں ہوں گی، لہذا تم سازش بھگڈے اور آزار و اذیت سے باز آ جاؤ ورنہ پیغمبر کی زوجیت کے اعزاز و افتخار سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاؤ گی اور تم سے بہتر اور بافضیلت عورتیں تمہاری جگہ لے لیں گی۔

نکات

۱: اچھی بیوی کے اوصاف

یہاں قرآن نے ایک اچھی بیوی کے لیے چھ صفات بیان کی ہیں تاکہ وہ سب مسلمانوں کے لیے بیوی کا انتخاب کرتے وقت نمونہ بن سکیں۔

پہلی صفت ”اسلام“ ہے اور اس کے بعد ”ایمان“ ہے۔ یعنی ایسا اعتقاد جو انسان کے دل کی گہرائیوں میں نفوذ کر جائے۔ اس کے بعد ”قوت“ یعنی تواضع، انکساری اور شوہر کی اطاعت ہے۔ اس کے بعد ”توبہ“ یعنی اگر اس سے کوئی غلط کام سرزد ہو جائے تو وہ حذر خواہی کرے اور اپنی غلطی پر اصرار نہ کرے۔ اس کے بعد خدا کی عبادت اور ایسی عبادت جو اس کی روح و جان کو سنوار دے، اور اسے پاک و پاکیزہ بنا دے۔ اس کے بعد فرمان خدا کی اطاعت اور ہر قسم کے گناہ سے پرہیز کا ذکر ہوا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بہت سے مفسرین نے ”ساعات“ جمع ’ساع‘ کی تفسیر صائم (روزہ دار) کے معنی میں کی ہے۔ لیکن جیسا کہ راعب نے مفردات میں کہا، روزہ دو قسم کا ہوتا ہے حقیقی روزہ جو کھانے پینے

اور تلبت جنسی کو ترک کرنے کے معنی میں ہے۔ دوسرا سخی روزہ جس کا معنی بدن کے اعضاء و جوارح کو گناہوں سے بچانا ہے یہاں اس کا دوسرا معنی مراد ہے۔

در اغب کا یہ قول مقام کی مناسبت کی طرف توجہ کرتے ہوئے بہت ہی عمدہ معلوم ہوتا ہے لیکن جاننا چاہیے کہ مفسرین نے صالح کی تفسیر اس شخص کے لیے بھی کی ہے جو خدا کی اطاعت کی راہ میں سیر کرتا ہے، لے

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن نے عورت کے باکرہ اور غیر باکرہ ہونے پر تکیہ نہیں کیا اور اس کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔ کیونکہ مذکورہ معنوی اوصاف کے مقابلہ میں اس مسئلہ کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہے،

❖ ❖ ❖

۲: صالح المؤمنین سے کون مراد ہے؟

اس میں شک نہیں کہ صالح المؤمنین ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو تمام صالح با تقویٰ اور کامل الایمان مومنین کو شامل ہے۔ اگرچہ صالح یہاں مفرد ہے جمع نہیں ہے، لیکن چونکہ جنس کا معنی رکھتا ہے۔ اس لیے اس سے عمومیت کے معنی کا استفادہ ہوتا ہے۔ لے

لیکن اس بارے میں کہ یہاں اس کا اتم و اکمل مصداق کون ہے؟ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد امیر المؤمنین علی ہیں۔

ایک حدیث میں امام محمد باقر سے آیا ہے:

لقد عرف رسول الله (ص) علياً (ع) اصحابه مرتين : اما مرة فحيث قال : "من كنت مولاه فعلي مولاه" واما الثانية فحيث نزلت هذه الآية : "فان الله هو مولاه وجبريل و صالح المؤمنين". اخذ رسول الله (ص) بيد علي (ع) فقال : ايها الناس هذا صالح المؤمنين !

لے "صالح" سياحت کے مادہ سے اصل میں ان چنانچہ سياحت کو کہتے ہیں جو بغیر قوش و زاد راہ کے چل پڑتے اور لوگوں کی مدد سے زندگی بسر کرتے تھے۔ چونکہ روزہ دار اپنے آپ کو کھانے سے روکتا ہے یہاں تک کہ افطار کا وقت آ جائے، اس لحاظ سے یہ بات سياحت کرنے والوں کے لیے لہذا اس لفظ کا اطلاق صائم یعنی روزہ دار پر ہوا ہے۔

لے بعض نے صالح کو یہاں جمع سمجھا ہے اور کہا ہے کہ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ صالحوا کی واو اضافت کے وقت حذف ہوتی ہے، لہذا قرآن کے رسم الخط میں بھی نہیں آئی لیکن یہ معنی بعید نظر آتا ہے۔

”حضرت رسول نے امام علیؑ کا اپنے اصحاب سے دو مرتبہ (صراحت کے ساتھ) تعارف کرایا۔ ایک مرتبہ تو اس وقت جبکہ آپ نے (غدیر خم میں) فرمایا : من كنت مولاه فعلي مولاه : ”جس جس کا میں مولا ہوں اُس اُس کا علیؑ مولا ہے، دوسری مرتبہ اس وقت جبکہ آیت ان الله هو مولاه نازل ہوئی، تب حضرت رسول نے امام علیؑ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: اے لوگو! یہ صالح المؤمنین ہے۔ اسے اس معنی کو بہت سے علماء اہل سنت نے بھی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ ان میں علامہ ثعلبی علامہ گنجی، ابو حیان اندلسی اور سبط ابن جوزی وغیرہ شامل ہیں۔ لے

بہت سے مفسرین اور مجملہ ان کے ’سیوطی‘ نے ’در المنثور‘ میں، ’قرطبی‘ نے اپنی مشہور تفسیر میں اور اسی طرح ’الوسی‘ نے ’روح المعانی‘ میں اسی آیت کی تفسیر میں اس روایت کو نقل کیا ہے۔ ’روح البیان‘ کا مولف اس روایت کو ’مجاہد‘ سے نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے : ”اس حدیث کی تائید مشہور حدیث ’منزلت‘ سے ہوتی ہے کہ جس میں پیغمبر نے امام علیؑ سے فرمایا : انت مني بمنزلة هارون من موسى؛ کیونکہ قرآن میں صالحین کا عنوان انبیاء کے لیے آیا ہے۔ مجملہ ان کے سورہ انبیاء کی آیت ۷۲ میں وکلاً جعلنا صالحین اور سورہ يوسف کی آیت ۱۰۱ میں الحقین بالصالحین ہے۔ پہلی آیت میں ’صالح‘ کا عنوان انبیاء کی ایک جماعت کے لیے اور دوسری میں حضرت یوسف کے لیے آیا ہے۔ اور جب علیؑ بمنزلہ ہارون ہوں تو آپ بھی صالح کا مصداق ہوں گے۔ (مخبر کیجیے)

خلاصہ یہ کہ اس سلسلے میں بہت زیادہ احادیث ہیں، جیسے مقبرہ معروف محدث ’بحرانی‘ تفسیر ’برہان‘ میں اس سلسلہ کی ایک روایت ذکر کرنے کے بعد محمد بن عباس سے نقل کرتا ہے کہ اس نے اس بارے میں ۵۲ احادیث شیعہ اور اہل سنت کے طرق سے جمع کی ہیں۔ اس کے بعد وہ خود ان میں سے چند ایک احادیث نقل کرتا ہے۔

۳: پیغمبر کی اپنی بعض بیویوں سے ناراضی

طویل تاریخ میں ایسے بہت سے بزرگ گزرے ہیں جن کی بیویاں ان کے شایان شان نہیں تھیں اور ان میں ضروری اوصاف نہ ہونے کی وجہ سے انھیں تکلیف اٹھانا پڑتی تھی۔ ان میں سے کچھ نمونے بزرگ انبیاء کے بارے میں قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں :-

تفسیر مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۲۱۶

مزید وضاحت کے لیے ”احقان الحق“ جلد ۲ ص ۳۱۱ کی طرف رجوع کریں۔

ایسا معلوم ہوا ہے کہ یہ محمد بن عباس دہی ابو عبد اللہ ہے جو ابن الجہم کے نام سے مشہور ہے اور کتاب منازل من القرآن من اہل بیت کا مولف ہے۔ اس کتاب کے متعلق علماء کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ اس کی مثل کوئی کتاب ابھی تک تالیف نہیں ہوئی۔ (جامع الرواة جلد ۲ ص ۱۳۴) لے تفسیر برہان جلد ۲ ص ۲۵۳ حدیث ۲ کے ذیل میں۔

اوپر والی آیات اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ پیغمبر اسلام کی حالت بھی اپنی بعض بیویوں کی طرف سے ایسی ہی تھی۔ ان رفتاروں کی وجہ سے جو وہ ایک دوسری سے رکھتی تھیں، بعض اوقات وہ آنحضرت کی روح پاک کو مجروح کرتی تھیں، کبھی وہ آپ پر اعتراض کرتی تھیں یا آپ کے راز کو فاش کر دیا کرتی تھیں، یہاں تک کہ خدا نے انہیں سرزنش کی اور اپنے پیغمبر کا دفاع کرتے ہوئے اس سلسلے میں تاکید فرما دیا اور انہیں طلاق تک کی ہتدیدہ بھی کی۔ جیسا کہ ہم نے معلوم کر لیا ہے کہ اوپر والی آیات میں مذکور واقعہ کے بعد آپ تقریباً ایک ماہ تک اپنی بیویوں سے ناراض رہے کہ شاید وہ اپنی اصلاح کر لیں۔

اصولی طور پر آنحضرت کی تاریخ زندگی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ پیغمبر کی بعض بیویاں نہ صرف نماز، نبوت کی ضروری اور لازمی معرفت نہیں رکھتی تھیں، بلکہ بعض اوقات آپ پر ایک عام آدمی کی طرح اعتراض کیا کرتی تھیں، یہاں تک کہ خدا نخواستہ آپ کی توہین بھی کرتی تھیں۔ اس بناء پر اوپر والی آیات کی صراحت کو دیکھتے ہوئے بھی یہ اصرار کرنا کہ سب کی سب شائستہ اور کامل تھیں، بے دلیل نظر آتا ہے۔

تاریخ اسلام نے پیغمبر کے بعد ان کی بیویوں کے بارے میں، خصوصاً داستان جنگ جمل نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ یہ بات نہ صرف آنحضرت کے زمانے میں تھی بلکہ آپ کے بعد آپ کے جانشینوں کے بارے میں بھی ذمہ داری گئی ہے۔ لیکن یہاں ان تمام مسائل کی تفصیل بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

اصولی طور پر اوپر والی آیات کی تعبیر جو یہ کہتی ہے: ”اگر پیغمبر تمہیں طلاق دے دے تو خدا تم سے تم سے بہتر بیویاں دے گا جو آیات میں مذکور چھ صفات کی حامل ہوں گی، اس واقعیت و حقیقت کو بیان کر رہی ہے کہ تم از کم آنحضرت کی بعض بیویاں ان اوصاف کی حامل نہیں تھیں۔

پیغمبر کی بیویوں کے بارے میں سورہ احزاب کی آیات کی طرف رجوع کرنے سے بھی اوپر والے نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔

۴ : افشائے راز

رازداری نہ صرف حقیقی مومنین کی صفات میں سے ہے بلکہ ہر بار ہر باخشیست انسان کو راز دار ہونا چاہیے، پھر یہ بات قریبی دوستوں اور زوجہ و شوہر میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اوپر والی آیات میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ پیغمبر کی بعض بیویوں کو رازداری ترک کرنے کی بناء پر خدا نے کیسی شدت کے ساتھ ملامت اور سرزنش کی ہے۔

امام علیؑ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

”جمع خیر الدنیا والأخرۃ فی کتمان السر ومصادقۃ الاخیار، وجمع الشر فی الازاعقہ ومواخاۃ الاشرار۔“

”دنیا اور آخرت کی تمام خیر و خوبی ان دو چیزوں میں چھپی ہوئی ہے : راز کو پوشیدہ رکھنا اور نیک افراد سے دوستی۔ اور تمام شران دو چیزوں میں چھپا ہوا ہے : رازوں کا افشاء کرنا اور اشرار سے دوستی رکھنا۔“

‡ ‡ ‡

۵ : حلال خدا کو اپنے اوپر حرام نہیں کرنا چاہیے

وہ امور جو خدا کی طرف سے حلال یا حلال کر دیئے گئے ہیں وہ سب دقیق مصدقوں کی بناء پر ہوتے ہیں۔ اسی بناء پر اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ انسان کسی حلال چیز کو اپنے اوپر حرام یا کسی حرام چیز کو اپنے اوپر حلال کرے، یہاں تک کہ اگر اس سلسلے میں قسم بھی کھالے، جیسا کہ اوپر والی آیات میں آیا ہے تو اس قسم کو توڑ سکتا ہے۔

ہاں ! اگر کوئی ایسا مباح فعل جس کے ترک کی قسم کھائی ہے، کوئی مکروہ فعل ہو یا کسی جہت سے اس کا ترک کرنا اولیٰ اور بہتر ہو تو اس صورت میں اُسے قسم کی پابندی کرنا چاہیے۔

- ⑥ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۝
- ⑤ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ إِنَّمَا تُجْرُونَ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝
- ⑧ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَصُوحًا عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا آتِنَا نُورَنَا وَاعْفِرْ لَنَا إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

ترجمہ

- ⑥ اے ایمان لانے والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ وہ آگ جس پر ایسے فرشتے مقرر ہیں جو بہت ہی سخت گیر اور تیز و متنبہ ہیں۔ وہ کبھی بھی خدا کی مخالفت نہیں کرتے اور اس کے احکام و فرامین کی پوری پوری تعمیل کرتے ہیں۔

۷۔ اے کافرو! آج عذرخواہی نہ کرو، کیونکہ تمہیں تو صرف تمہارے اعمال کا ہی بدلہ دیا جائے گا۔
 ۸۔ اے ایمان لانے والو! توبہ کرو۔ اللہ کے حضور خالص توبہ۔ امید ہے کہ تمہارا پروردگار اس کی وجہ سے تمہارے گناہ بخش دے گا، اور تمہیں جنت کے ان باغات میں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں داخل کرے گا۔ خدا اس دن پیغمبر کو اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو ذلیل و خوار نہیں کرے گا۔ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب چل رہا ہوگا اور وہ کہہ رہے ہوں گے: پروردگار! ہمارے نور کو کامل کر دے اور ہمیں بخش دے بیشک تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر

اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

خدا پیغمبر کی بعض بیویوں کو خبردار کرنے اور انہیں سرزنش کرنے کے بعد زیر بحث آیات میں رُوئے سخن تمام مومنین کی طرف کرتے ہوئے بیوی، اولاد اور گھر والوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں کچھ احکام دیتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے: ”اے ایمان لانے والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ کہ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں“ (یا ایہا الذین امنوا اتوا انفسکم و اہلیکم ناسراً و قد وہا الناس و الحجارة)۔ خود کو بچانا تو گناہوں کو ترک کرنے اور سرکش خواہشات کے سامنے تسلیم خم نہ کرنے کے ساتھ ہے، اور گھر والوں کو بچانا تعلیم و تربیت اور امر بالمعروف و نہی از منکر کرنا نیز گھر اور گھرانے کی فضا میں ایک پاک اور ہر قسم کی آلودگی سے مبرا ماحول فراہم کرنا ہے۔ یہ وہ طریقہ کار ہے جو گھرانے کے سنگ بنیاد، یعنی ازدواج کے مقدمات سے اور اس کے بعد بچے کی پیدائش کے پہلے لمحہ سے شروع ہونا چاہیے۔ ان تمام مراحل میں صحیح لائحہ عمل ترتیب دے کر پورے اٹھاک سے اس پر عمل کرنا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں بیوی اور اولاد کا حق صرف ان کی ضروریات زندگی، مکان اور کھانے پینے کی چیزوں کے فراہم کرنے سے پورا نہیں ہو جاتا۔ ان سے زیادہ اہم ان کی روح اور جان کی غذا کا ہتیا کرنا اور صحیح اصول تعلیم و تربیت کو

عمل میں لانا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ”قوا“ (بچاؤ) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر تم انہیں خود ان کی اپنی حالت پر چھوڑ دو گے تو وہ خواہ سزاوار جہنم کی آگ کی طرف بڑھیں گے، صرف تمہیں ان کو جہنم کی آگ میں گرنے سے بچا سکتے ہو۔

”وقود“ (بروزن کبود) جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں، ”استشگیر یعنی ایسے مادہ کے معنی میں ہے جو آگ پکڑنے کے قابل ہو۔ مثلاً ایندھن، (آگ لگانے والے مثلاً دیاسٹائی کے معنی میں نہیں ہے) کیونکہ عربی اُسے ’زاد‘ (جہاق) کہتے ہیں۔

اس لحاظ سے جہنم کی آگ دنیاوی آگ کی مانند نہیں ہے۔ اس کے شعلے خود انسان کے وجود کے اندر سے ہی بلند ہوتے ہیں۔ (اور پتھروں کے اندر سے بھی) نہ صرف گندھک کے پتھر سے جس کی طرف بعض مفسرین نے اشارہ کیا ہے بلکہ ہر قسم کے پتھر سے، کیونکہ آیت کا لفظ مطلق ہے۔ موجودہ زمانے میں ہم جانتے ہیں کہ پتھر کا ہر ٹکڑا ایٹم کے اربوں کھربوں ذرات سے مرکب ہے اور اگر ان کے اندر موجود ذخیرہ آزاد ہو جائے تو ایسی آگ پیدا کر دے کہ انسان دنگ رہ جائے۔

بعض مفسرین نے یہاں ’مجادہ‘ کی تفسیر بتوں کے ساتھ کی ہے جو پتھر سے بنائے جاتے تھے اور مشرکین نے انہیں پوجا کرتے تھے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”اس آگ پر ایسے فرشتے مقرر کیے گئے ہیں جو بہت ہی سخت اور تند و تیز ہیں۔ وہ ہرگز خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے۔ وہ انہیں جو بھی حکم دیتا ہے، اس کی بے چون و چرا تعمیل کرتے ہیں۔“ (علیہا ملائکۃ غلاظ شداد لا یصون اللہ ما امرہم ویفعلون ما یؤمرون)۔

اس طرح نہ تو بھانگنے کی ہی کوئی راہ ہے اور نہ ہی گریہ و زاری، التماس و التجا اور جہز و فزع ہی موثر ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ ہر مامور جس بھی کام پر مقرر ہوتا ہے وہ اس لحاظ سے مناسب جذبات رکھتا ہے۔ لہذا عذاب پر مامور افراد کو طبعی طور پر سخت اور تند و تیز ہونا چاہیے۔ کیونکہ جہنم رحمت کا مرکز نہیں ہے بلکہ خدا کے غیظ و غضب کا مرکز ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ مامورین ہرگز عدالت کی سرحد سے خارج نہیں ہوں گے اور حکم خدا کو بے کم و کاست جاری کریں گے۔

یہاں مفسرین کی ایک جماعت نے ایک سوال پیش کیا ہے کہ اوپر والی آیت میں عدم عصیاں کی تعبیر قیامت میں عدم وجود تکلیف کے مسئلہ کے ساتھ کس طرح سازگار ہے؟

لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ فرشتوں کی اطاعت اور ترک عصیاں ایک قسم کی تکوینی اطاعت ہے نہ کہ تشریحی اور اطاعت تکوینی ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اس طرح بنائے گئے ہیں کہ خدا تعالیٰ فرما میں کا انتہائی میل و رغبت اور خاص لگاؤ کے ساتھ عین اقتدار کے ساتھ اجراء کرتے ہیں۔

بعد والی آیت میں کفار کو مخاطب کر کے اس دن کی وضع و کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اے کافرو آج عذر و معذرت نہ کرو، کیونکہ تمہیں تو صرف تمہارے اعمال ہی کی جزا دی جائے گی۔" (یا ایہا الذین کفرو لا تقعدروا الیوم انما تجزون ما کنتم تعملون)۔

اس آیت کا گزشتہ آیت کے بعد قرار پانا کہ جس میں مخاطب مومنین تھے، اس واقعیت کی طرف اشارہ ہے کہ اگر تم اپنی بیوی اولاد اور گھر والوں کی حالت کا خیال نہ رکھو گے تو ممکن ہے تمہارا معاملہ اس حد تک پہنچ جائے کہ قیامت کے دن اس خطاب سے مخاطب کیے جاؤ۔

انما تجزون ما کنتم تعملون کی تعبیر دوبارہ اس حقیقت کی تائید کرتی ہے کہ قیامت میں گنہگاروں کی جزا خود انہیں کے اعمال ہیں جو ان کے سامنے ظاہر ہوں گے اور ان کے ساتھ ہوں گے۔ گزشتہ آیت کی تعبیر کہ جہنم کی آگ خود انسانوں کے اندر سے شعلہ زن ہوگی وہ اسی معنی کی تائید کرتی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ وہاں عذر و معذرت کا قبول نہ ہونا اس بنا پر ہے کہ عذر خواہی ایک قسم کی توبہ ہے اور توبہ صرف اس جہان میں ہی امکان پذیر ہے، نہ کہ دوسرے جہان میں اور نہ ہی جہنم میں ورنہ کے بعد توبہ کی کوئی گنجائش ہے۔

بعد والی آیت حقیقت میں جہنم کی آگ سے نجات کا راستہ بتاتی ہے، اذنہا ہوتا ہے: "اے ایمان لانے والو! اللہ کی طرف لوٹ آؤ اور توبہ کر لو، خالص توبہ" (یا ایہا الذین آمنوا توبوا الی اللہ توبۃ نصوحًا)۔

ہاں! نجات کے لیے پہلا قدم گناہ سے توبہ ہے، ایسی توبہ جو ہر لحاظ سے خالص ہو، ایسی توبہ جس کا محرک حکم خدا اور خوفِ گناہ ہو، نہ کہ گناہ کے اجتماعی اور دنیاوی آثار سے وحشت! ایسی توبہ جو انسان کو ہمیشہ کے لیے مصیبت اور نافرمانی سے دور کر دے اور پھر اس میں گناہ کی طرف بازگشت رو مانا نہ ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ توبہ کی حقیقت، وہی گناہ سے ندامت و پشیمانی ہے۔ اس کا لازمہ یہ ہے کہ وہ آئندہ کے لئے گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لے۔ اگر وہ کوئی ایسا کام تھا جس کی تلافی ہو سکتی ہے تو اس کی تلافی کی کوشش کرے۔ استغفار کرنا بھی اسی معنی کو ظاہر کرتا ہے۔ اور اس طرح سے توبہ کے ارکان کا پانچ باتوں میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے:

- ۱ : ترکِ گناہ
- ۲ : ندامت
- ۳ : آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ
- ۴ : گزشتہ گناہوں کی تلافی
- ۵ : استغفار

'نصح' (بروزن صلح) کے مادہ سے اصل میں خالص خیر خواہی کے معنی میں ہے۔ اسی لیے خالص شہد کو 'ناصح' کہا جاتا ہے۔ چونکہ حقیقی و واقعی خیر خواہی کو مضبوطی کے ساتھ توأم ہونا چاہیے، لہذا 'نصح' کا لفظ بعض اوقات اس معنی کے لیے بھی آتا ہے۔

اسی بنا پر محکم عمارت کو 'نصاح' (بروزن کتاب) اور درزی کو 'ناصح' کہا جاتا ہے۔ اس طرح یہ دونوں معنی یعنی خالص ہونا اور محکم ہونا تو بہ 'نصح' میں جمع ہونے چاہئیں۔

اس بارے میں کہ تو بہ 'نصح' کیا ہوتی ہے، مفسرین نے بہت زیادہ تفاسیر بیان کیں ہیں۔ یہاں تک کہ بعض نے ان تفاسیر کی تعداد ۲۳ بتائی ہے۔ لیکن وہ سب تفاسیر ایک ہی حقیقت کی طرف لوٹتی ہیں یا وہ تو بہ کی مختلف قسمیں اور مختلف اوصاف و صفات ہیں۔

منجملہ ان کے یہ ہے کہ 'تو بہ نصح' وہ ہوتی ہے جس میں چار اوصاف و شرائط ہوں۔

۱ : قلبی پشیمانی

۲ : زبانی استغفار

۳ : ترک گناہ

۴ : آئندہ کے لیے ترک گناہ کا پختہ ارادہ

بعض نے کہا ہے کہ تو بہ 'نصح' وہ ہوتی ہے جس میں تین اوصاف و شرائط ہوں :

۱ : اس بات کا خوف کہ شاید قبول نہ ہو

۲ : اس بات کی امید کہ قبول ہو جائے گی۔

۳ : خدا کی اطاعت پر قائم رہنا۔

یا تو بہ 'نصح' یہ ہے کہ اپنے گناہ کو ہمیشہ اپنی نظر کے سامنے رکھے اور اس سے شرمندہ ہوتا رہے۔

یا تو بہ 'نصح' یہ ہے کہ جو چیزیں ظلم کے ساتھ لی ہیں وہ ان کے مالکوں کو واپس کر دے، مظلوموں سے حلالت

طلب کرے اور خدا کی اطاعت کا پابند رہے۔

یا تو بہ 'نصح' وہ ہوتی ہے جس میں یہ تین شرطیں ہوں :

۱ : کم بولنا۔ ۲ : کم کھانا۔ ۳ : کم سونا۔

یا تو بہ 'نصح' وہ ہوتی ہے جو رونے والی آنکھ اور گناہ سے بیزار دل سے توأم ہو.... اور دیگر اسی قسم کے

بعض کا خیال یہ ہے کہ 'نصح' ایک خاص شخص کا نام ہے اور اس سلسلہ میں انہوں نے ایک مفصل داستان تو بہ 'نصح' کے عنوان سے نقل کی ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھنی چاہیے کہ 'نصح' کسی کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ذمی معنی ہے، اگرچہ ممکن ہے کہ یہ مشورہ واقعہ صیح ہو۔

تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۷۶

اور جو سب ایک ہی واقعیت کے شاخ و برگ ہیں اور یہ خالص و کامل توبہ ہے۔
ایک حدیث میں پیغمبر گرامی سے آیا ہے کہ جب 'معاذ بن جبل' نے توبہ نصوح کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا:

”ان يتوب التائب شعرا يرجع في ذنب كما لا يعود اللبث الى الضرع“
”توبہ نصوح“ یہ ہے کہ توبہ کرنے والا شخص پھر کسی طرح بھی گناہ کی طرف نہ لوٹے، جیسا کہ دودھ کبھی پستان کی طرف نہیں لوٹتا۔

یہ لطیف تعبیر اس واقعیت کو بیان کرتی ہے کہ توبہ نصوح انسان میں اس طرح سے انقلاب برپا کر دیتی ہے کہ اس پر پہلی حالت کی طرف بازگشت کی راہ کلی طور پر بند کر دیتی ہے، جیسا کہ دودھ کی پستان کی طرف بازگشت قطعی طور پر ناممکن ہوتی ہے۔

یہ مطلب جو دوسری روایات میں بھی آیا ہے، حقیقت میں توبہ نصوح کے اعلیٰ ترین درجہ کو بیان کرتا ہے، ورنہ نچلے مراحل میں توبہ ممکن ہے کہ گناہ کی طرف بازگشت ہو جائے اور توبہ کی تکرار کے بعد انجام کار دائمی ترک پر جا منتہی ہو۔

اس کے بعد توبہ نصوح کے آثار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: ”امید ہے کہ اس کام کی وجہ سے تمہارا پروردگار تمہارے گناہوں کو بخش دے اور ان کی پردہ پوشی کرے۔“ (عسیٰ ربکھ ان یکفر عنکم سیئاتکم)۔

”اور تمہیں اس جنت کے باغات میں داخل کرے جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔“ (و یدخلکم جنات تجري من تحتها الانهار)۔

”یہ کام اس دن ہو گا جس دن خدا پیغمبر اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لاتے ہیں ذلیل و خوار نہیں کرے گا۔“ (یوم لا ینزی اللہ النبی والذین امنوا معہ)۔
”یہ اس حال میں ہو گا کہ ان کا (ایمان اور عمل صالح کا) نور ان کے آگے آگے اور ان کی دائیں جانب چل رہا ہو گا، وہ عرصہ محشر کو روشن کر دے گا اور بہشت کی طرف ان کی راہ کھول دے گا۔“ (نورہم ویسعی بین یدہم ویبایمناہم)۔

یہ وہ منزل ہے کہ جہاں وہ خدا کی بارگاہ کی طرف رُخ کر کے کہیں گے: ”پروردگار! ہمارے نور کو مکمل کر دے اور ہمیں بخش دے کیونکہ تو ہر کام پر قدرت رکھتا ہے۔“ (یقولون ربنا اتمم لنا نورنا واخفر لنا انک علیٰ کل شیء قدير)۔

حقیقت میں اس توبہ نصوح کے پانچ عظیم ثمر ہیں :

پہلا : سیئات اور گناہوں کی بخشش۔

دوسرا : خدا کی نعمتوں والی جنت میں داخلہ۔

تیسرا : اس دن رسوائی اور ذلت کا نہ ہونا جس دن سب پر دے ہٹ جائیں گے اور جھوٹے تباہ و رسوا اور

ذلیل ہو جائیں گے۔ ہاں! اس دن پیغمبر اور مومنین آبرو مند ہوں گے۔ کیونکہ جو کچھ انھوں نے کہا تھا،

وہ حقیقت بن جائے گا۔

چوتھا : ان کے ایمان اور عمل کا نور ان کے آگے آگے اور ان کی دائیں جانب چلے گا اور جنت کی

طرف ان کی راہ کو روشن کر دے گا۔ بعض مفسرین نے اس نور کو جو ان کے آگے آگے چلے گا "عمل"

کا نور سمجھا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم ایک دوسری تفسیر بھی تفسیر نمونہ کی جلد ۱۲ میں سورہ حدید کی آیت ۱۲

کے ذیل میں پیش کر چکے ہیں۔

پانچواں : ان کی توجہ خدا کی طرف زیادہ ہو جائے گی۔ لہذا وہ بارگاہ خدا کی طرف رخ کر کے اس سے

نور کی تکمیل اور اپنے گناہوں کی مکمل بخشش کا تقاضا کریں گے۔

چند نکات

۱: اہل خانہ کی تعلیم و تربیت

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا محکم ایک عام حکم ہے جو تمام مسلمان ایک دوسرے کے لیے رکھتے ہیں لیکن اوپر والی آیات اور ان روایات جو اسلامی مصادر میں اولاد وغیرہ کے حقوق کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، اچھے طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان اپنی بیوی اور اولاد کے لیے بہت ہی بھاری ذمہ داری رکھتا ہے۔ اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ جہاں تک اس سے ہو سکے ان کی تعلیم و تربیت میں کوشش کرے، انھیں گناہ سے باز رکھے اور نیکیوں کی طرف دعوت دے، نہ یہ کہ صرف ان کے جسم کے لیے غذا وغیرہ مہیا کرنے پر قناعت کرے۔

حقیقت میں ایک عظیم معاشرہ چھوٹی چھوٹی اکائیوں سے مل کر بنتا ہے، جس کا نام خاندان (گھرانہ) ہے

جب ان چھوٹی چھوٹی اکائیوں کی اصلاح ہو جائے، جن کی دیکھ بھال آسان ہے، تو پھر سارے معاشرے کی

اصلاح ہو جاتی ہے اور یہ ذمہ داری پہلے درجہ میں ماں باپ کے کندھوں پر ہے۔

خصوصاً ہمارے زمانہ میں جب کہ فساد کی تباہ کرنے والی موجیں گہروں کے باہر بہت ہی قوی اور خطرناک

ہیں، انھیں بے اثر کرنے کے لیے گھرانے کی تعلیم و تربیت کا زیادہ بنیادی اور زیادہ دقیق لائحہ عمل مرتب کیا جانا چاہیے۔

صرف قیامت کی آگ بلکہ دنیا کی آگ کا سرچشمہ بھی انسانوں کے وجود کے اندر سے پیدا ہوتا ہے۔ پس ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے گھرانے کو اس آگ سے محفوظ رکھے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو اصحابِ پیغمبرؐ میں سے ایک نے آپ سے سوال کیا: ”ہم اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے کس طرح محفوظ رکھیں؟“ آنحضرتؐ نے فرمایا:

”تأمرهم بما أمر الله، وتنہاهم عما نہی الله ان اطاعوك كنت قد وقیتهم، وان عصواك كنت قد قضیت ما علیك“

”انھیں امر بالمعروف اور نہی ازمنکر کر، اگر تجھ سے انہوں نے قبول کر لیا تو پھر تو نے انھیں جہنم کی آگ سے بچا لیا، اگر انھوں نے قبول نہ کیا تو تو نے اپنا وظیفہ ادا ذمہ داری پوری کر دی۔“

ایک اور جامع اور عمدہ حدیث میں رسولِ خداؐ سے آیا ہے:

”الا کلکم راع، وکلکم مسئول عن رعیتہ، فالامیر علی الناس راع، وهو مسئول عن رعیتہ، والرجل راع علی اهل بیتہ وهو مسئول عنهم فالمرئۃ راعیۃ علی اهل بیتہ لعلها اولدہ وہی مسئلۃ عنهم، الافکلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔“

”یاد رکھو کہ تم سب کے سب نگہبان ہو، اور تم سب ہی جوابدہ ہو ان لوگوں کے لیے جن کی نگہبانی پر تم مامور ہو۔ حکومت اسلامی کا رئیس و امیر تمام لوگوں کا نگہبان ہے۔ لہذا وہ ان سب کے لیے جوابدہ ہے اور عورت بھی اپنے شوہر کے گھرانے اور اولاد کی نگہبان ہے اور ان کے بارے میں جوابدہ ہے۔ جان لو کہ تم سب ہی نگہبان ہو، اور تم سب ہی جوابدہ ہو، ان لوگوں کے لیے جن کی نگہبانی پر تم مامور ہو۔“

ہم اس وسیع بحث کو امیر المؤمنین علیؑ کی ایک حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں، امامؑ نے اوپر والی آیت

کی تفسیر میں فرمایا :

”علموا انفسکم واهلیکم الخیر وادبوهم“
اس سے مراد یہ ہے کہ تم خود کو اور اپنے گھر والوں کو نیکی کی تعلیم دو، اور انہیں آداب سکھاؤ۔ لے

❖ ❖ ❖

۲ : توبہ رحمتِ خدا کا ایک دروازہ ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان سے، خصوصاً تربیت اور سیر و سلوک الی اللہ کی ابتداء میں بہت سی لغزشیں ہو جاتی ہیں۔ اب اگر اس کے سامنے توبہ اور بازگشت کے دروازے بند کر دیئے جائیں تو وہ مایوس ہو جائے گا اور ہمیشہ کے لیے سیدھے راستے سے بھٹک جائے گا۔ اس لیے اسلام کے مکتبِ تربیتی میں توبہ کو ایک تربیتی اصل کے عنوان کے طور پر حد سے زیادہ اہمیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور وہ تمام گنہگاروں کو دعوت دیتا ہے کہ اپنی اصلاح اور گزشتہ کوتاہیوں کی تلافی کے لیے اس دروازے سے وارد ہوں۔

امام علی بن الحسین بارگاہِ خداوندی میں تائبین کی مناجات میں اس طرح سے عرض کرتے ہیں :

”اللہی انت الذی فتحت لعیبادک بابا الی عفوک سمیتہ التوبۃ، نقلت توبوا الی اللہ توبۃ

نصوحاً، فسا عذر من اغفل دخول الیاب بعد فتحہ“

”اے میرے اللہ تو ہی توبہ ہے کہ جس نے اپنی عفو و بخشش کی طرف اپنے بندوں کے سامنے ایک دروازہ کھولا ہے کہ جس کا نام توبہ رکھا ہے۔ تو نے فرمایا ہے کہ خدا کی طرف لوٹو، اور توبہ کر لو، خالص توبہ، اب ان لوگوں کا عذر کیا ہے جو اس دروازہ کے کھلنے کے بعد اس دروازے سے داخل ہونے سے غافل ہو جائیں؟ لے

ایک حدیث میں امام باقرؑ سے آیا ہے :

”ان اللہ قال اشد فرجاً بتوبۃ عبده من رجل اضل سرحلتہ و مراده فی

لیلة ظلماء، فوجدہا“

”خداوند تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے اس سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جتنا کہ وہ شخص خوش

ہوتا ہے جس نے ایک رات میں اپنی سواری اور زادِ راہ گنم کر دیا ہو، اور پھر اسے پا لیا ہو۔

عظمت اور بزرگواری رکھنے والی یہ سب تعبیری زندگی کے اس اہم امر کی حیاتی تشبیہ کے لیے ہیں۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھنا چاہیے کہ توبہ صرف تعلقہ لسانی اور زبان سے استغفر اللہ کہنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کی کچھ شرائط اور ارکان ہیں کہ جن کی طرف اوپر والی آیات میں توبہ نصوح کی تفسیر میں اشارہ ہوا ہے۔ جب توبہ ان شرائط کے ساتھ انجام پاتی ہے تو وہ اس طرح اثر کرتی ہے کہ وہ انسان کی روح اور جان سے گناہ اور آثارِ گناہ کو کلی طور پر محو کر دیتی ہے، اسی لیے ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے آیا ہے :

”التائب من الذنب کمن لا ذنب له، والمقیم علی الذنب وهو مستغفر

منہ کالمستہزم“

”جو شخص گناہ سے توبہ کر لے وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے بالکل کوئی گناہ نہیں کیا، جو شخص اپنے گناہ پر برقرار رہے اور استغفار بھی کرتا رہے، تو وہ اس شخص کی مانند ہے جو مذاق اڑاتا اور تمسخر کرتا ہو۔“

ہم توبہ کے بارے میں دوسرے تفصیلی مباحث (دوسری جلد میں) سورۃ نساء کی آیت ۱۷ کے ذیل میں اور

(جلد ۱۱ میں) سورۃ زمر کی آیت ۵۳ کے ذیل میں پیش کر چکے ہیں۔

- ۹) يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ
وَمَا لَهُمْ جَهَنَّمَ وِبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝
- ۱۰) ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَأَاتَ نُوحٍ وَ
امْرَأَاتَ لُوطٍ ۖ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا
صَالِحِينَ فَخَانَتَهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ شَيْئًا
وَقِيلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّٰخِلِينَ ۝
- ۱۱) وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَاتَ فِرْعَوْنَ
إِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِي عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِي
مِن فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهِ وَنَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝
- ۱۲) وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَتُ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا
فِيهِ مِنْ رُوحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتِبَ لَهَا
كَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ ۝

ترجمہ

۹) اے پیغمبر! کفار اور منافقین کے ساتھ جہاد کرو اور ان پر سختی کرو۔ ان کا ٹھکانہ
جہنم ہے۔

۹

ہے۔ اور وہ بُری جگہ ہے۔

خدا نے ان لوگوں کے لیے جو کافر ہو گئے ہیں، ایک مثال دی ہے۔ نوح کی بیوی کی مثال اور لوط کی بیوی کی مثال۔ وہ ہمارے دو صالح بندوں کے ماتحت تھیں۔ لیکن ان دونوں سے انھوں نے خیانت کی، اور ان دونوں (پیغمبروں) کے ساتھ ان کا تعلق (عذاب الہی کے مقابلہ میں) انھیں کوئی نفع نہ دے سکا اور ان سے کہا گیا کہ تم بھی آگ میں داخل ہونے والے دوسرے لوگوں کے ساتھ، آگ میں داخل ہو جاؤ۔

اور خدا نے مومنین کے لیے بھی ایک مثال بیان کی ہے۔ وہ فرعون کی بیوی کی مثال ہے، جبکہ اس نے کہا پروردگار! میرے لیے اپنے ہاں جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے نجات دے اور مجھے ظالم قوم سے رہائی بخش دے۔ اور اسی طرح سے مریم بنت عمران کی مثال بیان کی ہے جس نے اپنے دامن کو پاک رکھا اور ہم نے اپنی رُوح میں سے اس میں پھونکا، اس نے پروردگار کے کلمات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ خدا کے حکم کی اطاعت کرنے والوں میں سے تھی۔

مؤمن اور کافر عورتوں کے نمونے

چونکہ منافقین پیغمبر کے گھر کے اندر کے رازوں کے فاش ہونے اور آپ کی بیویوں کے درمیان جھگڑے اور اختلافات کے ظاہر ہونے پر جن کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا تھا، خوش تھے بلکہ انھیں اور ہوا دیتے تھے، شاید اسی مناسبت سے پہلی زیر بحث آیت میں ان کے بارے میں شدت عمل کا حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے: "لے پیغمبر! کفار اور منافقین کے ساتھ جہاد کرو اور ان پر سختی کرو، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔" دیا ایسا النبی جاہد الکفار و المنافقین و اغلظ علیہم و ما واهم جہنم و بیئس المصیر۔

یہ جہاد کفار کے مقابلہ میں تو ممکن ہے کہ مسلح یا غیر مسلح ہو، لیکن منافقین کے مقابلہ میں شک نہیں کہ یہ مسلح جہاد نہیں ہے۔ کیونکہ کسی بھی تاریخ میں یہ نقل نہیں ہوا کہ پیغمبر نے منافقین کے ساتھ مسلح جنگ کی ہو۔ لہذا ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

”ان رسول اللہ لعدیقاتل منافقا قط انما کان یتألفھم“
 ”رسول خدا نے ہرگز کسی منافق سے جنگ نہیں کی، بلکہ آپ ہمیشہ ان کی تالیف قلوب کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔“

اس بناء پر ان کے ساتھ جہاد کرنے سے مراد وہی توبیح، سرزنش، انذار، ڈرانا اور انھیں رسوا کرنا ہے یا بعض موارد میں ان کی تالیف قلوب کرنا ہے، کیونکہ جہاد ایک وسیع و عریض معنی رکھتا ہے۔ اور ہر قسم کی جہاد اور سعی و کوشش کو شامل ہے ”و اغلظ علیھم“ (ان پر سختی اور خشونت کرو) کی تیسری بھی گفتگو میں سختی اور اذیت کا مراد ہے، دھمکی اور اس قسم کی چیزوں میں سختی کی طرف اشارہ ہے۔

منافقین کے ساتھ یہ مخصوص وضع و کیفیت اس بناء پر تھی کہ وہ ظاہراً اسلام کا دم بھرتے اور مسلمانوں کے ساتھ مکمل طور پر آمیزش رکھتے تھے، لہذا یہ ممکن نہیں تھا کہ ان کے ساتھ ایک کافر جیسا سلوک کیا جائے۔ البتہ یہ اس صورت میں تھا کہ وہ ہتھیاروں کی طرف ہاتھ نہ اٹھاتیں۔ اگر وہ یہ کام کرتے تو یقیناً ان کے ساتھ مقابلہ بالمثل ہوتا، کیونکہ اس صورت میں وہ ”محارب“ کا عنوان اپنے لیے لے لیتے۔ اگرچہ یہ مسئلہ پیغمبر کے زمانہ میں واقع نہیں ہوا، لیکن آنحضرتؐ کے بعد خصوصاً امیر المومنینؑ کے زمانہ میں رونما ہوا اور آپ مسلح جنگ کے پئے کھڑے ہوئے۔

بعض نے کہا ہے کہ اوپر والی آیت میں ”منافقین سے جہاد“ کرنے سے مراد ان کے بارے میں حدود شرعی کا اجراء ہے، کیونکہ وہ لوگ جن پر حد جاری ہوئی اکثر منافقین تھے۔ لیکن اس تفسیر اور اس دعوے کے لیے کہ اس زمانہ میں زیادہ تر حدود شرعی ان ہی لوگوں پر جاری ہوئی ہیں، ہمارے پاس کوئی دلیل موجود نہیں ہے قابل توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیت بعینہم اور بغیر کسی کمی و زیادتی کے سورہ توبہ آیت ۷۳ میں بھی آئی ہے

❖ ❖ ❖

اس کے بعد دوبارہ پیغمبر کی بیویوں کے ماجرے کی طرف لوٹتا ہے۔ اس بناء پر کہ انھیں عملی اور زندہ سبق دے، دو بے تقوٰی عورتوں کی سرنوشت جو دو بزرگ پیغمبروں کے گھر میں تھیں، اور دو مومن و ایسا گھر خواتین کی سرنوشت بیان کرتا ہے جن میں سے ایک تاریخ کے جاہر ترین شخص کے گھر میں تھی۔

پہلے فرماتا ہے: ”خدا نے کافروں کے لیے ایک مثال بیان کی ہے۔ نوحؑ کی بیوی کی مثال لوطؑ کی بیوی کی مثال۔“ (ضرب اللہ مثلاً للذین کفروا امرأت نوح و امرأت لوط)۔ لے

لے ضرب کے یہاں دو مفعول ہیں۔ ”امراة نوح“ مفعول اول ہے جو مؤخر ہو گیا ہے اور مثلاً دوسرا مفعول ہے (باقی اگلے صفحہ)

وہ دونوں ہمارے دو صالح بندوں کے ماتحت تھیں لیکن انہوں نے اُن سے خیانت کی۔ (کائنات تحت عیندین من عبادنا صالحین فخانتا ہما)۔

لیکن ان دو عظیم پیغمبروں سے ان کے ارتباط نے عذابِ الہی کے مقابلہ میں انہیں کوئی نفع نہیں دیا اور اُن سے کہا گیا کہ تم بھی آگ میں داخل ہونے والے لوگوں کے ساتھ آگ میں داخل ہو جاؤ۔ (فلع ینفسیا عنہما من اللہ شیئاً وقیل ادخلا النار مع الداخلین)۔

اس طرح سے پیغمبرِ اسلام کی ان دو بیویوں کو جنہوں نے افشاءِ راز کیا اور آنحضرتؐ کو تکلیف و آزار پہنچایا تھا ضرور کرنا ہے کہ وہ یہ گمان نہ کر بیٹھیں کہ صرف پیغمبر کی بیوی ہونا انہیں عذاب سے بچالے گا۔ جس طرح نوح اور لوط کی بیویوں کا رابطہ خیانت کی وجہ سے خاندانِ نبوت و وحی سے منقطع ہو گیا اور وہ دونوں عذابِ الہی میں گرفتار ہو گئیں۔

معنی طور پر یہ تمام طبقات کے مومنین کو ایک تنبیہ ہے کہ وہ گناہ و عصیان کی صورت میں اولیاء اللہ کے ساتھ اپنے رشتوں اور تعلقات کو عذابِ الہی سے مانع نہ سمجھ بیٹھیں۔

مفسرین کے بعض کلمات میں آیا ہے کہ حضرت نوح کی بیوی کا نام ”والہۃ“ اور حضرت لوط کی بیوی کا نام ”والہۃ“ تھا۔ لے اور بعض نے اس کے برعکس لکھا ہے۔ یعنی نوح کی بیوی کا نام ”والہۃ“ اور لوط کی بیوی کا نام ”واہلۃ“ کہا ہے۔ لے

بہر حال ان دونوں عورتوں نے ان دونوں عظیم پیغمبروں کے ساتھ خیانت کی، البتہ ان کی خیانت جاہدِ عفت سے انحراف ہرگز نہیں تھا، کیونکہ کسی پیغمبر کی بیوی ہرگز بے عفتی سے آلودہ نہیں ہوتی جیسا کہ پیغمبرِ اسلام سے ایک حدیث میں صراحت کے ساتھ آیا ہے :

” ما بنت امراة النبی قط۔“

”کسی بھی پیغمبر کی بیوی ہرگز منافیِ عفت عمل سے آلودہ نہیں ہوئی۔“ لے
حضرت لوط کی بیوی کی خیانت یہ تھی کہ وہ اس پیغمبر کے دشمنوں کے ساتھ تعاون کرتی تھی اور آنحضرتؐ کے راز کے راز انہیں بتاتی تھی، اور حضرت نوح کی بیوی بھی ایسی ہی تھی۔

رُاعب، مفردات میں کہتا ہے کہ : ”خیانت“ اور نفاق حقیقت میں ایک ہی چیز ہیں، سوائے اُس

سے (یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ ضرب کا ایک ہی مفعول ہو اور وہ مثلاً ہے اور امراة نوح اس کا بدل ہے۔ (بیان فی غریبہ لغز العرب المکرر) جلد ۲ ص ۱۳۶)

سری جلد ۱۰ ص ۶۶۸۰

المنانی جلد ۲۸ ص ۱۳۲ (بعض نے نوح کی بیوی کا نام ”واعذیا“ والہ بھی بیان کیا ہے)

المنانی جلد ۶ ص ۲۲۵

کے کہ 'خیانت'، 'عقد و امانت' کے مقابلہ میں جوتی ہے، اور نفاق مسائل دینی میں۔

اس داستان کی بیہوشی کے گھر کے افشائے راز کی داستان کے ساتھ مناسبت بھی اسی بات کا تقاضا کرتی

ہے کہ خیانت سے مراد یہی ہے۔

بہر حال اوپر والی آیت ان افراد کی جھوٹی امیدوں کو جو یہ گمان کرتے ہیں کہ بیہوشی جیسے عظیم شخص سے تعلق ہے اور رشتہ داری ہی ان کی نجات کا سبب بن جائے گی (چاہے عمل کتنا ہی بُرا کیوں نہ ہو) منقطع کر دیتی ہے، تاکہ کوئی بھی شخص اس لحاظ سے اپنے لیے نجات کا قائل نہ ہو۔ اس لیے آیت کے آخر میں لکھا ہے: "ان سے کہا جائے گا تم بھی تمام دوزخیوں کے ساتھ جہنم میں داخل ہو جاؤ۔" یعنی تمہارے اور دوسروں کے درمیان اس لحاظ سے کوئی امتیاز نہیں ہے۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد بالایمان افراد کے لیے دو مثالیں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: "خدا نے مومنین کے لیے ایک مثال بیان کی ہے: یہ فرعون کی بیوی کی مثال ہے، جس وقت اس نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا: میرے پروردگار! میرے لیے اپنے نزدیک جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے کاموں سے نجات دے اور مجھے اس ظالم قوم سے نجات عطا فرما؛ (وَضْرِبِ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَتِ فِرْعَوْنَ إِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِي عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِي مِنَ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهِ وَنَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ)۔"

مشہور یہ ہے کہ فرعون کی بیوی کا نام آسیہ اور اس کے باپ کا نام فرام تھا۔ کہتے ہیں کہ جب اُس نے جادوگروں کے مقابلہ میں موسیٰ کے معجزہ کو دیکھا تو اس کے دل کی گہرائیاں نورِ ایمان سے روشن ہو گئیں، وہ اسی وقت موسیٰ پر ایمان لے آئی۔ وہ ہمیشہ اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھتی تھی۔ لیکن ایمان اور خدا کا عشق ایسی چیز نہیں ہے جسے ہمیشہ چھپایا جاسکے۔ جب فرعون کو اس کے ایمان کی خبر ہوئی تو اس نے اُسے بارہا سمجھایا اور منہ کیا اور ہراہرار کیا کہ موسیٰ کے دین سے دستبردار ہو جائے اور اس کے خدا کو چھوڑ دے، لیکن یہ با استقامت خاتون فرعون کی خواہش کے سامنے ہرگز نہ جھکی۔

آخر کار فرعون نے حکم دیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں میخوں کے ساتھ باندھ کر اسے سورج کی چلتی ہوئی دھوپ میں ڈال دیا جائے اور ایک بہت بڑا پتھر اس کے سینہ پر رکھ دیں۔ جب وہ خاتون اپنی زندگی کے آخری لمحے گزار رہی تھی تو اس کی دعا یہ تھی:

"پروردگار! میرے لیے جنت میں اپنے جوارِ رحمت میں ایک گھر بنا دے۔ مجھے فرعون اور اس

کے اعمال سے رہائی بخش اور مجھے اس ظالم قوم سے نجات دے۔"

خدا نے بھی اس پاکباز اور فداکار مومنہ خاتون کی دعا قبول کی اور اسے مریم جیسی دنیا کی بہترین خاتون کے

قرار دیا جیسا کہ وہ ان آیات میں مریم کے ہم ردیف قرار پائی ہے۔

ایک روایت میں رسول خدا سے آیا ہے :

”افضل نساء اهل الجنة خديجة بنت خويلد وفاطمة

بنت محمد (ص) ومريم بنت عمران و اسينة بنت مزاحم

امراة فرعون !

” اہل جنت میں افضل ترین اور برترین عورتیں چار ہیں۔ خویلد کی بیٹی خدیجہ،

محمد کی بیٹی فاطمہ اور عمران کی بیٹی مریم اور مزاحم کی بیٹی ’آسینہ‘ جو فرعون کی

بیوی تھی۔“

قابل توجہ بات یہ ہے کہ فرعون کی بیوی اپنی اس بات سے فرعون کے عظیم قصر کی تحقیر کر رہی ہے، اور اسے خدا کے جوار رحمت میں گھر، کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ اس گفتگو کے ذریعہ ان لوگوں کو جو اسے یہ نصیحت کرتے تھے کہ ان تمام نمایاں وسائل و امکانات کو جو ملکہ مصر ہونے کی وجہ سے تیرے قبضہ و اختیار میں ہیں موسیٰ جیسے چرواہے پر ایمان لا کر ہاتھ سے نہ دے۔ جواب دیتی ہے :

”وَجِبْنِي مِنَ فرعون وعمله“ کے جملہ کے ساتھ خود فرعون سے اور اس کے مظالم اور جرائم سے بیزاری کا اعلان کرتی ہے۔

اور ”جِبْنِي مِنَ القوم الظالمين“ کے جملہ سے اس آلودہ ماحول سے اپنی علیحدگی، اور ان کے جرائم سے اپنی بچانگی کا اظہار کرتی ہے۔

زندگی کے آخری لمحات میں اس با معرفت اور ایثارگر عورت کے یہ تینوں جملے کس قدر چچے تلے اور حساب شدہ ہیں، ایسے جملے جو پوری دنیا کی سب عورتوں اور مردوں کے لیے نفع بخش اور باعث ہدایت ہو سکتے ہیں۔ ایسے جملے، جو ان تمام افراد کے ہاتھوں سے، جو ماحول یا زوج کے دباؤ کو خدا کی اطاعت اور تقویٰ کو ترک کرنے کا ایک جواز شمار کرتے ہیں فضول بہانوں کو چھین لیتے ہیں۔

مسلمہ طور پر فرعون کے دربار سے بڑھ کر زرق برق اور جلال و جبروت موجود نہیں تھا۔ اسی طرح فرعون جیسے جاہل و ظالم کے تنگنحوں سے بڑھ کر فشار اور شکنجے موجود نہیں تھے۔ لیکن نہ تو وہ زرق برق اور نہ ہی وہ فشار اور شکنجے اس مومنہ عورت کے گھٹنے جھکا سکے۔ اس نے رضائے خدا میں اپنا سفر اسی طرح سے جاری رکھا۔ یہاں تک کہ اپنی عزیز جان اپنے حقیقی محبوب کی راہ میں فدا کر دی۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ وہ یہ استدعا کرتی ہے کہ اے خدا جنت میں اور اپنے جوار میں اس کے لیے

ایک گھر بنا لے جس کا جنت میں ہونا تو جنبہ جہانی ہے اور خدا کے جوار رحمت میں ہونا جنبہ روحانی ہے۔ اس نے ان دونوں کو ایک مختصر سی عبادت میں جمع کر دیا ہے۔

اس کے بعد دوسری با شخصیت خاتون کی طرف جو صاحب ایمان لوگوں کے لیے نمونہ شمار ہوتی ہے، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اور خدا نے مریم بنت عمران کی مثال بھی بیان کی ہے جس نے اپنے دامن کو پاک رکھا۔“ (ومریم ابنت عمران التي احصنت فرجها)۔

”اور ہم نے اپنی روح میں سے اس میں بھونکا۔“ (ففحننا فيه من روحنا)۔ اور اس نے خدا کے حکم سے شوہر کے بغیر بچہ بنا جو پروردگار کا اولوالعزم پیغمبر بنا۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”اس نے پروردگار کے کلمات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور ان سب پر ایمان لائی۔“ (وصدقت بكلمات ربها وكتبه)۔

”اور وہ خدا کے حکم کی اطاعت کرنے والوں میں سے تھی۔“ (وكانت من القانتين)۔ وہ ایمان کے لحاظ سے اعلیٰ مرتبہ پر تھی۔ تمام آسمانی کتابوں اور اوامر الہی پر ایمان رکھتی تھی اور عمل کے لحاظ سے ہمیشہ احکام الہی کی مطیع تھی۔ وہ خدا کی ایک ایسی کمیز تھی جو اپنی جان و دل ہتھیلی پر لیے ہوئے آنکھ اس کے حکم پر اور کان اس کے فرمان پر لگائے رکھتی تھی۔

”کلمات“ اور ”کتب“ میں فرق ممکن ہے اس لحاظ سے ہو کہ کتب کی تعبیر سے تو ان تمام آسمانی کتابوں کی طرف اشارہ ہو جو پیغمبروں پر نازل ہوئی ہیں اور کلمات کی تعبیر سے مراد وہ الہام ہوں جو کتاب آسمانی کی صورت میں نہیں آتے تھے۔

مریخو ان کلمات اور کتابوں پر ایسا ایمان رکھتی تھی کہ قرآن نے سورہ مائدہ کی آیت ۷۵ میں اُسے صدیقہ (بہت زیادہ تصدیق کرنے والی) کے عنوان سے یاد کیا ہے۔ قرآن کی مختلف آیات میں اس با ایمان خاتون کی شخصیت اور اس کے مقام والا کے سلسلہ میں بہت زیادہ مطالب نظر آتے ہیں۔ ان کا ایک اہم حصہ تو اس سورہ میں ہے جو اسی کے نام سے موسوم ہے۔ (ایک گروہ نے صدیقہ کی توصیف زیادہ سچ بولنے والی کے ساتھ کی ہے۔)

بہر حال قرآن ان تعبیروں کے ساتھ مریم کے دامن کو ان ناروا باتوں سے، جو آلودہ اور جنائتکار یہودیوں کی ایک جماعت اس کے بارے میں کہتی تھی اور وہ لوگ اس کی شخصیت اور اس کی پاک دامنی کے خلاف جو کبھی

اس بارے میں کفریج کی تعبیر سے کیا مراد ہے؟ ہم نے ایک تفصیلی بیان، تفسیر نمونہ کی جلد ۷ میں ص ۲۹۲ پر (سورہ انبیاء کی آیت ۹۱ کے ذیل میں پیش کیا ہے۔

باتیں بناتے تھے، ان سے اس کو پاک و پاکیزہ شمار کرتا ہے اور بدگوئی کرنے والوں کے مُتہ پر ایک سخت طمانچہ رسید کرتا ہے۔

”ذَنفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُوْحِنَا“ (ہم نے اپنی روح میں سے اس میں پھونکا،) کی تفسیر سے، جیسا کہ ہم اس سے پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں۔ ایک باعظمت اور بلند روح مُراد ہے، یا دوسرے لفظوں میں خدا کی طرتِ روح کی اضافت ایک ”اضافہ تشریفیہ“ ہے کہ جو کسی چیز کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے آتی ہے۔ مثلاً بیت اللہ کی تعبیر میں گھر کی اضافت خدا کی طرت سے ہے، ورنہ خدا کی نہ روح ہے نہ گھر اور نہ بیت۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے خدا کے ہاں با شخصیت اور والا مقام عورتوں کے بارے میں ایک حدیث نقل کی ہے جس میں بی بی عائشہ کو ان سب سے برتر و افضل ترین شمار کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ اس حدیث کو سورہ تحریم کی تفسیر میں ذکر نہ کرتے، کیونکہ سورہ تحریم تو اس گھڑی ہوئی حدیث کے برخلاف پکار پکار کر پیغام دے رہی ہے، جیسا کہ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ اہل سنت کے بہت سے مفسرین و مؤرخین نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ وہ دو عورتیں جن کی اس سورہ کی آیات شدت کے ساتھ مذمت کر رہی ہیں اور جو خدا اور اس کے رسولؐ کے غیظ و غضب کا سبب بنی ہیں، وہ حفصہ و عائشہ تھیں، اور یہی بیان صراحت کے ساتھ صحیح بخاری میں بھی آیا ہے۔ لے

ہم ان تمام لوگوں سے جو آزادانہ اور غیر جانبدارانہ طور پر غور و خوض اور سوچ بچار کرتے ہیں، یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ پھر سے اس سورہ کی آیات کا مطالعہ کریں اور اس کے بعد اس قسم کی حدیثوں کی قدر و قیمت کو واضح اور روشن کریں۔

❖ ❖ ❖

خداوندنا! ہمیں بے ثبوت اور تعصب آمیز حب و بغض سے محفوظ رکھ اور ایسا کر کہ ہم قرآن مجید کی آیات کے مقابلہ میں اپنے سارے وجود کے ساتھ تسلیم خم کر دیں اور خاضع رہیں۔
پروردگاہ! وہ دن نہ آئے کہ تیرا عظیم پیغمبر ہمارے اعمال سے ناخوش اور ہماری زندگی کی روش سے ناراض ہو۔
بار الہا! ہمیں ایسی استقامت عطا فرما کہ سارے جہان میں زمانے کے فرعونوں کے دباؤ اور شکنجے ہماری روح اور ایمان پر معمولی سے معمولی اثر بھی نہ کریں۔ آمین یا رب العالمین۔

اختتام سورہ تحریم
۶، ۱۲۰۶ھ

اختتام ترجمہ ۸ رذی الحجہ ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۳ اگست ۱۹۸۷ء
تقریباً پونے آٹھ بجے صبح ۸۱-۸۲ ماڈل ماڈن: لاہور

سُورَةُ مَلِكٍ

یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۳۰ آیتیں ہیں

تاریخ آغاز
برشوال ۱۲۰۶ھ

سورہ ملک کے مضامین

یہ سورہ جو قرآن مجید کے پارہ ۲۹ کی ابتداء ہے ان سورتوں میں ہے جو مشہور قول کے مطابق سارے کے سارے مکہ میں نازل ہوئے، جیسا کہ اس پارہ کی زیادہ تر سورتیں مکی ہی ہیں۔ بلکہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق تو اس پارے کی تمام کی تمام سورتیں مکی ہیں۔ اے گزشتہ پارہ کی سورتوں کے برعکس کہ جو مدنی تھیں لیکن جیسا کہ ہم بیان کریں گے کہ سورہ دہر (یا سورہ انسان) اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہے اور وہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔

سورہ ملک جس کا دوسرا نام 'مُنَجِّیہ' (نجات بخشنے والی) اور تیسرا نام 'واقیہ' یا 'نارہ' ہے (کیونکہ وہ اپنے تلاوت کرنے والے کو عذاب الہی یا عذاب قبر سے محفوظ رکھتی ہے) قرآن کی بہت ہی بافضیلت سورتوں میں سے ہے۔ اس میں بہت سے مسائل پیش ہوتے ہیں جو زیادہ تر تین محوروں کے گرد گردش کرتے ہیں:

۱: مبدأ، خدا کی صفات، خلقت کا شگفتہ انگیز نظام، خصوصاً آسمانوں اور ستاروں کی خلقت، زمین کی خلقت اور اس کی نعمتیں اور اسی طرح پرندوں کی خلقت، جاری ہونے والے پانی، نیز کان، آنکھ اور آلاتِ شناخت کی خلقت کے بارے میں بحث ہے۔

۲: معاد و قیامت، دوزخ کا عذاب اور دوزخیوں کے ساتھ عذاب کے فرشتوں کی گفتگو اور اسی قسم کے امور سے متعلق مباحث۔

۳: کافروں اور ظالموں کو دنیا و آخرت کے انواع و اقسام کے عذابوں سے انذار و تہدید، بعض کے قول کے مطابق تمام سورہ کا محور اصلی وہی خدا کی مالکیت و حاکمیت ہے جو پہلی آیت میں آئی ہے۔

تلاوت کی فضیلت

اس سورہ کی فضیلت میں پیغمبر اور ائمہ اہل بیت سے بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں :
منجملہ ان کے ایک حدیث میں پیغمبر اکرم سے آیا ہے :
”من قرأ سورة تبارك فكأنما أحيا ليلة القدر“
”جو شخص سورہ تبارک کو پڑھے تو ایسا ہے جیسا کہ اُس نے شب قدر بیدار رہ کر عبادت میں بسر کی ہو۔“
ایک اور حدیث میں آنحضرت سے آیا ہے :

”وَدِدْتُ أَنْ تَبَارَكَ الْمَلِكُ فِي قَلْبِ كُلِّ مُؤْمِنٍ“
”میں دوست رکھتا ہوں کہ سورہ تبارک تمام مومنین کے دل میں ثبت ہو جائے۔“
ایک حدیث میں امام محمد بن علی الباقر سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا :
”سورة الملك هي السافرة تمنع من عذاب القبر وهي مكتوبة في التوراة سورة الملك ومن قرأها في ليلة فقد أكثر، واطاب، ولم يكتب من الغافلين...“

”سورہ ملک سورہ مانہ ہے، یعنی عذاب قبر سے بچاتی ہے اور تورات میں اسی نام کے ساتھ لکھی ہوئی ہے جو شخص اس کو رات کے وقت پڑھے تو اس نے بہت کچھ پڑھا اور خوب پڑھا۔ وہ غافلین میں شمار نہیں ہوگا۔“

اس سلسلہ میں احادیث بہت زیادہ ہیں۔

البتہ یہ سب عظیم آثار فکر و عمل کے بغیر پڑھنے سے مربوط نہیں ہیں بلکہ ان کا مقصد ایسا پڑھنا ہے جس میں عمل کے لیے ہدایت ہو۔

- بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
- ۱ تَبْرَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ
- ۲ الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيْكُمْ اَحْسَنَ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُوْرُ
- ۳ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ط فَاَرْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ
- ۴ ثُمَّ اَرْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيْرٌ
- ۵ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمٰءَ الدُّنْيَا بِمَصٰبِيْحٍ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيْطٰنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ

ترجمہ

خدا تے رحمن ورحیم کے نام سے۔

- ۱ برکتوں والی اور زوال ناپذیر ہے وہ ذات جس کے قبضہ قدرت میں سارے عالم

ہستی کی حکومت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

- ② وہی ذات ہے جس نے موت و حیات کو پیدا کیا، تاکہ وہ آزمائے کائنات میں سے بہترین عمل کون کرتا ہے، اور وہ شکست ناپذیر اور بختنے والا ہے۔
- ③ وہی جس نے سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر پیدا کیا۔ تم خدائے رحمن کی مخلوق میں کوئی تضاد اور کسی قسم کا عیب نہیں دیکھو گے۔ پھر نظر دوڑا کر دیکھو۔ کیا تمہیں کوئی شکاف یا خلل نظر آتا ہے؟
- ④ پھر دوبارہ (عالم ہستی کی طرف) نظر اٹھا کر دیکھو، انجام کار تیری نظر (خلل و نقص کی صورت میں) ناکام ہو کر، تیری طرف پلٹ آئے گی اور وہ تھکی ہوئی ہوگی۔
- ⑤ ہم نے سچلے آسمان کو روشن چراغوں سے زینت دی ہے اور انہیں شیاطین کے لئے (شہب) تیر قرار دیا ہے، اور ہم نے ان کے لیے دوزخ کا عذاب فراہم کیا ہے۔

تفسیر

تم عالم ہستی میں کسی قسم کا نقص نہیں دیکھو گے۔

یہ سورہ خدا کی مالکیت و حاکمیت اور اس کی ذات پاک کے دوام اور ہمیشگی جیسے اہم مسئلہ سے شروع ہوتا ہے جو حقیقت میں اس سورہ کے تمام مباحث کی کلید ہے۔

فرماتا ہے: ”برکتوں والی اور زوال ناپذیر ہے وہ ذات، جس کے قبضہ قدرت میں عالم ہستی کی حکومت ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“ (تبارک الذی بیدہ الملك وهو علی کل شیء قدير)۔

”تبارک“، ”برکت“ کے مادہ سے اصل میں ”برک“ (بروزن برگ) ہے جو اونٹ کے سینہ کے معنی میں ہے۔ جب ”برک البعیر“ کہا جاتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اونٹ نے اپنا سینہ زمین پر رکھ دیا، اس کے بعد یہ لفظ دوام، بقا، اور زوال ناپذیر کے معنی میں اور ہر اس نعمت کے معنی میں جو پائیداری و دوام رکھتی ہو، بولا

جانے لگا۔ پانی کے خزانے کو بھی اس لیے 'برک' کہتے ہیں کیونکہ پانی ایک طویل مدت تک اس میں باقی اور محفوظ رہتا ہے۔

ادھر والی آیت میں حقیقت میں خدا کی ذات پاک کے مبارک ہونے کی دلیل بیان کی گئی ہے، اور عالم پر اس کی مالکیت و حاکمیت اور ہر چیز پر اس کی قدرت ہے، اسی بنا پر وہ زوال ناپذیر اور برکت سے پُر و جود ہے۔

♣ ♣ ♣
 بعد والی آیت میں انسان کی موت و حیات کی خلقت، جو خدا کی مالکیت و حاکمیت کے شون میں سے ہے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہی تو ہے کہ جس نے موت و حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمانے کہ تم میں سے بہترین عمل کون کرتا ہے" (الذی خلق الموت والحیاء لیبلوکم ایکم احسن عملاً)۔

"موت" اگر فنا اور نیستی کے معنی میں ہو تو مخلوق نہیں ہے۔ کیونکہ خلقت کا تعلق امور وجودی کے ساتھ ہے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ موت کی حقیقت ایک جہان سے دوسرے جہان کی طرف انتقال ہے اور یہ یقیناً ایک وجودی امر ہے جو مخلوق ہو سکتا ہے۔

اگر یہاں موت کا حیات سے پہلے ذکر ہوا ہے تو اس کی وجہ وہ گہری تاثیر ہے جو خشن عمل میں موت کی طرف توجہ سے ہوتی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ موت زندگی سے پہلے بھی تھی۔

خدا کی آزمائش سے مراد، جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، ایک قسم کی تربیت ہے اس معنی میں کہ وہ انسانوں کو میدان عمل کی طرف کھینچتی ہے تاکہ تجربے اور آزمائش میں پاک و پاکیزہ ہو کر قرب خدا کے لائق ہو۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ آزمائش کا ہدف "حسن عمل کو بتایا گیا ہے نہ کہ کثرت عمل کو۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام کیفیت کو اہمیت دیتا ہے کیفیت کو نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ عمل خالص ہو، خدا کے لیے اور سفید جاس ہو، اگرچہ کمیت و مقدار کے لحاظ سے تھوڑا ہو۔

اس لیے اس بارے میں کہ احسن عملاً سے کیا مراد ہے؛ بعض اسلامی روایات میں پیغمبر گرامی سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"اتمکم عقلاً، واشدکم لله خوفاً، واحسنکم فیما امر اللہ بہ و

نہی عنہ نظراً، و ان کان اقلکم تطوعاً؛

"اس سے مراد یہ ہے کہ تم میں سے کس کی عقل و فرد کامل اور خدا ترسی زیادہ ہے اور

۱۔ خدائی آزمائشوں کے بارے میں زمر تشریح کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۱ سورہ بقرہ کی آیت ۱۵۵ کے ذیل میں ملاحظہ کریں۔

خدا کے اوامر و نواہی سے کون زیادہ آگاہی رکھتا ہے، چاہے تمہارے مستحبی اعمال کم ہی ہوں۔ لے

صاف ظاہر ہے کہ کامل عقل، عقل کو پاک تر، نیت کو خالص تر اور اجر و پاداش کو زیادہ سے زیادہ کر دیتی ہے ایک حدیث میں امام جناب صادقؑ سے آیا ہے :

”لیس یمنی اکثر عملاً ، ولكن اصوبكم عملاً ، وانما الاصابة خشية الله والنية الصادقة ، ثم قال الابقاء على العمل حتى يخلص اشد من العمل ، والعمل المخلص الصالح الذي لا ترید ان يمدك عليه احد الا لله عزوجل“

یہ مراد نہیں ہے کہ تم میں سے کون زیادہ عمل کرتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ تم میں سے زیادہ صحیح عمل کون کرتا ہے۔ عمل صحیح وہ ہے جس میں خدا پرستی اور پاک نیت شامل ہو۔ اس کے بعد فرمایا: عمل کو آلودگی سے محفوظ رکھنا خود عمل سے زیادہ سخت ہے۔ خالص و صالح عمل وہ ہوتا ہے جس میں تو یہ نہ چاہے کہ خدا کے سوا کوئی اور اس عمل پر تیری تعریف کرے۔ لے

انسان کی خلقت کے ہدف کے بارے میں ہم سورہ ذاریت کی آیت ۵۶ ”وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون“ کے ذیل میں ایک تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ وہاں ہدف ”عبودیت خدا“ ذکر ہوا ہے، اور یہاں ”عمل کی آزمائش“ یہ بات واضح ہے کہ آزمائش و امتحان کا مسئلہ عبودیت کے مسئلہ سے الگ نہیں ہے، جیسا کہ کمال عقل، خدا ترسی اور نیت خالص، جن کی طرف اوپر والی روایات میں اشارہ ہوا ہے ذریعہ عبودیت ہیں۔ اس طرح یہ دنیا تمام انسانوں کے لیے ایک عظیم آزمائش کا میدان ہے۔ آزمائش کا ذریعہ موت و حیات ہے اور اس عظیم آزمائش کا ہدف حسن عمل تک پہنچنا ہے۔ جس کا مفہوم تکامل معرفت، اخلاص نیت اور ہر کار خیر کو انجام دینا ہے۔

اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض مفسرین نے یہاں ’احسن عملاً‘ کی تفسیر موت کو یاد کرنے یا موت کے لیے آمادگی ہونے اور اسی قسم کے امور سے کی ہے تو وہ حقیقت میں اس معنی کلمی کے مصادیق میں سے ہے۔

چونکہ اس عظیم آزمائش کے میدان میں انسان بہت سی لغزشوں میں گرفتار ہو جاتا ہے، یہ لغزشیں اسے مایوس کر دیں اور اس کی سعی و کوشش سے اسے باز نہ رکھیں۔ لہذا آیت کے آخر میں بندوں کو مدد اور بخشش کا وعدہ

لے تفسیر مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۲۲

لے تفسیر صافی زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

دیتے ہوئے کہتا ہے: ”اور وہ شکست ناپذیر اور بخشے والا ہے۔“ (وہوالمزیز النفوس)۔
ہاں! وہ ہر چیز پر قادر اور ہر توبہ کرنے والے انسان کو بخشنے والا ہے۔

موت و حیات کے نظام کو بیان کرنے کے بعد عالم کے نظام کلی کو پیش کرتے ہوئے انسان کو مجبوعہ عالم ہستی کے مطالعہ کی دعوت دیتا ہے تاکہ وہ اس طریقہ سے اپنے آپ کو اس عظیم آزمائش کے لیے آمادہ کرے، فرماتا ہے: ”وہی خدا جس نے سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر پیدا کیا“ (الذی خلق سبع سماوات طباقاً)۔ سات آسمانوں کے بارے میں تو ہم اس سے پہلے تھوڑی سی بحث سورۃ طلاق کی آیت ۱۲ کی تفسیر میں بھی کر چکے ہیں۔ یہاں ’طباقاً‘ کے بارے میں ہم کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ اس تعبیر کی بنا پر ساتوں آسمان ایک دوسرے کے اوپر قرار پاتے ہیں کیونکہ ’مطابقتہ‘ کا معنی اصل میں یہ ہے کہ ایک چیز کو دوسری چیز کے اوپر قرار دیں۔

اب اگر ہم سات آسمانوں کو منظومہ شمسی کے سات کڑوں کی طرف اشارہ سمجھیں، جو بغیر کسی آلہ کے دیکھے جاسکتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا سورج کے ساتھ ایک معین فاصلہ ہے، اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کے اوپر ہے۔

لیکن اگر ہم ان تمام ثابت و سیار ستاروں کو جنہیں ہم دیکھتے ہیں پہلے آسمان کی جزو شمار کر لیں تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بالاتر مراحل میں کچھ دوسرے عالم ہیں کہ جن میں سے ہر ایک دوسرے کے اوپر متدرج ہوتا ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”تم خدائے رحمن کی مخلوق میں کوئی تضاد اور کسی قسم کا عیب نہیں دیکھو گے۔“ (ما تری فی خلق الرحمن من تفاوت)۔

عالم ہستی اس ساری عظمت کے باوجود جو کچھ بھی ہے وہ نظم و نسق، استحکام و انسجام، چچی تلی اور ٹھیک ٹھیک حساب شدہ ترکیبات اور دقیق قوانین ہیں۔ اگر اس عالم کے کسی گوشہ میں بے نظمی واقع ہو جاتی تو وہ اسے نابود کر کے رکھ دیتی۔

اس عجیب و غریب نظام سے لے کر جو ایک ایٹم کے ذرہ اور الیکٹرون و پروٹون کے ذرات پر حاکم ہے، کل منظومہ شمس اور دوسرے منظوموں اور ککشاؤں پر حاکم نظامات تک، سب کے سب دقیق قوانین کے زیر تسلط ہیں جو انہیں ایک خاص راستہ پر چلا رہے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہر جگہ قانون و حساب ہے اور ہر جگہ ایک نظم اور خاص ترکیب ہے۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے: ”پھر نظر دوڑا کر دیکھو اور اس عالم کو غور سے دیکھو، کیا تمہیں اس میں کوئی شکاف یا خلل اور اختلاف نظر آتا ہے؟“ (فارجع البصر هل ترى من فطور)۔

’فطور‘ - ’فطر‘ (بروزن سطر) کے مادہ سے، طول میں شکاف کرنے کے معنی میں ہے اور توڑنے کے معنی میں (مثلاً روزہ کا افطار) اور اختلال و فساد کے معنی میں بھی آیا ہے۔ زیر بحث آیت میں اسی معنی میں ہے۔

خدا کے ادا کردہ نواہی سے کون زیادہ آگاہی رکھتا ہے، چاہے تمہارے مستحبی اعمال کم

ہی ہوں؟

صاف ظاہر ہے کہ کامل عقل، عقل کو پاک تر، نیت کو خالص تر اور اجر و پاداش کو زیادہ سے زیادہ کر دیتی ہے۔ ایک حدیث میں امام جنر صادقؑ سے آیا ہے :

”لیس یمنی اکثر عملا ، ولكن اصوبكم عملا ، وانما الاصابة
خشية الله والنية الصادقة ، شر قال الابقاء على العمل حتى يخلص
اشد من العمل ، والعمل الخالص الصالح الذي لا ترید ان یحمدك
عليه احد الا لله عزوجل“

”یہ مراد نہیں ہے کہ تم میں سے کون زیادہ عمل کرتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ تم میں
سے زیادہ صحیح عمل کون کرتا ہے۔ عمل صحیح وہ ہے جس میں خدا پرستی اور پاک نیت شامل
ہو۔ اس کے بعد فرمایا: عمل کو آلودگی سے محفوظ رکھنا خود عمل سے زیادہ سخت ہے۔
خالص و صالح عمل وہ ہوتا ہے جس میں تو یہ نہ چاہے کہ خدا کے سوا کوئی اور اس عمل پر
تیری تعریف کرے“

انسان کی خلقت کے ہدف کے بارے میں ہم سورہ ذاریت کی آیت ۵۶ ”وما خلقت الجن والانس
لیعبدون“ کے ذیل میں ایک تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ وہاں ہدف ”عبودیت خدا“ ذکر ہوا ہے، اور یہاں ”عقل
عمل کی آزمائش“ یہ بات واضح ہے کہ آزمائش و امتحان کا مسئلہ عبودیت کے مسئلہ سے الگ نہیں ہے، جیسا کہ
کمال عقل، خدا ترسی اور نیت خالص، جن کی طرف اوپر والی روایات میں اشارہ ہوا ہے، دُور عبودیت ہیں۔
اس طرح یہ دُنیا تمام انسانوں کے لیے ایک عظیم آزمائش کا میدان ہے۔ آزمائش کا ذریعہ موت و حیات ہے
اور اس عظیم آزمائش کا ہدف حسن عمل تک پہنچنا ہے۔ جس کا مفہوم تکامل معرفت، اخلاص نیت اور ہر کار خیر کو
انجام دینا ہے۔

اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض مفسرین نے یہاں ’احسن عملا‘ کی تفسیر موت کو یاد کرنے یا موت کے لیے آگاہی
ہونے اور اسی قسم کے امور سے کی ہے تو وہ حقیقت میں اس معنی کلمی کے مصداق میں سے ہے۔
چونکہ اس عظیم آزمائش کے میدان میں انسان بہت سی لغزشوں میں گرفتار ہو جاتا ہے، یہ لغزشیں اسے مایوس
کریں اور اس کی سعی و کوشش سے اسے باز نہ رکھیں۔ لہذا آیت کے آخر میں بندوں کو مدد اور بخشش کا دعویٰ

دیتے ہوئے کہتا ہے: ”اور وہ شکست ناپذیر اور بخشنے والا ہے“ (وہو العزیز الغفور)۔

ہاں! وہ ہر چیز پر قادر اور ہر توبہ کرنے والے انسان کو بخشنے والا ہے۔

موت و حیات کے نظام کو بیان کرنے کے بعد عالم کے نظام کئی کو پیش کرتے ہوئے انسان کو مجبوزہ عالم ہستی کے مطالعہ کی دعوت دیتا ہے تاکہ وہ اس طریقہ سے اپنے آپ کو اس عظیم آزمائش کے لیے آمادہ کرے، فرماتا ہے: ”وہی خدا جس نے سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر پیدا کیا“ (الذی خلق سبع سماوات طباقاً)۔ سات آسمانوں کے بارے میں تو ہم اس سے پہلے تھوڑی سی بحث سورۃ طلاق کی آیت ۱۲ کی تفسیر میں بھی کر چکے ہیں۔ یہاں ’طباقاً‘ کے بارے میں ہم کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ اس تعبیر کی بناء پر ساتوں آسمان ایک دوسرے کے اوپر قرار پاتے ہیں کیونکہ ”مطابقت“ کا معنی اصل میں یہ ہے کہ ایک چیز کو دوسری چیز کے اوپر قرار دیں۔ اب اگر ہم سات آسمانوں کو منظومہ شمسی کے سات کردوں کی طرف اشارہ سمجھیں، جو بنیر کسی آلہ کے دیکھے جا سکتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا سورج کے ساتھ ایک معین فاصلہ ہے، اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کے اوپر ہے۔

لیکن اگر ہم ان تمام ثابت و تیار ستاروں کو جنہیں ہم دیکھتے ہیں پہلے آسمان کی جُزء شمار کر لیں تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بالاتر مراحل میں کچھ دوسرے عوالم ہیں کہ جن میں سے ہر ایک دوسرے کے اوپر قرار پاتا ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”تم خدائے رحمن کی مخلوق میں کوئی تضاد اور کسی قسم کا عیب نہیں دیکھو گے“ (ماتری فی خلق الرحمن من تفاوت)۔

عالم ہستی اس ساری عظمت کے باوجود جو کچھ بھی ہے وہ نظم و نسق، استحکام و انسجام، سچی تلی اور ٹھیک ٹھیک حساب شدہ ترکیبات اور دقیق قوانین ہیں۔ اگر اس عالم کے کسی گوشہ میں بے نظمی واقع ہو جاتی تو وہ اسے نابود کر کے رکھ دیتی۔

اس عجیب و غریب نظام سے لے کر جو ایک ایٹم کے ذرہ اور الیکٹرون و پروٹون کے ذرات پر حاکم ہے، کل منظومہ شمس اور دوسرے منظوموں اور ککشاؤں پر حاکم نظامات تک، سب کے سب دقیق قوانین کے زیر تسلط ہیں جو انہیں ایک خاص راستہ پر چلا رہے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہر جگہ قانون و حساب ہے اور ہر جگہ ایک نظم اور خاص ترکیب ہے۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے: ”پھر نظر دوڑا کر دیکھو اور اس عالم کو غور سے دیکھو، کیا تمہیں اس میں کوئی شکاف یا خلل اور اختلاف نظر آتا ہے؟“ (فارجع البصر هل تری من فطور)۔ ”فطور“ - ”فطر“ (بروزن سطر) کے مادہ سے، طول میں شکاف کرنے کے معنی میں ہے اور توڑنے کے معنی میں (مثلاً روزہ کا افطار) اور اختلال و فساد کے معنی میں بھی آیا ہے۔ زیر بحث آیت میں اسی معنی میں ہے۔

مُراد یہ ہے کہ انسان عالم آفرینش میں چاہے جتنا بھی غور کرے، کم سے کم خلل اور ناموزونیت بھی اس میں نہیں دیکھے گا۔

اسی لیے بعد والی آیت میں اس معنی کی تاکید کے لیے مزید کہا ہے: ”پھر دوبارہ عالم ہستی کی طرف آنکھ کھول کر دیکھ، انجام کار تیری نظر خلل و نقص کی جستجو میں ناکام ہو کر اور تھک بار کر تیری طرف پلٹ آئے گی۔“

دشم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاصاً وھو حسیر۔

”کرتین“ ”کر“ (بروزن شر) کے مادہ سے کسی چیز کی طرف توجہ کرنے اور بازگشت کرنے کے معنی میں ہے۔ کسرت کا معنی تکرار بھی ہے اور ”کرتین“ اس کا تشبیہ ہے۔ لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں کرتین سے تشبیہ کا معنی مراد نہیں، بلکہ اس سے مکرر، بار بار، پلے درپلے اور متعدد مرتبہ توجہ کرنا مراد ہے۔ اس بناء پر قرآن ان آیات میں لوگوں کو کم از کم تین مرتبہ عالم ہستی کی طرف نظر کرنے اور اسرارِ خلقت و آفرینش کا مطالعہ کرنے کا حکم دیتا ہے کہ وہ ایک چیز میں بار بار غور کریں۔ پھر جب اس عجیب و غریب نظام میں معمولی سے معمولی اور کم سے کم خلل اور نقص نہ دیکھیں تو اس کارخانہ عالم کے پیدا کرنے والے خالق اور اس کے بے پایاں علم و قدرت سے زیادہ سے زیادہ آشنا ہوں۔

”خاصی“ ”خاصاً“ اور ”حسوع“ (بروزن مدح و شوع) کے مادہ سے۔ جب آنکھ کے لیے استعمال ہو تو نختہ اور ناتواں ہونے کے معنی میں ہے اور جب ”کتے“ کے بارے میں استعمال ہو تو اسے دُور کرنے کے معنی میں ہے۔

”حسیر“ ”حسر“ (بروزن قصر) کے مادہ سے برہنہ کرنے کے معنی میں ہے، چونکہ انسان خستگی اور تکان کے وقت اپنی توانائی کھو بیٹھتا ہے اور گویا وہ اپنی توانائیوں سے برہنہ ہو جاتا ہے، لہذا یہ خستگی اور ناتوانی کے معنی میں آیا ہے۔ اس بناء پر اوپر والی آیت میں ”خاصی“ اور ”حسیر“ دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ یعنی عالم ہستی کے نظام میں کسی نقص و عیب کے دیکھنے سے آنکھ کی در ماندگی اور ناتوانی کے موضوع میں تاکید کے لیے آئے ہیں۔

بعض نے ان دونوں کے درمیان اس طرح فرق کیا ہے کہ ”خاصی“ ناکام ہونے کے معنی میں، اور ”حسیر“ ناتواں کے معنی میں ہے۔

بہر حال ان آیات سے دو اہم نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ قرآن راہ حق کے تمام رہزوں کو تاکید کی طور پر یہ حکم دیتا ہے کہ ان سے جتنا ہو سکتا ہے اس عالم ہستی کے اسرار اور جہان آفرینش کے عجائبات کا مطالعہ کرتے ہوئے ان میں غور و خوض کریں۔ نیز یہ کہ ایک مرتبہ اور دو مرتبہ پر قناعت نہ کریں۔ کیونکہ بہت سی ایسی اسرار ہیں جو پہلی یا دوسری نگاہ میں اپنی نشان دہی نہیں کرتے۔ تیز بین نگاہیں کسی مرتبہ نظر دوڑانے کے بعد ہی ان

کو دیکھ پانے میں کامیاب ہوتی ہیں۔

دوسرا یہ کہ انسان اس نظام میں جتنا زیادہ غور و خوض کرے گا اتنا ہی اس کے پردوں کو بہتر طور پر درک کر سکے گا۔
ایسا نظام، ساخت اور ترتیب جو ہر قسم کے نقص، خلل، کجی اور ٹیڑھے پن سے خالی ہے۔

اگر سطحی اور ابتدائی نظر میں اس جہان کے بعض موجودات، شرور و آفات اور فساد کے عنوان سے نظر آتے ہیں (مثلاً زلزلے، سیلاب، بیماریاں اور ناگوار حوادث، جو کبھی کبھی انسان کی زندگی میں رونا ہوتے رہتے ہیں) تو زیادہ دقیق مطالعات سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ بھی اپنے اندر بہت سے اہم اسرار و رموز رکھتے ہیں۔ لے یہ آیات برہان نظم کی طرف ایک واضح اشارہ ہے کہ جو کہتی ہیں: ہر کارخانہ میں نظم و نسق کا وجود، اس کارخانہ کی پشت پر علم و قدرت کے وجود کی نشانی ہے۔ ورنہ اتفاقی حوادث جو حساب شدہ نہ ہوں اندھے بہرے تصادفات نظام و حساب کا مبداء نہیں ہو سکتے، جیسا کہ حدیث مفضل میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

”ان الاهیات لا یأتی بالصواب، والتضاد لا یأتی

بالنظام“

”مہمل کام کبھی درست نتیجہ نہیں دیتے، اور تضاد کسی نظام کا

مبداء نہیں ہو سکتا۔“ لے

آفری زیر بحث آیت نے صفحہ آسمان پر نگاہ ڈالی ہے جو خوبصورت اور پچکنے والے ستاروں کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہے: ”ہم نے نچلے آسمان کو چمکدار اور روشن ستاروں سے زینت بخشی ہے اور انہیں ہم نے شیطین کے لیے تیر قرار دیا ہے، اور ان کے لیے جہنم کی آگ کا عذاب فراہم کیا ہے۔“ (ولقد زینا السماء الدنیا بمصابیح وجعلناھا رجوماً للشیاطین و اعتدنا لھم عذاب السعیر)۔

ایک تاریک اور تاروں بھری رات میں آسمانوں کی طرف ایک نگاہ دور دور تک دکھائی دینے والے عوالم کی طرف توجہ اور ان نظاموں کا تصور جو ان پر حاکم ہے، اس خوب صورتی، نفاست، عمدگی، عظمت ہیبت اور پراسرار سکوت میں غور کہ جو ان کے اوپر سایہ نگیں ہے۔ انسان کو ایک عرفان اور نور حق سے پر جہان میں داخل کر دیتا ہے۔ اسے عشق پروردگار کے ان عوالم میں سیر کرانا ہے جن کی کسی زبان سے تعریف و توصیف نہیں ہو سکتی۔

یہ آیت دوبارہ اس حقیقت کی تائید کرتی ہے کہ وہ تمام ستارے جنہیں ہم دیکھ رہے ہیں، سب

لے ہم نے اس مطلب کی تشریح ”اثبات وجود خدا“ کے مباحث میں آفات و مہلکات کے سلسلہ میں مادیات کے دلائل کے جواب میں کی ہے۔ کتاب

آفریہ گار جہاں کی طرف رجوع کریں۔ لے بحار الانوار جلد ۲ ص ۶۳

پہلے آسمان کا حصہ ہیں۔ وہ آسمان جو سات آسمانوں میں ہم سے زیادہ قریب ہے۔ اسی بناء پر اسے "رد السماء الدنيا" (نزدیک اور نچلے آسمان) کے عنوان سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"رجوہ" (تیر) کی تعبیر ان شہابوں کی طرف اشارہ ہے جو تیر کی طرح آسمان کی ایک طرف سے دوسری طرف پھینکے جاتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ "شہب" ان ستاروں کے باقی ماندہ اجزاء ہیں جو بعض حواث میں تباہ ہو گئے ہیں۔ اس بناء پر اگر وہ کوکب (ستاروں) کو شیاطین کے لیے تیر قرار دینے کی بات کہتا ہے ہے، تو وہ انہیں مخصوص سنگیزوں کی طرف اشارہ ہے۔

لیکن شیاطین شہاب کے ان تیروں سے جو آسمانوں میں چھوٹے چھوٹے سرگرداں پتھر ہیں، کس طرح شانہ بنتے ہیں؟ ہم اس کی تشریح تفسیر نمونہ جلد ۶ (سورۃ حجر کی آیت ۱۸ کے ذیل میں) اور جلد ۱۰ (سورۃ صافات کی آیت ۲۰ کے ذیل میں) تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔

ایک نکتہ

عالو آفرینش کی عظمت

باوجودیکہ قرآن مجید عرب کے زمانہ جاہلیت کے پیمانہ ماحول میں اُترا، لیکن وہ اکثر تاکید کرتا ہے کہ مسلمان عالم ہستی کے باعظمت اسرار میں غور و فکر کریں۔ وہ مطلب جس کا زمانہ جاہلیت میں کوئی مفہوم ہی نہیں تھا یہ خود اس بات کی ایک واضح دلیل ہے کہ قرآن ایک دوسرے بعد سے صادر ہوا ہے۔ اب علم و دانش جس قدر آگے بڑھتے جا رہے ہیں، اس سلسلہ میں قرآنی تاکیدوں کی عظمت اسی قدر آشکار تر ہوتی جا رہی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ کترہ زمین جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں، اتنا بڑا ہونے کے باوجود منظومہ شمس کے مرکز یعنی سورج کی ٹکیہ کے مقابلہ میں اس قدر چھوٹی ہے کہ اگر بارہ لاکھ کترہ زمین کو ایک دوسرے کے اوپر رکھیں تو پھر وہ سورج کی ٹکیہ کے برابر ہوگی۔

دوسری طرف سے ہمارا منظومہ شمسی ایک عظیم ککشائیں کا ایک جز ہے، وہی ککشائیں جسے راہ شمسیا کہتے ہیں۔ لے

لے ککشائیں ستاروں کے مجموعے ہیں جو ستاروں کے شہروں کے نام سے مشہور ہیں اور ایک دوسرے سے نزدیک ہونے کے باوجود بعض اوقات ان کے درمیان کئی ملین ذریعہ سائوں کا فاصلہ ہوتا ہے۔

ماہرین علم الافلاک کے حساب کے مطابق صرف ہماری ککشاں میں ایک کھرب (.....۱۰۰۰۰۰۰۰۰) سے زیادہ ستارے موجود ہیں، اور ہمارا سورج اپنی تمام عظمت کے باوجود اس کے متوسط ستاروں میں سے ایک شمار ہوتا ہے۔

تیسری طرف اس عظیم جہان میں اس قدر ککشاں موجود ہیں جو حساب و کتاب اور شمار و قطار سے باہر ہیں۔ نیز ستاروں کو دیکھنے والی دور بینیں جتنی عظیم اور آراستہ ہوتی جا رہی ہیں اتنی ہی نئی سے نئی ککشاں کشف ہو رہی ہیں۔ کس قدر عظیم و بزرگ ہے وہ خدا جس نے یہ عظیم منصوبہ ایسے دقیق نظام کے ساتھ بنایا ہے۔

العظمة لله الواحد القهار

ماہرین علم الافلاک کے حساب کے مطابق صرف ہماری کہکشاں میں ایک کھرب (۱۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰) سے زیادہ ستارے موجود ہیں، اور ہمارا شعور اپنی تمام عظمت کے باوجود، اس کے متوسط تاروں میں سے ایک شمار ہوتا ہے۔

تیسری طرف اس عظیم جہان میں اس قدر کہکشاں موجود ہیں جو حساب و کتاب اور شمار و قطار سے باہر ہیں۔ نیز تاروں کو دیکھنے والی دور بینیں جتنی عظیم اور آراستہ ہوتی جا رہی ہیں اتنی ہی نئی سے نئی کہکشاںیں کشف ہو رہی ہیں۔ کس قدر عظیم و بزرگ ہے وہ خدا جس نے یہ عظیم منظوم ایسے دقیق نظام کے ساتھ بنایا ہے۔

العظمة لله الواحد القهار
Duplicate

- ① وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ
وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝
- ② إِذَا أُلْقُوا فِيهَا سَمِعُوا لَهَا شَهيقًا وَهِيَ تَفورُ ۝
- ③ تَكَادُ تَمَيِّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۖ كُلَّمَا أُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ
سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ ۝
- ④ قَالُوا بَلَىٰ قَدْ جَاءَنَا نَذِيرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا
نَزَّلَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ ۖ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ كَبِيرٍ ۝
- ⑤ وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ
السَّعِيرِ ۝
- ⑥ فَأَعْتَرَفُوا بِذَنبِهِمْ ۖ فَسُحِقًا لِأَصْحَابِ السَّعِيرِ ۝

ترجمہ

- ① اور ان لوگوں کے لیے جنہوں نے اپنے پروردگار کا کفر کیا، جہنم کا عذاب ہے اور وہ بڑی جگہ ہے۔
- ② جس وقت وہ اس میں ڈالے جائیں گے تو اس میں سے ایک دشتناک آواز سنیں گے

① ڈالا
طرد
② کہا
③ کہا
④ تفر
اگر
تھی
کی
ہے

اس
رہتی
طولانی

اور وہ ہمیشہ جوش مار رہی ہوگی۔

۸) قریب ہے کہ وہ شدتِ غضب سے پارہ پارہ ہو جائے۔ جس وقت اس میں کوئی گمروہ ڈالا جاتا ہے تو دوزخ کے نگران (فرشتے) ان سے سوال کرتے ہیں کیا تمہارے پاس خدا کی طرف سے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔

۹) وہ کہیں گے، ہاں! انذار کرنے والا تو ہمارے پاس آیا تھا مگر ہم نے اُسے جھٹلایا اور یہ

کہا کہ خدا نے بالکل کوئی چیز نازل نہیں کی ہے اور تم ایک بہت بڑی گمراہی میں ہو۔

۱۰) اور یہ بھی کہیں گے کہ اگر (ان کی بات) سنتے یا سمجھتے تب تو (آج) دوزخیوں میں نہ ہوتے۔

۱۱) اس موقع پر وہ اپنے گناہ کا اعتراف کر لیں گے، دوزخی خدا کی رحمت سے دُور رہیں۔

تفسیر

اگر ہم سننے والا کان اور سیدھا فکر رکھتے تو دوزخ میں نہ ہوتے۔

گذشتہ آیات میں خدا کی عظمت و قدرت کی نشانیوں اور عالمِ آفرینش میں ان کے دلائل کے بارے میں گفتگو تھی۔ لہذا قرآن زیر بحث آیات میں ایسے لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے جنہوں نے ان دلائل کی پروا نہیں کی، انہوں نے کفر و شرک کی راہ اختیار کر لی اور شیاطین کی طرح عذابِ الہی خرید بیٹھے۔

پہلے فرماتا ہے: ”ان لوگوں کے لیے جنہوں نے اپنے پروردگار کا کفر کیا عذابِ جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے۔“ (وللذین کفروا برہم عذاب جہنم و بئس المصیر)۔

♣ ♣ ♣

اس کے بعد اس وحشناک عذاب کے ایک گوشہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”جس وقت کفار اس میں ڈالے جائیں گے تو وہ اس میں سے ایک وحشناک صدائیں گے اور وہ ہمیشہ جوش مارنے کی حالت میں رہتی ہے۔“ (اذا القوا فیہا سمعوا لہا شہیقًا وہی تفرور)۔

ہاں! جس وقت انہیں انتہائی ذلت و حقارت کے ساتھ اس میں پھینکا جائے گا تو جہنم کی وحشناک اور طولانی صدا بلند ہوگی جو ان کے تمام وجود کو وحشت میں غرق کر دے گی۔

”شہیق“ اصل میں تہج اور بُری آواز کے معنی میں ہے جیسا کہ گدھے کی آواز ہے۔ لیکن اہل لغت نے یہ

بھی کہا ہے کہ یہ "شہوق" کے مادے سے طولانی ہونے کے معنی سے لیا گیا ہے۔ (اسی لیے اُدبے اور بلند ہواؤ کو جبل شاہق کہتے ہیں) اس بنا پر شیع طولانی نالہ و فریاد کے معنی میں ہے۔

لبض نے کہا ہے کہ "زفیر" تو اس آواز کو کہتے ہیں جو گلے میں پیچ کھاتی رہے اور "شہیق" وہ آواز ہے جو سینہ میں آمدورفت کرتی ہے۔ بہر حال یہ وحشت انگیز اور بے چین کر دینے والی آوازوں کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے بعد "دوزخ" کے غیظ و غضب کی شدت کو مجسم کرنے کے لیے مزید کہا ہے: "قریب ہے کہ وہ شدت غضب سے پارہ پارہ ہو جائے۔" (تکاد تمیز من الغیظ)۔

ٹھیک اس عظیم برتن کی طرح جسے حد سے زیادہ تیز حرارت والی آگ کے اوپر رکھا ہوا ہو اور وہ اس طرح ہوتا ہوا اوپر نیچے ہو رہا ہو کہ ہر لمحہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا خوف لگا رہتا ہو، یا اس غصہ میں بھرے ہوئے انسان کی طرح جو چیخ چلا رہا ہو اور اس طرح کی آوازیں نکال رہا ہو جیسے ابھی پھٹ پڑے گا۔ ہاں! خدائی غضب کے اس مرکز، جہنم کا منظر ایسا ہی ہے۔

پھر وہی بات جاری ہے۔ جس وقت کافروں کا کوئی گروہ اس میں پھینکا جائے گا تو دوزخ کے نگہباز تعجب اور سرزنش کے طور پر اس سے سوال کریں گے، کیا تمہارا کوئی رہبر و راہنما نہیں تھا؟ کیا خدا کی طرف سے کوئی ڈرانے والا تمہارے پاس نہیں آیا تھا؟ پھر تم اس بدبختی میں کیوں آن پڑے ہو؟ "کلمہ القی فیما فی سألہم خزنتہا المر یأتکھ مذیر۔"

انہیں اس بات کا یقین ہی نہیں آئے گا کہ کوئی انسان جانتے بوجھے اور آسمانی رہبر کے ہوتے ہوئے اس قسم کی سرفروشتی میں گرفتار ہو جائے۔ اور اپنے لیے اس قسم کی جگہ کا انتخاب کرے۔

لیکن وہ جواب میں کہیں گے: "ہاں ڈرانے والا تو ہمارے پاس آیا تھا مگر ہم نے اس کی تکذیب کی اور کہا کہ خدا نے ہرگز کوئی چیز نازل نہیں کی۔ اور خدا نے کسی پر وحی نہیں بھیجی ہے تاکہ ہم اپنی خواہش نفس کی جاری رکھیں۔ یہاں تک کہ ہم نے ان سے کہا کہ تم عظیم گمراہی میں مبتلا ہو۔" (قالوا بلی قد جاءنا مذیر فکذبنا وقلنا ما نزل اللہ من شیء وان انتہ الا فی ضلال کبیر۔)

صرف یہ کہ ہم نے ان کی تصدیق نہیں کی اور ان کے حیات بخش پیغام پر کان نہیں دھرا، بلکہ ان کی نصیحت کے لیے کھڑے ہو گئے، ان روحانی طبیبوں کو گمراہ کہہ کر اپنے سے دور کر دیا۔

اس کے بعد اپنی بدبختی اور گمراہی کی اصل دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہیں گے: ”اگر ہم سننے والے کان رکھتے اور اپنی عقل کو کام میں لاتے تو ہرگز دوزخیوں میں سے نہ ہوتے۔“ (وقالوا لو كنا نسمع او نعقل ما كنا في اصحاب السعير).

✦ ✦ ✦

ہاں! اس موقع پر وہ اپنے گناہ کا اعتراف کر لیں گے۔ ”دور ہوں دوزخی خدا کی رحمت سے۔“ (فاعترفوا بذنوبهم فسحقا لاصحاب السعير).

ان آیات میں دوزخیوں کی وحشت ناک سرنوشت کے بیان کے ضمن میں ان کی بدبختی کی اصل علت کی نشان دہی کرتے ہوئے کہتا ہے: ایک طرف تو خدا نے سننے والے کان اور عقل و ہوش عطا کیا اور دوسری طرف واضح دلائل کے ساتھ اپنے پیغمبر بھیجے۔ اگر یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کریں تو انسان کے سعادت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

لیکن اگر انسان کان تو رکھتا ہے مگر ان سے سنتا نہیں، آنکھیں رکھتا ہے مگر ان سے دیکھتا نہیں، اور عقل رکھتا ہے مگر اس سے سوچتا نہیں، تو اب اگر خدا کے تمام کے تمام پیغمبر اور آسمانی کتابیں اس کے پاس آجائیں تو اس پر کچھ اثر نہیں ہوگا۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک گروہ نے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں ایک مسلمان کی مدح و ثنا کی تو رسولؐ خدا نے فرمایا:

”کیف عقل الرجل؟“

”اس کی عقل کیسی ہے؟“

انہوں نے عرض کیا: ”یا رسول اللہ! ہم تو عبادت اور طرح طرح کے نیک کاموں میں اس کی جدوجہد کی بات کر رہے ہیں اور آپ اس کی عقل کے بارے میں پوچھ رہے ہیں تب آپ نے فرمایا:

”ان الاحق یصیب بحمقہ اعظم من فجور الفاجر، وانما

یرتفع العباد غداً فی الدرجات، وینالون الزلفی من بہم

علی قدر عقولہم!“

”احق کی حماقت سے جو مصیبت آتی ہے وہ فاجروں کے فجور اور بدکاروں

کے گناہ سے بدتر ہوتی ہے۔ کل قیامت کے دن خدا بندوں کو ان کے

عقل و خرد کے مطابق درجات عطا فرمائے گا اور وہ اسی بنیاد پر قرب خداوندی

حاصل کریں گے۔“

”سحق“ (بروزن قتل) اصل میں پینے اور نرم کرنے کے معنی میں ہے اور پُرانے لباس کو بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن یہاں رحمتِ خدا سے دوری کے معنی میں ہے۔ تو اس بناء پر فسحاً لاصحاب السعیر کا مفہوم یہ ہے کہ دوزخی رحمتِ خدا سے دُور رہیں، کیونکہ خدا کی نفرین تحقیق خارجی سے توأم ہوتی ہے۔ تو یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ گروہ کئی طور پر رحمتِ خدا سے دُور ہو گا۔

ایک نکتہ

عقل و خرد کی اونچی قدر و قیمت

یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ قرآن مجید عقل و خرد کی حد سے زیادہ قدر و قیمت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ نیز دوزخیوں کا بنیادی گناہ اور ان کی بدبختی کا اصلی عامل اس خدائی قوت سے کام نہ لینے کو شمار کرتا ہے۔ بلکہ جو شخص قرآن سے آشنائی رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اُس نے مختلف مناسبتوں سے اس موضوع کی اہمیت کو آشکار کیا ہے۔ اس نے ان لوگوں کی دروغ بافیوں کے برخلاف، جو مذہب کو دماغوں کے مست اور مست کرنے کا ذریعہ اور عقل و خرد کی پروا نہ کرنے والا شمار کرتے ہیں، اسلام خدائشناسی اور سعادت و نجات کی اساس و بنیاد عقل و خرد پر رکھتا ہے، بلکہ جگہ جگہ اس کا روتے سخن ”اولو الالباب“ (صاحبانِ عقل) اور ”اولو البصائر“ (صاحبانِ بصیرت) غور و فکر کرنے والے عقلاء کی طرف ہے۔

اسلامی منابع میں اس سلسلہ میں اس قدر روایات وارد ہوئی ہیں جو حساب و شمار سے باہر ہیں۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مشہور کتاب ’کافی‘ جو منابعِ حدیث میں سب سے زیادہ قابلِ اعتبار ہے وہ مختلف کتابوں پر مشتمل ہے اس کی پہلی کتاب کا نام کتاب ’عقل و جبل‘ ہے۔ جو شخص ان روایات کو ملاحظہ کرے جو اس ضمن میں اس کتاب میں نقل ہوئی ہیں، وہ اس سلسلہ میں اسلام کی نظر کی گہرائی کو پالے گا۔ ہم یہاں صرف دو روایات کے ذکر پر قفا کریں گے۔

(اسی کتاب میں) امیر المؤمنین امام علیؑ سے روایت آئی ہے کہ جبرئیل آدمؑ پر نازل ہوتے اور ان سے ”مجھے حکم ہوا ہے کہ میں آپ کو ان تین نعمتوں میں سے کسی ایک کو اپنانے کا اختیار دوں، آپ ان میں سے کون ایک کا انتخاب کر لیں اور باقی دو کو چھوڑ دیں۔“

آدمؑ نے کہا: ”وہ کون سی نعمتیں ہیں؟“

جبرئیل نے جواب دیا: ”عقل، حیا اور دین۔“

آدم نے کہا : ”میں نے عقل کا انتخاب کیا ہے۔“ جبریل نے حیا اور دین سے کہا : ”اسے چھوڑ دو، اور اپنا کام کرو۔“ انھوں نے کہا : ”ہم مامور ہیں کہ ہر جگہ عقل کے ساتھ رہیں اور اس سے جدا نہ ہوں۔“ جبریل نے کہا : ”اب جبکہ یہ بات ہے تو پھر اپنی ماموریت پر عمل کرو۔“ اور اس کے بعد وہ آسمان کی طرف صعود کر گئے۔

یہ ایک ایسی لطیف ترین تعبیر ہے جو عقل و فرد اور حیا و دین سے اس کی نسبت کے بارے میں کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اگر عقل، دین سے جدا ہو جائے تو وہ ذرا سی بات میں برباد ہو جائے گا یا انحراف کا شکار ہو جائے گا۔ باقی رہی حیا کہ جو انسان کو بُرائیوں اور گناہوں کے ارتکاب سے روکتی ہے تو وہ بھی معرفت اور عقل و فرد کا نتیجہ ہوتی ہے۔

یہ چیز اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ آدم عقل کے ایک قابل ملاحظہ حصہ کے مالک تھے جنہوں نے ان تین چیزوں کے درمیان اختیار کے موقع پر عقل کے بالاتر مرحلہ کو انتخاب کیا اور اس کے سائے میں دین کو بھی ساتھ رکھا اور حیا کو بھی۔

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے :

”مَنْ كَانَ عَاقِلًا كَانَ لَهُ دِينٌ ، وَمَنْ كَانَ لَهُ دِينٌ دَخَلَ الْجَنَّةَ“

”جو عقلمند ہوگا وہ دیندار بھی ہوگا، اور جو دیندار ہوگا وہ جنت میں داخل ہوگا۔“

(اسی بناء پر جنت عقلمندوں کی جگہ ہے) ۱

البتہ عقل یہاں سچی معرفت کے معنی میں ہے نہ کہ شیاطین کی وہ شیطنت جو دنیا کے جابر اور ظالم سیاستداروں میں نظر آتی ہے کہ جو امام جعفر صادقؑ کے قول کے مطابق :

”شَبِيهَةٌ بِالْعَقْلِ ، وَلَيْسَتْ بِالْعَقْلِ“

”عقل کے مشابہ ہے لیکن وہ عقل نہیں ہے۔“ ۲

۱۲) إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ

۱۳) وَأَسِرُّوا قَوْلَكُمْ أَوِ اجْهَرُوا بِهِ إِنَّهُ عَلِيمٌ

بِذَاتِ الصُّدُورِ
۱۴) الْآيَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۖ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ

ترجمہ

۱۲) وہ لوگ جو اپنے پروردگار سے پوشیدہ طور سے ڈرتے ہیں ان کیلئے بخشش اور اجر عظیم ہے۔

۱۳) اپنی گفتگو کو پوشیدہ رکھو یا آشکار کرو (کچھ فرق نہیں ہے) وہ دلوں کی باتوں سے آگاہ ہے۔

۱۴) کیا وہ ہستی کہ جس نے تمام موجودات کو پیدا کیا ہے ان کے حالات سے آگاہ نہیں

ہے؟ جب کہ وہ دقیق اسرار سے باخبر اور ہر چیز کا عالم ہے۔

تفسیر

کیا جہان کا خالق جہان کے اسرار سے آگاہ نہیں ہے؟

ان مباحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں قیامت کے روز کفار اور ان کی سرنوشت کے بارے میں بیان ہوئے تھے، زیر بحث آیات میں قرآن مومنین اور ان کی عظیم جزاؤں کو بیان کر رہا ہے۔ پہلے فرماتا ہے: ”وہ لوگ جو اپنے پروردگار سے پنہاں طور پر ڈرتے ہیں، ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم

ہے۔ (ان الذین یغشون ربہم بالغیب لہم مغفرة واجر کبیر)۔

”غیب“ کی تفسیر یہاں ممکن ہے کہ ناپیدہ خدا کی معرفت یا ناپیدہ معاد و قیامت یا ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ

۲۹۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ شاید یہ پوشیدہ گناہوں کے بارے میں خدا کے خوف کی طرف اشارہ ہو۔ کیونکہ اگر انسان پوشیدگی میں بھی کوئی گناہ نہ کرے تو وہ بطریق اولیٰ آشکار گناہ نہیں کرے گا۔ یا یہ تفسیر گناہوں سے پرہیز کرنے اور اوامر الہی کے انجام دینے میں غلوں نیت کے مقام کی طرف اشارہ ہو کیونکہ پوشیدہ طور سے کیا ہوا عمل ریا اور دکھاوے سے دور ہوتا ہے۔

ان تفسیر کے درمیان جمع کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

”مغفرة“ کی تفسیر کا نکرہ کی صورت میں ہونا اور اس طرح ’اجر کبیر‘ اس کی عظمت و اہمیت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی یہ مغفرت اور اجر و پاداش اتنی عظیم ہوگی جو سب کے لیے انجامی ہوگی۔

اس کے بعد تاکید کے لیے مزید کہتا ہے: ”اگر تم اپنی گفتگو پنہاں طور پر یا آشکار کرو، خدا دلوں کی باتوں سے آگاہ ہے۔“ (واسروا قولکموا و اجہروا بہ انہ علیہم بذات الصدور)۔

بعض مفسرین نے ابن عباس سے اس آیت کی ایک شان نزول نقل کی ہے کہ کفار یا منافقین کی ایک جماعت پیغمبر خدا کے پس پشت ناروا باتیں کرتی تھی۔ جبریل آکر پیغمبر کو خبر دے دیا کرتے تھے، تب ان میں سے بعض نے ایک دوسرے سے کہا: ”اسروا قولکم“ ”اپنی باتیں پوشیدہ طور پر کیا کرو تاکہ محمد کا خدا نہ سُن لے“ تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور کہا: ”چاہے آشکارا باتیں کرو یا پوشیدہ طور پر، خدا ان سے آگاہ ہے۔“

بعد والی آیت اس چیز کے لیے جو گزشتہ آیت میں بیان ہوئی ہے ایک دلیل کے طور پر آئی ہے۔ فرماتا ہے: ”کیا وہ ذات جس نے موجودات کو پیدا کیا ہے ان کے حالات سے آگاہ نہیں ہے؟ جبکہ وہ دقیق ترین اسرار سے باخبر اور ہر چیز کا عالم ہے۔“ (الایصلہ من خلق و هو اللطیف الخبیر)۔

”الایصلہ من خلق“ کے جملہ کی تفسیر میں کئی احتمال دیئے گئے ہیں:

بعض نے کہا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ کیا وہ خدا جس نے دلوں کو پیدا کیا ہے، وہ ان کے اندر کے اسرار سے آگاہ نہیں ہے؟

یا یہ کہا ہے کہ وہ خدا جس نے بندوں کو پیدا کیا ہے، کیا وہ ان بندوں کے اسرار سے بے خبر ہے؟

یا یہ کہا ہے کہ وہ خدا جس نے تمام عالم ہستی کو پیدا کیا ہے وہ تمام جہان کے اسرار سے آگاہ ہے تو کیا وہ

انسان جو اس عظیم خلقت میں سے ایک موجود ہے، اس کے اسرار خدا سے پوشیدہ ہوں گے؟
بہر حال اس حقیقت کو معلوم کرنے کے لیے ہمیشہ اس نکتہ کی طرف توجہ کرنی چاہیے کہ خدا کی خلقت دائم
ہے۔ یعنی اس کی طرف سے فیض وجود ہر لمحہ مخلوقات کو پہنچ رہا ہے۔ معاملہ اس طرح نہیں ہے کہ وہ انہیں
کرنے کے ان کی حالت پر چھوڑ دے۔

اصولی طور پر تمام ممکنات (موجودات) اس کے وجود کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی ان
رشتہ اس کی ذات پاک سے منقطع ہو جائے تو وہ فنا کی راہ اختیار کر لیں۔ اس دائمی تعلق اور خلقت کی طرف مسلسل
توجہ، ہر زمانہ اور ہر مکان میں تمام موجودات کے اسرار کے بارے میں علم خدا کی ایک بہترین دلیل ہے۔
’لطیف‘ کے ساتھ خدا کی توصیف اس لحاظ سے ہے کہ لطیف لطف کے مادہ سے ہے۔ وہ ہر دقیق
ظریف موضوع اور ہر قسم کی سریع حرکت اور جسم لطیف کے معنی میں ہے۔ اس بناء پر خدا کا لطیف ہونا غلط
کے دقیق و ظریف اسرار کے بارے میں اس کے علم کی طرف اشارہ ہے۔ یہ لفظ بعض اوقات اجسام لطیف
خورد بینی ذرات اور ان سے مافوق کے معنی میں بھی آیا ہے۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمہاری دلی نیتیں چاہے جتنی پوشیدہ ہوں اور تم اپنی باتوں کو مخلوقوں میں
چاہے جتنا مخفی طور پر کہو یا غلط اعمال خلوت گاہوں میں انجام دو، خداوند لطیف و ذمیران سب سے آگاہ ہے
بعض مفسرین نے ’لطیف‘ کی تفسیر میں کہا ہے: (هو الذی یکلف الیسیر و یحیط الیکشیر) ”وہ
ہستی ہے جو ذمہ داری تو آسان ڈالتی ہے مگر اجر و پاداش فراوان دیتی ہے۔“
حقیقت میں یہ بھی رحمت میں ایک قسم کی ظرافت و وقت ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ لطیف کے ساتھ خدا کی توصیف اس بناء پر ہے کہ وہ تمام چیزوں کے اندر نفوذ
رکھتا ہے اور سارے جہان میں کوئی جگہ اس سے خالی نہیں ہے۔
لیکن یہ سب باتیں ایک ہی حقیقت کی طرف لوٹتی ہیں اور خدا کے علم کی گہرائی اور پوشیدہ و آشکار اسرار
اس کے علم پر ایک تاکید ہے۔

- ۱۵ هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ ذُلُولًا فَأَمْشُوا فِي
مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِنْ رِزْقِهِ وَإِلَيْهِ الشُّورُ
- ۱۶ ءَأَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يَخْسِفَ بِكُمْ
الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ
- ۱۷ أَمْ أَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ
حَاصِبًا ۗ فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرِ
- ۱۸ وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ
نَكِيرِ

ترجمہ

- ۱۵ وہی تو ہے کہ جس نے زمین کو مختارے لیے رام کر دیا۔ اس کے دوش پر چلو پھرو
اور خدا کی روزیوں میں سے کھاؤ اور تم سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔
- ۱۶ جو آسمان پر حاکم ہے کیا تم اس کے عذاب سے خود کو امان میں سمجھتے ہو کہ زمین اس
کے حکم سے پھٹ جائے اور تمہیں نگل لے اور مسلسل لرزتی اور کانپتی رہے۔

- ۱۷) یا تم خداوند آسمان کے عذاب سے اپنے آپ کو امان میں سمجھتے ہو کہ وہ ایسی آندھی تم پر بھیج دے جو سنگریزوں سے بھری ہوئی ہو اور تم جلدی ہی جان لو گے کہ میری دھکیاں کیسی ہیں۔
- ۱۸) وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے انھوں نے آیاتِ الہی کی تکذیب کی تھی، لیکن (دیکھو) میرا عذاب کیا تھا؟

تفسیر

کوئی مجھو اس کے عذاب و سزا سے امان میں نہیں ہے۔

ان مباحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں دوزخیوں، جنتیوں، کافروں اور مومنوں کے بارے میں گزرے ہیں، زیر بحث آیات میں جنتیوں کی صفوں میں جاننے کی ترغیب و تشویق اور دوزخیوں کی راہ و رسم سے بچنے کے لیے چند خدائی نعمتوں کا ذکر اور پھر اس کے عذابوں کے ایک حصہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔
فرماتا ہے: ”وہی تو ہے کہ جس نے زمین کو تمھارے لیے رام کر دیا ہے“ (هو الذی جعل لکم الارض ذلولاً)۔

”پس تم زمین کے دوش پر چلو پھرو، اور پروردگار کی روزیوں میں سے کھاؤ اور جان لو کہ سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔“ (فامشوا فی مناكبھا وکلوا من رزقہ والیہ النشور)۔

”ذلول“ رام ہونے کے معنی میں ایک جامع ترین تعبیر ہے جو زمین کے بارے میں ممکن ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہ تیز رو سواری بہت ہی تیز اور متعدد حرکات رکھنے کے باوجود ایسی پرسکون نظر آتی ہے گویا کہ مطلقاً ساکن ہے۔ بعض ماہرین کہتے ہیں کہ زمین چودہ قسم کی مختلف حرکتیں رکھتی ہے۔ جن میں سے تین اقسام یعنی اس کی اپنے محور پر حرکت، سورج کے گرد حرکت اور منظومہ شمسی کے ہمراہ کہکشاں کے اندر حرکت ہے۔ یہ حرکات جو بہت ہی زیادہ تیز ہیں ایسی نرم اور ملائم ہیں کہ جب تک زمین کی حرکت پر قطعی دلائل قائم نہیں ہوتے تھے، کوئی شخص باور ہی نہیں کرتا تھا کہ اس میں کوئی حرکت ہے۔

دوسری طرف زمین نہ تو اس طرح کی سخت ہے کہ قابل زندگی ہی نہ ہو اور نہ ہی اس طرح کی ڈھیلی اور اور نرم ہے کہ قرار و آرام نہ پکڑتی ہو۔ بلکہ یہ مکمل طور پر انسانی زندگی کے لیے رام ہے۔ مثلاً اگر زمین زیادہ پکڑ والی ہوتی جس میں ہر چیز دھنس جاتی، یا نرم ریت ہوتی کہ جس میں انسان کے پاؤں گھٹنوں تک دھنس جاتے

یا تیز اور سخت پتھر ہوتے جو تھوڑا سا چلنے سے انسانی بدن کو زخمی کر دیتے تو اس سے زمین کی بے آرامی کے معنی واضح ہو جاتے۔

تیسری طرف اس کا فاصلہ سورج سے نہ تو اتنا کم ہے کہ تمام چیزیں گرمی کی شدت سے جل جائیں اور نہ ہی اتنا زیادہ ہے کہ ہر چیز سردی سے خشک ہو جائے۔ زمین پر ہوا کا دباؤ اس طرح سے ہے جو انسان کو سکون و آرام دیتا کرتا ہے، وہ نہ تو اس قدر زیادہ ہے کہ انسان کا گلا گھونٹ دے اور نہ اس قدر کم ہے کہ وہ پارہ پارہ ہو جائے۔ زمین کی قوتِ جاذبہ نہ اس قدر زیادہ ہے کہ وہ ہڈیوں کو توڑ دے اور نہ ہی اس قدر کم ہے کہ ایک ہی حرکت سے انسان اپنی جگہ سے اکھڑ جائے اور فضا میں جا پڑے۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے 'ذلول' اور انسان کے حکم کے آگے مستخر اور رام ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ زمین کے ذلول اور مطیع ہونے کی توصیف کے بعد حکم دیتا ہے کہ اس کے کندھوں پر چلو۔ ہم جانتے ہیں کہ 'منکب' جمع 'منکب' (بروزن مغرب) کندھے کے معنی میں ہے، گویا انسان زمین کے کندھے پر قدم رکھتا ہے اور زمین ایسی نرسکون ہے کہ وہ اپنے اعتدال کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب تک تم قدم نہ اٹھاؤ گے اور سعی و کوشش نہ کرو گے، زمین کی دوزیوں سے بہرہ مند نہ ہو پاؤ گے۔

'رزق' کی تعبیر بھی ایک بہت ہی جامع تعبیر ہے جو زمین کے تمام موادِ غذائی کو چاہے وہ حیوانی ہو یا نباتی یا مدنی، سب کو شامل ہے۔

لیکن جان لو کہ یہ تمہاری خلقت کا مقصد اصلی نہیں ہے۔ یہ سب کے سب تو تمہارے "فشوور" قیامت اور حیاتِ ابدی کی راہ کے لیے وسائل و ذرائع ہیں۔

اس تشریح اور بشارت کے بعد تہدید و انذار کی بات کرتا ہے۔ مزید کہتا ہے: "جو آسمان پر حاکم ہے، کیا تم اس کے عذاب سے اپنے آپ کو امان میں سمجھتے ہو کہ زمین اس کے حکم سے پھٹ جائے، وہ تمہیں اپنے اندر نکل لے اور ہمیشہ لرزتی اور کانپتی رہے۔" (ء امنتع من فی السماء ان یخسف بککم الارض فاذا ہی تموسر)۔

ہاں! اگر وہ حکم دے تو یہ مایع دساکن زمین سرکش ہو جائے اور وحشی جانور کی صورت اختیار کر لے، زلزلے آنے شروع ہو جائیں، زمین میں شگاف پڑ جائیں اور وہ تمہیں، تمہارے گھروں اور شہروں کو نکل جائے اور پھر بھی لرزتی اور کانپتی رہے۔

"فاذا ہی تموسر" وہ ہمیشہ لرزتی رہے اور بے سکون رہے، کا جملہ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ خدا یہ حکم دے سکتا ہے کہ زمین تمہیں نکل جائے اور تمہیں مسلسل ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنے اندر

ہی اندر منتقل کرتی رہے۔ یہاں تک کہ تھاری قبر بھی ساکن اور بغیر حرکت کے نہ ہو۔

یہ ہے کہ زمین اپنے سکون و آرام کو ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھے اور اس میں ہمیشہ زلزلے آتے رہیں اس معنی کا ادراک ان لوگوں کے لیے آسان ہے جنہوں نے بعض زلزلہ خیز علاقوں میں زندگی بسر کی ہے۔ انہوں نے دیکھا ہوگا کہ بعض اوقات زمین کئی کئی دن اور راتیں بالکل بے سکون و بے آرام رہتی ہے۔ تب ان سے کہا جائے گا کہ سونا اور آرام کرنا ختم ہو جاتا ہے لیکن ہم لوگوں کے لیے جنہوں نے عادتاً زمین کے آرام و سکون سے ہی کو دیکھا ہے اس کا سمجھنا مشکل ہے۔

”من فی السماء (وہ جو آسمان میں ہے) کی تعبیر خدا کی ذات پاک کی طرف اشارہ ہے کہ جس کی حاکمیت زمین تو کیا آسمانوں پر بھی مُسَلَّم ہے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ خدا کے فرشتوں کی طرف اشارہ ہے جو آسمانوں میں ہیں اور اس کے فرمان کے اجراء پر مأمور ہیں۔“

❖ ❖ ❖

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”ضروری نہیں ہے کہ حتمی طور پر زلزلے ہی تھاری طرف آئیں، بلکہ وہ یہ فرمان تغذیہ آندھیوں کو دے سکتا ہے۔ کیا تم اپنے آپ کو امان میں سمجھتے ہو کہ آسمانوں کا حاکم خدا ایسی تیز آندھی جو سنگرزوں پر ہوتی ہو تم پر بھیج دے اور تمہیں اس پہاڑ کے نیچے دفن کر دے؟“ (ام امنتم من فی السماء ان یرسل علیکم خاصباً)۔

”اور تم جلدی ہی جان لو گے کہ میری ہتدیدیں (اور دھمکیاں کیسی ہیں)۔“ (فستعلمون کیف نذرتکم) اس معنی کا ادراک ان لوگوں کے لیے بہت آسان ہے جنہوں نے چلتی ہوئی ریت اور خاصب اور ہوا میں دیکھی ہیں۔ (یہ جو ایں ریت کے جو تودے اپنے ساتھ لے جاتی ہیں انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی رہتی ہیں) وہ جانتے ہیں کہ چند ہی لمحوں کے اندر گھر اور آبادیاں رواں دواں ریت کے تودوں کے نیچے دفن ہو سکتی ہیں یا وہ قافلے جو بیابان کے وسط میں چل رہے ہوتے ہیں اس کے نیچے دفن ہو سکتے ہیں۔

❖ ❖ ❖

حقیقت میں اوپر والی آیات اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ یہ عذاب قیامت کے عذاب میں سے نہیں ہے۔ اس دنیا میں خدا زمین کی مختصر سی حرکت یا آندھیوں کے چلنے سے ان کی زندگی کو ختم کر سکتا ہے۔ اس امکان کی بہترین دلیل گزشتہ امتوں میں ان امور کا واقع ہونا ہے۔

لہذا آخری زیر بحث آیت میں کہتا ہے:

”وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے انہوں نے خدا کی آیات اور اس کے رسولوں کی تکذیب کی لہذا انہیں دیکھو میری دی ہوئی سزا اور عذاب ان کے حق میں کیسا تھا؟“ (ولقد کذب الذین من قبلہم فلعلکم تترعون)۔

(حاشیہ لہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

ایک گروہ کو تباہ کرنے والے زلزلوں سے، کچھ قوموں کو بجلیوں سے اور ایک جماعت کو طوفان یا تیز آندھیوں کے ذریعہ سزا دی، اور ان کے تباہ شدہ خاموش شہروں کو ہم نے درسِ عبرت کے طور پر باقی رہنے دیا:

❖ ❖ ❖

(عاشیہ سابقہ صفحہ) لے سکیں انکار کے معنی میں ہے اور یہاں عذاب و سزا سے کنایہ ہے کیونکہ خدا کا انکار ان قوموں کے افعال کے مقابلہ میں ان کی سزا کے طریقے سے صورت پذیر ہوا، اس بات پر توجہ رہے کہ یہ لفظ منکیری تھا۔ جیسا کہ گذشتہ آیت میں لفظ نذیر نذیری تھا (میرا انکار اور میرا ڈرانا) ”یَا“ متکلم صفت ہو گئی اور زیر جو اس پر دلالت کرتی ہے باقی رہ گئی۔

۱۹) أَلْوَيْدُوا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَفَتْ وَيَقْبِضُ
مَا يُمْسِكُنَّ إِلَّا الرَّحْمَنُ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ

بَصِيرٌ

۲۰) أَمَّنْ هَذَا الَّذِي هُوَ جُنْدٌ لَكُمْ يَنْصَرِكُمْ مِ

دُونِ الرَّحْمَنِ إِنَّ الْكُفْرَانَ إِلَّا فِي غُرُورٍ

۲۱) أَمَّنْ هَذَا الَّذِي يَرْزُقُكُمْ إِنْ أَمْسَكَ رِزْقَهُ

بَلْ لَجَوَانِي عْتَوْ وَنَفُورٍ

ترجمہ

۱۹) کیا انھوں نے ان پرندوں کی طرف نہیں دیکھا، جو ان کے سروں کے اوپر کبھی اپنے پروں

کو پھیلاتے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں؟ خدائے رحمن کے سوا کوئی

انھیں آسمان کی بلندی پر روکے ہوئے نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے۔

۲۰) کیا وہ جو تمہارا شکر ہے وہ خدا کے مقابلہ میں تمہاری مدد کر سکتا ہے؟ لیکن کافر تو صرف

دھوکہ میں ہیں۔

۲۱) کیا وہ جو تمہیں روزی دیتا ہے اگر وہ اپنی روزی روک لے، (تو تمہاری ضروریات کو کون

کر سکتا ہے؟ لیکن وہ نرسرکشی اور حقیقت سے فرار کرتے ہوئے ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہیں

تفسیر

اپنے سر کے اوپر ان پرندوں کی طرف دیکھو

اس سورۃ کی ابتدائی آیات میں جب خدا کی قدرت اور مالکیت کے بارے میں بحث تھی تو ساتوں آسمانوں، ان کے ستاروں اور کواکب کے بارے میں گفتگو تھی۔ لیکن یہاں پہلی زیر بحث آیت میں اسی مسئلہ قدرت کو عالم ہستی کے بظاہر ایک پھوٹے سے موجود کے ذکر کے ذریعہ بیان کیا جا رہا ہے۔ فرماتا ہے: ”کیا انہوں نے ان پرندوں کی طرف نہیں دیکھا جو ان کے سروں کے اوپر کبھی اپنے پروں کو پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں؟“ (اولم یروا الی الطیر فوقہم مصافات ویقبضن)۔ لے

یہ سنگین جسم قانون جاذبہ کے برخلاف زمین سے اٹھتے ہیں اور آرام کے ساتھ آسمان کی بلندی پر گھنٹوں تک اور بعض اوقات ہفتوں اور مہینوں تک مسلسل اپنی سرخی اور نرم حرکت کو جاری رکھتے ہیں، اور انہیں اس میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

پرواز کرتے وقت اکثر پرندے اپنے پروں کو کھولے ہوئے ہوتے ہیں۔ ”صافات“ گویا ایک پُر اسرار قوت انہیں چلا رہی ہوتی ہے۔

جبکہ بعض ہمیشہ پر مار رہتے رہتے ہیں۔ (ممکن ہے یقبضن اسی معنی کی طرف اشارہ ہو) بعض دوسرے کبھی پر مار رہتے ہیں اور کبھی پروں کو پھیلا لیتے ہیں۔

چوتھا گروہ ایک مدت تک پر مارتا ہے اور جب تیزی پکڑ لیتا ہے تو اپنے پروں کو کلی طور پر سمیٹ لیتا ہے اور فضا کے سمندر میں غوطہ لگا لیتا ہے (مثلاً چڑیا) خلاصہ یہ ہے کہ باوجودیکہ وہ سب پرواز کرتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے۔

ان کے جسم کو کس نے اس طرح سے پیدا کیا ہے کہ وہ آرام و سکون کے ساتھ فضا میں سیر کرتے ہیں؟ ان کے پروں کو یہ قدرت کس نے عطا کی اور انہیں پرواز کا علم سکھایا ہے؟ خصوصاً مہاجر پرندوں کی پیچیدہ قسم کی اجتماعی پرواز جو بعض اوقات کئی کئی ماہ تک طول کھینچتی ہے اور ہزاروں کلومیٹر کا راستہ طے کر کے بہت سے ملکوں، پہاڑوں، دروں، جنگلوں اور سمندروں کے اوپر سے گزر کر اپنے مقصد تک پہنچتی ہیں۔ واقعتاً ایسی قوت

لے ”الطیر“ طائر کی جمع ہے۔ اسی لیے اس کا فعل اور صفت جمع کی صورت میں آیا ہے۔ بعض نے جو یہ تصور کیا ہے کہ طیر مفرد ہے تو یہ ارباب لغت کی تصریح کے خلاف ہے۔

اور آگاہی انہیں کس نے عطا کی ہے؟

لہذا آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "خدا کے رحمن کے سوا کوئی انہیں آسمان کی بلندی پر روکے ہوئے نہیں ہوتا، کیونکہ وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے اور ہر مخلوق کی نیاز اور حاجت کو جانتا ہے۔" (ما یسکمن الا الرحمن انہ جکل شیء بصیر)۔

وہی تو ہے کہ جس نے انہیں پرواز کے لیے مختلف وسائل اور استعدادیں عطا کی ہیں۔ ہاں! خدا کے رحمن جس کی رحمتِ عاترہ نے تمام موجودات کو گھیرا ہوا ہے، اسی نے پرندوں کو بھی ان کی ضرورت کی چیزیں بخشی ہیں۔ ہستی آسمان اور فضا میں پرندوں کو روکے ہوئے ہے، وہی زمین اور دوسری موجودات کی بھی نگہدار ہے۔ جب ارادہ کر لے تو نہ پرندہ پرواز کر سکتا ہے اور نہ ہی زمین اپنے سکون کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔

"صافات" و "یقبضن" (پرول کو پھیلاتے اور سمیٹتے ہیں) کی تعبیر ممکن ہے مختلف پرندوں کی طرف ایک ہی پرندہ کے مختلف حالات کی طرف اشارہ ہو۔

ہم نے پرندوں کی دنیا اور ان کی پرواز کے عجائبات کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۶ (سورۃ نحل کی آیت کے ذیل میں) تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

بعد والی آیت میں اس معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کفار خدا کی قدرت کے مقابلہ میں کبھی قسم کا کوئی مددگار نہیں رکھتے، فرماتا ہے: "کیا وہ جو تمہارا لشکر ہے، وہ خدا کے مقابلہ میں تمہاری مدد کر سکتا ہے؟" (ہذا الذی ہو جند لکم ینصرکم من دون الرحمن)۔

نہ صرف یہ کہ وہ مصیبتوں میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے بلکہ اگر وہ چاہے تو انہیں کو تمہارے عذاب نابودی پر مقرر کر دے۔ کیا پانی، ہوا، مٹی اور آگ تمہارے خدمت گزار اور تمہاری زندگی کے ارکان نہیں ہیں لیکن خدا نے انہیں کو سرکش اقوام کی نابودی پر مامور کر دیا۔ نیز تاریخ میں بہت ایسے واقعات محفوظ ہیں کہ بادشاہ فراعنہ اور سرکش حکمرانوں کے نزدیک ترین افراد ہی ان کی موت کا سبب بن گئے۔ موجودہ زمانہ کی تاریخ میں ماجرادیکھنے میں آیا ہے کہ حکومتوں کی وفادار ترین طاقتوں نے ہی ان کے خلاف بغاوت کر دی، اور ان موت کا فرمان جاری کیا۔

اس بارے میں کہ "صافات" و "یقبضن" فعل مضارع کی صورت میں آیا ہے، ممکن ہے یہ اس وجہ سے کہ پرول کا پھیلانا ایک خاص انداز ہے جبکہ کھولنا اور بند کرنا پرول کی تکرار ہے۔

اس جملہ میں حرفِ عطف ہے۔ "من" بتداء "ہذا" دوسرا بتداء اور "الذی" اس کی خبر ہے۔ "ہو جند لکم" صلہ ہے اور "ینصرکم" جند کی صفت اور جملہ کے پہلے بتداء کی خبر ہے (البیان فی غریب اعراب القرآن جلد ۲ ص ۴۵۹) لیکن یہ ہے کہ الذی عطف بیان ہو اور "ینصرکم" خبر ہو۔ کیونکہ اس کے بغیر جملہ ناقص ہے۔ (غور کیجیے)

لیکن کافر صرف دھوکہ، فریب اور غفلت میں گرفتار ہیں۔ ”ان الکافرون الا فی خسوفٍ“ دھوکہ، فریب اور جہالت کے پردے ان کی عقلوں پر پڑے ہوئے ہیں۔ وہ انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ تاریخ کے صفحات پر یا اپنی زندگی کے گوشہ و کنار میں یہ درس عبرت دیکھیں۔
 ’جند‘ اصل میں ناہموار اور ایسی سخت زمین کے معنی میں ہے جس میں بہت زیادہ پتھر جمع ہو گئے ہوں۔ اسی مناسبت سے بہت زیادہ شکر کو بھی ’جند‘ کہتے ہیں۔
 بعض مفسرین زیر بحث آیت میں جند کو بتوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ وہ قیامت میں مشرکین کی مدد پرگز قدرت نہیں رکھتے۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے اور وہ بت بھی اس کا ایک امدان ہو سکتے ہیں۔

پھر مزید تاکید کے لیے کہتا ہے: ”کیا وہ ہستی جو تمہیں روزی دیتی ہے، اگر وہ اپنی روزی تم سے روک لے تو تمہیں کون بے نیاز کر سکتا ہے؟“ (امن لهذا الذی یرزقکم ان امسک رزقہ)۔
 اگر وہ آسمان کو حکم دے دے کہ وہ بارش نہ برسا کے اور زمین سبز نہ اگائے یا مختلف قسم کی نباتی آفات پھلوں کو نابود کر دیں تو کس میں یہ طاقت ہے کہ تمہارے لیے کوئی غذا تیار کر دے؟ نیز اگر وہ معنوی روزیاں اور آسمانی وحی تم سے منقطع کر لے تو کس میں یہ طاقت ہے کہ تمہاری راہنمائی کرے؟
 یہ واضح حقائق ہیں، لیکن ہٹ دھرمی اور گستاخی انسان کے ادراک اور شعور کے آگے ایک حجاب بن جاتی ہے۔ اس لیے آیت کے آخر میں فرماتا ہے:
 ”لیکن وہ تو سرکشی اور حقیقت سے فرار کرتے ہوئے ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہیں“ (سبل لجوا

فی عتو و نفوس)۔
 اس موجودہ زمانہ میں بھی جبکہ انسان کی زندگی کے مختلف جہات ہیں، خصوصاً غذائی مصنوعات میں بہت ہی ترقی ہو چکی ہے، اگر صرف ایک ہی سال کے لیے مطلقاً بارش نہ ہو تو ساری دنیا میں کیسی مصیبت کھڑی ہو جائے گی، یا ٹیڈی دل کا شکر اور آفاتِ نباتی ہر جگہ کو گھیر لیں تو کیسی مصیبت واقع ہو جائے گی۔

آیت میں جزاء کی شرط مفذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے ”ان امسک رزقہ من سیرن تمکم خیرہ“ (اگر وہ اپنے روک لے تو اس کے علاوہ کون تمہیں رزق دے گا۔)

ایک نکتہ

انسانوں کی ناکامی کے چار عوامل

گذشتہ آیات میں بیان ہوا تھا کہ سننے والا کان اور بیدار عقل کا نہ ہونا، وہ اہم ترین عامل ہے جو دوزخیوں کو دوزخ کی طرف کھینچ کر لے جائے گا۔ زیر بحث آیات میں یہ بیان ہوا ہے کہ دوسرے چار عوامل یعنی ”دھوکہ و فریب“، ”ہٹ دھرمی“، ”سرکشی“ (عنت) اور ”حق سے دوری اختیار کرنا“ (نغون) انسان کی بدبختی اور گمراہی کا سبب ہیں۔

اگر ہم صحیح طور پر غور کریں تو ہم دیکھ لیں گے کہ یہ عوامل گزشتہ عوامل کے ساتھ مربوط ہیں۔ کیونکہ یہ بری صفات انسان کے کان اور آنکھ پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور اس کے لیے حقائق کے ادراک سے مانع ہو جاتی ہیں۔

❖ ❖ ❖

۲۲) اَفَمَنْ يَّمْشِي مُكِبًّا عَلَىٰ وَجْهِهِ أَهْدَىٰ أَمَّنْ يَمْشِي سَوِيًّا عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝

۲۳) قُلْ هُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۗ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۝

۲۴) قُلْ هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۝

۲۵) وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝

۲۶) قُلْ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ ۖ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝

۲۷) فَلَمَّا رَأَوْهُ زُلْفَةً سَيِّئَتْ وُجُوهُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَقِيلَ هَذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تَدْعُونَ ۝

ترجمہ

۲۲) کیا وہ شخص جو منہ کے بل گرا ہوا چل رہا ہو ہدایت کے زیادہ نزدیک ہے یا وہ شخص جو راست قامت صراط مستقیم پر گامزن ہے؟

۲۳) کہہ دیجئے وہی تو ہے کہ جس نے تمہیں پیدا کیا ہے ، اور تمہارے لیے کان ، آنکھیں اور دل قرار دیتے ، لیکن تم بہت ہی کم شکر کرتے ہو۔

۲۴) کہہ دیجئے کہ وہی تو ہے کہ جس نے تمہیں زمین میں پیدا کیا ، اور اسی کی طرف تم لوٹ جاؤ گے۔

۲۵) وہ کہتے یہ ہیں کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو یہ قیامت کا وعدہ کب پورا ہو گا۔

۲۶) کہہ دیجئے کہ اس کا علم تو خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے ، اور میں تو صرف واضح دانش ڈرانے والا ہوں۔

۲۷) جس وقت اس وعدہ الہی کو قریب سے دیکھیں گے تو کافروں کے چہرے قیح اور سیاہ ہو جائیں گے اور انہیں کہا جائے گا ، یہ وہی چیز ہے جس کا تم تقاضا کیا کرتے تھے۔

تفسیر

شاہراہ توحید کے راست قامت افراد

گذشتہ آیات کے بعد پہلی زیر بحث آیت میں کفار و مومنین کے ان دونوں گروہوں کی حالت کی کیفیت ایک عمدہ مثال کے ضمن میں منکس کرتے ہوئے فرماتا ہے : ”کیا وہ شخص جو منہ کے بل گرا ہوا چل رہا ہے ، ہدایت کے زیادہ نزدیک ہے یا وہ شخص جو راست قامت صراطِ مستقیم پر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے“ (اذمن یشی مکباً علی وجہہ اہدی امن یشی سویاً علی صراط مستقیم)۔

یہاں بے ایمان ، ظالم ، ہٹ دھرم اور فریبی لوگوں کو ایسے شخص کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو ناہوار اور پیچ و خم سے پُر راہ سے گزر رہا ہو ، وہ منہ کے بل گرا ہوا ہو ، اور ہاتھ پاؤں سے یا سینہ کے بل چل رہا ہو ، نہ ٹھیک طرح سے راستہ دیکھ سکتا ہو اور نہ ہی اپنے اوپر نظر کر سکتا ہو ، نہ رکاوٹوں سے باخبر ہو اور نہ ہی سرعت اور تیزی سے چل سکتا ہو ، تھوڑا سا رستہ چلتا ہو اور پھر تھک جاتا ہو۔

لیکن مومنین کو ایسے راست قامت افراد سے تشبیہ دیتا ہے جو ہموار، صاف اور سیدھے راستے پر سرعت قدرت اور پوری آگاہی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہوں۔

کتنی عمدہ اور دقیق تشبیہ ہے، جس کے آثار ان دونوں گروہوں میں مکمل طور پر نمایاں ہیں اور ہم اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔

بعض نے ان دو گروہوں کا منظر پیغمبر اسلامؐ اور ابو جہل کو شمار کیا ہے۔ یقیناً یہ دونوں اوپر والی آیت کے روشن اور واضح مصداق ہیں، لیکن آیت کے مفہوم کی عمومیت کو محدود نہیں کرتے۔

”مکثاً علیٰ وجہہ“ میں کئی ایک احتمال دیئے گئے ہیں :

جو تفسیر اس کے لغوی مفہوم کے ساتھ زیادہ سازگار ہے وہ وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے، یعنی وہ ایسا شخص ہے جو منہ کے بل گرا ہوا ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے سینہ کے بل چل رہا ہو۔

لیکن بعض نے کہا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ سیدھا چل رہا ہے لیکن سر نیچے کیے ہوئے ہے اور اپنے راستے کو کسی طرح سے نہیں دیکھتا۔

جبکہ بعض یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد ایسا شخص ہے جو اپنے اعتدال کو محفوظ نہیں رکھتا، چند قدم چلتا ہے اور زمین پر گر پڑتا ہے، پھر کھڑا ہو جاتا ہے اور مسلسل اسی کیفیت کی تکرار کرتا رہتا ہے۔

راغب کے مفردات میں بعض کلمات سے بھی یہی مفہوم نکلتا ہے، اس سے مراد ایسا شخص ہے جس کی پوری توجہ اپنی ہی وضع و کیفیت کی طرف ہے اور وہ اپنے غیر سے غافل ہے لیکن پہلا معنی مومنین کی وضع کے مقابلہ کے قرینہ سے زیادہ مناسب نظر آتا ہے کہ اس کی ”سویا“ سے تعبیر ہوئی ہے۔

بہر حال کیا کافر و مومن کی یہ وضع و کیفیت آخرت میں ہوگی؟ یا دونوں جہانوں میں؟ آیت کے معنی کے محدود ہونے پر کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے۔ وہ دنیاوی زندگی میں بھی اسی طرح ہوں گے اور آخرت میں بھی۔

ہاں! بے ایمان افراد چونکہ خود خواہ، خود پرست اور ہٹ دھرم ہوتے ہیں اور اپنے مادی اور جلد گزر جانے والے منافع کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھتے۔ چونکہ ان کی راہ ایک ہوا پرست کی راہ ہے، لہذا وہ اس شخص کی مانند ہیں جو سنگلاخ زمین سے گزرتے ہیں اور سینہ کے بل ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے رہتے ہیں، لیکن وہ لوگ جو ایمان کے سائے میں ہوا کے نفس کی قید سے چھوٹ چکے ہیں وہ ایک گہری بصیرت اور صاف و واضح راستہ رکھتے ہیں۔

بعد والی آیت میں پیغمبر کو مخاطب کر کے مزید کہا ہے: ”کہہ دیجئے، وہی تو ہے کہ جس نے تمہیں پیدا کیا ہے، اور تمہارے لیے کان آنکھیں اور دل قرار دیئے ہیں لیکن تم بہت ہی کم شکر کرتے ہو۔“ (قل ھو

الذی انشأکم وجعل لکم السمع والابصار والانفۃ قلیلاً ما تشکرون۔

خدا نے مشاہدے اور تجربے کا ذریعہ اور وسیلہ (آنکھ) بھی تمہارے اختیار میں قرار دی۔ دوسروں کے انعام سے آگاہی کا ذریعہ (کان) اور علوم عقلیہ میں عذوق کر کرنے کا ذریعہ (قلب) بھی دیا۔ خلاصہ یہ کہ سب قسم کے عقلی و نقلی علوم سے آگاہی کے لیے تمام ضروری آلات تمہارے اختیار میں دے دیئے ہیں۔ لیکن ان تمام عظیم نعمتوں کا بہت کم لوگ شکر یہ ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ شکر نعمت یہ ہے کہ ہر نعمت کو اسی مقصد کے لیے استعمال کیا جائے جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے۔ کیا واقفاً سب لوگ کان، آنکھ اور عقل سے اسی طریقہ سے استفادہ کرتے ہیں؟

❖ ❖ ❖

پھر دوبارہ پیغمبر کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”مجھ دیکھو وہی تو ہے جس نے تمہیں زمین میں پیدا کیا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹ کر جاؤ گے اور اسی کے پاس تم جمع ہو گے۔“ (قل هو الذی ذرأکم فی الامرض والیہ تحشرون)۔

حقیقت میں پہلی آیت راستے کو شخص کرتی ہے اور دوسری آیت کام کے آلات و وسائل کو اور یہ آیت ہدف و مقصد کو کہ اسلام و ایمان کے سیدھے راستے اور صراطِ مستقیم میں قدم آگے بڑھاؤ، معرفت اور شناخت کے تمام آلات سے فائدہ اٹھاؤ اور جاودانی زندگی کی طرف چل پڑو۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں انشاء کا کلمہ کی تعبیر ہوئی ہے اور اس آیت میں ”ذرأکم“ آیا، ممکن ہے ان دونوں تعبیروں کا فرق اس بات میں ہو کہ پہلا جملہ تو انسان کو عدم سے وجود میں لانے کی طرف اشارہ ہو (یعنی تم نہیں تھے اور خدا نے تمہیں پیدا کیا ہے) نیز دوسرا جملہ مادہ خاکی سے انسان کی پیدائش کی طرف اشارہ ہو۔ یعنی ہم نے تمہیں خاک سے پیدا کیا ہے۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد اسی رابطہ میں منکرین معاد کی گفتگو اور ان کا مطالبہ پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”وہ استہزاء کے طور پر کہتے ہیں: اگر تم سچ کہتے ہو تو یہ قیامت کا وعدہ کس وقت پورا ہو گا۔“ (ویقولون مستیٰ ہذا الوعد ان کنتم صادقین)۔ تم اس کی کوئی یقینی تاریخ معین کیوں نہیں کرتے؟ اور اس لحاظ سے تم سب کی ذمہ داری واضح کیوں نہیں کرتے؟

ہذا الوعد سے کیا مراد ہے۔ اس کے دو احتمال بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا قیامت کا وعدہ، دوسرا دنیا کی گونا گوں سزاؤں کا وعدہ، مثلاً زلزلے، صائقے، بیماریاں اور طوفان۔ لیکن گزشتہ آیت کی طرف توجہ کرتے ہوئے پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے اگرچہ دونوں معانی کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

بعد والی آیت میں انہیں اس طرح جواب دیتا ہے: ”کہہ دیجئے اس موضوع کا علم و آگہی تو خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور میں تو صرف واضح و آشکار انذار کرنے والا اور ڈرانے والا ہوں۔“ (قتل انسا العلم عند اللہ و انسا انا نذیر مبین)۔

یہ تعبیر ٹھیک اسی چیز کے مشابہ ہے جو قرآن کی متعدد آیات میں آئی ہے۔ مجملہ سورہ اعراف کی آیت ۱۸۷ میں آیا ہے: ”قتل انسا علمہا عند ربی“ کہہ دیجئے کہ قیامت کے وقوع کے زمانہ کا علم صرف میرے پروردگار کے پاس ہے۔

❖ ❖ ❖

اور ایسا ہی ہونا چاہیے، کیونکہ اگر قیامت کی تاریخ معلوم ہوتی اور اس کا عرصہ اور فاصلہ زیادہ ہوتا تو لوگ غفلت میں پڑ جاتے اگر وہ عرصہ کم ہوتا تو اضطراب جیسی حالت پیدا کر لیتے اور دونوں حالتوں میں تربیتی اہداف ناممکن رہ جاتے۔

❖ ❖ ❖

آخری زیر بحث آیت میں مزید کہتا ہے: ”جس وقت اس وعدہ الہی اور عذاب کو قریب سے مشاہدہ کریں گے تو کافروں کے چہرے قبیح اور سیاہ ہو جائیں گے“ جیسا کہ غم و اندوہ کے آثار ان سے برس برس ہیں۔ (فلما رأوه نزلتہ سیئت وجوه الذین کفروا)۔ اور ان سے کہا جائے گا: ”یہ وہی چیز ہے جس کا تم تقاضا کیا کرتے تھے۔“ (و قیل لهذا الذی کنتم بہ تدعون)۔

”تدعون“ دعا کے مادہ سے ہے۔ یعنی تم ہمیشہ اصرار اور تقاضا کیا کرتے تھے کہ قیامت واقع ہو، اب وہ واقع ہو گئی ہے۔ اور اس سے راہ فرار ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا یہ مضمون حقیقت میں اسی چیز کے مشابہ ہے جو سورہ ذاریت کی آیت ۱۴ میں کفار کو مخاطب کرتے ہوئے آیا ہے کہ قیامت کے دن ان سے کہا جائے گا:

”هذا الذی کنتم بہ تستعجلون“۔ ”یہ وہی چیز ہے جس کے لیے تم جلدی کیا کرتے تھے۔“ بہر حال یہ عذاب قیامت کے بارے میں ہی بیان کر رہی ہے جیسا کہ اکثر مفسرین نے کہا اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ متی هذا الوعد کا جملہ بھی قیامت کے وعدہ کی طرف اشارہ ہے۔

❖ ❖ ❖

لہٰذا تدعون ”باب انتقال“ سے اور دعاء کے مادہ سے تقاضا کرنے کے معنی میں ہے یا دعوا کے مادہ سے تقاضا یا کسی چیز سے انکار کرنے کے معنی میں ہے۔

حاکم ابوالقاسم حکمانی کہتا ہے :

”جب کافروں نے خدا کے ہاں امام علیؑ کے مقامات کو مشاہدہ کیا

تو ان کے چہرے (غیظ و غضب کی شدت سے) سیاہ ہو گئے۔“

ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے بھی یہی مطلب نقل ہوا ہے کہ یہ آیت المیر المؤمنین علیؑ اور آپ کے

یار و انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔“

البتہ یہ تفسیر جو شیعہ اور اہل سنت کے طرق سے نقل ہوئی ہے ایک قسم کی تطبیق کے قبیل سے ہے،

ورنہ آیت کا محل وقوع معاد و قیامت کے ساتھ مربوط ہے اور اس قسم کی تطبیق روایات میں کچھ کم نہیں۔

❖ ❖ ❖

اور آپ کے نبیل سے ہے نہیں۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَهْلَكَنِی اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِیَ ۙ أَوْ رَحِمَنَا ۚ فَمَنْ یُّجِیْرُ الْکَافِرِیْنَ مِنْ عَذَابِ الْیَوْمِ ۚ (۲۸)

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلِیْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ (۲۹)

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ یَأْتِیْكُمْ بِسَآءٍ مُّعِیْنٍ ۚ (۳۰)

ترجمہ

(۲۸) کہہ دیجئے : اگر خدا مجھے اور ان تمام لوگوں کو جو میرے ساتھ ہیں ہلاک کر دے یا ہم پر رحم کر دے تو بھی کافروں کو دردناک عذاب سے کون پناہ دے گا؟

(۲۹) کہہ دیجئے : وہ خدا رحمن ہے ، ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور اسی پر ہم نے توکل کیا ہے ، اور عنقریب تم جان لو گے کہ کون شخص واضح گمراہی میں ہے۔

(۳۰) کہہ دیجئے : مجھے بتاؤ اگر تمہاری (سرزمین کے) پانی زمین کے اندر چلے جائیں تو کون تمہارے لیے جاری پانی لا سکتا ہے؟

تفسیر

جاری پانی تمہارے اختیار میں کون دیتا ہے؟

اوپر والی آیات جو سورۃ ملک کی آخری آیات ہیں اور وہ سب لفظ 'قل' سے، جو پیغمبرؐ کو خطاب ہے شروع ہوتی ہیں، انہیں باتوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں جو گزشتہ آیات میں کفار کے ساتھ ہوئی ہیں اور ان کے دوسرے پہلو ان آیات میں بیان ہوئے ہیں۔

سب سے پہلے ان لوگوں کے بارے میں کہ جو غالباً پیغمبرؐ اور ان کے اصحاب کی موت کے انتظار میں تھے وہ یہ گمان کرتے تھے کہ آپ کی وفات سے آپ کا دین ختم ہو جائے گا اور باقی کچھ نہ رہے گا۔ (عام طور پر شکست خوردہ دشمن سچے رہبروں کے بارے میں ہمیشہ یہی توقع رکھتے ہیں) فرماتا ہے: "کہہ دیجیے اگر خدا مجھے اور ان تمام کو جو میرے ساتھ ہیں ختم کر دے یا ہم پر رحم کرے تو بھی کفار کو دردناک عذاب سے کون پناہ دے گا؟" (قتل اس آیت ان اهلکنى الله ومن معى اور رحمتا فمن یحییہر الکافرین من عذاب الیوم)۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ کفار مکہ پیغمبرؐ اسلام اور مسلمانوں کے لیے بددعا (نفرین) کیا کرتے اور ان کی موت کی دعائیں مانگا کرتے تھے، ان کا گمان یہ تھا کہ اگر آنحضرتؐ دنیا سے چلے جائیں تو آپ کی دعوت بھی ختم ہو جائے گی، تب اوپر والی آیت نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا۔

اسی معنی کے مشابہ سورۃ طور کی آیت ۳۰ میں بھی آیا ہے، جہاں کتا ہے: ام یقولون شاعر متربص بلہ ربیب المنون "وہ سمجھتے ہیں کہ محمدؐ (م) ایک شاعر ہے جس کی موت کا ہم انتظار کر رہے ہیں" وہ اس بات سے غافل ہیں کہ محمدؐ مصطفیٰؐ سے الطاف حق تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر وہ مر بھی جائیں تو اس سے حق کا پیغام نہیں مرے گا۔ ہاں! اس دین کی کامیابی اور تمام جہان پر اس کے غلبہ کا انہیں وعدہ دیا گیا ہے، اور پیغمبر اکرمؐ کی حیات اور موت کسی چیز کو نہیں بدلے گی۔

بعض نے اس آیت کی ایک اور تفسیر بیان کی ہے کہ خدا پیغمبرؐ سے یہ فرما رہا ہے: "کہہ دیجئے، ہم خدا پر ایمان رکھنے کی بنا پر خوف ورجاء کے درمیان ہیں، تم اپنے بارے میں کیا سوچتے ہو؟" لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔

اسی بات کو جاری رکھتے ہوئے فرید کتا ہے: "ان سے کہہ دیجئے کہ وہ خداوند رحمن ہے ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور اسی پر ہم نے توکل کیا ہے، اور عنقریب تم جان لو گے کہ واضح گمراہی میں کون ہے۔" (قتل هو بہتر)

الرحمن اماناً وعلیہ توکلنا فتعلمون من ہونی ضلال مبین۔

یعنی اگر ہم خدا پر ایمان لے آئے ہیں اور اسے اپنا ولی، وکیل اور سرپرست سمجھا ہے تو اس کی دلیل واضح ہے، وہ خدائے رحمن ہے۔ اس کی رحمت عمومی ہر جگہ پہنچی ہوئی ہے اور اس کے انعام کے فیض نے دوست اور دشمن سب کو گھیر رکھا ہے کہ عالم ہستی اور صفحہ زندگی پر مختصر سی نگاہ اس مدعا کی شاہد ہے۔ لیکن تمہارے معبودوں نے کون سا کام کیا ہے؟ اگرچہ تمہاری ضلالت و گمراہی اسی سے واضح ہے لیکن آخرت میں اور زیادہ واضح ہو جائے گی، یا اس دنیا میں جب اسلام خدائی امدادوں سے لشکر کفر پر کامیاب ہو جائے گا تو اس معجزانہ کامیابی سے حقیقت اور زیادہ واضح ہو جائے گی۔

یہ آیت حقیقت میں پیغمبر اسلام اور مومنین کے لیے ایک قسم کی تسلی ہے کہ وہ یہ خیال نہ کریں کہ وہ حق و باطل کے اس مبارزہ میں تنہا ہیں، بلکہ بخشنے والا اور مہربان خدا ان کا یار و مددگار ہے۔

❖ ❖ ❖

آخری آیت میں خدا کی رحمت عامہ کے ایک مذاق کے ذکر کے عنوان سے کہ جس سے لوگ غافل ہیں، کتا ہے: ”کہہ دیجئے: مجھے بتاؤ وہ پانی جس سے تم استفادہ کر رہے ہو، اگر وہ زمین کے اندر دُور تر میں چلا جائے تو کون تمہارے لیے جاری پانی لاسکتا ہے؟“ (قل امرہ میتھ ان اصبح ماؤ کھ غوٹرا فن یأتیکھ جماء معین)۔

ہم جانتے ہیں کہ زمین دو قسم کے مختلف قشروں سے بنی ہے۔ ”نفوذ پذیر قشر“ جو پانی کو اپنے اندر لے جاتا ہے اور اس کے نیچے ”نفوذ نا پذیر“ قشر ہے جو پانی کو وہیں محفوظ رکھتا ہے۔ تمام پتھریں، کنوئیں، ندی، نالے اسی خاص ترکیب کی برکت سے وجود میں آئے ہیں۔ کیونکہ اگر تمام روئے زمین زیادہ گہرائیوں تک نفوذ پذیر قشر ہوتی تو پانی اتنا نیچے چلا جاتا کہ ہرگز اس تک کسی کی رسائی نہ ہوتی۔ اگر وہ ساری کی ساری نفوذ نا پذیر ہوتی تو روئے زمین کے تمام پانی اس کے اوپر ہی کھڑے رہتے اور دلدل اور کچیڑ میں تبدیل ہو جاتے یا جلدی سمندروں میں جا پڑتے اور اس طرح سے پانی کے زیر زمین ذخیرے ہاتھ سے نکل جاتے۔

خدا کی رحمت کا یہ ایک چھوٹا سا نمونہ ہے کہ جس سے انسان کی موت و حیات شدت کے ساتھ وابستہ ہے ”معین“۔ ”معین“ (بروزن طعن) کے مادہ سے پانی کے جاری ہونے کے معنی میں ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ ’عین‘ سے لیا گیا اور اس کی میم زائدہ ہے۔ اسی لیے بعض مفسرین نے معین کو اس پانی کے معنی میں لیا ہے جو آنکھ سے دیکھا جاسکے اگرچہ وہ جاری نہ ہو۔

لیکن اکثر نے اس کی جاری پانی کے معنی میں ہی تفسیر کی ہے۔

اگرچہ وہ پانی جو پیا جاتا ہے وہ جاری پانی میں منحصر نہیں ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ جاری پانی ان کی بہترین قسم شمار ہوتا ہے، چاہے وہ دریا، نہروں، ندی، نالوں اور اپنیے واسطے کنوئوں کی صورت میں ہو۔

بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ جب ایک کافر نے یہ آیت سنی جو یہ کہتی ہے: "اگر تمہارے استعمال میں آسٹہ والا پانی زمین کی تہ میں چلا جائے تو کون تمہارے لیے آب جاری لا دے گا" تو اس نے کہا "رجال شداد و معامل حداد" (طاقتور مرد اور تیز کدال) پانی کو زمین کی گہرائیوں میں سے نکال لائیں گے۔ لیکن رات کو جب وہ سویا تو اس کی آنکھ میں آب سیاہ (کالاموتیا) اتر آیا، اس حال میں اس نے ایک آواز سنی جو کہہ رہی تھی: "ان قوی پنجہ مردوں اور تیز کدالوں کو لے آتا کہ وہ اس پانی کو تیری آنکھ سے باہر نکالیں"۔
لیکن موجودہ زمانہ میں ہم جانتے ہیں کہ اگر زمین کا "نفوذ ناپذیر" قشر ختم ہو جائے تو کوئی قوی پنجہ انسان اور تیز کدال پانی کو نہیں نکال سکتا۔ لے

❖ ❖ ❖

ایک نکتہ

جو روایات کہ ائمہ اہل بیت[ؑ] سے ہم تک پہنچی ہیں، ان میں اس آخری آیت کی حضرت ممدی[ؑ] کے ظہور اور ان کے وسیع عالمی عدل کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے، منجملہ ایک حدیث میں امام محمد باقر[ؑ] سے اس آیت کی تفسیر میں آیا ہے:

"نزات فی الامام القاسم (ع)، یقول ان اصبح امامکم غائباً عنکم لا تتدرون ایمن هو؟ فمن یأتیکم بامام ظاہر یأتیکم باخباہر السماوات والارض وحلال اللہ وحرامہ، ثم قال واللہ ماجاء تأویل هذه الآية ولا بد ان یجیء تأویلہا۔"

"یہ آیت اس امام کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو عدلِ الہی کے ساتھ قیام کرے گا (حضرت ممدی[ؑ]) وہ کہتا ہے کہ اگر تمہارا امام غائب ہو جائے اور تمہیں معلوم نہ ہو کہ وہاں کہاں ہے تو کون تمہارے لیے امام کو بھیجے گا جو آسمانوں اور زمین کی خبریں اور خدا کے حلال و حرام کو تمہارے لیے بیان کرے"۔ اس کے بعد فرمایا "خدا کی قسم اس آیت کی تاویل ابھی تک نہیں آئی اور بالآخر یہ آکر رہے گی۔ لے"

اس سلسلہ میں روایات بہت زیادہ ہیں لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ یہ سب تطبیق کے طور پر ہیں دوسرے لفظوں میں آیت کا ظاہر تو جاری پانی کے ساتھ ہی مربوط ہے جو زندہ موجودات کی حیات و زندگی کا باعث ہے مگر آیت کا باطن امام کے وجود اور ان کے وسیع علم و عدالت کے ساتھ مربوط ہے کیونکہ وہ بھی انسانی معائنات

کی حیات کا سبب ہے۔ ہم نے بارہا کہا ہے کہ آیاتِ قرآنی کے متعدد معانی اور ان کا ظاہر و باطن ہوتا ہے لیکن ہم اس نکتہ کا بھی تاکید کے ساتھ تکرار کرتے ہیں کہ بطونِ آیات کی تہ تک پہنچنا اور انہیں معلوم کرنا سوائے پیغمبر اور امام معصوم کے ممکن نہیں اور کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ کسی چیز کو آیت کے باطن کے عنوان سے اپنی طرف سے پیش کرے۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ آیات کے ظواہر کے ساتھ مربوط ہے اور جو چیز بطونِ آیات کے ساتھ مربوط ہے وہ ہمیں صرف معصومین ہی سے سنا چاہیے۔

سورہ ملک "خدا کی حاکمیت و مالکیت سے شروع ہوئی اور اس کی رحمانیت پر کہ جو اس کی حاکمیت اور مالکیت کی ایک شاخ ہے ختم ہو رہی ہے۔ اس طرح سے اس کا آغاز و انجام مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ خداوند! ہمیں اپنی عام اور خاص رحمت کا مشمول قرار دے اور اپنے اولیاء کی ولایت کے آبِ حیات سے سیراب فرما۔

پروردگارا! حضرت مہدی کا ظہور جلد فرما کہ جو آبِ حیات کا سرچشمہ ہے۔ ہاں ان کے جمال کے متوالوں کو ان کے ظہور سے سیراب کر دے۔
بِسْمِ اللّٰہِ! تو نے ہمیں دیکھنے والی آنکھ، سننے والے کان اور سمجھنے والی عقل مرحمت فرمائی ہے۔ پس خود خواہی اور غرور کے پردوں کو ان کے سامنے سے ہٹا دے تاکہ ہم حقیقت کے چہرے کو جس طرح کا وہ ہے اسی طرح سے دیکھ سکیں اور تیری ہدایت کے صراطِ مستقیم میں راست قامت ہو کر قدم بٹھائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

سورہ ملک کا اختتام

۱۲ شوال ۱۴۰۶ھ

۳ / ۳ / ۱۳۶۵ ش

ترجمہ کا اختتام

بروز جمعرات ۱۰ ذی الحجہ، عید قربان ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۶ اگست ۱۹۸۶ء بوقت ۱۰ بجے شب

۸۱ ای، ماڈل ٹاؤن، لاہور

سورۃ القلم

یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۵۲ آیات ہیں۔

تاریخ آغاز ، ۲۰ شوال المکرم ۱۴۰۶ھ

رہنما

مدینہ میں
ہم آہستہ
تھے ،
کرتی ۔

اس
سورۃ کا بھی
نام ن والا

سورۃ قلم کے مضامین

اگرچہ بعض مفسرین نے اس تمام سورہ کے کئی ہونے پر شک کیا ہے یا ان کا نظریہ ہے کہ اس کا ایک حصہ مدینہ میں اور ایک حصہ مکہ میں نازل ہوا ہے۔ لیکن سورہ کا لب و لہجہ اور آیات کا مضمون مکمل طور پر کئی "سورتوں سے ہم آہنگ ہے کیونکہ یہ سب سے زیادہ پیغمبر اسلام کی نبوت اور ان دشمنوں سے مبارزہ جو آپ کو مجنون سمجھتے تھے، صبر و استقامت کی دعوت اور مخالفین کو عذاب الہی سے انذار و تہدید کے مسئلہ کے محور پر ہی گردش کرتی ہے۔

مجموعی طور پر اس سورہ کے مضامین کو سات حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :

۱ : سب سے پہلے رسول خدا کی مخصوص صفات کے ایک حصہ کے ذکر خصوصاً آپ کے عمدہ اخلاق کو پیش کرتا ہے اور ان کی تکرار قسموں کے ساتھ تاکید کرتا ہے۔

۲ : اس کے بعد آپ کے دشمنوں کی قبیح صفات اور مذموم اخلاق کے ایک حصہ کو پیش کرتا ہے۔

۳ : ایک اور حصہ میں "اصحاب الجنة" کی داستان، جو حقیقت میں قبیح سیرت مشرکین کے لیے ایک تشبیہ ہے، بیان کرتا ہے۔

۴ : ایک اور حصہ میں قیامت اور اس دن کفار کے عذاب سے متعلق گونا گوں مطالب بیان ہوتے ہیں۔

۵ : ایک اور حصہ میں مشرکین کے لیے انذار اور تہدید و تحویل کا بیان ہے۔

۶ : ایک اور حصہ میں پیغمبر اسلام کو حکم دیا گیا ہے کہ کثر دشمنوں کے مقابلہ میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کریں۔

۷ : پھر سورہ کے آخر میں بھی قرآن کی عظمت اور پیغمبر کے خلاف دشمنوں کی مختلف سازشوں کے بارے میں گفتگو ہے۔

اس سورہ کے لیے قلم کے نام کا انتخاب اس کی پہلی آیت کی مناسبت سے ہے۔ بعض نے اس کا نام سورۃ قلم بھی ذکر کیا ہے۔ بعض روایات، جو اس سورہ کی فضیلت میں آئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ کا نام ن والقلم ہے۔

تلاوت کی فضیلت

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت میں پیغمبر گرامیؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:
 ”من قرأ سورة ن والقلم اعطاه الله ثواب الذين حسن
 اخلاقهم“۔

”جو شخص سورہ ن والقلم کی تلاوت کرے گا، خدا اس کو ان لوگوں کا ثواب
 دے گا جو حسن اخلاق کے حامل ہیں۔“ لے

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:
 ”من قرأ سورة ن والقلم في فريضة او ناخلة امنه الله ان يصيبه
 في حياته فقر ابدا، واعاذه ادامات من ضمة القبر ان شاء الله“۔
 ”جو شخص سورہ ن والقلم کو واجب یا مستحب نماز میں پڑھے گا خدا اسے ہمیشہ
 کے لیے فقر و فاقہ سے امان میں رکھے گا اور جب وہ مرے گا تو انشاء اللہ اسے قبا قبر
 سے امان دے گا۔“ لے

ان ثوابوں کا سورہ کے مضامین کے ساتھ خاص تناسب ہے۔ اور یہ اس بات کی نشان دہی کرتے
 ہیں مقصد وہ تلاوت ہے جو علم و آگہی کے ساتھ ہو اور اس کے بعد اس پر عمل بھی ہو۔

✦ ✦ ✦

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ۝

مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ ۝

وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ ۝

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ۝

فَسَبِّحْهُ وَوَبِّحْهُ وَبِصِرُونَ ۝

بِأَيْكُمُ الْمَفْتُونُ ۝

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ ۝

هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ۝

ترجمہ

خدا کے رحمن و رحیم کے نام سے۔

۱ ن، قلم ہے قلم کی اور اس کی جو کہ وہ قلم سے لکھتے ہیں۔

۲ اپنے پروردگار کی نعمت سے تو مجنون نہیں ہے۔

۳ اور تیرے لیے عظیم اور ہمیشہ رہنے والا اجر و ثواب ہے۔

۴ اور تیرے اخلاق بہت ہی عمدہ اور عظیم ہیں۔

- ۵) اور عنقریب تو بھی دیکھ لے گا اور وہ بھی دیکھ لیں گے۔
- ۶) کہ تم میں سے کون مجنون ہے۔
- ۷) تیرا پروردگار ہر شخص سے بہتر جانتا ہے کہ اس کی راہ سے کون شخص گمراہ ہوا ہے وہ ہدایت پانے والوں کو بھی بہتر طور پر جانتا ہے۔

تفسیر

تیسرے اخلاق کتے عمدہ ہیں!

یہ واحد سورہ ہے جو حرف مقطع ن سے شروع ہوا ہے۔ فرماتا ہے: (ن)۔ ہم نے حروف مقطعات کے بارے میں بارہا اور خصوصاً سورہ بقرہ و ”آل عمران“ اور ”اعراف“ (تفسیر نمونہ ۶۱۲) میں اس سے متعلق بحث کی ہے۔ جو چیز اب یہاں بیان کرنا ہے وہ یہ ہے کہ بعض نے یہاں ن کو لفظ کا مخففت اور اس کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ بعض نے اس کی ’لوح‘ کے معنی میں یا ’دوات‘ کے معنی میں یا جہ کی ایک ہنر کے معنی میں تفسیر کی ہے، لیکن ان تفسیروں میں سے کوئی بھی واضح قرینہ اور شاہد نہیں رکھتی۔ اس بناء پر اس حرف مقطع کی تفسیر ان تمام حروف مقطع سے الگ نہیں جن کی طرف ہم نے اوپر کیا ہے۔

اس کے بعد انسانی زندگی کے مسائل میں سے دو اہم موضوعات کی قسم کھاتے ہوئے مزید کہتا ہے: ”ہے قلم کی اور اس کی جسے وہ قلم کے ساتھ لکھتے ہیں“ (والقلم وما یسطرون)۔ کیسی عجیب و غریب قسم ہے؟ حقیقت میں وہ چیز جس کی یہاں قسم کھائی گئی ہے، ظاہراً ایک چھوٹا سا موضوع ہے۔ سرکڈے کا ایک ٹکڑا یا اس کے مشابہ کوئی چیز اور کچھ سیاہ رنگ کا مادہ اور اس کے بعد وہ سطح معمولی کاغذ کے صفحہ پر لکھی جاتی ہیں۔

لیکن حقیقت میں یہ وہی چیز ہے جو تمام انسانی تمدنوں کی پیدائش، علوم کی پیش رفت، افکار کی بیدار نگہداشت، مذاہب کے تشکیل پانے کا سرچشمہ اور نوری بشر کی آگاہی اور ہدایت کا ذریعہ ہے۔ یہاں تک کہ انسانی زندگی دو ادوار میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ”تاریخی دور“ اور ”تاریخ سے پہلے کا دور“۔ تاریخ بشر کا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب سے خط اور تحریر ایجاد ہوئے اور انسان اپنی زندگی کے واقعات کو صفحات پر نقش کرنے

قابل ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ دور جس میں انسان نے قلم کو ہاتھ میں لیا ہے اور اس سے ”مایسٹرون“ یادگار کے طور پر رہ گیا ہے۔

اس قسم کی عظمت اس وقت زیادہ آشکار ہوتی ہے جب ہم اس بات کی طرف توجہ کریں کہ جس دن یہ آیات نازل ہوئیں، اس وقت لکھنے والے اور اہل قلم اس ماحول میں موجود نہ تھے۔ اگر کچھ تھوڑے بہت لوگ لکھنے پڑھنے کی کچھ آگاہی اور علم رکھتے بھی تھے تو ان کی تعداد سر زمین مکہ میں جو حجاز کا عبادتی، سیاسی اور اقتصادی مرکز تھا، میں افراد تک بھی نہیں پہنچتی تھی۔ ہاں ایسے ماحول میں قلم کی قسم کھانا ایک خاص عظمت رکھتا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے: ان پہلی آیات میں بھی جو جبل النور اور غار حرا میں پیغمبر کے پاک دل پر نازل ہوئی تھیں قلم کے بلند مقام کی طرف اشارہ ہوا ہے، جہاں فرماتا ہے:

”اقرأ باسم ربك الذي خلق - خلق الانسان من علق - اقرأ وربك الاكرم - الذي علم بالقلم - علم الانسان ما لم يعلم۔“

”اپنے پروردگار کے نام سے پڑھیے، جس نے مخلوقات کو پیدا کیا ہے، اور انسان کو بتے اور بچے ہوئے خون سے پیدا کیا، اپنے عظیم پروردگار کے نام سے پڑھیے جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ تعلیم دی اور جو کچھ وہ نہیں جانتا تھا اُسے وہ سکھایا۔ (علق ۱: ۵)“

سب سے عمدہ بات یہ ہے کہ یہ سب باتیں اس شخص کی زبان سے ادا ہو رہی تھیں جس نے خود (عالم ظاہر میں) کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی، کبھی مدرسہ نہیں گیا تھا اور کوئی تحریر نہیں لکھی تھی۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ وحی آسمانی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔

بعض مفسرین نے یہاں ”قلم“ کی اس قلم سے تفسیر کی ہے جس سے خدا کے عظیم فرشتے وحی آسمانی کو لکھتے ہیں یا جس سے انسانوں کے اعمال نامے رقم کرتے ہیں۔ لیکن مسئلہ طور پر یہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے اور یہ تفسیر اس کے ایک مصداق کو بیان کرتی ہے، جیسا کہ ”مایسٹرون“ بھی ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے، اور انسان کی عملی، اخلاقی اور فکری ہدایت اور تکامل و ارتقاء کے لیے جو کچھ بھی لکھتے ہیں ان سب کو شامل ہے۔ نقطہ وحی آسمانی یا انسانوں کے اعمال میں منحصر نہیں ہے۔ لہ

اس کے بعد اس چیز کو جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے، پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اپنے پروردگار کی نعمت سے تو مجنون نہیں ہے“ (ما انت بنعمة ربك بمجنون)۔

وہ لوگ جو یہ ناروا نسبت تیری طرف دیتے ہیں دل کے ایسے اندھے ہیں جو تیرے بارے میں خدا کی ان تمام نعمتوں کو نہیں دیکھتے، نعمت عقل و درایت، نعمت امانت و صدق و راستی، نعمت علم و دانش اور مقام نبوت

(عاشیہ ملہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

اور مقام عصمت۔

دیوانے تو وہ ہیں جو عقل کل کے منظر کو جنون کے ساتھ مشتم کرتے ہیں اور انسانوں کے رہبر و رہنما کو اس ناروا نسبت کے ذریعہ اپنے سے دور کر رہے ہیں۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”تیرے لیے عظیم اور ہمیشہ رہنے والا اجر و ثواب ہے“ (و ان للاجرذا غیر ممنون)۔

تیرے لیے ایسا اجر و ثواب کیوں نہ ہو؟ جبکہ تو ایسی قبیح اور ناروا تمہتوں کے مقابلہ میں استقامت ظاہر کرتا ہے۔ ان کے لیے ہدایت و نجات کی آرزو رکھتا ہے اور اس راستے میں سعی و کوشش کرنے سے تھکتا نہیں ہے۔ ”ممنون“ ”من“ کے مادہ سے ”منقطع“ ہونے کے معنی میں ہے۔ یعنی ایسا اجر و پاداش جو ہرگز منقطع نہیں ہوگا اور ہمیشہ باقی رہے گا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس معنی کی اصل اور ریشہ منت سے لیا گیا ہے۔ کیونکہ منت، نعمت کے قطع ہونے کا باعث ہوتی ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ غیر ممنون سے مراد یہ ہے کہ خدا اس اجر عظیم کے مقابلہ میں تجھ پر ہرگز منت نہیں رکھتا لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

❖ ❖ ❖

بعد والی آیت پیغمبر کی ایک اور صفت کے بارے میں کہتی ہے: ”تو عظیم اور عمدہ اخلاق کا حامل ہے“ (وانٹ لعلی خلق عظیم)۔

ایسے اخلاق جن کے مقابل عقل حیران ہے، بے نظیر لطف و محبت، بے مثل صفا و صمیمیت اور توصیف سے باہر صبر و استقامت اور تحمل و حوصلہ۔

اگر تو لوگوں کو خدا کی بندگی کی دعوت دیتا ہے تو سب سے زیادہ عبادت بھی کرتا ہے۔ اگر بڑے کام سے روکتا ہے تو سب سے پہلے خود اس کام سے روکتا ہے، وہ تجھے تکلیف پہنچاتے ہیں اور تو پند و نصیحت کرتا ہے۔ وہ تجھے بُرا بھلا کہتے ہیں اور تو ان کے لیے دعا کرتا ہے، وہ تیرے جسم پر پتھر مارتے ہیں اور گرم مٹی تیرے سر پر پھینکتے ہیں لیکن تو ان کی ہدایت کے لیے بارگاہِ خدا میں ہاتھ اٹھاتا ہے۔ ہاں! تو محبت اور مہربانیوں کا مرکز اور رحمت کا سرچشمہ ہے۔

(عاشیہ لے صفر سابقہ) ”مایدسٹرون“ کے ”ما“ کو بعض تو ما مصدریہ سمجھتے ہیں اور بعض ما موصولہ لیکن دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے۔ یہ تقدیریں اس طرح ہے ”مایدسٹرون“ بعض اس کو لوح یا کاغذ کے معنی میں سمجھتے ہیں کہ جس پر کاتبت کی جاتی ہے اور تقدیریں مایدسٹرون فیہ ہے۔ بعض نے ما کو یہاں ذوی العقول اور ان افراد کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو ان سطور کو لکھتے ہیں لیکن وہی معنی زیادہ مناسب ہے جو ہم نے متن میں ذکر کیا ہے۔

”خلق“ خلقت“ کے مادہ سے ایسی صفات کے معنی میں ہے جو انسان سے جدا نہیں ہوتے اور وہ انسان کی خلقت و آفرینش کے مانند ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین نے پیغمبرؐ کے خلقِ عظیم کی راہِ حق میں صبر و استقامت، سخاوت و بخشش میں وسعت، تدبیر اور، رفق و مدارا، خدا کی طرف دعوت کی راہ میں سختیوں کا برداشت کرنا، عفو و درگزر، پروردگار کی راہ میں جہاد اور حدودِ حصر کو ترک کرنے کے ساتھ ”تفسیر کی ہے۔ اگرچہ یہ سب کی سب صفات پیغمبرؐ میں موجود تھیں لیکن آپ کا خلقِ عظیم صرف انہیں میں منحصر نہیں تھا۔

بعض تفسیر میں ”خلقِ عظیم“ کی قرآن یا دینِ اسلام کے ساتھ بھی تفسیر کی گئی ہے جو اوپر والے وسیع مفہوم کا ایک مصداق ہو سکتی ہے۔ بہر حال پیغمبرؐ میں اس ”خلقِ عظیم“ کا ہونا آنحضرتؐ کی عقل و درایت اور دشمنوں کی طرف سے دی گئی نسبتوں کی نفی پر ایک واضح دلیل ہے۔

✦ ✦ ✦

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”عنقریب تو بھی دیکھ لے گا اور وہ بھی دیکھ لیں گے۔“ (فستبصر و یبصرون)۔

✦ ✦ ✦

”کہ تم میں سے کون مجنون ہے۔“ (بایئکھ المفتون)۔
”مفتون“ ”قنہ“ سے اسم مفعول ہے جو ابتلاء کے معنی میں ہے اور یہاں جنون میں مبتلا ہونے کے معنی میں ہے۔

ہاں! وہ آج یہ ناروا نسبت تیری طرف دیتے ہیں تاکہ بندگانِ خدا کو تجھ سے دُور کر دیں، لیکن لوگ عقل و شعور رکھتے ہیں۔ آہستہ آہستہ تیری تعلیمات اور ارشادات سے آگاہی حاصل کریں گے۔ اس وقت یہ مسئلہ واضح ہو جائے گا کہ یہ عمدہ تعلیمات خدا کے عظیم کی طرف سے تیرے پاک اور نورانی دل پر نازل ہوئی ہیں اور خدا نے عقل و علم کا ایک عظیم حصہ تجھے بخشا ہے۔

مستقبل میں تیری تھرکیں اور طریق کار اور ان کے سایہ میں اسلام کی پیش رفت اور سریلے نفاذ بھی اس بات کی نشان دہی کر دے گا کہ تو عقل و درایت کا ایک عظیم منبع ہے۔ دیوانے تو وہ چمگادڑ ہیں جو اس آفتاب کے نور سے جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

پھر قیامت میں تو یہ حقایق لہجینی طور پر اور بھی زیادہ روشن اور زیادہ واضح و آشکار ہو جائیں گے۔

✦ ✦ ✦

لے ”بایئکھ“ میں ’با‘ زائدہ ہے اور ایئکھ قبل کے دو افعال کا مفعول ہے۔

نیز مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے: ”تیرا پروردگار سب سے بہتر جانتا ہے کہ اس کی راہ سے کون شخص گمراہ ہوا ہے اور ہدایت پانے والوں کو بھی بہتر طور پر جانتا ہے“ (ان سہیلک ہو اعلم بمن ضل عن سبیلہ و هو اعلم بالمہتدین)۔

کیونکہ یہ راستہ اسی کا راستہ ہے اور وہ اپنی راہ کو ہر شخص سے بہتر پہچانتا ہے۔ گویا اس طرح پیغمبر اسلام کو زیادہ سے زیادہ اطمینان دلاتا ہے کہ وہ ہدایت کے راستہ پر ہیں اور ان کے دشمن ضلالت و گمراہی کے راہ پر ہیں۔

ایک مستند حدیث میں آیا ہے کہ جس وقت قریش نے دیکھا کہ پیغمبر علیؑ کو دوسروں پر ترجیح دیتے اور ان کی تعظیم اور احترام کرتے ہیں تو انہوں نے امام علیؑ کی مذمت شروع کر دی اور کہا کہ محمدؐ اس کا مفتون اور اس پر فریفتہ ہو گیا ہے۔ اس موقع پر خدا نے ن وَالْقَلَمِ نازل فرمایا اور قسم لگا کر کہا کہ اے محمدؐ! تو مفتون و مجنون نہیں ہے۔ یہاں تک فرمایا: خدا ان لوگوں کو بھی جانتا ہے جو گمراہ ہو گئے ہیں۔ (یہ قریش کے اس گروہ کی طرف اشارہ ہے جو یہ باتیں کرتے تھے) اور خدا ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی بہتر طور سے جانتا ہے۔ (یہ امام علیؑ کی طرف اشارہ ہے)۔

❖ ❖ ❖

چند نکات

۱: انسانی زندگی میں قلم کا نقش و اثر

نوع بشر کی زندگی کا اہم ترین مرحلہ، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، خط کا پیدا ہونا اور قلم کا کاغذ یا پتھر پر چلنا تھا۔ یہ وہی وقت تھا کہ جس نے تاریخ کے دور کو ماقبل تاریخ سے جدا کر دیا۔ کاغذ کے صفحہ رونق قلم کی گردش بشر کی سرفروشت کو رقم کرتی ہے۔ لہذا انسانی معاشرہ کی کامیابی اور شکست نوک قلم سے وابستہ ہے۔

قلم علم و معارف کا محافظ، مفکرین کے افکار کا پاسدار، علماء کے فکری اتصال کی کڑی اور نوع بشر کے ماضی و حال کے ارتباط کے لیے ایک پل ہے۔ یہاں تک کہ آسمان و زمین کا ارتباط بھی لوح و قلم کے ذریعہ ہی جوڑا ہے۔

قلم ان انسانوں کو جو زمان و مکان کے لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ زندگی بسر کرتے ہیں، ایک دوسرے سے جوڑ دیتا ہے۔ گویا تمام طول تاریخ اور تمام روئے زمین کے سب مفکرین نوع بشر کو

ایک کتابخانہ عظیم میں دیکھ لیں گے۔
 قلم رازدار بشر ہے، خزانہ دارِ علوم ہے۔ قرون و اعصار کے تجربات کو جمع کرنے والا ہے۔ اگر قرآن
 اس کی قسم کھاتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے۔ کیونکہ قسم ہمیشہ ایک بہت ہی عظیم اور قدر و قیمت رکھنے والی
 چیز کی کھائی جاتی ہے۔
 البتہ "قلم" "مایطرون" (تخریروں) کے لیے ایک وسیلہ ہے اور قرآن نے دونوں کی قسم کھائی
 ہے، یعنی آگ کی بھی اور آگ کے محصول کی بھی۔

بعض روایات میں آیا ہے :
 ان اول ما خلق الله القلم
 پہلی چیز جو خدا نے خلق کی وہ قلم تھا۔
 اس حدیث کو شیعہ محدثین نے امام صادقؑ سے نقل کیا ہے۔ لہٰذا نیز یہ اہل سنت کی کتابوں میں بھی
 ایک مشہور خبر کے عنوان سے آئی ہے۔ لہٰذا
 ایک دوسری حدیث میں آیا ہے :
 "اول ما خلق الله تعالى جوہرۃ"
 پہلی چیز جس کو خدا نے خلق کیا وہ ایک گوہر تھا۔ لہٰذا
 بعض اخبار میں یہ بھی آیا ہے :
 "ان اول ما خلق الله العقل"
 پہلی چیز جسے خدا نے خلق فرمایا وہ عقل تھی۔ لہٰذا

اس وصف کے تعلق کی طرف توجہ جو "گوہر" "قلم" اور "عقل" کے درمیان ہے، ان سب کے اول
 ہونے کے مفہوم کو واضح کر دیتی ہے۔
 جو حدیث ہم نے اوپر امام صادقؑ سے نقل کی اس میں آیا ہے کہ خدا نے قلم کو پیدا کرنے کے بعد
 اس سے فرمایا: "لکھ" اور اس نے جو کچھ تھا اور جو قیامت کے دن تک ہوگا سب کچھ لکھ دیا۔
 اگرچہ اس روایت میں قلم سے قلم تقدیر اور قضاوت کی طرف اشارہ ہے، لیکن چاہے جو کچھ بھی
 ہے بشر کی سرنوشت اور اس کے مقدرات میں قلم کے نقش و اثر کو واضح کرتی ہے۔

۱۔ نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۹۹ حدیث ۹

۲۔ تفسیر فخر رازی جلد ۳۰ ص ۷۸

۳۔ تفسیر فخر رازی جلد ۳۰ ص ۷۸

پشویان اسلام متعدد احادیث میں اپنے اصحاب کو تاکید کیا کرتے تھے کہ وہ اپنے حافظے پر قناعت نہ کریں اور احادیثِ اسلامی اور علومِ الہی کو رشتہ ستھری میں لا کر آنے والے لوگوں کے لیے یادگار کے طور پر چھوڑ جائیں۔

بعض علماء نے کہا ہے :

”البيان بيانان : بيان اللسان ، وبيان البنان ، وبيان اللسان تدرسه الاعوام . وبيان الاقلام باق على مر الایام“

”بیان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ زبان کا بیان اور قلم کا بیان۔ زبان کا بیان تو زمانہ اور سالوں کے گزرنے سے کہنہ اور پرانا ہو جاتا اور ختم ہو جاتا ہے، لیکن قلموں کا بیان ابد تک باقی رہتا ہے : لہٰذا یہ بھی کہا گیا ہے :

”ان قوام امور الدین والدنیا بشیثین القلم والسیف والسیف تحت القلم“

”دین و دنیا کے امور کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ قلم و شمشیر، اور شمشیر قلم کے زیر سایہ قرار پاتی ہے۔“

اس معنی کے بعض شعراء نے عرب نے اس طرح نظم کیا ہے :

كذا قضی الله للاقلام مذ بیت

ان السيوف لها منذ ارفقت خدم

خدا نے قلم کے لیے اسی روز سے جب سے وہ بنایا گیا ہے

اسی طرح مقدر کیا ہے۔

کہ تیز دھار تلواریں اس کی خدمت گزار ہوں۔

(یہ تعبیر قلم کے چاقو کے ذریعہ تراشے جانے کی طرف نیز تلواروں کا ابتداء کار سے قلم کی خدمت میں ہونے

کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔)

ایک دوسرا شاعر، زیر بحث آیات کے استاد کے ساتھ اس سلسلہ میں کہتا ہے :

اذا اقم الابطال يوماً بسيفهم

وعدوه مما يجلب المجد والكرم

کفی قلم الکتاب فخرًا ورفعة

مدی الدهران الله اقسو بالقلع
 ”جس دن بہادر جنگجو لوگ اپنی تلواروں کی قسم کھائیں اور انہیں
 بزرگی اور افتخار کے اسباب میں سے شمار کریں تو لکھنے والوں
 کے قلم کے لیے عالم کے تمام زمانوں میں یہی اعزاز اور
 سربلندی کافی ہے کہ خدا نے مسلم کی قسم کھائی ہے۔ (نہ کہ
 تلوار کی) لے

واقعاً یہی بات ہے۔ کیونکہ فوجی کامیابیوں کی اگر قومی تمدن کے ذریعہ ضمانت نہ ہو تو وہ ہرگز پایدار
 نہ ہوں گی۔ منعموں نے ایران کی تاریخ میں بہت بڑی کامیابی حاصل کی لیکن چونکہ وہ ایک ایسی قوم تھی
 جس کا کوئی تمدن نہیں تھا، لہذا وہ جلد ہی ہی اسلام اور ایران کے تمدن میں تحلیل ہو گئے اور انھوں
 نے اپنا راستہ بدل لیا۔

اگرچہ یہ بحث بڑی وسیع ہے لیکن اس بناء پر کہ ہم تفسیر کے راستہ سے باہر نہ ہو جائیں اس بحث
 کو پیغمبر اسلام کی ایک بہت ہی پرمعنی حدیث پر ختم کرتے ہیں:

”ثلاث تحرق الحجب، وتنتهی الی مابین یدی
 اللہ: صریح اقلام العلماء، ووطی اقدام المجاہدین
 وصوت مضاشرل المحصنات“

”تین آوازیں ایسی ہیں جو جابوں کو توڑ کر خدا کی با عظمت بارگاہ میں پہنچ
 جاتی ہیں۔ لکھتے وقت علماء کے قلموں کے چلنے کی آواز، میدان
 جہاد میں مجاہدین کے قدموں کی چاپ، اور پاک دامن عورتوں کے چرخوں
 کی آواز“ لے

البتہ جو کچھ بیان ہوا ہے یہ سب ان قلموں کے بارے میں ہے جو حق و عدالت کی راہ اور صراط
 مستقیم میں چلتی ہیں۔ لیکن مسموم، زہریلے اور گمراہ کرنے والے تو انسانی معاشروں کے لیے عظیم ترین
 بلا اور بہت بڑا خطرہ ہوتے ہیں۔

❖ ❖ ❖

۲ : پیغمبر کے اخلاق کا ایک نمونہ

پیغمبر اسلام کی کامیابی اگرچہ خدائی تائید و امداد کے ساتھ ہوئی تھی، لیکن آپ ظاہری لحاظ سے بھی اس کے لیے کئی عوامل رکھتے تھے جن میں سے اہم ترین پیغمبر کا جاذبہ اخلاقی تھا۔ اعلیٰ انسانی صفات اور مکام اخلاق آپ میں اس طرح سے جمع تھے جو سخت ترین دشمنوں کو بھی متاثر کر دیتے، انھیں سر تسلیم خم کرانے پر ابھارتے اور دوستوں میں شدید جذب و محبت پیدا کر دیتے تھے۔

بلکہ اگر ہم اسے پیغمبر کا اخلاقی معجزہ کہیں تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس اخلاقی معجزہ کا ایک نمونہ فتح مکہ میں نمایاں ہوا جب وہ خوشخوار اور جرائم پیشہ مشرکین مکہ جنہوں نے سالہا سال تک اسلام اور پیغمبر کے خلاف اپنی پوری قوت صرف کی تھی، مسلمانوں کے جنگل میں گرفتار ہوئے تو پیغمبر اسلام نے دوستوں اور دشمنوں کے تمام اندازوں کے برخلاف ان کے لیے عام معافی کا فرمان جاری کر دیا، اور ان کے تمام جرائم کو معاف کر دیا۔ یہی چیز اس بات کا سبب بنی کہ وہ یدِ خلون فی دین اللہ افواجہ کے مصداق بن کر فوج در فوج مسلمان ہو جائیں۔

پیغمبر کے حسن خلق، حفو و درگزر، عطف و مہربانی، ایثار و فداکاری اور تقویٰ و پرہیزگاری کے بارے میں تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں بہت زیادہ واقعات لکھے ہوئے ہیں۔ ان سب کا بیان ہمیں تفسیری بحث سے خارج کر دے گا۔ لیکن ہمارے لیے اتنا لکھنا ہی کافی ہے کہ ایک حدیث میں حضرت امام حسین ابن علیؑ سے آیا ہے، کہ آپ نے فرمایا:

”میں نے اپنے پدربزرگوار امیر المومنین علیؑ سے پیغمبر کی زندگی کی خصوصیات اور آپ کے اخلاق کے بارے میں سوال کیا تو میرے والد نے تفصیل کے ساتھ مجھے جواب دیا۔ اس حدیث کے ایک حصہ میں آیا ہے:

”اپنے پاس بیٹھے والوں کے ساتھ پیغمبر کی رفتار اس طرح تھی کہ آپ خوشروا خداں، خلیق اور نرم رہتے تھے، اور کبھی بھی سخت مزاج، سنگدل، پرخاش رکھنے والے، سخت زبان، عیب جو اور تعریف پسند نہ تھے۔ کوئی شخص آپ سے مایوس نہ ہوتا تھا، جو شخص بھی آپ کے گھر کے دروازے پر آتا مایوس و ناامید نہ لوٹتا تھا۔ تین چیزوں کو آپ نے اپنے سے الگ کر رکھا تھا، گفتگو میں جھگڑنا، زیادہ باتیں کرنا، اور ایسے کام میں دخل دینا جو آپ سے مربوط نہ ہو۔ اسی طرح تین چیزوں کو لوگوں کے بارے میں چھوڑ رکھا تھا، کسی کی مذمت نہیں کرتے تھے، کسی کو سرزنش نہیں کرتے تھے اور لوگوں کے پوشیدہ عیوب اور لغزشوں کی جستجو نہیں کرتے تھے۔ آپ

ہرگز کوئی گفتگو نہیں کرتے تھے سوائے ان امور کے بارے میں جن میں حصولِ ثواب کی امید رکھتے تھے، گفتگو ایسی موثر ہوتی تھی کہ تمام سننے والے لوگ سکوت اختیار کر لیتے تھے اور اپنی جگہ سے ہلنے تک نہیں تھے۔ جب آپ خاموش ہو جاتے تو پھر وہ لوگ بولتے۔ لیکن وہ آپ کے پاس نزاع اور جھگڑا نہیں کرتے تھے۔ جب کوئی اجنبی اور ناواقف آدمی سختی سے بات کرتا اور درخواست کرتا تو آپ تحمل سے کام لیتے اور اپنے اصحاب سے فرماتے: جب کسی کو دیکھو کہ وہ کوئی حاجت رکھتا ہے تو اس کی حاجت پوری کرو۔ آپ ہرگز کسی کی بات کو نہیں کاٹتے تھے جب تک کہ اس کی بات ختم نہ ہو جاتی۔^۱

ہاں! اگر یہ اخلاقِ کریمہ اور یہ ملکاتِ فاضلہ نہ ہوتے تو وہ پسماندہ اور جاہل قوم اور وہ سخت اور اثر ناپذیر گروہ آغوشِ اسلام میں ہرگز نہ آتا، اور لائفوضوا من حولک کا مصداق بن کر سب پر اگندہ ہو جاتے۔

کیا ہی اچھا ہو کہ یہ اسلامی اخلاق آج زندہ ہوں اور ہر مسلمان میں پیغمبرِ اسلام کے اخلاق و عادات کا عکس نظر آتے۔

اس سلسلہ میں اسلامی روایات بھی چاہے وہ خود پیغمبر کے بارے میں ہوں یا سب مسلمانوں کے ذمہ داری کے بارے میں، بہت زیادہ ہیں جن میں سے چند روایات کی طرف ہم یہاں اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر نے فرمایا:-

۱: "انما بعثت لاقسم مکارم الاخلاق"

"میں اس لیے مبعوث ہوا ہوں کہ اخلاقی فضائل کی تکمیل کروں"۔^۲
اسی طرح پیغمبر کی بعثت کا ایک اصلی ہدف یہی اخلاقِ فاضلہ کی تکمیل ہے۔ ایک حدیث میں آنحضرتؐ سے آیا ہے:-

۲: "انما المؤمن لیدرک بحسن خلقه درجۃ قائم اللیل وصائم النهار"۔^۳

"مومن اپنے حسنِ خلق کی وجہ سے اس شخص کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے جو راتوں کو عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور دنوں میں روزے رکھتا ہے۔"

^۱ معانی الاخبار ص ۸۲ (مختصری سی تمخیص کے ساتھ)
^۲ مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۳۳

۳ : آنحضرتؐ ہی سے یہ بھی آیا ہے کہ آپ نے فرمایا :

”ما من شيء أثقل في الميزان من خلق حسن“
”کوئی چیز میزانِ عمل میں قیامت کے دن اچھے اخلاق سے
زیادہ وزنی نہیں ہوگی۔“

۴ : آنحضرتؐ سے یہ بھی نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا :

”احبكم الى الله احسنكم اخلاقا الموطون اكنافا، الذين
يألفون ويؤلفون، وابتضكم الى الله المشاؤون بالخصبة
المفرقون بين الاخوان، الملتصقون للبراء العثرات؟“

”تم سب میں سے خدا کے ہاں زیادہ محبوب وہ شخص ہے جس کے
اخلاق سب سے بہتر ہوں، وہی لوگ جو متواضع ہیں، دوسروں سے
جوشِ محبت کے ساتھ ملتے ہیں۔ تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے
زیادہ مبغوض وہ لوگ ہیں جو خفلیاں کرتے ہیں کہ بھائیوں کے درمیان
جدائی ڈال دیں اور بے گناہ لوگوں کے لیے لغزش کی جگہیں بن گئے
رہتے ہیں۔“

۵ : ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے :

”اکثر ما يدخل الناس الجنة تقوى الله و حسن
الخلق“

”وہ چیز جو سب سے زیادہ لوگوں کو جنت میں داخل کرے گی، تقویٰ اور
حُسنِ خلق ہے۔“

۶ : ایک حدیث میں امام باقرؑ سے آیا ہے :

”ان أكمل المؤمنين إيماناً احسنهم خلقاً“

”مومنین میں سے اس کا ایمان سب سے بہتر ہے جس کے اخلاق

۱؎ مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۳۳

۲؎ مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۱۰

۳؎ سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۴۱۰ (یہی مضمون وسائل الشیخہ جلد ۸ ص ۵۰۴ میں بھی آیا ہے۔ اسی طرح تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۰۰

میں بھی ہے۔)

زیادہ کامل ہیں۔ لے

۷ : ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا سے آیا ہے کہ پیغمبر نے فرمایا :

”علیکم بحسن الخلق ، فان حسن الخلق فی الجنة لا

محالة و ایاکم و سوء الخلق - فان سوء الخلق فی النار

لا محالة۔“

”تمہارے لیے لازم ہے کہ حُسنِ خلق اختیار کرو، کیونکہ حُسنِ خلق والا انجامِ کار

جنت میں ہے۔ سوءِ خلق سے بچو، کیونکہ سوءِ خلق والا انجامِ کار جہنم میں

ہے۔ لے

اوپر والی روایات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ حسنِ خلقِ جنت کی کلید اور رضائے خدا کے حاصل کرنے

کا ایک وسیلہ ہے، قدرتِ ایمانی کی نشانی ہے، دن رات کی عبادتوں کے ہم پتہ ہے اور اس سلسلہ میں احادیث

بہت زیادہ ہیں۔

❖ ❖ ❖

لے روح البیان جلد ۱۰ ص ۱۰۸

لے وسائل الشیخہ جلد ۸ ص ۵۰۶ حدیث ۲۱

- ۸ فَلَا تُطِيعُ السُّكَّادِيْنَ ۝
- ۹ وَذُوَ الْوَلَوِّ ثُدَّ هُنَّ فَيُدْهِنُوْنَ ۝
- ۱۰ وَلَا تُطِيعُ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝
- ۱۱ هَمَّا زِي مَشَاءٍ بِنَبِيْمٍ ۝
- ۱۲ مَنَّا عِ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝
- ۱۳ عُمْلِيْ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۝
- ۱۴ اِنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِيْنٍ ۝
- ۱۵ اِذَا تُثْلِيْ عَلَيْهِ اَيْتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِ
- ۱۶ سَنَسِيْدُهُ عَلٰى الْخُرْطُوْمِ ۝

ترجمہ

- ۸ اب جب کہ یہ بات ہے تو تکذیب کرنے والوں کی اطاعت نہ کرو۔
- ۹ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم کچھ نرمی اختیار کرو تا کہ وہ بھی کچھ نرمی کریں (ایسی نرمی جو راہ حق انحراف کے ساتھ ملی ہوئی ہو)۔
- ۱۰ اور ایسے پست اور بہت زیادہ قسمیں کھانے والے آدمی کی اطاعت نہ کرو۔
- ۱۱ جو بہت ہی زیادہ عیب جو اور چٹاخور ہے۔

نیک کاموں میں بہت زیادہ رکاوٹیں ڈالنے والا، تباہ و برباد اور گنہگار ہے۔ اور ان سب باتوں کے علاوہ کینہ پرور، پرخور، سخت مزاج اور بدنام ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ صاحب مال اور زیادہ اولاد ہونے کی وجہ سے اس کی پیروی کرنے لگے۔ جب ہماری آیات اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو گزرے ہوئے لوگوں کے بے فائدہ افسانے ہیں۔

ہم عنقریب اس کی ناک پر ننگ و عار کا داغ اور نشانی لگا دیں گے۔

ایسی صفات والوں کی پیروی نہ کرو

پیغمبر کے عظیم اخلاق کا ذکر کرنے کے بعد کہ جو گزشتہ آیات میں بیان ہوئے تھے، ان آیات میں ان کے دشمنوں کے اخلاق کو بیان کر رہا ہے تاکہ ان میں موازنہ کرنے سے ان دونوں کا فرق کامل طور سے آشکار ہو جائے۔ پہلے فرماتا ہے: "ان تکذیب کرنے والوں کی، جو خدا، پیغمبر، قیامت کے دن اور خدا کے دین کی تکذیب کرتے ہیں، اطاعت اور پیروی نہ کرو۔" (فلا تطع المكذبین)۔

وہ خود گمراہ اور دوسروں کو گمراہ کرنے والے لوگ ہیں اور انہوں نے حق کے تمام اصول اپنے پاؤں تلے روند ڈالے ہیں۔ ایسے لوگوں کی صرف ایک بات میں اطاعت بھی گمراہی اور بدبختی کے علاوہ اور کوئی نتیجہ نہیں رکھتی۔

اس کے بعد پیغمبر کو اپنے ساتھ ملانے اور اپنی طرف مائل کرنے کی ساز باز میں ان کی کوششوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم کچھ نرمی اختیار کر لو تاکہ وہ بھی کچھ نرمی کریں۔" (ردوا لوتدھن فیدھنون)۔

نرمی اور جھکاؤ کا معنی یہ ہے کہ ان کی خدا کے فرامین کے ایک حصہ سے صرف نظر کرے۔ مفسرین نے نقل کیا ہے کہ یہ آیات اس وقت نازل ہوئیں جب رؤساکہ نے پیغمبر کو اپنے بزرگوں کے دین، شرک اور بت پرستی کی دعوت دی تو خدا نے آپ کو ان کی اطاعت سے منع کیا۔ (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بعض دوسروں نے یہ نقل کیا ہے کہ ولید بن مغیرہ، جو شرک کے بہت بڑے سرغنوں میں سے تھا، انہوں نے بہت زیادہ مال پیغمبر کی خدمت میں پیش کیا اور قسم کھائی کہ اگر آپ اپنے دین سے پھر جائیں تو یہ سارا مال آپ کو دے دے گا۔

آیات کے لب و لہجہ اور تاریخوں میں درج واقعات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ جب دل کے اندھے مشرکین نے دین اسلام کی پیش رفت کی سرعت کا مشاہدہ کیا تو وہ اس فکر میں پڑ گئے کہ پیغمبر کو کچھ امتیازات دے کر ان سے کچھ امتیازات لے لیں اور انھیں سازش کے ذریعہ اپنی طرف کھینچ لیں۔ جیسا کہ طول تاریخ میں سرسبز ہی طرفداران باطل کا طریقہ رہا ہے۔ لہذا کبھی تو بہت زیادہ مال کی، کبھی خوبصورت عورتوں کی اور کبھی اعلیٰ عہدے اور مقام کی پیش کش کرتے۔ حقیقت میں وہ روح پیغمبر کو بھی اپنے وجود کے ترازو میں تول رہے تھے۔

لیکن قرآن پیغمبر کو بار بار خبردار کرتا ہے کہ ان اخلاقی پیشکشوں کے مقابلہ میں اپنی طرف سے معمولی سے کام لیں۔ ان کا بھی اظہار نہ کریں اور اہل باطل کی خاطر ہرگز نرمی نہ کریں۔ جیسا کہ سورہ مادہ کی آیت ۲۹ میں آیا ہے: "واللہ الیئک" ان (اہل کتاب) کے درمیان خدا کے نازل کردہ فرمان کے مطابق حکم کرو اور ان کی ہوا ہوس کی پیروی نہ کرو اور اس بات سے ڈرتے رہو کہ وہ تمہیں ان تعلیمات سے جو خدا نے تم پر نازل کی ہیں منحرف نہ کر دیں۔

"یدھنون"۔ "مداھنہ" کے مادہ سے اصل میں "دھن" بمعنی روغن لیا گیا ہے اور اس قسم کے مواد میں نرمی کرنے اور بھجکاؤ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ تعبیر مذموم اور منافقانہ بھجکاؤ کے مواد میں استعمال ہوتی ہے۔

✦ ✦ ✦

اس کے بعد دوبارہ ان کی اطاعت سے منع کرتے ہوئے نو مذموم صفات کو جن میں سے ہر ایک اکیلی اطاعت اور پیروی کرنے سے مانع ہو سکتی ہے، ان کو شمار کرتا اور فرماتا ہے: "اور ایسے لوگوں کی جو پست اور بہت زیادہ قسمیں کھانے والے ہوں اطاعت نہ کرو" (ولا تطع کل حلاف مہین)۔ "حلاف" اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ قسمیں کھاتا ہو اور ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے قسم کھانے لگے۔ عام طور پر اس قسم کے لوگ اپنی قسموں میں سچے نہیں ہوتے۔ "مہین"۔ "مہانت" سے حنارت و پستی کے معنی میں ہے۔ بعض نے اس کی کم عقل یا جھوٹے یا بہت

زیادہ شریر افراد کے ساتھ تفسیر کی ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”وہ شخص جو بہت ہی زیادہ عیب جو اور چیلوڑ ہے۔“ (ہمٹانہ مٹاے بنیہ)۔

”ہمٹانہ“ - ”ہمٹن“ (بروزن طرنز) کے مادہ سے غیبت اور عیب جوئی کرنے کے معنی میں ہے۔ ”مٹاے بنیہ“ ایسا شخص جو تعلقات خراب کرنے، فساد پھیلانے اور لوگوں میں دشمنی پیدا کرنے کے لیے آدورفت رکھتا ہو۔ اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ یہ دونوں اوصاف صیغہ مبالغہ کی صورت میں آئے ہیں جو اس قسم کے قبیح کاموں میں ان کے انتہائی اصرار کی ترجمانی کرتے ہیں۔

پانچویں جھپٹی اور ساتویں صفت میں کہتا ہے: ”وہ شخص جو نیک کاموں میں بہت زیادہ رکاوٹیں ڈالنے والا، تجاوز کر اور گنگار ہے۔“ (مٹاع للخیر معتد اشیہ)۔

نہ صرف خود کوئی اچھا کام نہیں کرتا اور اچھائی کا راستہ نہیں دکھاتا، بلکہ دوسروں کی خیر و برکت کے مقابلہ میں بھی ایک رکاوٹ بنا جوتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ ایک ایسا انسان ہے جو حدودِ الہی اور ان حقوق سے جو خدا نے ہر انسان کے لیے معین کر دیئے ہیں، تجاوز کرنے والا ہے۔ ان صفات کے علاوہ ہر قسم کے گناہ میں بھی آلودہ ہے، اس طرح کہ گناہ اس کی طبیعت اور مزاج کا جز بن چکا ہے۔

آخر کار ان کی آٹھویں اور نویں صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”وہ ان سب باتوں کے علاوہ پر خور و بدنام ہے۔“ (عتل بعد ذالک من نیہ)۔

”عتل“ جیسا کہ ”راغب“ نے ”مفردات“ میں کہا ہے، ایسے شخص کو کہتے ہیں جو غذا بہت زیادہ کھاتا ہو، ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتا ہو اور دوسروں کو اس سے محروم کر دیتا ہو۔

بعض دوسروں نے ”عتل“ کو ایک بدجو، کینہ پرور، سخت مزاج انسان یا بے حیا اور بدخلق انسان کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔

”نہ نیہ“ ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کا حسب و نسب واضح نہ ہو اور اسے کسی قوم کی طرف نسبت دیتے ہیں، حالانکہ وہ ان میں سے نہیں ہوتا۔ اصل میں ”ذنیہ“ (بروزن قلم) گو سفند کے کان کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ گویا وہ کان کا جز نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔

”نعد ذالک“ کی تعبیر اس معنی کی طرف اشارہ ہے کہ یہ دونوں صفات سابقہ صفات سے زیادہ ترچہ اور مذموم ہیں جیسا کہ مفسرین کی ایک جماعت نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہاں خدا نے جھٹلانے والوں، ان کی قبیح صفات اور اخلاقِ رذیلہ کی ایسی تصویر کشی کی ہے،

کہ شاید سارے قرآن میں اس کی مثل و نظیر نہ ہو۔ وہ اس طرح سے یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ اسلام و قرآن کے مخالف اور پیغمبر کی ذات کے مخالفین خود کس قسم کے لوگ تھے۔ جھوٹے، پست، عجیب جُو، چُغناخوڑ، حد سے تجاوز کرنے والے، گنہگار اور بے اصل و نسب افراد اور واقعاً اس قسم کے افراد کے علاوہ اور کبھی سے اس قسم کے افراد کی اصلاح کی مخالفت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

بعد والی آیت میں خبردار کرتا ہے: ”کہیں ایسا نہ ہو کہ جب وہ زیادہ مال اور اولاد رکھتے ہیں، اس بنا پر تم ان کے مقابلہ میں نرم پڑ جاؤ اور سر تسلیم خم کر کے ان کی اطاعت کرنے لگو۔“ (ان کان ذامنا و بنین)۔

اس میں شک نہیں کہ پیغمبر ہرگز ان کی اطاعت و پیروی نہ کرتے، لیکن یہ آیات حقیقت میں اس امر پر ایک تاکید ہیں تاکہ آپ کے مکتب کی راہ اور عملی روش سب پر آشکار ہو جائے اور دوست و دشمنوں میں سے کوئی بھی شخص اس قسم کی توقع نہ رکھے۔

اس بنا پر اوپر والا جملہ آیت و لا تطع کل حلاف مہین کا تمہ ہے، لیکن بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت حقیقت میں ان صفات کی پیدائش کی علت کا بیان ہے۔ یعنی دولت و ثروت اور افرادی قوت سے پیدا ہونے والا غرور و تکبر انھیں ان اخلاقی رذائل کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔ چنانچہ بہت سے بے ایمان دولت مندوں اور قدرت رکھنے والوں میں یہ صفات نظر آتی ہیں۔ لیکن آیات کا لب و لہجہ پہلی تفسیر کے ساتھ زیادہ مناسب ہے، اور اسی وجہ سے اکثر مفسرین نے بھی اس کو انتخاب کیا ہے۔

بعد والی آیت میں اس قسم کی پست صفات کے حامل افراد کا آیات الہی کے مقابلہ میں عکس العمل دکھانے ہوئے کہتا ہے: ”جب ہماری آیات اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو گزرے ہوئے لوگوں کے بے فائدہ افسانے ہیں“ (اذا تتلى عليه اياتنا قال اساطير الاولين)۔

وہ اس بہانے سے اور اس قبیح نسبت کی وجہ سے آیات خدا سے دور ہو جاتا ہے اور انھیں فراموش کر دیتا ہے۔ نیز دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ اسی بنا پر اس قسم کے افراد کی اطاعت و پیروی نہیں کرنا چاہیے اور یہ اس قسم کے افراد کی اطاعت سے نہی میں ایک تکمیل ہے۔

آخری زیر بحث آیت، اس گروہ کی ایک سزا سے پردہ اٹھاتے ہوئے مزید کہتی ہے: ”ہم عنقریب اس کی ناک پر ننگ و عار کا داغ اور نشانی لگا دیں گے۔“ (سنمہ علی الخراطوم)۔

یہ ان کو انتہائی ذلیل کرنے کے لیے ایک منہ بولتی تعبیر ہے۔ کیونکہ اول تو ناک کی خراطوم سے تعبیر جو صرف سوز اور ہاتھی کے لیے بولی جاتی ہے، ان کے لیے ایک واضح تحقیر و تذلیل ہے۔ دوسرے لذت عرب میں

چند

لے
بجہ
اس
رضہ
ان
لا
پہ

ناک عام طور پر بزرگی اور عزت سے کنایہ ہوتا ہے، جیسا کہ فارسی میں بھی جس وقت ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کی ناک کو مٹی میں رکھ دو۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی عزت کو برباد کر دو۔ (اردو میں ناک کا کٹنا بے عزتی کے معنی میں آتا ہے۔) تیسرے نشان و علامت لگانا جانوروں کے ساتھ مخصوص ہے، لیکن جانوروں میں بھی ان کے چروں خصوصاً ان کے ناک پر علامت نہیں لگائی جاتی، اور اسلام میں بھی اس کام سے روکا گیا ہے۔ یہ سب چیزیں واضح بیان کے ساتھ کہتی ہیں کہ خدا اس قسم کے طغیان گر، خودخواہ، متجاوز اور سرکش افراد کو اس طرح سے ذلیل کرتا ہے اور ہر جگہ ان کی رسوائی کا ڈھنڈورا پیٹا دیتا ہے تاکہ سب کے لیے عبرت ہو۔

تاریخ اسلام بھی اس معنی پر گواہ ہے کہ ہٹ دھرم مخالفین کا یہ گروہ اسلام کی پیش رفت سے اس طرح ذلیل رسوا ہوا کہ جس کی کوئی مثال اور نظیر نہیں ملتی۔ آخرت کی رسوائی اس سے بھی زیادہ ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سورہ کی زیادہ تر آیات شرک کے ایک مشہور سرغنہ "ولید بن مغیرہ" کے بارے میں آئی ہیں۔ لیکن یہ بات آیات کی عمومیت، وسعت اور اس کی تعبیرات کے شمول سے مانع نہیں ہے۔

❖ ❖ ❖

چند نکات

۱: اخلاقی ردائل

اوپر والی آیات اگرچہ پیغمبر اسلام کے سخت مخالفین کی صفاتِ مذلیلہ کی تفصیلات کے بارے میں ہیں، لیکن اس کے باوجود ان صفات کی تشخیص کے لیے ایک نمونہ ہمارے ہاتھ میں دیتی ہیں۔ وہ ایسی بری صفات ہیں جو انسان کو خدا سے دور کر دیتی ہیں اور شقاوت و بد سنجی کے گڑھے میں گرا دیتی ہیں۔ وہ ایسی صفات ہیں کہ جن سے سچے مومنین کو بچتے رہنا چاہیے اور ان سے آلودہ نہیں ہونا چاہیے۔ اسی لیے اسلامی روایات میں بھی اس سلسلہ میں بہت زیادہ تاکید آئی ہے۔ منجملہ:

بعض نے کہا ہے کہ ناک پر علامت لگانا جنگِ بدر میں عملی طور پر صورت پذیر ہو گیا کہ کفر کے بعض سرغنوں کی ناک پر اس طرح سے ضرب لگی کہ اس کی علامت باقی رہی۔ اگر یہاں ولید بن مغیرہ ہی مراد ہو تو تاریخ یہ کہتی ہے کہ وہ جنگِ بدر سے پہلے ہی ذلت و خواری کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی اور شخص مراد ہو تو پھر وہ بات ممکن ہے جو امام علی بن الحسین کے شام کے مشہور خطبہ میں بھی آئی ہے انا ابن من ضرب خراطیم الخلق حتی قالوا لا اله الا الله! میں اس کا بیٹا ہوں جس نے مشرکین کی ناکوں پر ضرب لگائی، یہاں تک کہ انہوں نے لا اله الا الله پڑھ لیا (اس سے مراد امیر المومنین علی ہیں۔ سبارا الا نور جلد ۲۵ ص ۱۳۸) زیر بحث آیت کی طرت توجہ کرتے ہوئے خدا کہتا ہے ہم اس کی فطرم پر علامت لگائیں گے یہ تعبیر ایک عمدہ معنی رکھتی اور بتاتی ہے کہ خدا کا یہ ارادہ اس کے مخصوص بندہ علی کے ہاتھ سے پورا ہوا۔

۱ : ایک حدیث میں رسول خداؐ سے آیا ہے :

”ألا ابنكوا بشراسكم قالوا بلى يا رسول الله (ص) قال : المشاؤون بالنميمة المنفوقون
بين الاحبته الباعون للبر راء المعاييب“

”کیا میں تمہیں پتھارے شری ترین افراد کے بارے میں خبر دوں؟ انہوں نے کہا جی ہاں! اے رسول
خدا! فرمایا : وہ لوگ جو بہت زیادہ چغلیوز ہیں، دوستوں کے درمیان جدائی ڈالتے ہیں اور پاکیزہ اور
بے گناہ افراد میں عیوب کی جستجو میں لگے رہتے ہیں“ لے

۲ : پیغمبرؐ اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ وصیت کیا کرتے اور فرماتے تھے :

”لا يبلغني احد من اصحابي شيئاً فاني احب ان اخرج اليكم وانا سليم الصدر“
”تم میں سے کوئی بھی شخص میرے اصحاب میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی ایسی بات نہ
کرے جو مجھے اس کی نسبت بدظن کر دے، کیونکہ میں دوست رکھتا ہوں کہ پاک و پاکیزہ دل کے ساتھ
تم سے ملا کروں“ لے

۳ : نیز ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا :

”لا يدخل الجنة جو اظ، ولا جعظري، ولا عتل زعيم“

”تین گروہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے۔ ”جواظ“، ”جعظري“ اور ”عتل زعيم“۔ راوی کہتا ہے کہ
میں نے پوچھا۔ ”جواظ“ کون ہے؟ فرمایا: کل جماع مناع۔ ہر وہ شخص جو زیادہ مال جمع کرتا ہے، اور
دوسروں سے سخیل کرتا ہے۔ میں نے پوچھا: جعظري کون ہے؟ فرمایا: سخت مزاج اور تند خو۔ میں نے
پوچھا: عتل زعيم کون ہے؟ فرمایا: شکم پرور اور بد اخلاق لوگ جو زیادہ کھاتے زیادہ پینتے اور بیداگر
اور ظالم ہیں“ لے

۲ : مد اہنہ اور سازگاری

وہ واضح اختلافات جو راہ حق کے راہروں اور سیاسی بازی گروں کے درمیان موجود ہیں، ان میں سے
ایک یہ ہے کہ دوسرا گروہ کسی خاص اصول پر ثابت قدم نہیں رہتا۔ بلکہ وہ ہمیشہ اس بات کے لیے تیار
رہتے ہیں کہ ان امتیازات کے مقابلہ میں جو ان کو حاصل ہیں کچھ اور امتیازات حاصل کریں اور اپنے اصول

لے اصول کافی جلد ۲ باب النبیہ حدیث ۱

لے سنن ابوداؤد و صحیح ترمذی (مطابق نقل فی لئال القرآن جلد ۸ ص ۲۳۰)

لے نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۹۲

سے کچھ منافع کی خاطر، صرف نظر کر لیں۔ ان کے اہداف و عقائد ان کیلئے کوئی مقدس چیز نہیں ہیں، اور وہ ہمیشہ ان کی قیمت پر معاملہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ ٹھیک اوپر والی آیت کا مضمون ہے جو کہتی ہے: (وَدَّوَالُو تَدَاهِن فَيُدْهِنُونَ) وہ دوست رکھتے ہیں کہ تجھے بھی اپنے جتنے میں کھینچ لیں اور جس طرح وہ مدہانت اور معاملہ کرتے ہیں، تو بھی کرے۔“

لیکن پہلا گروہ ہرگز معاملہ کر نہیں ہوتا، وہ اپنے مقدس اہداف کو کسی بھی قیمت پر اپنے ہاتھ سے نہیں دیتے اور اس پر معاملہ نہیں کرتے۔ مدہانت و موافقت اور اس قسم کے سیاسی لین دین ان میں نہیں ہوتے۔ یہ ایک بہترین ثانی ہے جس سے پیشہ ور سیاست بازوں کو پہچانا جا سکتا ہے اور انھیں مزان خدا سے الگ کیا جا سکتا ہے۔۔



۱۷ اَنَا بَلَوْنَهُمْ كَمَا بَلَوْنَا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ إِذْ أَقْسَمُوا
أَيُّرْمُنَّهَا مُصْبِحِينَ ۝

۱۸ وَلَا يَسْتَشْنُونَ ۝

۱۹ فَطَافَ عَلَيْهَا طَائِفٌ مِّن رَّبِّكَ وَهُمْ نَائِمُونَ ۝

۲۰ فَأَصْبَحَتْ كَالصَّرِيمِ ۝

۲۱ فَتَنَادُوا مُصْبِحِينَ ۝

۲۲ أَنْ ائْتَدُوا عَلَىٰ حَرْثِكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝

۲۳ فَأَنطَلَقُوا وَهُمْ يَتَخَفَتُونَ ۝

۲۴ أَنْ لَا يَدْخُلَنَهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مَسْكِينٌ ۝

۲۵ وَغَدَوْا عَلَىٰ حَرْدٍ قَادِرِينَ ۝

ترجمہ

۱۷ ہم نے انھیں آزمایا جیسا کہ ہم نے باغ والوں کی آزمائش کی تھی جب انھوں نے یہ قسم

کھائی کہ باغ کے پھلوں کو صبح کے وقت (جاہتمندوں کی نگاہوں سے بچا کر) نہیں گے۔

۱۸ اور اس میں کسی چیز کا استناد نہ کریں گے۔

لیکن ان کے سارے باغ پر (راتوں رات) ایک گھیر لینے والا عذاب نازل ہو گیا جبکہ وہ سو رہے تھے اور وہ ہر ابھرا باغ تاریک رات کی مانند ہو گیا۔

صبح کے وقت انھوں نے ایک دوسرے کو صدا دی۔

اگر تمہارا ارادہ پھلوں کو توڑنے کا ہو تو اپنے کھیت اور باغ کی طرف چلو۔

وہ چل پڑے اور ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ کہتے جاتے تھے۔

اس بات کو خیال رکھو کہ ایک بھی فقیر تمہارے پاس نہ آنے پائے۔

انھوں نے صبح کے وقت یہ مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ پوری قوت کے ساتھ حاجت مندوں کو

روکیں گے۔

تفسیر

باغ والوں کی عبرت انگیز داستان

اس بحث کی مناسبت سے جو گزشتہ آیات میں مفرور و خودخواہ دولت مندوں کے بارے میں تھی اور وہ مال اور اولاد کی زیادتی کی وجہ سے ہر چیز انکار دیتے تھے، ان آیات میں پہلے زمانہ کے کچھ دولت مندوں کے بارے میں جو ایک سرسبز و شاداب باغ کے مالک تھے اور آخر کار وہ خود سری کی بناء پر نابود ہو گئے تھے، ایک داستان بیان کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ داستان اس زمانہ کے لوگوں میں مشہور و معروف تھی، اور اسی بناء پر اس کو گواہی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: ”ہم نے انہیں آزمایا، جیسا کہ ہم نے باغ والوں کی آزمائش کی تھی“ (اتنا بلونا ہم کما بلونا اصحاب الجنة)۔

یہ باغ کہاں تھا، عظیم شہر صنعا کے قریب سرزمین یمن میں؟ یا سرزمین حبشہ میں؟ یا بنی اسرائیل کے سرزمین شام میں؟ یا طائف میں؟ اس بارے میں اختلاف ہے۔ لیکن مشہور یمن ہی ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ یہ باغ ایک بوڑھے مرد مومن کی ملکیت تھا۔ وہ اپنی ضرورت کے مطابق اس میں سے لے

لیا کرتا اور باقی مستحقین اور حاجت مندوں کو دے دیتا تھا۔ لیکن جب اس نے دنیا سے آکھ بند کر لی (اور مر گیا) تو اس کے بیٹوں نے کہا ہم اس باغ کی پیداوار کے زیادہ مستحق ہیں، چونکہ ہمارے عیال و اطفال زیادہ ہیں۔ لہذا ہم اپنے باپ کی طرح عمل نہیں کر سکتے۔ اس طرح انھوں نے یہ ارادہ کر لیا کہ ان تمام حاجت مندوں کو جو ہر سال اس سے فائدہ اٹھاتے تھے محروم کر دیں۔ لہذا ان کی سرنوشٹ وہی ہوئی جو ان آیات میں بیان ہوئی۔

کہتا ہے: ”ہم نے انھیں آزما یا، جب انھوں نے یہ قسم کھائی کہ باغ کے پھلوں کو صبح کے وقت حاجت مندوں کی نظریں سچا کر چیں گے۔“ (اذ اقموا الیصر منھا مصبحین)۔ اور اس میں کسی قسم کا استثناء نہ کرینگے اور حاجت مندوں کے لیے کوئی چیز بھی نہ رہنے دیں۔“ (و لا یستثنون)۔

ان کا یہ ارادہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ یہ کام ضرورت کی بناء پر نہیں تھا، بلکہ یہ ان کے بخل اور ضعف ایمان کی وجہ سے تھا۔ کیونکہ انسان چاہے کتنا ہی ضرورت مند کیوں نہ ہو، اگر وہ چاہے تو کثیر پیداوار والے باغ میں سے کچھ نہ کچھ حصہ حاجت مندوں کے لیے مخصوص کر سکتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ عدم استثناء سے مراد یہ ہے کہ انھوں نے ”الا ان یشاء اللہ“ نہیں کہا تھا۔ یعنی وہ اس قدر مغرور تھے کہ انھوں نے کہا ہم جائیں گے اور یہ کام ضرور کریں گے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنے آپ کو انشاء اللہ کہنے سے بھی بے نیاز سمجھا۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح ہے۔ اس کے بعد اسی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے: ”رات کے وقت جبکہ وہ سوتے ہوئے تھے، تیرے پروردگار کا ایک گھیر لینے والا عذاب ان کے سارے باغ پر نازل ہو گیا“ (ظلمات علیہا طائف من ربک و ہم نامنون)۔

ایک جلانے والی آگ اور مرگ بار بجلی اس طرح سے اس کے اوپر مُسَلط ہوئی کہ وہ سرسبز و شاداب باغ رات کی مانند سیاہ اور تاریک ہو گیا اور مٹھی بھر راکھ کے سوا کچھ بھی باقی نہ بچا۔“ (فاصبحت کالصریو)۔ ”طائف“ ظلوف کے مادہ سے اصل میں اس شخص کے معنی میں ہے جو کسی چیز کے گرد گھومتے لیکن بعض اوقات اس بلا و مصیبت سے کنایہ ہوتا ہے جو رات کو نمودار ہو اور اس جگہ یہی مراد ہے۔

”صریو“ صرور کے مادہ سے قطع کرنے کے معنی میں ہے اور یہاں ”تاریک رات“ یا پھل کے بغیر درخت“ یا ”سیاہ راکھ“ کے معنی میں ہے۔ کیونکہ رات دن کے آجانے سے منقطع ہو جاتی ہے، جیسا کہ دن

لہ یصر من صرور (بردوزن شرم) کے مادہ سے پھل توڑنے کے معنی میں ہے اور مطلق طور پر قطع کرنے کے معنی میں بھی ہے۔ اسی طرح کام کو محکم کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

لے کیونکہ خاص مناسبت کے علاوہ، جو پہلا معنی اصل قصہ کے ساتھ رکھتا ہے، اگر دوسرا معنی مراد ہوتا تو لا یستثنون کے بجائے ”ولم تستثنوا“ کہا جاتا۔ (غور کیجیے)

رات کے آجانے سے منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی لیے بعض اوقات رات اور دن کو 'صریمان' کہتے ہیں۔ بہر حال مراد یہ ہے کہ یہ آسمانی بلا جو ظاہراً ایک عظیم ضائعہ (بجلی) تھی، اس طرح سے اس باغ پر نازل ہوئی کہ جس نے سارے باغ کو ایک ساتھ آگ لگا دی اور مٹھی بھر کوٹوں اور سیاہ راکھ کے سوا کچھ بھی باقی نہ بچا، کیونکہ صاعقے اور بجلیاں جب بھی کسی چیز پر پڑتی ہیں تو ان کا حال اسی طرح کا ہو جاتا ہے۔

✦ ✦ ✦

بہر حال باغ کے مالکوں نے اس گمان سے کہ یہ لدے پھندے درخت اب تیار ہیں کہ ان کے پھل توڑ لیے جائیں: "صبح ہوتے ہی ایک دوسرے کو پکارا۔" (فتنادوا مُصبحین) یہ

✦ ✦ ✦

انہوں نے کہا: "اگر تم اپنے باغ کے پھلوں کو توڑنا چاہتے ہو تو اپنے کھیت اور باغ کی طرف چلو" (ان اغدوا علی حرشکم ان کنتم صامر مین)۔

"اغدوا"۔ "عدوۃ" کے مادہ سے دن کے اول حصہ کے معنی میں ہے۔ اسی لیے اس غذا کو جو صبح سویرے کھائی جاتی ہے۔ غذا، ذراشتہ کہتے ہیں۔ (اگرچہ عربی کے موجودہ روزمرہ کی تعبیرات میں غداء دن کے کھانے کو کہا جاتا ہے۔)

✦ ✦ ✦

"اسی طرح سے وہ اپنے باغ کی طرف چل پڑے اور وہ آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے" (فا نطلقوا وهو يتخافتون)۔

"کہ اس بات کا خیال رکھو کہ ایک بھی فقیر تمہارے پاس نہ آنے پائے" (ان لا یدخلنہا الیوم علیکم مسکین)۔

اور وہ اس طرح آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے کہ ان کی آواز کسی دوسرے کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی فقیر خبردار ہو جائے اور بچے کچھ پھل چننے کے لیے یا اپنا پیٹ بھرنے کے لیے تھوڑا سا پھل لینے ان کے پاس آجائے۔

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ان کے باپ کے سابقہ نیک اعمال کی بناء پر فقراء کا ایک گروہ ایسے دنوں کے انتظار میں رہتا تھا کہ باغ کے پھل توڑنے کا وقت شروع ہو تو اس میں سے کچھ حصہ انہیں بھی ملے۔ اسی لیے یہ سبیل اور ناضلٹ بیٹے اس طرح سے معنی طور پر چلے کہ کبھی کو یہ احتمال نہ ہو کہ اس قسم کا دن آہنچا ہے، اور

لے "تنادوا" راغب مفردات میں کہتا ہے کہ "نداء" (بروزن عنا) اصل میں "ندی" سے لیا گیا ہے جو رطوبت کے معنی میں ہے۔ کیونکہ مشور ہے کہ جن لوگوں کے منہ میں کافی رطوبت ہوتی ہے وہ آرام اور سکون سے گفتگو کر سکتے ہیں اور ان کا کلام فصیح اور آواز صاف ہوتی ہے۔

جب فقراء کو اس کی خبر ہو تو معاملہ ختم ہو چکا ہو۔

”اس طرح سے وہ صبح سویرے اپنے باغ اور کھیت میں جانے کے ارادے سے حاجت مندوں اور فقراء کو روکنے کے لیے پوری قوت اور پختہ ارادے کے ساتھ چل پڑے۔“ (وعدوا علیٰ حردقا دسریین)۔
”حسرت“ (بروزن سرد) شدت و غضب سے توأم ممانعت کے معنی میں ہے۔ ہاں! وہ فقراء و مساکین کی تمنا اور انتظار سے سبک پاتے اور پختہ ارادہ کیے ہوئے تھے کہ پوری قوت کے ساتھ انہیں منع کریں گے۔
اسی لیے یہ تعبیر ان سالوں کے لیے کہ جن میں بارش نہ ہو یا اس اونٹنی کے لیے جس کا دودھ ختم ہو جائے استعمال ہوتی ہے۔

اب دیکھتے ہیں کہ ان کا انجام کیا ہوا۔

❖ ❖ ❖

ترجمہ

بھوا

فَلَمَّا رَأَوْهَا قَالُوا إِنَّا لَضَالُّونَ ۝
 بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ۝
 قَالَ أَوْسَطُهُمْ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُونَ ۝
 قَالُوا سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ۝
 فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَلَوْمُونَ ۝
 قَالُوا يَٰوَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا طُغْيَانًا ۝
 عَسَىٰ رَبُّنَا أَنْ يُبَدِّلَنَا خَيْرًا مِّنْهَا إِنَّا إِلَىٰ
 رَبِّنَا سَارِعُونَ ۝
 كَذَلِكَ الْعَذَابُ ۖ وَالْعَذَابُ الْآخِرَةُ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا
 يَعْلَمُونَ ۝

ترجمہ

(جب باغ میں وارد ہوئے اور) اسے دیکھا تو کہنے لگے کہ ہم تو راستہ

بھول گئے ہیں۔

(ہاں ہر چیز مکمل طور پر ہمارے ہاتھ سے نکل گئی ہے، بلکہ ہم محروم ہیں۔

ادی
کو د
کہا تھا
کاشک
اور بچ
چونکہ و
زبان ک
کرتار

پروردگار
سبحا
کے اہ
بہت
اور اس
”لولا“
اصل

لیکن

- ۲۸) اُن میں سے ایک (جو سب سے زیادہ عقلمند تھا) اس نے کہا: کیا میں نے تم سے یہ کہا تھا کہ تم خدا کی تسبیح کیوں نہیں کرتے؟
- ۲۹) انھوں نے کہا: ہمارا پروردگار پاک و پاکیزہ اور منترہ ہے، یقیناً ہم ہی ظالم تھے۔
- ۳۰) پھر انھوں نے ایک دوسرے کی طرف رُخ کیا اور ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔
- ۳۱) (اور ان کی فریاد بلند ہوئی) اور کہا: وائے ہو ہم پر ہم ہی طغیانگر اور سرکش تھے۔
- ۳۲) ہم اُمید رکھتے ہیں کہ ہمارا پروردگار ہمیں بخش دے اور اس کے بجائے اس سے بہتر دے دے، کیونکہ اب ہم نے اس سے دل لگایا ہے۔
- ۳۳) خدا کا عذاب (دنیا میں) اسی طرح سے ہوتا ہے۔ اور اگر وہ جانتے تو آخرت کا عذاب اس سے بھی بڑا ہے۔

تفسیر

سرسبز باغ کے مالکوں کا دردناک انجام

یہ آیات انہیں باغ والوں کی داستان کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ جو گزشتہ آیات میں گزر چکی ہے۔ وہ باغ والے اس اُمید پر کہ باغ کی فراواں پیداوار کو چنیں اور مساکین کی نظریں سچا کر اسے جمع کر لیں اور یہ سب کچھ اپنے لیے خاص کر لیں، یہاں تک کہ خدا کی نعمت کے اس وسیع دسترخوان پر ایک بھی فقیر نہ بیٹھے۔ یوں صبح سویرے چل پڑے لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ رات کے وقت جب کہ وہ پڑے سو رہے تھے ایک مرگلا صاعقہ نے باغ کو ایک مٹھی بھر خاکستر میں تبدیل کر دیا ہے۔

قرآن کہتا ہے: ”جب انھوں نے اپنے باغ کو دیکھا تو اس کا حال اس طرح سے بگڑا ہوا تھا کہ انھوں نے کہا یہ ہمارا باغ نہیں ہے۔ ہم تو رات بھول گئے ہیں۔“ (فلما رأوا ما آلوا لؤلؤا نورا)۔

’ضالون‘ سے مراد ممکن ہے باغ کا رات بھول جانا ہو جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، یا راہ حق کو بھول جانا اور گمراہ ہو جانا ہو جیسا کہ بعض نے احتمال دیا ہے۔ لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

پھر انھوں نے مزید کہا: "بلکہ ہم تو حقیقت میں محروم ہیں۔" (میل سخن محرومون)۔
 ہم چاہتے تھے کہ مساکین اور ضرورت مندوں کو محروم کریں لیکن ہم تو خود سب سے زیادہ محروم ہو گئے ہیں،
 ادا منافع سے بھی محروم ہو گئے ہیں اور معنوی برکات سے بھی کہ جو راہِ خدا میں خرچ کرنے اور حاجت مندوں
 کو دینے سے ہمارے ہاتھ آتیں۔

”اس اثنا میں ان میں سے ایک جو سب سے زیادہ عقلمند تھا، اس نے کہا: ”کیا میں نے تم سے نہیں
 کہا تھا کہ تم خدا کی تسبیح کیوں نہیں کرتے۔“ (قال اوسطهم الم اقل لکھ لولا تسبحون)۔
 کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ خدا کو عظمت کے ساتھ یاد کرو اور اس کی مخالفت سے بچو، اس کی نعمت
 کا شکر سجالاؤ اور حاجت مندوں کو اپنے اموال سے بہرہ مند کرو! لیکن تم نے میری بات کو توجہ سے نہ سنا
 اور بدبختی کے گڑھے میں جا گرے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ایک مرد مومن تھا جو انھیں سخی اور حرص سے منع کیا کرتا تھا۔
 چونکہ وہ اقلیت میں تھا لہذا کوئی بھی اس کی بات پر کان نہیں دھرتا تھا۔ لیکن اس دردناک حادثہ کے بعد اس کی
 زبان کھل گئی۔ اس کی منطق زیادہ تیز اور زیادہ کاٹ کرنے والی ہو گئی، اور وہ انھیں مسلسل ملامت اور سرزنش
 کرتا رہا۔

وہ بھی ایک لمحہ کے لیے بیدار ہو گئے اور انھوں نے اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا: ”انھوں نے کہا: ہمارا
 پروردگار پاک اور منزہ ہے۔ یقیناً ہم ہی ظالم و شتمگہ تھے۔ ہم نے اپنے اوپر بھی ظلم کیا اور دوسروں پر بھی۔“ (قالوا
 سبحان ربنا انما كنا ظالمین)۔

”اوسط“ کی تفسیر جو گزشتہ آیت میں آئی ہے، اس شخص کے معنی میں ہے جو عقل و خرد اور علم و دانش
 کے اعتبار سے سرحد اعتدال میں ہو، بعض نے اسے سن و سال میں حدِ وسط کے معنی میں لیا ہے۔ لیکن یہ معنی
 بہت بعید نظر آتا ہے۔ کیونکہ سن و سال اور اس قسم کی پر معنی گفتگو کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے۔ البتہ عقل و خرد
 اور اس قسم کی باتوں کے درمیان ارتباط ہے۔

”لولا تسبحون“ (تم خدا کی تسبیح کیوں نہیں کرتے) کی تعبیر اس بناء پر ہے کہ تمام نیک اعمال کا ریشہ اور
 اصل، ایمان، معرفتِ خدا اور تسبیح و تنزایہ خدا ہے۔

بعض نے تسبیح خدا کا معنی شکرِ نعمت کیا ہے، جس کا لازمہ محروموں کو بہرہ مند کرنا اور فائدہ پہنچانا ہے،
 لیکن یہ دونوں تفاسیر ایک دوسرے کے ساتھ منافات نہیں رکھتیں اور آیت کے مفہوم میں جمع ہیں۔
 لیکن گناہ کے اعتراف سے پہلے ان کی تسبیح ممکن ہے اس بناء پر ہو کہ وہ یہ چاہتے ہوں کہ یہ بلائے عظیم

تم سے یہ نہیں
 تھے۔
 کرنے لگے
 تھے۔
 سے بہتر ہیں
 کا عذاب
 ہے۔ وہ بار
 ب کچھ اپنے
 بیج سویرا
 ایک مرگ
 کہ انھوں
 (ن)
 راہ حق کہ
 ے۔

جو ان کے باغ پر نازل ہوئی اور جس نے اسے نابود کر دیا ہے خدا کو اس میں ہر قسم کے ظلم و ستم سے منزه سمجھیں اور یہ کہیں کہ خداوند ایہ ہم ہی تھے جنہوں نے خود اپنے اوپر اور دوسروں پر ظلم کیا، اور اس قسم کے دردناک عذاب کے مستحق ہوئے ہیں، لیکن تیرا کام عین عدالت و حکمت ہے۔

قرآن کی بعض دیگر آیات میں بھی اپنے ظلم کا اقرار کرنے سے پہلے یہی تیسخ نظر آتی ہے جیسا کہ حضرت یونس کی داستان میں آیا ہے۔ جب وہ اس عظیم مچھلی کے پیٹ میں پہنچے تو کہا: لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین: تیرے علاوہ اور کوئی معبود نہیں ہے۔ تو منزه ہے۔ میں ہی ظالموں اور ستمگروں میں سے تھا۔ (انبیاء، ۸۷)

البتہ اس عظیم پیغمبر کے بارے میں ظلم ترک ادولی کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ تفسیر نمونہ جلد ۱۲ میں ہم اس آیت کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔

❖ ❖ ❖

لیکن مطلب یہیں پر ختم نہیں ہو گیا: ”انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دُخ کیا اور ایک دوسرے کو ملامت و سرزنش کرنے لگے۔ (فا قبل بعضہم علی بعض یتلوا و یومنون)۔

احتمال یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی خطا کے اعتراف کے باوجود اصلی گناہ کو دوسرے کے کندھے پر ڈالتا اور شدت کے ساتھ اس کو سرزنش کرتا تھا کہ ہماری بربادی کا اصل عامل تو ہے! ورنہ ہم خدا اور عدالت سے اس قدر بیگانہ نہیں تھے۔

ہاں! تمام ظالموں کی سرفروخت کہ جو عذاب الہی کے چنگل میں گرفتار ہوتے ہیں، اسی طرح ہے کہ گناہ کا اعتراف کرنے کے باوجود ہر ایک کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی بدبختی کا عامل دوسرے کو شمار کرے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس قسم کے مواقع پر ایک آدمی تجویز پیش کرتا ہے، دوسرا تائید کرتا ہے، تیسرا اس کا اجراء لینے ذمہ لیتا ہے اور چوتھا اپنے سکوت اور خاموشی کے ذریعے اپنی رضامندی کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ یہ سب کے سب شریک جرم اور گناہ میں پورا پورا دخل رکھتے ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ جب وہ اپنی بدبختی کی انتہا سے آگاہ ہوئے تو ان کی فریاد بلند ہوئی اور انہوں نے کہا: ”وائے جو ہم پر کہ ہم ہی سرکشی اور طغیان کرنے والے تھے۔“ (قالوا یا وایلاتنا انا کنا طامغین)۔

انہوں نے پہلے مرحلہ میں تو ظلم و ستم کا اعتراف کیا اور یہاں طغیان و سرکشی کا اعتراف ہے۔ حقیقت میں طغیان ظلم سے بالاتر ایک مرحلہ ہے، کیونکہ ظالم ممکن ہے اصل قانون کو قبول کرے لیکن ہوا سے نفس کے زیر اثر ہو کر ظلم و ستم کرے۔ لیکن طغیان کرنے والا تو اصلاً قانون کے زیر بار ہی نہیں ہوتا اور اسے قانون کی حیثیت سے تسلیم ہی نہیں کرتا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ ظلم تو اپنے آپ کو ظلم کرنے کی طرف اشارہ ہو اور طغیان دوسروں کے حق میں تجاوز کرنے کی طرف اشارہ ہو۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ عرب جب کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے یا کسی چیز سے نفرت کا اظہار کرنا چاہتے تھے تو کبھی "وایس" کہتے تھے اور کبھی 'وایح' اور کبھی 'ویل' جن میں سے پہلا مصیبت میں خیف، دوسرا زیادہ شدید اور تیسرا سب سے زیادہ شدید ہے اور یہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ باغ والے اپنے آپ کو شدید ترین سزائیں کا مستحق سمجھتے تھے۔

انجام کار انھوں نے اس بیداری، گناہ کے اعتراف اور خدا کی طرف بازگشت کے بعد اس کی بارگاہ کی طرف مراجعہ کیا اور کہا۔ "امید ہے کہ ہمارا پروردگار ہمارے گناہوں کو بخش دے گا اور ہمیں اس سے بہتر باغ عطا فرمائے گا" (عسلی دینا ان یبدلنا خیرا لہما)۔

"کیونکہ ہم نے اس کی طرف رُخ کر لیا ہے اور اس کی پاک ذات کے ساتھ لو لگائی ہے۔ لہذا اس مشکل کا حل بھی اسی کی بے پایاں قدرت سے طلب کرتے ہیں" (انا الیٰ ربنا سراغبون)۔ یہ کیا یہ گروہ واقعا اپنے فعل پر پشیمان ہو گیا تھا، اس نے اپنے طرز عمل میں تبدیلی نظر کر لی تھی اور قطعی اور پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ اگر خدا نے ہمیں آئندہ اپنی نعمتوں سے نوازا تو ہم اس کے شکر کا حق ادا کریں گے؛ یا وہ بھی بہت سے ظالموں کی طرح کہ جب وہ عذاب میں گرفتار ہوتے ہیں تو وقتی طور پر بیدار ہو جاتے ہیں، لیکن جب عذاب ختم ہو جاتا ہے تو وہ دوبارہ انھیں کاموں کی تکرار کرنے لگتے ہیں۔

اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعد والی آیت کے لب ولہجہ سے احتمالی طور پر جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی توبہ شرائط کے صحیح نہ ہونے کی بنا پر قبول نہیں ہوئی۔ لیکن بعض روایات میں آیا ہے کہ انھوں نے خلوص نیت کے ساتھ توبہ کی، خدا نے ان کی توبہ کو قبول کر لیا اور انھیں اس سے بہتر باغ عنایت کیے جس میں خاص طور پر بڑے بڑے خوشوش والے انور کے پریمیہ درخت تھے۔

آخری زیر بحث آیت میں کلی طور پر نتیجہ نکالتے ہوئے سب کے لیے ایک درس کے عنوان سے فرماتا ہے: "خدا کا عذاب اس طرح کا ہوتا ہے اور اگر وہ جانیں تو آخرت کا عذاب تو بہت ہی بڑا ہے" (کذالک العذاب وللعذاب الاخرة اکبر لو کما نوا یعلمون)۔

اگر تم بھی مال و ثروت اور مادی وسائل کی بنا پر مست و مغرور ہو گئے، ذخیرہ طلبی کی رُوح نے تم پر غلبہ کر لیا، ہر چیز کو اپنے لیے ہی طلب کرنے لگو اور حاجت مندوں کو محروم کر دو تو تمہاری سرنوشت بھی ان سے بہتر نہیں ہے۔

لے "سراغبون"۔ "سراغب" کے مادہ سے ہے۔ یہ مادہ جب 'الی' یا 'فی' کے ساتھ مستدی ہوتا ہے تو کسی چیز کی طرف تمایل کے معنی دیتا ہے۔ جب 'عن' کے ساتھ مستدی ہوتا ہے کسی چیز سے انصراف اور بے اعتنائی کے معنی میں ہوتا ہے

مرزہ سمجھیں اور
اک عذاب کے
کہ حضرت یونس
فی کنت من
" (انیامہ)
ن ہم اس
سرے کو
ندے پر
الست
گناہ کا
ے شاید
براد اپنے
واضح
فقول
نت
کے
کی
نے

ہوگی۔ البتہ وہ ایک روز تھا کہ صاعقہ (بجلی) آئی اور اس نے اس باغ کو آگ لگا دی۔ آج ممکن ہے کچھ اور آگ ہوں یا گھروں اور آبادیوں کو جلا دینے والی علاقائی یا عالمی جنگیں ان نعمتوں کو تباہ و برباد کر دیں۔

ۛ ۛ ۛ

چند نکات

۱: انحصار طلبی: ثروت مندوں کی بہت بڑی مصیبت

انسان خواہ نخواہ مال دنیا سے لگاؤ رکھتا ہے، کیونکہ اس کی زندگی کا گزارہ اسی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ لگاؤ اعتدال کی حد میں مذموم نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ضرورت مندوں کو بھی اپنے اموال میں شریک کرے۔ صرف الہی حقوق واجبہ کو ادا کرے، بلکہ مستحب انفاق سے بھی ہاتھ نہ روکے۔ خصوصاً باغ اور زراعت کے بارے میں اسلامی روایات میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ حاضر آنے والے ضرورت مندوں کو ایک حصہ دیں، جو آیہ شریفہ (وَأْتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ) اس کا حق فصل کاٹنے کے وقت دے دو، (الانعام) سے اقتباس کرتے ہوئے حق الحصاد کے عنوان سے مشہور ہوا ہے۔ وہ ایک ایسا حق ہے جو زکوٰۃ معروف حق سے الگ ہے اس سے مراد وہ چیز ہے جو پھل توڑنے یا زراعت کاٹنے کے موقع پر حاضر آنے والے ضرورت مندوں کو دی جاتی ہے اور اس کی کوئی حد معین نہیں ہے۔ لہٰذا

لیکن جب مال و ثروت سے لگاؤ افراط اور انحراف کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے تو انحصار طلبی کی صورت اختیار کر لیتا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات اپنے لیے کسی چیز کی ضرورت نہ ہونے کے باوجود وہ یہ چاہتا ہے کہ دوسرے اس سے محروم رہیں۔ یہ وہ عظیم مصیبت ہے خصوصیت کے ساتھ جس کے آج بھی انسانی معاشرہ میں بہت سے نمونے موجود ہیں اور اس کو ایک قسم کی خطرناک بیماری شمار کیا جاسکتا ہے۔

باغ والوں کی داستان جو اوپر والی آیات میں بیان کی گئی ہے ثروت مندوں کے ایک گروہ کے انحصار طلبی کے جذبہ کی واضح طور پر تصویر کشی کرتی ہے۔ یعنی وہ کس طرح سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہیں ضرورت مندوں کے محروم کرنے کے لیے منصوبہ بناتے ہیں۔ اور ان کی نظریں سچا کر عظیم منافع اور بڑے بڑے فوائد حاصل کرتے ہیں، لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان محروموں کی آہ جلانے والی سبلیوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور ان انحصار طلب ثروت مندوں کے فرم زندگی کو آگ لگا دیتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ یہ سبلیاں انقلابوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں اور جس چیز کو وہ باور نہیں کرتے تھے اسے اپنی آنکھ سے دیکھ لیتے ہیں۔ ان کی آہ و فریاد آسمان سے

ۛ لے اس موضوع سے مربوط روایات کا وسائل الشیعہ کی جلد ۶ ابواب زکوٰۃ الغلات باب ۱۳ میں اور سنن بہقی جلد ۲ ص ۱۳۳ میں مطالعہ فرمائیں۔

بمک بند ہوتی ہے اور وہ گزشتہ خطاؤں اور گناہوں سے توبہ اور تلافی کا دم بھرتے ہیں لیکن مُعاظہ ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔

❖ ❖ ❖

۲ : گناہ اور قطع رزق کے درمیان رابطہ

اوپر والی آیات سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ گناہ اور قطع رزق کے درمیان قریبی رابطہ ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے آیا ہے :

”ان الرجل لیذنب الذنب فیدرأ عنه الرزق وتلا هذه الآية : اذا قسموا لیصر منها مصبحین ولا یستثنون فطاف علیها طائف من ربك وهم نامئون۔“
”بعض اوقات انسان گناہ کرتا ہے تو اس کی روزی منقطع ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد امام نے اوپر والی آیات کی تلاوت کی۔“

”جب انھوں نے یہ قسم کھائی کہ ہم صبح سویرے پھلوں کو توڑ لیں گے اور اپنے سوا کسی کو بھی اس سے فائدہ نہیں اٹھانے دیں گے، لیکن اس وقت کہ جب وہ سوئے ہوئے تھے تیرے پروردگار کی طرف سے ایک بلا اس باغ پر مستط ہو گئی اور اسے نابود کر دیا۔“

ابن عباس سے بھی یہ نقل ہوا ہے کہ گناہ اور روزی کے منقطع ہونے کا ربط سورج سے بھی زیادہ واضح ہے جیسا کہ خدا نے اسے سورہ ن والقلم کی زیر بحث آیت میں بیان فرمایا ہے۔

❖ ❖ ❖

- ۳۲) إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٍ النَّعِيمِ ۝
- ۳۵) أَفَجَعَلُ الْمَسِيئِينَ كَالْمَجْرِمِينَ ۝
- ۳۶) مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۝
- ۳۷) أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ۝
- ۳۸) إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ ۝
- ۳۹) أَمْ لَكُمْ آيَاتُنَا عَلَيْنَا بِالْفِتْنَةِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۝
- ۴۰) إِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُونَ ۝
- ۴۱) سَأَلَهُمْ آيَهُمْ بِذَلِكَ زَعِيمٌ ۝
- ۴۲) أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ ۚ فَلْيَأْتُوا بِشُرَكَائِهِمْ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ ۝

ترجمہ

- ۳۲) پرہیزگاروں کے لیے ان کے پروردگار کے پاس جنت کے پُر نعمت باغات ہیں۔
- ۳۵) کیا ہم مومنین کو مجرمین کی طرح قرار دے دیں؟
- ۳۶) تمہیں کیا ہو گیا ہے تم کس قسم کے فیصلے کرتے ہو؟

- ۱۷) کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے کہ جس سے تم درس پڑھتے ہو؟
- ۱۸) کیا جسے تم انتخاب کرتے ہو وہ تمہارے لیے مخصوص ہے؟
- ۱۹) یا تم نے قیامت کے دن تک کے لیے کوئی تاکید یا عہد و پیمان لے لیا ہے کہ جو کچھ تم اپنے نفع کے لیے اختیار کرو گے وہ اسے تمہارے لیے قرار دے دے گا؟
- ۲۰) ان سے پوچھ لیجئے ان میں سے کون اس قسم کی چیز کی ضمانت لیتا ہے؟
- ۲۱) یا ان کے ایسے معبود ہیں (جنہیں انہوں نے خدا کا شریک قرار دیا ہے) اور وہ ان کے لیے شفاعت کرتے ہیں۔ اگر وہ سچ کہتے ہیں تو اپنے معبودوں کو سامنے لائیں۔

تفسیر

مُحَلِّ بَازِ پُرْس

ہم جانتے ہیں کہ قرآن کی روش اور طریقہ یہ ہے کہ بُروں اور اچھوں کے حالاتِ زندگی کو ایک دوسرے کے مقابل لانا ہے تاکہ ایک دوسرے کے ساتھ موازنہ میں بہتر طور پر پہچانے جائیں۔ یہ طریقہ تربیتی لحاظ سے بہت ہی مؤثر ہے۔

اسی روش کے مطابق ”اصحاب الجنتۃ“ (سرسبز و شاداب باغ والوں) درناک سرفروشت کے ذکر کے بعد، جو گزشتہ آیات میں گزری ہے، پرہیزگاروں کا حال بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ”پرہیزگاروں کے لیے ان کے پروردگار کے پاس جنت کے پُر نعمت باغ ہیں۔“ (ان للمتقين عند ربهم جنات النعیم)۔

جنت کے ایسے باغات رجن میں ہر وہ نعمت جس کا تصور کیا جاتے، اس کی کامل ترین نوع موجود ہے۔ اس کے علاوہ وہ نعمتیں بھی ہوں گی جو کسی انسان کے خواب و خیال میں بھی نہ آئی ہوں گی۔ چونکہ مشرکین اور ثروت مندوں کی ایک جماعت خود خواہ تھی، جن کا دعویٰ یہ تھا کہ جس طرح دنیا میں ہماری حالت بہتر اور اعلیٰ ہے اسی طرح قیامت میں بھی بہت اچھی ہوگی۔ خدا نے بعد والی آیت میں ان کاشتدت کے ساتھ مواخذہ کیا ہے کہ فرماتا ہے: ”کیا ہم مومنین کو جو حق و عدالت کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں،

مشرکین اور مجرمین کی مانند قرار دیں گے۔ (انفجمل المسلمین کالمجرمین)۔

تھیں کیا ہو گیا ہے؟ یہ تم کس طرح کے فیصلے کرتے ہو؟ (مالکھ کیف تحکمون)۔
کیا کوئی عقلمند انسان یہ باور کمرے گا کہ عادل و ظالم، مطیع و مجرم، ایثارگر اور انحصار طلب کی سرزنش
ایک جیسی ہوگی؟ وہ بھی اس خدا کی بارگاہ میں جس کے سارے کام بچے تلے اور حکیمانہ نظام کے ماتحت
ہوتے ہیں۔

سورہ طہ سجدہ کی (آیت ۵۰) میں بھی اسی قسم کے افراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: (و
لئن اذقناه مرحمة منا من بعد ضراء مسته ليقولن هذا لي وما اظن الساعة قائمة ولئن
رجعت الی ربی ان لی عنده للحسنى)۔

جب ہم اسے اپنی طرف سے تکلیف و پریشانی کے بعد رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ کہتا ہے: یہ
میری شائستگی اور استحقاق کی بنا پر تھا اور میں گمان نہیں کرتا کہ کوئی قیامت برپا ہوگی۔ اگر بالفرض قیامت ہوئی
بھی تو جس وقت میں اپنے پروردگار کے پاس لوٹوں گا تو میرے لیے اس کے پاس اچھے اجر اور اچھے بدلے
ہی ہوں گے۔ ہاں یہ خود پسند اور مغرور گروہ دنیا و آخرت کو اپنے لیے ہی مخصوص سمجھتا ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”اگر عقل و فرد نے اس قسم کے حکم میں تمہاری رہنمائی نہیں کی ہے تو کیا اس پر
کوئی ”نقلی“ دلیل تمہارے پاس ہے؟ کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے کہ جس سے تم درس لیتے ہو؟“ (انکم
کتاب فیہ تدرسون)۔

”کہ جیسے تم انتخاب کرتے ہو اور اس کی طرف میلان رکھتے ہو وہ تمہارے لیے مخصوص ہے۔“ (انکم
فیہ لما تخیرون)۔

تم یہ توقع رکھتے ہو کہ تم جیسے مجرم بھی مسلمانوں کے ہم پلہ ہو جائیں گے۔ یہ تو ایک ایسی بات ہے کہ جس کا
عقل حکم کرتی ہے اور نہ ہی کسی معتبر کتاب میں آئی ہے۔

بعد والی آیت میں بات کو اس طرح جاری رکھے ہوئے ہے:

”اگر تمہارے پاس عقل و نقل سے کوئی مدرک اپنے دعوے کے لیے نہیں ہے تو کیا تم نے کوئی تاکید

لے ”انکم...“ کا جملہ ”تدرسون“ کا مفعول ہے۔ تاعدہ کی رو سے ان کو ہزہ کی زبر کے ساتھ پڑھا جانا چاہیے، لیکن لام کی مناسبت سے جو ”ان“ کے
سم کے اوپر آئی ہے ”ان“ زبر کے ساتھ پڑھا جاتا ہے، کیونکہ فعل عمل کرنے سے ملحق ہو جاتا ہے۔

عہد و پیمانہ ہم سے لے لیا ہے جو قیامت تک برقرار رہے گا کہ تم جو کچھ بھی اپنے نفع میں فیصلہ کر لو، اسے وہ بخوار لے لے کر دے دے گا۔ (ام لکو ایمان علینا بالفتۃ الی یوم القیامتہ انّ لکم لما تحکمون۔ کون شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس نے خدا سے یہ عہد و پیمانہ لے لیا ہے کہ وہ جو چاہیں گے خدا اسے تسلیم کر لے گا، جو تمام و منصب وہ چاہیں گے وہ بے چون و چرا ان کو دے دے گا؟ یہاں تک کہ مجرمین مسلمانوں کے ہم پلہ ہو جائیں۔ لے

سرزشت
تحت

پھر انہیں سوالات کو جاری رکھتے ہوئے، جو ہر طرف سے ان پر راستوں کو بند کر رہے ہیں مزید کہتا ہے: ”ان سے پوچھ لیجئے کہ ان میں سے کون اس بات کا ضامن ہے کہ مجرمین اور مومنین برابر ہیں یا جو کچھ وہ چاہتے ہیں خدا ان کے اختیار میں دے دے گا۔“ (سلفہو ایہم بذالک نرعیہ)۔

: و
تولن

آخری مرحلہ میں ان سے ایک عجیب سوال کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”یا ان کے ایسے معبود ہیں جو خدا کے ہاں ان کی شفاعت و حمایت کریں گے۔ اگر وہ سچ کہتے ہیں تو ان کو سامنے لائیں اور ان کا تعارف کرائیں:“ (ام لہم شروکاء فلیأتوا بشر کا ٹھم ان کا فوا صدقین)۔

: :
ہوئی
بدلے

کیا ان کے پاس کوئی معمولی سے معمولی دلیل ہے کہ یہ بے قدر و قیمت اور بے شور جہادات خدا کے شریک ہیں اور اس کی بارگاہ میں شفاعت کرنے والے ہیں۔ بعض مفسرین نے یہاں شرکاء کو شہداء (گواہوں) کے معنی میں لیا ہے۔

س پر
کم

اس طرح اوپر والی آیات کے مجموعہ سے نیچائی طور پر یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ انہیں اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے، کہ وہ مومنین کے ہم پلہ بلکہ ان سے افضل و برتر ہیں، چار میں سے کسی ایک وسیلہ کے ساتھ متمسک ہونا پڑے گا۔ یا عقل سے کوئی دلیل یا آسمانی کتابوں میں سے کوئی کتاب، یا خدا کی طرف سے کوئی عہد و پیمانہ، یا شفاعت کرنے والوں کی شفاعت اور گواہوں کی گواہی۔ چونکہ ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے اس بنا پر مذکورہ دعویٰ کالی طور پر بے بنیاد اور بے قدر و قیمت ہے۔

کم

س کا

لے بالفتۃ کے لفظ کی تفسیر شکر کے معنی میں اور بعض نے جاری و مسلسل کے معنی میں کی ہے۔ لیکن دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے۔ اس بنا پر (الی یوم القیامتہ) کا جار و مجرد اس کے متعلق ہے۔

کے

و انه لذكر لك ولقومك : ”قرآن تیرے اور تیری قوم کے لیے شرف اور آبرو کا موجب ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے مذکورہ آیت کے ذیل میں بھی کہا ہے کہ ”ذکر“ وہاں بھی یاد آوری اور آگاہی بخشنے کے لیے ہے۔ نیز اصولی طور پر قرآن مجید کے ناموں میں سے ایک نام ”ذکر“ ہے۔ اس بنا پر پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔

ایک نکتہ

کیا نظربد کی کوئی حقیقت ہے؟

بہت سے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ بعض آنکھوں میں ایک خاص قسم کا اثر ہوتا ہے۔ جب وہ کسی طرف توجہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو ممکن ہے کہ اُسے نابود کر دیں یا درہم برہم کر دیں اور اگر کوئی انسان ہے اسے بیمار یا دیوانہ کر دیں۔

یہ مسئلہ عقلی لحاظ سے کوئی امر محال نہیں ہے، کیونکہ موجودہ زمانہ کے بہت سے ماہرین کا نظریہ ہے کہ آنکھوں میں ایک خاص قسم کی مقناطیسی قوت چھپی ہوئی ہوتی ہے جو بہت سارے کام کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے ذریعے اس کی پرورش ہو سکتی ہے۔ آنکھوں کی اسی مقناطیسی قوت کے ذریعے دوسرے آدمی پر مقناطیسی طاری کی جاتی ہے۔

جس دنیا میں ”لیزر شعاعیں“ جو غیر مرئی ہیں، ایسا کام کر سکتی ہیں جو کسی انتہائی خطرناک اور تباہ کن ہتھیار سے بھی نہیں ہو سکتا، تو بعض آنکھوں میں ایسی قوت کے وجود کو تسلیم کر لینا جو مخصوص لہروں کے ذریعے طرف متقابل اثر انداز ہو سکے، کوئی عجیب چیز نہیں ہوگی۔

بہت سے لوگ نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے ایسے افراد دیکھے ہیں جو آنکھ کی مرہوز توانائی کے حامل تھے، اور انھوں نے کچھ لوگوں، جانوروں یا پھر دوسری چیزوں کو اپنی آنکھوں کی اس طاقت سے بیکار کر دیا تھا۔

لہذا نہ صرف یہ کہ ان امور کے انکار پر اصرار نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کے وجود کے امکان کو عقل اور علم لحاظ سے قبول کر لینا چاہیے۔

اسلامی روایات میں بھی ایسی بہت سی مختلف تعبیریں نظر آتی ہیں جو اس امر کی اجمالاً تائید کرتی ہیں۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ اسماء بنت عمیس نے پیغمبر کی خدمت میں عرض کیا: ”بعض اوقات جعفر بیٹوں کو نظر لگ جاتی ہے، کیا میں ان کے لیے ”رقیہ“ لے لوں۔“ (رقیہ سے مراد وہ لکھی ہوئی دعائیں ہیں، جن سے کچھ لوگ بُری نظر سے بچنے کے لیے اپنے پاس رکھتے ہیں اور اسے تعویذ بھی کہتے ہیں)۔

پیغمبر نے فرمایا:

”نعم، فلو كان شيء يسبق القدر لسبقة العين“
ہاں! کوئی حرج نہیں ہے، اگر کوئی چیز قضاء و قدر پر سبقت لے سکتی ہے تو وہ نظر بد کا لگنا ہے۔“

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ امیر المؤمنین نے فرمایا:

”پیغمبر نے امام حسن اور امام حسین کے لیے ایک تعویذ بنایا اور آپ نے یہ دعا پڑھی:
”اعيند كما بكلمات التامة واسماء الله الحسنى كلها عامة،
من شر السامة والهامة ومن شر كل عين لامة، ومن شر
حاسد اذا حسد“

”میں تمہیں تمام کلمات اور خدا کے اسمائے حسنیٰ کے، موت، موذی جانوروں کے شر اور ہر بُری آنکھ اور حسد کرنے والے کے شر سے جبکہ وہ حسد کرے، سپرد کرتا ہوں۔“
اس کے بعد پیغمبر نے ہماری طرف دیکھا اور فرمایا: حضرت ابراہیمؑ نے اسمعیلؑ و اسحاقؑ کے لیے اسی طرح سے تعویذ بنایا تھا۔“

نبی البلاغہ میں بھی آیا ہے: ”العين حق والرق حق“ نظر بد بھی حق ہے اور اس کے دفع کرنے کے لیے دعا و تعویذ سے متوسل ہونا بھی حق ہے۔“

اس نکتہ کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ یہ دعائیں اور ویسے حکم خدا سے آنکھوں کی مرموز مقناطیسی قوت و توانائی کی تاثیر کو روک دیں، جیسا کہ دعائیں بہت سے دوسرے حزب عمال پر اثر انداز ہوتی ہیں اور انھیں خدا کے حکم سے بے اثر کر دیتی ہیں۔

یہ بات بھی یاد دلانی ضروری ہے کہ اجمالی طور سے نظر بد کی تاثیر کو قبول کرنے کا یہ معنی نہیں ہے کہ اس قسم کے موارد میں بہودہ کاموں اور عامیانه اعمال کی پناہ لی جائے جو احکام شریعت کے برخلاف ہیں اور اصل موضوع میں بے خبر لوگوں کے شک و تردید کا باعث بھی ہیں۔ جیسا کہ بہت سے حقائق کے ان خرافات کے ساتھ آلودہ

۱۔ مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۲۱

۲۔ نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۰۰

۳۔ نبی البلاغہ کلمات قصار جلد ۲۰۰ (یہ حدیث صحیح بخاری جلد ۲ ص ۱۴۰، باب العین حق میں بھی اس صرت میں نقل ہوئی ہے العین حق)

”المعجم المفہرین لالفاظ الحدیث النبوی“ میں یہی معنی مختلف منابع سے نقل ہوا ہے۔ (جلد ۲ ص ۲۵۱)

ہونے سے یہ غیر مطلوب تاثیر ذہنوں میں بیٹھ گئی ہے۔

خداوند! ہمیں شر اشرار اور دشمنوں کے مکروں سے اپنی پناہ میں محفوظ رکھ! پروردگارا! ہمیں وہ صبر و استقامت مرحمت فرما جس کے ساتھ میں ہم تیری رضا کو حاصل کر سکیں۔ یا سہا! ہمیں اپنی بے پایاں نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کی توفیق مرحمت فرما، اس سے پہلے کہ ناشکریاں اسے ہم سے سلب کر لیں۔ آمین یا رب العالمین۔

سورۃ قلم کا اختتام
۲۸، سوال المکرم ۱۴۰۶ھ

ترجمہ کا اختتام
۱۵ ذی الحجہ ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۱ اگست ۱۹۸۷ء
بروز منگل بوقت صبح ساڑھے پانچ بجے
۱۰۸، ماڈل ٹاؤن
لاہور

سورہ حاقہ

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۵۲ آیات ہیں۔

تاریخ آغاز
۲۸ شوال المکرم ۱۲۰۶ھ

سورہ حاقہ کے مضامین

اس سورہ کے مباحث تین محروں پر گردش کرتے ہیں :

- ۱ پہلا محور : جو اس سورہ کی بحث کا اہم ترین موضوع ہے وہ قیامت سے مربوط مسائل اور اس کی بہت سی تفصیلات ہیں۔ اسی لیے قیامت کے تین نام 'حاقہ'، 'قارۃ' اور 'واقۃ' اس سورہ میں آتے ہیں۔
- ۲ دوسرا محور : وہ مباحث ہیں جو گزشتہ کافراقوام خصوصاً قوم عاد، ثمود اور قوم فرعون کی سرنوشت کے بارے میں ہیں جو تمام کفار اور منکرین قیامت کے لیے قوی اور مؤکد اندازوں پر مشتمل ہیں۔
- ۳ تیسرا محور : وہ مباحث ہیں جو قرآن کی عظمت، پیغمبر کے مقام نیز تکذیب کرنے والوں کی سزا اور عذاب کے بارے میں ہیں۔

❖ ❖ ❖

تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر گرامی سے آیا ہے :

”من قرأ سورة الحاقة حاسبه الله حساباً يسيراً“

جو شخص سورہ حاقہ کی تلاوت کرے گا خدا قیامت میں اس کے حساب کو آسان کر دے گا۔ لے

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر سے آیا ہے :

”اکثروا من قرأ سورة الحاقة، فان قرأتهما في الفرائض والنوافل من الايمان

بالله ورسوله ولم يسلب قارئهما دينه حتى يلقى الله“

سورہ حاقہ کی بہت زیادہ تلاوت کیا کرو، کیونکہ فرائض و نوافل میں اس کی قرأت خدا اور اس کے رسول پر

ایمان کی نشانی ہے، اور جو شخص اسے پڑھے گا اس کا دین محفوظ رہے گا، یہاں تک کہ لقاء اللہ پر پہنچ جائے۔ لے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱ الْحَاقَّةُ ۝

۲ مَا الْحَاقَّةُ ۝

۳ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحَاقَّةُ ۝

۴ كَذَّبَتْ ثَمُودُ وَعَادٌ بِالْقَارِعَةِ ۝

۵ فَمَا ثَمُودٌ فَأُهْلِكُوا بِالطَّاغِيَةِ ۝

۶ وَأَمَا عَادٌ فَأُهْلِكُوا بِرِيحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝

۷ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَثَلَاثِينَ أَيَّامٍ ۝

فُودًا لَا فَتْرَى الْقَوْمِ فِيهَا صَرَعى لَا كَانَهُمْ

أَعْبَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝

۸ فَهَلْ تَرَى لَهُمْ مِنْ بَاقِيَةٍ ۝

❖ ❖ ❖

ترجمہ

۱ رحمن ورحیم خدا کے نام سے

۲ وہ دن جو یقیناً واقع ہوگا۔

۳ اور یہ واقع ہونے والا دن کیا ہے؟

سی صورت

سے میں ہیں

کے بارے

مان

ل پر
نے

اور تجھے کیا معلوم کہ وہ واقع ہونے والا دن کیا ہے ؟

۳

قوم ثمود و عاد نے خدا کے سرکوبی کرنے والے عذاب کا انکار کیا۔

۴

تو قوم ثمود تو سرکش عذاب سے ہلاک ہوئی۔

۵

اور قوم عاد طغیانی کرنے والی ٹھنڈی اور زور دار اور تیز آندھی سے ہلاک ہوئی۔

۶

خدا نے بنیادوں کو اکھاڑنے والی اس تیز آندھی کو سات راتیں اور آٹھ دنوں تک پلے در پلے

۷

ان پر مسلط رکھا (اور اگر تو وہاں ہوتا تو دیکھتا کہ وہ قوم بوسیدہ تنوں اور کھجور کے کھوکھلے درختوں کی مانند

اس تیز آندھی کے درمیان زمین پر پڑی ہے اور ہلاک ہو گئی ہے۔

۸

کیا ان میں سے تو کسی کو باقی دیکھتا ہے۔

❖ ❖ ❖

تفسیر

سرکشی کرنے والی قوم کے لیے سرکش عذاب

یہ سورۃ مسد قیامت سے اور وہ بھی ایک نئے عنوان کے ساتھ شروع ہوتا ہے، فرماتا ہے :

”وہ تحقق پانے والا دن“ (الحاقۃ)۔

❖ ❖ ❖

”وہ تحقق پانے والا دن کیا ہے“ (ما الحاقۃ)۔

❖ ❖ ❖

”اور تجھے کیا معلوم کہ وہ تحقق پانے والا دن کیا ہے؟“ (وما ادرک ما الحاقۃ)۔

تقریباً تمام مفسرین نے ”حاقۃ“ کی قیامت کے دن کے معنی میں تفسیر کی ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایسا دن ہے
قطعی اور یقینی طور پر واقع ہوگا، جیسا کہ سورہ ”واقعہ“ میں ”الواقعت“ کی تعبیر ہے۔ یہی تعبیر اسی سورہ کی آیت ۱۶ میں بھی آئی
ہے اور یہ سب اس عظیم دن کے یقینی ہونے کی حکایت بیان کرتی ہیں۔

لہٰذا اس جملہ کی ترکیب میں کئی احتمال دیتے گئے ہیں جن میں سب سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ یہ کہا جائے۔ ”الحاقۃ“ مبتدأ ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

ہیں :
ہے۔

”ما ادرک“
خطابہ
دنیا و
کے۔

”الحاقۃ“
میں دا
ہوا۔
نوط کی

میں (ا
ہوا) اور

نزول
شمود

(بقیہ صفحہ سابقہ)
لے بعض مفسر
میں آیا ہے جما
لے تفسیر علی بن
(توجہ)

”ما الحاقۃ“ کی تعبیر اس دن کی عظمت کے بیان کے لیے ہے، ٹھیک اسی طرح جیسا کہ ہم روزمرہ کی تعبیروں میں سمجھتے ہیں: فلاں شخص انسان ہے، کیا ہی انسان ہے؟ یعنی اس کی انسانیت کی تعریف و توصیف کے لیے کوئی حد نہیں ہے۔ (یعنی بہت اچھا انسان ہے)

”ما ادراک ما الحاقۃ“ کی تعبیر دوبارہ اس عظیم دن کے حوادث کی عظمت پر مزید تاکید ہے۔ یہاں تک کہ پیغمبر سے خطاب ہوتا ہے کہ تو نہیں جانتا وہ دن کس قسم کا ہے؟ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قیامت کے حقائق کو درک کرنا ہم دنیاوی زنداں کے قیدیوں کے لیے امکان پذیر نہیں ہے، جیسا کہ دنیا سے مربوط مسائل کا درک کرنا شکم مادر کے جنین کے لیے کسی بھی بیان سے میسر نہیں ہے۔ لے

ایک اور احتمال جو ان آیات کی تفسیر میں ہے، اگرچہ بہت کم مفسرین نے اسے قبول کیا ہے، یہ ہے کہ ”الحاقۃ“ ان عذابوں کی طرف اشارہ ہے جو سرکش، طاعنی، خودخواہ و خود پسند مجرموں کو اچانک اور ناگہانی طور پر اس دنیا میں دامن گیر ہو جاتے ہیں جیسا کہ بعد والی آیت میں ”القارعة“ بعض مفسرین کے کلام میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ یہی تفسیر آئندہ والی آیات کے ساتھ جو قوم عاد، قوم ثمود، قوم فرعون اور قوم لوط کی سرکوبی کرنے والے عذابوں کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں، زیادہ مناسب نظر آتی ہیں۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی آیا ہے۔ ”الحاقۃ، الحدس، بنزول العذاب“۔ جیسا کہ (سورہ مؤمن کی آیت ۲۵ میں) آل فرعون کے بارے میں فرماتا ہے: وحق بال فرعون سوء العذاب۔ بُرُءذاب آل فرعون پر نازل ہوا اور اس نے انھیں گھیر لیا، لے

اس کے بعد ان قوموں کی سرنوشت کو بیان کرتا ہے جنھوں نے قیامت کے دن (یا دنیا میں عذاب الہی کے نزول) کا انکار کیا۔ لہذا مزید کہتا ہے: ”قوم عاد و ثمود نے خدا کے سرکوبی کرنے والے عذاب کا انکار کیا“ (کذبت ثمود و عاد بالقارعة)۔

(بقیہ صفحہ سابقہ) اور ما استفہامیہ دوسرا بتدرا ہے۔ اس کے بعد والا ”الحاقۃ“ خبر ہے دوسرے بتدرا کی اور ان کا مجموعہ خبر ہے پہلے بتدرا کی۔ لے بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ ”ما ادراک“ کا جملہ قرآن میں اس جگہ کہا گیا ہے جہاں مطلب معلوم اور مسلم ہے۔ لیکن ”وما یدرک“ ان موارد میں آیا ہے جہاں مطلب نامعلوم ہے۔ (مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۴۳) بعض دوسرے مفسرین مثلاً قرطبی نے بھی اسی معنی کو نقل کیا ہے۔ لے تفسیر علی بن ابراہیم جلد ۲ ص ۳۸۳۔

(توجہ رکھیں کہ ”حاقۃ“ اور ”حق“ کا مادہ ایک ہی ہے۔)

یسا دن ہے
ا میں بھی آئی

گلے صفحہ پر

”پس قوم ثمود تو سرکش عذاب کے ذریعہ ہلاک ہوئی۔“ (خاماسود فاهلکوا بالطاغیۃ)۔

ثمود وہ قوم تھی جو حجاز و شام کے درمیان کوہستانی علاقہ میں آباد تھی۔ حضرت صالحؑ ان کی طرف مبعوث ہوئے لیکن وہ ہرگز ایمان نہ لائے اور ان سے مبارزہ کے لیے تیار ہو گئے۔ یہاں تک کہ انھوں نے حضرت صالحؑ سے کہا کہ اگر تو بیچ کرتا ہے تو وہ عذاب جس کا تو ہمیں وعدہ دیتا ہے اسے نازل کر دے۔ اس وقت ایک تباہ کرنے والی بجلی ان پر مسلط ہو گئی جس نے چند لمحوں کے اندر ان کے مضبوط گھروں اور مستحکم محلوں میں لرزہ پیدا کر دیا۔ ان سب کو تھس تھس کر دیا اور ان کے بے جان جسم زمین پر پڑے رہ گئے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن اس نافرمان قوم کی نابودی کے عامل کو سرکش عذاب شمار کرتا ہے۔ ”الطاغیۃ اور یہ سرکش عذاب سورہ اعراف کی آیت ۷۸ میں ”جفۃ“ (زلزلہ) کے عنوان سے ذکر ہوا۔ سورہ طہ سجدہ کی آیت ۱۳ میں ”صاعقۃ“ اور سورہ ہود کی آیت ۶۷ میں ”صیحۃ“ کے نام سے مذکور ہے۔ یہ سب الفاظ حقیقت میں ایک ہی معنی کی طرف لوٹتے ہیں، کیونکہ صاعقہ (بجلی)، ہمیشہ ایک مہیب آواز کے ساتھ ہوتی ہے۔ (کڑکتی ہے)، جس جگہ آکر گرتی ہے اس میں لرزہ پیدا کر دیتی ہے اور وہ سرکش عذاب بھی ہے۔

اس کے بعد قوم عاد کی سر نوشت بیان کرتا ہے۔ وہ قوم جو سرزمین احقاف (جزیرہ نمائے عرب یا یمن میں آباد تھی ان کے قد و قامت طویل، بدن قوی، شہر آباد، زمینیں سرسبز و شاداب اور ہرے بھرے باغات تھے۔ ان کے پیغمبر حضرت ہودؑ تھے۔ ان لوگوں نے بھی اپنے طغیان و سرکشی کو اس حد تک پہنچا دیا تھا کہ خدا نے ایسے دردناک عذاب کے ساتھ جس کی تشریح انھیں آیات میں آئی ہے، ان کی زندگی کے دفتر کو پیٹ دیا۔ پہلے فرماتا ہے: ”باقی رہی قوم عاد تو وہ ایک تیز سرکش، زناٹے دار، اونچی آواز والی سرد اور زہریلی آندھی کے ذریعہ ہلاک ہو گئی۔“ (و اما عاد فاهلکوا بسبع مصرع عاتیۃ)۔

”صرص“ (بروزن دفتر) سرد یا زناٹے دار آواز والی یا زہریلی ہواؤں کو کہا جاتا ہے۔ مفسرین نے اس کی تفسیر میں یہ تینوں معانی ذکر کیے ہیں، اور ان کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

”عاتیۃ“ ”عتو“ (بروزن غلو) کے مادہ سے سرکش کے معنی میں ہے۔ البتہ فرمان خدا سے سرکش نہیں بلکہ معمولی اور سبک رفتار ہواؤں کے معیار سے سرکش۔

اس کے بعد اس تیز سرکوبی کرنے والی آندھی کی ایک دوسری توصیف کو بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: ”خدا نے اس کو اس قوم پر مسلسل سات راتیں اور آٹھ دن ان کی بنیادیں اکھاڑنے کے لیے مسلط کیے رکھا:“ (سخرھا علیہم سبع لیل وثمانیۃ ایام حسوما)۔

لے قوم ثمود کی سرگزشت تفسیر نمونہ کی جلد ۴ میں تفصیل کے ساتھ آئی ہے۔

حسوماً - حسوم (بروزن اسم) کے مادہ سے کسی چیز کے آثار ختم کرنے کے معنی میں ہے۔ اگر تلوار کو حسام (بروزن غلام) کہا جاتا ہے تو وہ اسی مناسبت سے ہے۔ بعض اوقات زخم کی جڑ کو جلانے کے لیے اس پر داغ لگانے کو بھی حسم کہا جاتا ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ سخت آندھی نے سات راتوں اور آٹھ دنوں میں اس عظیم قوم کی وسیع اور بارونق زندگی کو یکسر تباہ و برباد کیا، اور ان کو جڑ سے اکھاڑ کر پراگندہ کر دیا۔ لہٰذا نتیجہ وہ ہوا کہ قرآن کہتا ہے: "اگر تو وہاں ہوتا تو مشاہدہ کرتا کہ وہ ساری کی ساری قوم منہ کے بل گری پڑی ہے۔" (فتی القوم فیہا صرخی کانہم اعجاز غنل خاویۃ)۔

کتنی عمدہ تشبیہ ہے، جو ان کے طویل قد و قامت کو بھی مشخص کرتی ہے، ان کے جڑ سے اکھڑ جانے کو بھی ظاہر کرتی ہے اور خدا کے عذاب کے مقابلہ میں ان کے اندر سے خالی ہونے کو بھی بیان کرتی ہے، اس طرح کہ وہ تیز آندھی جھر پڑتی ہے انہیں آسانی کے ساتھ لے جاتی ہے۔

"خاویۃ" - "خواء" (بروزن ہوا) کے مادہ سے اصل میں خالی ہونے کے معنی میں ہے۔ یہ تعبیر بھوکے شکموں (زمانہ جاہلیت کے عربوں کے عقیدے کے مطابق) بارش سے خالی ساروں اور بے منظر افروٹ کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔

آخری آیت میں مزید کہتا ہے: "کیا تم ان میں سے کسی کو باقی دیکھتے ہو؟" (فصل قرآنی لہو من باقیۃ)۔ ہاں! آج نہ صرف قوم عاد کا کوئی نام و نشان باقی نہیں بلکہ ان کے آباد شہروں اور پُر شکوہ عمارتوں کے کھنڈرات اور ان کے سرسبز کھیتوں میں سے کوئی چیز باقی نہیں ہے۔

قوم عاد کی سرگزشت کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد ۵ (سورۃ ہود کی آیت ۵۸ تا ۶۰ اور اسی طرح جلد ۱۱ میں بھی تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں)۔

❖ ❖ ❖

لہٰذا تو قرآن نے کہ سوما، سبع لیال وثمانیۃ ایام (سات راتیں اور آٹھ دن) کی صفت ہے اور بعض نے اسے بیچ سے حال یا مفعول لہٰذا سمجھا ہے۔ لہٰذا باقیۃ ایک مقدر موصوف کی صفت ہے اور اصل میں "نفس باقیہ" ہے۔

۹ وَجَاءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهُ وَالْمُؤْتَفِكِ
بِالْخَاطِئَةِ ۝

۱۰ فَعَصَا رَسُولَ رَبِّهِمْ فَأَخَذَهُمْ أَخْذَةً رَابِيَةً ۝

۱۱ إِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَاءُ حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝

۱۲ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَتَعِيهَا أذُنٌ وَاعِيَةٌ ۝

ترجمہ

۹ اور فرعون اور وہ لوگ جو اس سے پہلے تھے اور تم و بالا ہونے والے سردوں کے لوگ

(قوم لوط) بہت بڑے گناہوں کے مرتکب ہوئے۔

۱۰ انہوں نے اپنے پروردگار کے بھیجے ہوئے رسول کی مخالفت کی اور خدا نے بھی انہیں شدید

عذاب میں گرفتار کیا۔

۱۱ ہم نے اس وقت، جب پانی میں طغیانی آئی، تو تمہیں کشتی میں سوار کر دیا۔

۱۲ تاکہ ہم اسے تمہارے لیے تو تذکرہ کا وسیلہ قرار دیں اور سننے والے کان اسے یاد رکھتے ہیں

تفسیر

سننے والے کان کہاں ہیں؟

قوم عاد و ثمود کی سرگزشت کے ایک گوشہ کو بیان کرنے کے بعد دوسری اقوام جیسے قوم نوح اور قوم لوط کی طرف

توجہ کرتا ہے تاکہ ان کی زندگی سے بیدار دل افراد کو ایک اور درس عبرت دے، فرماتا ہے: فرعون اور وہ لوگ جو اس سے پہلے تھے اور تہ و بالا ہونے والے شہروں کے لوگ (قوم لوط) بہت بے گناہوں کے مرتکب ہوئے۔ (وجاء فرعون ومن قبلہ والمؤتفکات بالخاطئة)۔

”خاطئة“ خطا کے معنی میں ہے (دونوں مصدری معنی رکھتے ہیں)۔ اور یہاں خطا سے مراد شرک و کفر، ظلم و فساد اور انواع و اقسام کے گناہ ہیں۔

”مؤتفکات“، ”مؤتفکھ“ کی جمع ہے۔ ”اتفکاک“ کے مادہ سے الٹ پلٹ اور تہ و بالا ہونے کے معنی میں ہے اور یہاں قوم لوط کے شہروں کی طرف اشارہ ہے جو ایک شدید زلزلے کی وجہ سے تہ و بالا ہو گئے۔
”من قبلہ“ سے مراد وہ قومیں ہیں جو فرعون سے پہلے تھیں۔ مثلاً قوم شعیب اور قوم نرود جیسے سرکش لوگ۔

ۛ ۛ ۛ

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”وہ اپنے پروردگار کے بھیجے ہوئے رسول کی مخالفت کے لیے کھڑے ہو گئے اور خدا نے انہیں شدید عذاب میں گرفتار کر لیا“ (فحصوا رسول ربهم فاخذهم اخذة ساریة)۔
فرعون، موسیٰ اور ہارون کی مخالفت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ سدوم کے شہروں میں رہنے والوں نے لوطؑ کی مخالفت کی اور دوسری اقوام نے بھی اپنے پیغمبروں کے فرمان سے روگردانی کی۔ ان سرکشوں میں سے ہر گروہ ایک خاص قسم کے عذاب میں گرفتار ہوا۔ فرعون نیل کی موجوں میں، جو ان کی حیات و آبادی اور ملک کی برکت کا سبب تھا، غرق ہو گئے، اور قوم لوط کے لوگ شدید زلزلہ اور اس کے بعد پتھروں کی بارش سے تباہ و برباد اور نابود ہو گئے۔

”ساریة“ اور ”سربا“ ایک ہی مادہ سے ہیں اور آزمائش اور اضافہ کے معنی میں ہیں، یہاں وہ عذاب مراد ہے، جو بہت ہی سخت اور شدید تھا۔

قوم فرعون کی داستان کی تفصیل قرآن کی بہت سی سورتوں میں آئی ہے۔ سب سے زیادہ تفصیل تفسیر نمونہ جلد ۸ سورہ شعراء کی آیت (۱۰ تا ۶۸) میں، تفسیر نمونہ جلد ۴ (سورہ اعراف آیت ۱۰۳ تا ۱۳۷) میں اور تفسیر نمونہ جلد ۷ (سورہ طہ آیت ۲۳ سے ۷۹) میں آئی ہے۔

قوم لوطؑ کی داستان بھی قرآن کی بہت سی سورتوں میں ہے، چنانچہ تفسیر نمونہ جلد ۶ (سورہ حجر آیت ۶۷ تا ۷۷) اور تفسیر نمونہ جلد ۵ (سورہ ہود آیت ۷۷ تا ۸۳) میں آیا ہے۔

آخر میں قوم نوح کی سرنوشت اور ان کے دردناک عذاب کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ”ہم نے اس وقت جب پانی میں طغیانی آئی تو تمہیں کشتی میں سوار کر دیا۔“ (اتالمنا طغنا السماء حملناکم فی العاصریة)۔

پانی کی طغیانی اس طرح تھی کہ تیرہ و تار یک بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ایسی بارش ہوئی کہ گویا آسمان کی طرف سے سیلاب گر رہا ہے اور زمین سے بھی چشے اُبلنے لگے۔ پھر یہ دونوں طرف کے پانی ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے اور ہر چیز پانی میں ڈوب گئی، پس باغات، کھیتیاں اور سرکش قوم کے مملکت اور مکانات سب غرقاب ہو گئے۔ جن لوگوں نے نجات پائی ان میں صرف وہ مومنین تھے جو نوح کے ہاہِ نشتی میں سوار ہو گئے تھے۔

”حملناکم“ (تمہیں کشتی میں سوار کیا) کی تعبیر ہمارے اسلاف اور بڑوں سے کنایہ ہے، کیونکہ اگر انھوں نے نجات حاصل نہ کی ہوتی تو آج ہم موجود نہ ہوتے۔ لے

اس کے بعد ان سزاؤں کے ہدف اصلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: ”مقصود یہ تھا کہ اسے تمہاری یاد آوری اور تذکر کے لیے وسیلہ قرار دیں؛ (لنجعلھا لکم تذکرۃ)۔

”اور سننے والے کان اس کی حفاظت کریں۔“ (و قیما اذن و اعیۃ)۔

ہم ہرگز ان سے انتقام لینا نہیں چاہتے تھے، بلکہ ہدف انسانوں کی تربیت اور راہِ کمال میں ان کی ہدایت، راست دکھانا اور مطلوب تک پہنچانا تھا۔

”قیما“ ’وہی‘ (بروزن سعی) کے مادہ سے ہے جس طرح ’راغب‘ نے ’مفردات‘ میں اور ’ابن منظور‘ نے ’لسان العرب‘ میں کہا ہے۔ اصل میں کسی چیز کو دل میں محفوظ رکھنے کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد ہر برتن کو ’وعاء‘ کہا گیا، کیونکہ وہ اپنے اندر کسی چیز کو محفوظ رکھتا ہے۔

زیر بحث آیت میں یہ صفت کانوں کے لیے بیان ہوئی ہے۔ وہ کان جو حقائق کو سنتے ہیں اور اپنے اندر محفوظ رکھتے ہیں۔

یا دوسرے لفظوں میں بعض اوقات انسان ایک بات کو سنتا ہے اور فوراً اُسے کان سے باہر نکال دیتا ہے جیسا کہ عام لوگوں کی تعبیروں میں کہا جاتا ہے: ”ایک کان سے سنی اور دوسرے کان سے نکال دی“۔ لیکن بعض اوقات وہ اس بات میں غور و فکر کرتا ہے، اسے اپنے دل میں جگہ دیتا ہے اور اس کو اپنی زندگی کی راہِ کاپرچا شمار کرتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے ’وہی‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

✦ ✦ ✦

لے اس طرح بعض نے یہ کہا ہے کہ آیت میں ایک مذمت ہے اور تقدیر میں حملنا اُجابا شکر تھا۔

چند نکات

۱: علیؑ کے فضائل میں سے ایک اور فضیلت

بہت سی مشہور اسلامی کتابوں میں، چاہے وہ تفسیر کی ہوں یا حدیث کی، یہ آیا ہے کہ پیغمبر گرامیؐ نے اوپر والی آیت (وَقِيمَا اِذْنَ وَاَعِيْنَهٗ) کے نزول کے وقت فرمایا:

”سَأَلْتُ رَبِّي اَنْ يَّجْعَلَهَا اِذْنَ عَلِيٍّ“

”میں نے خدا سے سوال کیا ہے کہ علیؑ کے کان کو ان سننے والے حقائق کو محفوظ رکھنے والے کانوں میں سے قرار دے۔“

اس کے بعد امام علیؑ فرماتے تھے:

”مَا سَمِعْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ شَيْئًا قَطُّ فَسَيِّئًا اِلَّا وَحَفِظْتَهُ“

”میں نے رسول خداؐ سے کوئی چیز نہیں سنی جسے بھول گیا ہوں، بلکہ وہ ہمیشہ میرے حافظہ میں رہی ہے۔“

”تعمایۃ المرام“ میں اس سلسلہ میں سولہ احادیث شیعہ اور اہل سنت کے طرق سے نقل ہوئی ہیں، اور محدث بخرانی نے تفسیر ”البرہان“ میں محمد بن عباس سے نقل کیا ہے کہ اس سلسلہ میں تیس احادیث عامہ اور خاصہ کے طرق سے نقل ہوئی ہیں۔

ہاں! یہ اسلام کے عظیم پیشوا اور امام علیؑ کی ایک عظیم فضیلت ہے کہ وہ اسرار پیغمبرؐ کے خزانہ اور رسول خداؐ کے تمام علوم کے وارث ہیں۔ اسی بناء پر آنحضرتؐ کے بعد ان مشکلات میں جو اسلامی معاشرے کو پیش آتی تھیں، موافق و مخالف سبھی لوگ آپ کی پناہ لیتے، اور آپ سے ہی مشکل کا حل چاہتے تھے۔ یہ واقعات کتب و تاریخ میں تفصیل کے ساتھ آئے ہیں۔

❖ ❖ ❖

۲: گناہ اور سزا میں تناسب

جو تعبیریں اوپر والی آیات میں آئی ہیں قابل توجہ ہیں۔ قوم ثمود کے عذاب کے بارے میں ”طاعیغیر“، قوم عاد

لے تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۷۲۔ مجمع البیان، روح البیان، روح المعانی، ابوالفتح رازی، المیزان میں زیر بحث آیات کے ذیل میں، نیز یہ حدیث ”مناقب ابن منذر شافعی“ ص ۲۶۵ (طبوع اسلامیہ) میں بھی آئی ہے۔

کے بارے میں "عاتیہ" قوم فرعون اور قوم لوط کے بارے میں رابیتہ اور قوم نوح کے بارے میں "طفنا الماء" کی تعبیر لانا ہے، ان سب میں طغیان اور سرکشی کا مفہوم پوشیدہ ہے۔ اس طرح سے اس سرکشی کرنے والی قوم کے عذاب میں زندگی کی بعض نعمتوں کے سرکش ہونے کو شمار کیا گیا ہے، چاہے وہ پانی، ہوا یا مٹی اور آگ کے یہ تعبیریں اس حقیقت پر ایک تاکید ہیں کہ دنیا و آخرت کے عذاب خود ہمارے اعمال ہی کا نتیجہ ہیں اور یہ خود انسانوں کا کردار ہی ہے جو انہیں کی طرف لوٹایا جائے گا۔

✦ ✦ ✦

- فَإِذَا نَفَخَ فِي الصُّورِ نَفْحَةً وَوَاحِدَةً ۝ (۱۳)
- وَحَمَلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَوَاحِدَةً ۝ (۱۴)
- فِيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝ (۱۵)
- وَانشَقَّتِ السَّمَاءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَاهِيَةٌ ۝ (۱۶)
- وَالْمَلَكُ عَلَى أَرْجَائِبِهَاتٍ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ
يَوْمَئِذٍ ثَمَنِيَةٌ ۝ (۱۷)

ترجمہ

- جو نہی کہ ایک مرتبہ صور میں پھونکا جائے گا۔ (۱۳)
- اور زمین اور پہاڑ اپنی جگہ سے اٹھالیے جائیں گے، اور وہ یکایک ٹنکر اکر پارہ پارہ ہو جائیں گے۔ (۱۴)
- اس دن (یہ عظیم واقعہ) واقع ہوگا۔ (۱۵)
- آسمان پھٹ جائیں گے اور کمزور ہو کر گر پڑیں گے۔ (۱۶)
- فرشتے آسمانوں کی طرفوں اور کناروں پر ہوں گے۔ (اور مامور سینوں کی انجام دہی کے لیے تیار ہوں گے) اور اس دن تیرے پروردگار کے عرش کو آٹھ فرشتے اپنے اوپر اٹھالیں گے۔ (۱۷)

تفسیر

وہ دن جس میں وہ عظیم واقعو رونما ہوگا۔

اس سورہ کی ابتدائی آیات کو جاری رکھتے ہوئے جو معاد اور قیامت کے مسئلہ کو بیان کرتی تھیں، زیر بحث آئے۔ اس عظیم قیامت کے حوادث کے مباحث کو پیش کرتی ہیں، ایسی ہلا دینے والی اور بیدار کرنے والی تعبیروں کے جو انسان کو ان وقائع کی عظمت سے آشنا کرتی ہیں جو اسے درپیش ہوں گے۔

پہلے فرماتا ہے: ”جب ایک دفعہ صور میں پھونکا جائے گا“ (فاذا انفخ في الصور نفخة واحدة)۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان کے اختتام اور دوسرے کے آغاز میں، ناگہاں اور اچانک ایک عظیم صدا پیدا ہوگی۔ جسے نفخہ صور (ناقوس میں پھونکنے سے) تعبیر کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ زمانہ میں اور آج بھی لشکر کو اکٹھا اور تیار کرنے کے لیے یا اسے آرام گاہ یا چھاؤنی کی طرف بھیجنے کے لیے بگل سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ جب آرام کرنے اور سونے کا بگل بجایا جاتا ہے تو سب سپاہی آرامگاہ میں جاتے ہیں اور جب جمع کرنے اور تیار کرنے کے لیے بجایا جاتا ہے تو تمام سپاہی اپنی جگہ سے چل پڑتے ہیں اور صفوں کو منظم کرتے ہیں۔ گویا خدا یہ کہنا چاہتا ہے کہ اس جہان کے ختم کرنے اور دوسرے جہان کے آغاز کا مسئلہ میری قدرت کے مقابلہ میں ایک بگل میں پھونکنے جتنا آسان ہے۔ ایک ہی فرمان سے ایک لمحہ کے اندر اندر تمام آسمان اور سب اہل زمین مرجائیں گے۔ پھر ایک دوسرے فرمان کے ساتھ سب کے سب زندہ ہو جائیں گے اور حساب کے نیلے تیار ہو جائیں گے۔

”صور“ کی خصوصیات اور اس میں ”نفخ“ کی کیفیت پھونکنے کی مقدار اور ان کے درمیان فاصلہ کے بارے میں بہت سے مطالب ہیں۔ وہ ہم نے تفسیر نمونہ جلد ۱۱ سورہ زمر کی آیت ۶۸ کی تفسیر میں بیان کر دیے ہیں۔ یہاں ان کی تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک چیز کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ نفخہ صور جیسا کہ اوپر بھی اشارہ ہوا ہے دو نفخے ہیں، ”موت کا نفخہ“ اور ”حیات کا نفخہ“۔ اس بارے میں کہ زیر بحث آیت میں جو نفخہ آیا ہے پہلا نفخہ ہے یا دوسرا، مفسرین کا اس سلسلہ میں کوئی ایک نظریہ نہیں ہے کیونکہ جو آیات بعد میں آئی ہیں ان میں سے بعض موت کے نفخہ سے اور بعض حیات و معاد اور قبروں کے اٹھنے کے نفخہ سے مناسبت رکھتی ہیں، لیکن مجموعی طور پر یہ آیات پہلے نفخہ کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہیں اور وہ اختتام جہاں کا نفخہ ہے۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”اور جب زمین اور پہاڑ اپنی جگہ سے اٹھالیے جائیں گے اور ایک ہی ضرب

کے ساتھ درہم برہم اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ (وحملت الارض والجبال فذکتا ذکۃ واحدة)۔
 ”ذک“ جیسا کہ راغب، مفردات میں کہتا ہے: اصل میں صاف اور نرم زمین کے معنی میں ہے چونکہ ایک
 ناہموار زمین کو صاف کرنے کے لیے اسے کوٹنا پٹینا پڑتا ہے۔ لہذا بہت سے موارد میں یہ لفظ شدت سے کوٹنے کے
 معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

لیکن بعض منابع لغت سے معلوم ہوتا ہے کہ ”ذک“ کا اصل معنی کوٹنا اور ویران کرنا ہے۔ چونکہ کوٹنے اور ویران
 کرنے کا لازمہ صاف اور ہموار کرنا ہے۔ لہذا یہ لفظ اس معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ لے
 بہر حال زیر بحث آیت میں یہ لفظ پہاڑوں اور ناہموار زمینوں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے اور کوٹے جانے
 کے معنی میں ہے، اس طرح کہ ایک ہی دفعہ میں ریزہ ریزہ ہو کر ہموار ہو جائیں۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”اس دن جہان میں واقعہ عظیم رونما ہوگا اور قیامت برپا ہوگی“ (فیومئذ
 وقت الواقعة)۔

❖ ❖ ❖

صرف زمین اور پہاڑ بکھر کر پراگندہ ہو جائیں گے بلکہ ”آسمانوں اور زمینوں میں بھی شگاف پڑ جائیں گے اور وہ کمزور
 اور غیر محکم ہو جائیں گے“ (وانشقت السماء فیہی یومئذ واہیئة)۔
 عظیم آسمانی کمرے بھی اس ہولناک اور وحشتناک حادثہ سے بچ کر نہیں رہ سکتے، وہ بھی شگاف اور پراگندہ ہو کر بکھر جائیں
 گے اور اپنی مضبوطی اور استحکام کے باوجود وہ اس قدر کمزور ہو جائیں گے کہ سورہ الرحمن کی آیت ۳۷ میں قرآن کے
 قول کے مطابق، ”آسمان پھٹ کر پگھلے ہوئے روغن کی طرح سُرخ ہو جائیں گے“ فاذا انشقت السماء فکانت
 واردة کالدھان“

یا دوسرے لفظوں میں موجودہ زمین و آسمان ویران ہو جائیں گے اور ان کے ویرانوں اور کھنڈرات پر ایک
 نیا جہان برپا ہوگا جو موجودہ جہاں سے برتر، بالاتر اور کامل تر ہوگا۔

❖ ❖ ❖

”اور فرشتے آسمانوں کی طرفوں اور کناروں پر ہوں گے“ (والملک علی امر جائئھا)۔
 ”ارجاء“ سرجا کی جمع ہے جو کسی چیز کے اطراف، جانب کے معنی میں ہے۔ ”ماک“ اگرچہ یہاں صیغہ مفرد میں آیا
 ہے۔ لیکن اس سے مراد جنس و جمع ہے۔

گویا فرشتے اس دن مامورین کی طرح، جو کسی میدان کے اطراف میں کھڑے ہوں اور کام انجام دینے کے لیے

فرمان کے منتظر ہوں، آسمان کے گردا گرد صفت باندھے ہوئے ہوں گے اور حق تعالیٰ کے فرمان کے منتظر ہوں گے

❖ ❖ ❖

اس کے بعد فرماتا ہے: ”اور اس دن آٹھ فرشتے اپنے پروردگار کا عرش اٹھائے ہوتے ہوں گے۔“ (وینجل عرش ربك فوقہم یومئذ ثمانیۃ۔)

یہ حاملین عرش اگرچہ صراحت کے ساتھ اس آیت میں متعین نہیں ہوتے ہیں کہ وہ فرشتوں میں سے ہوں گے یا ان کے علاوہ کوئی اور ہوں گے لیکن پوری آیت کی تعبیریں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ فرشتوں میں سے ہوں گے، لیکن یہ مشخص نہیں ہے کہ وہ آٹھ فرشتے ہوں گے یا وہ فرشتوں کے آٹھ چھوٹے یا بڑے گروہ ہوں گے۔ البتہ اسلامی روایات میں آیا ہے کہ اس وقت بھی حاملین عرش چار نفر ہیں، لیکن قیامت میں وہ دُگنے ہو جائیں گے۔ جیسا کہ پیغمبر گرامیؐ سے ایک حدیث میں آیا ہے:

”انہم الیوم اربعۃ فاذا کان یوم القیامۃ ایدہم باربعۃ
آخرین، فیکونون ثمانیۃ“

”وہ اس وقت چار افراد ہیں اور قیامت کے دن دوسرے چار افراد سے ان کو تقویت
دے گا اور وہ آٹھ ہو جائیں گے۔“

لیکن عرش کیا ہے؟ اور یہ فرشتے کون ہیں؟ مسئلہ طور پر عرش سے مراد ایک جسمانی تخت سلطنت نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی لفظ عرش کی تفسیر میں بیان کیا ہے وہ جہانِ ہستی کے مجموعہ کے معنی میں ہے جو خدا کی حکومت کا عرش ہے۔ پس ان فرشتوں کے ذریعہ، جو خدا کے حکم و فرمان کو جاری کرتے ہیں، اس کا ارادہ و تدبیر کی جاتی ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ایک روایت میں آیا ہے قیامت میں عرش خدا کے اٹھانے والے چار افراد اولین میں سے اور چار آخرین میں سے ہوں گے۔ اولین میں سے تو نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ و عیسیٰؑ ہوں گے اور آخرین میں سے محمدؐ، علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ ہوں گے۔

یہ تعبیر ممکن ہے ان حضرات کے اولین و آخرین میں مقام شفاعت کی طرف اشارہ ہو، لیکن یہ شفاعت ایسے افراد کے بارے میں ہوگی جو شفاعت کے لائق ہوں گے۔ بہر حال یہ تعبیر عرش کے مفہوم کی وسعت کو بتاتی ہے۔ البتہ اگر عرش کے اٹھانے والے آٹھ گروہ ہوں تو پھر ممکن ہے کہ کچھ گروہ تو فرشتوں کے ہوں اور کچھ گروہ انبیاء اور اولیاء کے ہوں کہ جو اس اہم مقام کے عمدہ دار ہوں گے۔ گویا اس طرح اس دن کے نظام کی تدبیر کے ایک حصہ کو تو فرشتے چلا رہے ہوں گے اور ایک حصہ کے عمدہ دار انبیاء و اولیاء ہوں گے۔ لیکن یہ سب حکم خدا کے ساتھ ہوگا۔

۱۔ تفسیر علی بن ابراہیم جلد ۲ ص ۲۸۲

۲۔ مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۲۲۶

اس بارے میں کہ فوقہ (ان کے اوپر) میں ہم کی ضمیر انسانوں کی طرف لوٹتی ہے یا فرشتوں کی طرف ہوگی احتمال دینے گئے ہیں۔ چونکہ اس سے قبل کے جملہ میں گفتگو فرشتوں کے بارے میں ہے لہذا ظاہر یہ ہے کہ یہ ضمیر انہیں کی طرف لوٹتی ہے۔ اس طرح سے فرشتے سارے جہان کو ہر طرف سے گھیر لیں گے۔ اور (مقام کے لحاظ سے) ان کے اوپر آٹھ فرشتے خدا کے عرش کو اٹھانے والے ہوں گے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ خدا کے عرش کو اٹھانے والے ایسے افراد ہیں جو فرشتوں سے برتر و بالاتر ہیں۔ اس صورت میں یہ بیان گذشتہ حدیث جو خدا کے عرش کو اٹھانے والے انبیاء و اولیاء میں سے آٹھ افراد کو شمار کرتی ہے کے مطابق ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ اس دن عرش کو اٹھانے والوں کا تو کھنا ہی کیا قیامت سے مربوط حوادث بھی اس قسم کی چیز نہیں ہیں جو ہم اس محدود و تاریک جہان کے رہنے والوں کے لیے دقیق طور پر واضح و روشن ہوں، جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ ایک شیخ (سایہ یا ہیولا سا) ہے جسے ہم آیات الہی کے سائے میں بہت دور سے دیکھتے ہیں، ورنہ ان کی حقیقت تو ہمیں وہاں جانے کے بعد ہی نظر آئے گی۔

اس نکتہ کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ پہلے ”نفعہ صُور“ میں آسمانوں اور زمین کے تمام ذمی رُوح مر جائیں گے۔ اس بناء پر عرش کے اٹھانے والوں کے بارے میں جو بحث ہے وہ نفعہ دوم کے ساتھ مربوط ہے جس میں سب زندہ ہو جائیں گے، اگرچہ آیت میں دوسرے نفعہ کے بارے میں گفتگو نہیں ہے۔ لیکن قرآن سے واضح ہوتا ہے کہ جن مطالب کو ہم بعد والی آیات میں پڑھتے ہیں وہ بھی اسی نفعہ دوم کے ساتھ ہی مربوط ہیں۔

لے نفت اور قرآن مجید کے لحاظ سے عرش کے مٹانے کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ میں کئی مرتبہ بحث کی ہے۔ مجملہ ان کے جلد ۴ سورہ اعراف آیت ۵۴ کے ذیل میں گفتگو کی گئی ہے۔

لے حقیقت میں آیت میں ایک مجدد ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے۔ ”شم نفعہ فیہ اخری“ (پھر اس میں دوبارہ پھونکا جائے گا)

- یَوْمِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفَىٰ مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ۝ (۱۸)
- فَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ۖ فَيَقُولُ هَٰؤُلَاءِ
أَقْرَبُ وَكَتِبِيهِ ۝ (۱۹)
- إِنِّي ظَنَنْتُ أَنِّي مُلْقٍ حِسَابِيهِ ۝ (۲۰)
- فَهَوِّقِي عَيْشَةً رَّاضِيَةً ۝ (۲۱)
- فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝ (۲۲)
- فَطُوفْهَا دَانِيَةً ۝ (۲۳)
- كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ
الْخَالِيَةِ ۝ (۲۴)

ترجمہ

- (۱۸) اس دن تم سب کے سب بارگاہِ خداوندی میں پیش کیے جاؤ گے اور تمہارے کاموں میں سے کوئی چیز مخفی نہیں رہے گی۔
- (۱۹) لیکن وہ شخص جس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں ہوگا، (وہ فرطِ مسرت اور فخر کے ساتھ) پکار اٹھے گا کہ (اے اہلِ محشر) لو میرا نامہ اعمال پڑھو۔
- (۲۰) مجھے یقین تھا کہ (قیامت آ کے رہے گی اور) میرے اعمال کا حساب ہوگا۔

وہ ایک کامل پسندیدہ زندگی میں قرار پائے گا۔

ایک عالی جنت

جس کے پھل دسترس میں ہوں گے۔

(اور ان سے کہا جائے گا) مزے مزے سے کھاؤ اور پیو، یہ ان اعمال کا بدلہ ہے جنہیں تم نے

گذشتہ ایام میں انجام دیا تھا۔

تفسیر

اے اہل محشر میرا نامہ اعمال پڑھو

گذشتہ آیات کی تفسیر میں بیان کیا جا چکا ہے کہ ”نفع صور“ دو مرتبہ رونا ہوگا۔ پہلی دفعہ سب ذی رُوح مر جائیں گے اور نظام زندگی بکھر کر رہ جائے گا۔ دوسری مرتبہ ایک نیا جہان اور ایک نیا عالم برپا ہوگا، انسان اور فرشتے ایک نئی زندگی حاصل کریں گے، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ان آیات کا آغاز تو پہلے نفع کی اور ان کا آخر دوسرے نفع کی خبر دیتا ہے۔

اسی مطلب کو جاری رکھتے ہوئے زیر بحث آیات میں فرماتا ہے: ”اس دن تم سب کے سب بارگاہِ خداوندی میں پیش کیے جاؤ گے اور تمہارے اعمال میں سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہے گی“ ﴿یومئذ ترضون لا تحفئ منکم خافیۃ﴾۔ ترضون، عرض کے مادہ سے کسی چیز کو دکھانے اور پیش کرنے کے معنی میں ہے۔ چاہے معاملہ کے وقت مال اور جنس ہو یا اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہو۔ البتہ انسان اور ان کے علاوہ جو کچھ بھی ہے اس دنیا میں بھی ہمیشہ اس کے سامنے ہیں۔ لیکن یہ بات قیامت میں زیادہ سے زیادہ نمایاں اور ظاہر ہوگی جیسا کہ خدا کی حاکمیت عالم ہستی پر دائمی ہے لیکن یہ حاکمیت اس دن ہر زمانہ اور وقت سے زیادہ واضح اور آشکار ہوگی۔

”لا تحفئ منکم خافیۃ“ کا جملہ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اس دن غیب اور لوگوں کے اسرار، شہود و ظہور میں بدل جائیں گے، جیسا کہ قرآن قیامت کے بارے میں کہتا ہے: یوم تبتلی السرائر: وہ ایسا دن ہوگا جس میں سارے پوشیدہ صفات ظاہر ہو جائیں گے۔ (طارق- ۹)

صرف انسانوں کے مخفی اعمال، بلکہ ان کے صفات، جذبات، اخلاق اور تئیں، سب کھل کر سامنے آ جائیں گی۔

یہ ایک عظیم حادثہ ہے اور بعض مفسرین کے مطابق پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے اور آسمانوں کے کتروں کے پھرتے جانے سے زیادہ عظیم، بدکاروں کی عظیم رسوائی اور مومنین کی بے مثال سر بلندی کا دن ہے۔ وہ ایسا دن ہو گا جس میں انسان اس میدان میں، اعمال اور اندرونی اسرار کے لحاظ سے غریاں ظاہر ہو گا۔ ہاں! اس دن ہمارے وجود کی کوئی چیز پنہاں اور مخفی نہیں رہے گی۔

ممکن ہے کہ یہ اس دن خدا کے ہر چیز پر احاطہ علمی کی طرف اشارہ ہو، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

لہذا اس کے بعد کہتا ہے: ”لیکن وہ شخص جس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں ہو گا وہ فرط مسرت میں پکار اٹھے گا، لو آؤ اور میرا نامہ اعمال پڑھو“ (فاما من اوتی کتابہ بیسینہ فیقول ہاؤم اقسروا کتابیہ) گویا خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور ان سب نعمتوں، توفیقات اور ہدایت کی وجہ سے جو خدا نے اُسے دی ہیں اس کے وجود کا ہر ہر ذرہ شکر گزار ہے اور وہ بے ساختہ ’الحمد لله‘ پکار رہا ہے۔

اس کے بعد اپنے عظیم ترین افتخار کو اس کلمہ میں خلاصہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ”مجھے یقین تھا کہ قیامت آکے رہے گی اور مجھے اپنے اعمال کا حساب دینا پڑے گا“ (انی ظننت انی ملاق حسابیہ)۔ ’ظن‘ اس قسم کے موارد میں ’یقین‘ کے معنی دیتا ہے۔ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ مجھے جو کچھ نصیب ہوا ہے، وہ اس دن پر ایمان کی وجہ سے ہے۔ واقعات یہی ہے کہ حساب و کتاب پر ایمان، انسان کو تقویٰ اور پرہیزگاری کی روح عطا کرتا ہے، تعهد اور مسئولیت کا احساس پیدا کرتا ہے اور انسان کی تربیت کا اہم ترین عامل ہے۔

بعد والی آیت میں اس قسم کے افراد کے اجر و ثواب کے ایک گوشہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”وہ ایک کامل اور پسندیدہ زندگی میں قرار پائے گا“ (فہو فی عیشۃ راضیۃ)۔

۱۔ ’ہاؤم‘ ارباب لغت کے قول کے مطابق، ’لے لو‘ کے معنی میں ہے۔ اگر مخاطب مردوں کی جماعت ہو تو ’ہاؤم‘ کہا جاتا ہے۔ عورتوں کی جماعت ہو تو ’ہاسن‘ اور اگر مفرد مذکر ہو تو ’ہاؤ‘ (ذکر کے ساتھ) اور مفرد مؤنث ہو تو ’ہاؤ‘ (ذکر کے ساتھ) اور شنیہ کے لیے ’ہاسنا‘ کہا جاتا ہے۔

۲۔ ’ہاؤ‘ یعنی کے معنی میں اور ’ہات‘ دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

۳۔ ’حسابیہ‘ میں ہاد استراحت کی یا سکتہ کی ہے اور اس کا کوئی خاص معنی نہیں ہے، جیسا کہ کتابیہ میں بھی ایسا ہی ہے۔

۴۔ اگرچہ ’رضایت اور خوشی‘ اس زندگی والوں کی ایک صفت ہے لیکن اوپر والی آیت میں اسے خود زندگی کی صفت قرار دیا ہے۔ یہ چیز انتہائی تاکید کا فائدہ دیتی ہے۔ یعنی وہ ایک ایسی زندگی ہے جو ساری کی ساری رضایت و خوشی ہے۔

پنہا

۱۔ قطعہ

اگرچہ اس نے اسی ایک جُملہ کے ساتھ تمام کھنے کی باتیں کہہ دی ہیں لیکن مزید وضاحت کے لیے کہتا ہے :
”وہ عالی مرتبہ بہشت میں ہوگا“ (فی جنۃ عالیۃ)۔
وہ بہشت جو اتنی بلند و بالا اور رفیع و والا قدر ہے کہ نہ کسی شخص نے دیکھی ہے نہ سنی ہے اور نہ ہی کبھی
اس کا تصور کیا ہے۔

❖ ❖ ❖

ایسی بہشت جس کے پھل دسترس میں ہوں گے“ (قطوفہا دانیتۃ)۔
ز پھلوں کو توڑنے کی زحمت اٹھانا پڑے گی، نہ ہی اس کے لدے پھندے درختوں کے قریب ہونے
میں کوئی مشکل ہوگی اور اصولی طور پر اس کی تمام نعمتیں بغیر کسی استثناء کے دسترس میں ہوں گی۔ لے

❖ ❖ ❖

آخری زیر بحث آیت میں، ان بہشتیوں کے لیے خدا کے محبت آمیز خطاب کو اس طرح بیان کیا ہے:
”مڑے مڑے سے کھاؤ اور پیو، یہ ان اعمال کا بدلہ ہے جنہیں تم نے گذشتہ ایام میں انجام دیا تھا“ (کلوا واشربوا
ہنیئاً بما اسلفتم فی الایام الخالیۃ)۔
اں! یہ عظیم نعمتیں بے حساب نہیں ملیں گی۔ یہ تمہارے اعمال کا بدلہ ہے جنہیں تم نے دنیا میں آج کے لیے
دنیہ کیا اور آگے بھیجا ہے، لیکن یہ ناچیز اعمال جب فضل و رحمت الہی کے ان فی میں قرار پائے ہیں تو اس
قسم کے ثمرات و نتائج تک منتہی ہوئے ہیں۔

پند نکات

۱: لفظ عرش کی ایک اور تفسیر

ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا :
حملة العرش - والمرش العلم - ثمانية اربعة منا ،
واربعة من شاء الله -
حاملین عرش - عرش سے مراد علم خدا ہے۔ آٹھ افراد میں چار تو ہم میں سے ہیں اور چار ان میں سے جنہیں
خدا نے چاہا ہے۔ لے

لے قطوف، قطف (بروزن حرب) کی جمع ہے جو چنے ہوئے پھلوں کے معنی میں ہے اور کبھی چنے کے لیے تیار پھلوں کے لیے بھی آیا ہے۔

لے نور الثمین جلد ۵ ص ۲۰۶ حدیث ۲۸

ایک اور حدیث میں امیر المؤمنین علیؑ سے آیا ہے :

”فَالَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ ، هُمُ الْعُلَمَاءُ ، الَّذِينَ جَلَّهُمُ اللَّهُ عِلْمَهُ۔“

”حاملین عرش وہ علماء اور دانش مند ہیں جنہیں خدا نے اپنے علم کی تعلیم دی ہے۔“

ایک اور حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے آیا ہے :

”الْعَرْشُ لَيْسَ هُوَ اللَّهُ وَالْعَرْشُ اسو علم و قدسرة۔“

”عرش خدا نہیں ہے، بلکہ اس کے علم و قدرت کا نام ہے۔“

ان احادیث سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ عرش کی اس تفسیر کے علاوہ، جو ہم نے پہلے بیان کی تھی، ایک اور تفسیر بھی ہے۔ یعنی وہ خدا کے علم و قدرت جیسی صفات ہیں۔ اس بناء پر عرش الہی کے حامل اس کے علم کے حامل ہیں۔ پس انسان یا فرشتے جتنا زیادہ علم رکھتے ہوں گے، اتنا ہی زیادہ حصہ اس عظیم عرش کا اٹھائے ہوئے ہوں گے۔

اس طرح یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے، کہ عرش تخت سلطنت کے مشابہ کسی جسمانی تخت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ جب خدا کے بارے میں استعمال ہوتا ہے تو مختلف کنائی معانی رکھتا ہے۔

۲ : علیؑ اور ان کے شیعوں کا مقام

کئی روایات میں آیا ہے آیت فاما من اوتی کتابہ ببینینہ ... علیؑ کے بارے میں ہے، یا علیؑ اور ان کے شیعوں کے بارے میں ہے۔ لہ

حقیقت میں یہ واضح مصداق کے بیان کے قبیل سے ہے۔ اس سے آیت کے مفہوم کو محدود نہیں کیا جاسکتا۔

۳ : ایک سوال کا جواب

مکین ہے یہاں ایک سوال کیا جائے کہ کیا وہ مومنین جو اوپر والی آیات کے مطابق پکاریں گے۔ ”اے

۱۔ نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۰۵ حدیث ۲۶

۲۔ نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۰۵ حدیث ۲۷

۳۔ تفسیر المیزان جلد ۲۰ ص ۶۶

اہل محشر آؤ اور ہمارے نامہ اعمال کو پڑھو، تو کیا ان کے نامہ اعمال میں کوئی گناہ نہیں ہوگا۔
 اس سوال کا جواب بعض احادیث سے معلوم کیا جا سکتا ہے، منجملہ ان کے پیغمبر گرامی سے منقول ہے:
 ”خدا قیامت میں پہلے اپنے بندوں سے ان کے گناہوں کا اقرار لے لے گا پھر فرمائے
 گا، ”میں نے تمہارے یہ گناہ دنیا میں بھی مستور اور پوشیدہ رکھے ہیں اور آج بھی میں انہیں نشتا
 ہوں،“ اس کے بعد (صرف) ان کے حسنات اور نیکیوں کا دفتر ان کے دائیں ہاتھ میں
 دے دے گا۔ لے
 بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس دن خدا مومنین کے سینات اور برائیوں کو حسنات اور نیکیوں میں بدل
 دے گا۔ اسی وجہ سے ان کے نامہ اعمال میں کوئی ضعیف نقطہ نہیں ہوگا۔

۲۵) وَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ ۖ فَيَقُولُ يَلِيَّتِي لِمَ
أُوْتِيَ كِتَابِي ۚ

۲۶) وَلَمْ أَدْرِ مَا حِسَابِي ۚ

۲۷) يَلِيَّتَهَا كَانَتْ الْقَاضِيَةَ ۚ

۲۸) مَا آغْنِي عَنِّي مَالِي ۚ

۲۹) هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِي ۚ

ترجمہ

۲۵) لیکن وہ شخص جس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا: اے کاش!

میرا نامہ اعمال مجھے ہرگز نہ دیا جاتا۔

۲۶) اور میں یہ نہ ہی جانتا کہ میرا حساب کیا ہے؟

۲۷) اے کاش! مجھے تو موت ہی آ جاتی۔

۲۸) میرے مال و دولت نے مجھے ہرگز بے نیاز نہیں کیا۔

۲۹) میری قدرت بھی ہاتھ سے نکل گئی۔

میرا نمونہ

ف

ا

ہاتھ

بند

دونو

میں

فیقو

الف

تو

ہوگا

غیظ

کن

کن

ہم

نہ

”

نفس

اے کاش مجھے موت آجاتی۔

گذشتہ آیات میں گفتگو 'اصحاب الیمین' اور ان مومنین کے بارے میں تھی کہ جن کا نامہ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ وہ فخریہ اہل معشر کو پکاریں گے اور انہیں اپنے اعمال کو پڑھنے کی دعوت دیں گے، اس کے بعد بہشت جاوداں میں پہنچ جائیں گے۔

لیکن زیر بحث آیات ٹھیک ان کے نقطہ مقابل یعنی 'اصحاب شمال' کو پیش کرتی ہیں اور ایک موازنہ میں ان دونوں کی کیفیت کو کامل طور پر واضح کر دیتی ہیں۔ پہلے فرماتا ہے: "لیکن جس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، وہ کہے گا: اے کاش میرا نامہ اعمال کبھی بھی مجھے نہ دیا جاتا۔" (و اما من اوتی کتابہ بشمالہ یقول یا لیتنی لہ اوت کتابیہ)۔

"اور اے کاش! میں اپنے حساب کتاب سے ہرگز خردار نہ ہوا ہوتا۔" (ولم ادر ما حسابیہ)۔

"اور اے کاش مجھے موت آجاتی جو میری اس حسرت ناک زندگی کو ختم کر دیتی۔" (یا لیتما کانت

القاضیۃ)۔

ہاں! اس عظیم عدالت میں، اس 'یوم البروز' اور 'یوم الظہور' میں جب اپنے تمام قبیح اعمال کو بر ملا دیکھے گا تو اس کی فریاد بلند ہوگی۔ وہ دل سے پہلے درپلے آہ سوزاں کھینچے گا۔ ایسی آہ جو حسرت بار ہوگی اور ایسا نالہ جو شر بار ہوگا۔ وہ یہ آرزو کرے گا کہ اس کا اپنے ماضی سے کلی طور پر رابطہ ختم ہو جائے۔ وہ خدا سے موت و نابودی اور اس عظیم رسوائی سے نجات کی آرزو کرے گا، جیسا کہ سورہ 'نبا' کی آیت ۴۰ میں بھی آیا ہے: "ویقول الکافر یا لیتنی کنت مترا بئاً" "گافر اس دن یہ کہے گا۔ اے کاش! میں مٹی ہوتا اور ہرگز انسان نہ بنتا۔"

"یا لیتما کانت القاضیۃ" کے جملہ کی اور تفاسیر بھی بیان کی گئی ہیں۔ سمجھو ان کے یہ ہے کہ قاضیۃ سے

لے کتابیہ میں اور اسی طرح حسابیہ و مالیہ و سلطانیہ میں 'ہا' جو بعد میں آیات میں آئے گا ہا، سکت یا ہا، استراحت ہے۔ نیز جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس کا کوئی خاص معنی نہیں ہے بلکہ یہ اس قسم کے کلمات میں ایک خوبصورت وقت شمار ہوتا ہے۔ یہ ان اشخاص کے حالات اور نفس کی کیفیت کے ساتھ ایک قسم کی مناسبت رکھتا ہے، جو یہ بات کریں گے۔

لے "کانت القاضیۃ" کے جملہ میں ایک محدود ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے۔ (کانت هذه الحالة القاضیۃ)

مراد پہلی موت ہے، یعنی اسے کاش! جب ہم دنیا میں مر رہی گئے تھے تو پھر دوبارہ زندہ نہ ہوتے۔ یہ اس حال میں ہے کہ دنیا میں کوئی چیز اس کی نظر میں موت سے زیادہ ناخوش آئند نہیں تھی، لیکن قیامت میں آرزو کرے کہ اسے کاش وہ موت ہی برقرار رہتی۔
بعض نے اسے صُور کے پہلے نغمہ کے بارے میں سمجھا ہے، جسے قارعتہ سے بھی تعبیر کیا گیا۔ یعنی اسے کاش دوسرا نغمہ واقع ہی نہ ہوتا۔

لیکن وہ تفسیر جو ہم نے ابتداء میں بیان کی ہے سب سے زیادہ مناسب ہے۔

✦ ✦ ✦

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”یہ گنہگار مجرم اعتراف کرتے ہوئے کہے گا: ”میرے مال و دولت نے مجھے ہرگز بے نیاز نہیں کیا، اور آج کی مصیبت میں جو میری بیچارگی کا دن ہے، میرے کچھ کام نہ آیا۔“ (عنی عافی مالہ)۔

✦ ✦ ✦

نہ صرف میرے مال و دولت نے مجھے بے نیاز نہیں کیا اور میری کسی مشکل کو حل نہیں کیا، بلکہ میری قدرت و سلطنت بھی نابود ہو گئی اور ہاتھ سے چلی گئی۔“ (ہلک عافی سلطانہ)۔
خلاصہ یہ ہے کہ نہ تو مال ہی کام آیا اور نہ ہی مقام و منصب، آج خالی ہاتھ، انتہائی ذلت و شرمساری کے ساتھ دادگاہِ عدلِ الہی میں حاضر ہوں، نجات کے تمام اسباب منقطع ہو گئے ہیں، میری طاقت و قدرت برباد ہو گئی ہے اور میری امید ہر جگہ سے ختم ہو چکی ہے۔

بعض نے یہاں سلطان کو دلیل و برہان کے معنی میں سمجھا ہے جو انسان کی کامیابی کا سبب ہوتا ہے۔ یعنی آج میرے پاس کوئی ایسی دلیل اور حجت نہیں ہے جس کے ذریعے میں بارگاہِ خدا میں اپنے اعمال کی توجیہ کر سکوں۔
بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں ”سلطان“ سے مراد سلطہ و حکومت نہیں ہے، کیونکہ وہ سب لوگ جو دوزخ میں وارد ہوں گے کسی ملک کے بادشاہ یا کچھ شہروں کے امیر تو نہیں تھے بلکہ اس سے مراد انسان کا اپنے نفس اور اپنی زندگی پر تسلط ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ بہت سے دوزخی اس جہان میں تسلط و نفوذ رکھتے تھے یا وہ سردار اور امیر کبیر لوگ تھے، لہذا یہ صحیح نظر آتا ہے۔

ایک نکتہ

چند عبرت انگیز داستانیں

یہاں بہت سے واقعات نقل ہوئے ہیں جو سب کے سب اوپر والی آیات کے مضمون پر ایک تاکید، اور

ان لوگوں کے لیے ایک درس عبرت ہیں جنہوں نے مال و مقام اور منصب پر تکیہ کیا اور سر تا پا غرور و غفلت اور گناہ میں آلودہ ہیں، منجملہ :

۱ : سفینۃ البحار میں کتاب نصاب سے اس طرح سے نقل ہوا ہے۔ ”خراسان میں جب ہارون الرشید کی بیماری شدید ہو گئی تو اس نے طوس سے کسی طبیب کو بلانے کا حکم دیا۔ پھر اس نے کہا کہ اس کا پیشا دوسرے چند بیماریوں اور کچھ صبح و سالم افراد کے پیشاب کے ساتھ طبیب کے سامنے پیش کیا جائے۔ طبیب ان شیشیوں کو دیکھے بعد دیگرے دیکھتا جا رہا تھا یہاں تک کہ وہ ہارون الرشید کے پیشاب والی شیشی تک پہنچ گیا۔ چنانچہ یہ جانے بغیر کہ یہ شیشی کس کی ہے اُس نے کہا : اس شیشی والے سے کہہ دیں کہ وہ اپنی وصیت کر دے، کیونکہ اس کی طاقت و قوت محضمل ہو چکی ہیں اور اس کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ ہارون الرشید طبیب کی اس بات کو سن کر اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا، اور یہ اشعار پڑھنا شروع کر دیئے۔

ان الطیب بطلہ و دواشہ

لا یستطیع دفاع غیب قدائی

ما للطیب یموت بالداء الذی

قد کان یبصر مثله فیما مضی

”طبیب اپنی طبابت اور دواؤں کے ذریعے اس موت کا دفاع

کرنے کی قدرت نہیں رکھتا جو آپہنچی ہے۔“

”اگر وہ یہ قدرت رکھتا ہوتا تو پھر وہ خود اُسی بیماری سے کیوں مرنے

کہ جس کا وہ پہلے علاج کیا کرتا تھا۔“

اسی اثناء میں اُسے خبر ملی کہ لوگوں نے اس کی موت کی خبر بھیل دی ہے۔ اس شہرت کو ختم کرنے کے لیے اس نے ایک سوازی لانے کا حکم دیا اور کہا کہ مجھے اس پر سوار کر دو، لیکن اچانک اس جانور کا زانو کمزور ہو گیا۔ تب اس نے کہا : ”مجھے سوازی سے اتار دو کیونکہ اس خبر کو اڑانے والے سچ سمجھتے ہیں۔“ اس کے بعد اس نے وصیت کی کہ اس کے لیے کسی کفن لائے جائیں، ان میں سے اس نے ایک کو پسند کر کے رکھ لیا اور کہا ”میرے بستر کے قریب ہی میری قبر تیار کرو۔“ پھر اس نے قبر کی طرف دیکھا اور ان آیات کی تلاوت کی : ما اعثنیٰ عنی مالہ۔ هلك عنی سلطانہ اور اسی دن دنیا سے رخصت ہو گیا۔

- ۲ : اسی کتاب میں عالم بزرگوار شیخ بہائی سے بھی اسی طرح نقل ہوا ہے :
- ”ایک شخص جس کا نام ’توبہ‘ تھا اور غالباً وہ اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہتا تھا، ایک دن اس نے اپنی گزری ہوئی عمر کا حساب لگایا تو وہ ۲۱۵۰۰ دن تھے۔ تب اس نے کہا : وائے ہو مجھ پر ! اگر میں ہر دن کے مقابلہ میں صرف ایک ہی گناہ کیا ہو تو وہ بھی اکیس ہزار سے زیادہ بنتے ہیں۔ تو کیا میں سے اکیس ہزار گناہوں کے ساتھ طلاقات کروں گا۔ اسی وقت اس نے ایک پیچ ماری زمین پر گر پڑا اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔“
- ۳ : ’ثنا لہی‘ کی کتاب ’یتیمہ‘ میں اس طرح آیا ہے :
- ”جب عضد الدولہ کی موت کا وقت آن پہنچا تو اس کی زبان سے سوائے اس آیت کی تلاوت کے کچھ نہ نکلتا تھا : ما اغنی عنی مالیک۔ ہلک عنی سلطانیدہ۔“ ”میرا مال بھی میرے کچھ کام نہ آیا اور میری سلطنت بھی برباد ہو گئی۔“

- خُذُوهُ فَغُلُّوهُ ۝ (۳۰)
- ثُمَّ الْجَحِيمِ صَلُّوهُ ۝ (۳۱)
- ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا
فَأَسْلُكُوهُ ۝ (۳۲)
- إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ ۝ (۳۳)
- وَلَا يَحْضُ عَلَىٰ طَعَامِ الْمَسْكِينِ ۝ (۳۴)
- فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هُنَا حَيِّمٌ ۝ (۳۵)
- وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينَ ۝ (۳۶)
- لَا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِرُونَ ۝ (۳۷)

ترجمہ

- ۳۰ اسے پکڑو اور طوق و زنجیر میں جکڑ دو۔
- ۳۱ پھر اسے جہنم میں پھینک دو۔
- ۳۲ اس کے بعد اسے ایسی زنجیر میں باندھ دو جو ستر ہاتھ ہے۔
- ۳۳ کیونکہ وہ ہرگز خداوند عظیم پر ایمان نہیں لاتا تھا۔
- ۳۴ اور مسکین کو کھانا کھلانے کی لوگوں کو تشویق نہیں کرتا تھا۔

- ۳۵) لہذا آج یہاں اس کا کوئی مہربان اور یارو یاور نہیں ہے۔
- ۳۶) اور نہ ہی پیپ اور خون کے علاوہ کوئی اور کھانا ہے۔
- ۳۷) ایسی غذا جسے خطا کاروں کے علاوہ اور کوئی نہیں کھاتا۔

تفسیر

اسے پکڑ کر زنجیروں میں جکڑ دو۔

گذشتہ آیات کو جاری رکھتے ہوئے جو اصحاب شمال کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں کہ ان کا نامہ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، ان کے آہ و نالہ کی فریاد بلند ہوگی اور وہ موت کی آرزو کریں گے۔ زیر بحث آیات میں ان کے عذاب کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اس وقت عذاب کے فرشتوں کو حکم دیا جائے گا: ”اسے پکڑ لو اور طوق و زنجیر میں جکڑ دو“ (خذوه فخلوه)۔

خلوہ، غسل کے مادہ سے جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے، ایسی زنجیر کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ بعض اوقات مجرموں کے ہاتھ پاؤں ان کی گردن کے ساتھ باندھ دیئے جاتے ہیں اور وہ بہت ہی تکلیف دہ ہوتی ہے۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد کہا جائے گا: ”اس کو جہنم کی آگ میں داخل کر دو“ (ثم الجحیم صلّوہ)۔

❖ ❖ ❖

پھر اسے اتنی لمبی زنجیر میں جکڑ دو جو ستر ہاتھ ہے“ (ثم فی سلسلۃ ذرعھا سبعون ذراعاً فاسلکوه)۔

”سلسلہ“ زنجیر کے معنی میں ہے اور اصل میں تسلسل کے مادہ سے لیا گیا ہے جو پلنے اور لرزنے کے معنی میں ہے کیونکہ زنجیر کے حلقے اور کڑیاں لرزتی اور ہلتی رہتی ہیں۔

”ستر ہاتھ“ کی تعبیر ممکن ہے ”تکثیر“ کے عنوان سے ہو، کیونکہ ستر کا عدد ایسے اعداد میں سے ہے جو عام طور پر کثرت کے لیے استعمال ہوتا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ ستر کا عدد ہی مراد ہو۔ بہر حال اس قسم کی زنجیر کو مجرموں کے گرد اس طرح سے لپیٹ دیں گے کہ وہ انھیں سر سے لے کر پاؤں تک گھیر لے گی۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ طولانی زنجیریں ایک ہی شخص کے لیے نہیں ہوں گی، بلکہ ہر گروہ کو ایک

زنجیر میں بانڈھیں گے۔ گذشتہ آیات میں غل و زنجیر کے ذکر کے بعد اس سزا کا ذکر اسی معنی کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

ذراغ کہنی سے لے کر انگلیوں کی نوک تک کے فاصلہ کے معنی میں ہے (جو تقریباً آدھا میٹر ہوتا ہے) اور یہ عربوں کے نزدیک ایک ہی طول تھا جو ایک طبعی پیمانہ ہے لیکن بعض نے کہا ہے کہ یہ عام ذراغ سے مختلف ہے۔ اس طرح کہ اس کی ایک ذراغ بہت زیادہ فاصلوں کو گھیر لیتی ہے اور سارے کے سارے دو ذریعوں کو اسی ایک زنجیر کے ساتھ بانڈھ دیں گے۔

ہم پھر کہتے ہیں کہ قیامت سے مربوط مسائل کو ہم دنیا کے رہنے والوں کی زبان میں پورے طور پر بیان نہیں کیا جاسکتا۔ جو کچھ آیات و روایات میں آیا ہے وہ صرف اس کی ایک شبح (سایہ یا ہیولے) کی تصویر کشی کرتا ہے۔

اس آیت میں شہ کی تعبیر اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ وہ جہنم میں داخل ہونے کے بعد ستر ذراغ کی زنجیر میں جکڑے جائیں گے اور یہ ان کے لیے ایک نئی سزا ہوگی۔ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تمام انفرادی اور اجتماعی زنجیریں جہنم میں وارد ہونے سے پہلے ہوں گی اور شہ اصطلاح کے مطابق ذکر میں تاخیر کے لیے ہے۔

بعد کی دو آیات میں اس سخت و شدید عذاب کی اصلی علت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”کیونکہ وہ خدائے عظیم پر ایمان نہ لانے پر مصر تھا“ (انہ کان لا یؤمن باللہ العظیم)۔
انبیاء و اولیاء اور پروردگار کے رسول اسے جس قدر خدا کی طرف دعوت دیتے تھے وہ اسی قدر انکار کرتا اور قبول نہیں کرتا تھا۔ اس طرح اپنے خالق سے اس کا رشتہ کلی طور پر منقطع ہو گیا تھا۔

”اور وہ لوگوں کو، مسکین کو کھانا کھلانے کی تشویق نہیں کرتا تھا“ (ولا یحض علی طعام المسکین)۔
اس طرح سے اس نے مخلوق سے بھی اپنا رشتہ توڑا ہوا تھا۔
اس بناء پر اس کی بدبختی کا سب سے بڑا عامل خالق و مخلوق سے رابطے کا منقطع ہونا تھا۔
اس تعبیر سے ابھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ عمدہ اطاعتوں، عبادتوں اور شرعی احکام کو انھیں دو اعمال میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے۔ نیز ”اطعام مسکین“ کا ایمان پر عطف، اس عظیم انسانی عمل کی حد سے زیادہ اہمیت کی طرف اشارہ ہے اور واقعا ایسا ہی ہے، کیونکہ بعض کے قول کے مطابق بدترین عقیدہ کفر ہے اور رذائل اخلاقی میں سے بدترین شغل ہے۔

قابل توجہ بات ہے کہ یہ نہیں کہتا: ”وہ کھانا نہیں کھلاتا تھا“ بلکہ یہ کہتا ہے کہ دوسروں کو کھانا کھلانے

پر آمادہ نہیں کرتا تھا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے :

اولاً : صرف ایک شخص کا کھانا کھلانا فقراء و مساکین کی مشکل کو حل نہیں کر سکتا ، لہذا دوسروں کو بھی اس کا ذخیرہ کی دعوت دینا چاہیے تاکہ وہ عوامیت کا پہلو اختیار کر لے۔

ثانیاً : ممکن ہے کہ انسان شخصی طور پر کھانا کھلانے کی توانائی اور قدرت نہ رکھتا ہو لیکن ہر شخص دوسروں کو ترغیب دلانے کی قدرت تو رکھتا ہے۔

ثالثاً : بخیل افراد اس قسم کے ہوتے ہیں جو نہ صرف خود عطاء اور بخشش نہیں کرتے بلکہ دوسروں کے عطاء اور بخشش سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

بعض قدام سے نقل ہوا ہے جو اپنی بیوی کو یہ حکم دیا کرتے تھے کہ وہ کھانا زیادہ پکایا کرے تاکہ وہ فقراء و مساکین کو بھی دے سکیں ، اس کے بعد یہ کہا کرتے :

” اس زنجیر کا آدھا حصہ خدا پر ایمان لانے کی وجہ سے ہم نے باہر نکال دیا ہے اور اس کا دوسرا آدھا حصہ کھانا کھلوا کر باہر نکالتے ہیں۔“ لے

♦ ♦ ♦

اس کے بعد مزید کہتا ہے : ” چونکہ اس کا کوئی عقیدہ و عمل ایسا نہ تھا، لہذا آج یہاں اس کا کوئی مہربان اور مددگار نہیں ہے۔“ (فلیس لہ الیوم ہمننا حسیو)۔

اور نہ ہی پیپ اور خون کے علاوہ اس کے لیے یہاں کوئی اور کھانا ہے۔“ (ولا طعام الا من غسلین)۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان کی جزا اور عمل کامل طور پر ایک دوسرے کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں۔ خالق سے رشتہ توڑنے کی وجہ سے وہاں ان کا کوئی گرم جوش اور گہرا دوست نہیں ہو گا۔ نیز فقراء اور مساکین کو کھانا نہ کھلوانے کی وجہ سے ، پیپ اور خون کے سوا اور کوئی کھانے کی چیز ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گی ، کیونکہ وہ سالہا سال تک لذیذ ترین کھانے کھاتے رہے تھے جبکہ بے نوا اور بے کس لوگوں کے پاس خون دل کے سوا اور کوئی کھانا نہیں تھا۔

” راغب“ مفردات میں کہتا ہے کہ ”غسلین“ اس پانی کے معنی میں ہے جو کفار کے بدن کو دھونے سے جہنم میں گرے گا۔ لیکن مشہور یہ ہے کہ اس سے مراد وہ پیپ اور خون ہے جو دوزخیوں کے بدن سے گرے گی ، شاید راغب کی مراد بھی یہی ہو اور طعام کی تعبیر بھی اسی معنی کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ سورہ غاشیہ کی آیت ۶ میں آیا ہے : لیس لہم طعام الا

من ضریح : ان کا کھانا "ضریح کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا" اور ضریح کی تفسیر ایک قسم کے کانٹے سے کی ہے۔ سورہ دخان کی آیت ۴۲، ۴۳ میں آیا ہے : ان شجرت الزقوم طعام الاشیع : "درخت زقوم گھنگاڑوں کا کھانا ہے۔ اور "زقوم" کی ایک کڑوے بدبودار اور بد ذائقہ نبات کے ساتھ تفسیر کی گئی ہے، جس کا نمونہ سرزمین 'ہمامہ' میں اگا کرتا تھا جو تلخ اور جلانے والا شیرہ رکھتا تھا۔ پس ان آیات اور زیر بحث آیت کو کیسے جمع کیا جاسکتا ہے ؟

اس سوال کے جواب میں بعض نے تو یہ کہا ہے : یہ تینوں الفاظ 'ضریح'، 'زقوم'، 'غسلین' ایک ہی چیز کی طرف اشارہ ہیں۔ (اور وہ ایک سخت اور ناگوار نبات ہے جو اہل دوزخ کی غذا ہے۔) بعض دوسروں نے یہ کہا ہے : دوزخیوں کے مختلف طبقات ہیں، ان تینوں چیزوں میں سے ایک ایک چیز ایک گروہ کی غذا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ ان کی غذا تو "زقوم و ضریح" ہے، پینے کے لیے غسلین ہے اور مشروب کے بارے میں 'طعام' کی تعبیر نئی نہیں ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں تاکید کے لیے مزید کہتا ہے : "اس غذا کو خطا کاروں کے سوا اور کوئی نہیں کھائے گا" (لا یأكله الا الخاطون)۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ خاطی اس شخص کو کہا جاتا ہے جو جان بوجھ کر غلط کام کرے، لیکن "مخطی" عمداً خطا کرنے والے اور سہواً خطا کرنے والے کو بھی کہا جاتا ہے۔ اس بناء پر دوزخ کی یہ غذا ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو جانتے بوجھتے عمداً ظنیان و سرکشی کے عنوان سے شرک و کفر اور سبیل کی راہ پر چلتے ہیں۔

ایک نکتہ

حروفِ قرآن پر اعراب لگانے کی ابتداء

ایک حدیث میں آیا ہے کہ "صعصع بن صوحان جو امام علیؑ کے اصحاب میں سے تھے کہتے ہیں : "ایک عرب امام علیؑ کی خدمت میں آیا اور آیت "لا یأكله الا الخاطون" کے بارے میں سوال کیا اور اس نے خاطون یعنی خطا کاروں کی بجائے "خاطون" (جو قدم اٹھانے والوں کے معنی میں ہے) پڑھا اور پوچھا کہ قدم تو سب ہی لوگ اٹھاتے ہیں، تو کیا خدا ان سب ہی کو یہ غذا دے گا؟

امام نے تیسرے فرمایا : کہا : اے مرد عرب ! اس آیت کے صحیح الفاظ لا یأكله إلا الخاطئون ہیں۔ اس نے عرض کیا : اے امیر المؤمنین ! آپ نے سچ فرمایا ہے، خدا کسی بے خطا بندے کو عذاب کے سپرد نہیں کرے گا۔ اس کے بعد امام نے ابوالاسود کی طرف جو ایک ادیب شخص تھا رخ کیا اور فرمایا : اس وقت عربی زبان سے بیگانہ لوگ بھی مسلمان ہو گئے ہیں۔ ایسا کام کرو کہ وہ اپنی زبان کی اصلاح کر سکیں۔ اس حکم کے بعد ابوالاسود نے الفاظ قرآن پر نصب اور کسر (زبر، زیر، پیش) کی علامت لگائی۔



- فَلَا أُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُونَ ۝ (۳۸)
- وَمَا لَا تُبْصِرُونَ ۝ (۳۹)
- إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝ (۴۰)
- وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَّا تُوْمِنُونَ ۝ (۴۱)
- وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۝ (۴۲)
- تَنْزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۴۳)

ترجمہ

- قسم کھاتا ہوں میں اس کی جسے تم دیکھ رہے ہو۔ (۳۸)
- اور اس کی جسے تم نہیں دیکھتے۔ (۳۹)
- کہ یہ قرآن، ایک بزرگوار رسول کی زبان سے نکلا ہوا کلام ہے۔ (۴۰)
- اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے، لیکن تم بہت کم ایمان لاتے ہو۔ (۴۱)
- اور نہ ہی یہ کسی کاہن کا قول ہے۔ لیکن تم بہت ہی کم متذکر ہوتے ہو۔ (۴۲)
- (بلکہ یہ وہ کلام ہے جو) عالمین کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ (۴۳)

تفسیر

یہ قرآن یقیناً خدا کا کلام ہے۔

ان مباحث کے بعد جو گذشتہ آیات میں قیامت اور مومنین و کفار کی سرنوشہ کے بارے میں بیان ہوئے تھے، ان آیات میں قرآن مجید اور نبوت کے بارے میں ایک فصیح و بلیغ بحث کرتا ہے تاکہ ”نبوت“ اور ”معاد“ کی بحث ایک دوسرے کی تکمیل کریں۔

پہلے فرماتا ہے: ”قسم کھاتا ہوں میں اس کی جسے تم دیکھتے ہو“ (فلا اقسم بما تبصرون)۔

”اور اس کی جسے تم نہیں دیکھتے“ (وما لاتبصرون)۔

مشہور یہ ہے کہ لفظ لا اس قسم کے موارد میں زائدہ اور تاکید کے لیے ہوتا ہے۔ لیکن بعض نے کہا ہے کہ لا یہاں بھی نفی کے معنی دیتا ہے۔ یعنی میں ان امور کی قسم نہیں کھاتا، کیونکہ اولاً تو اس قسم کی ضرورت نہیں اور ثانیاً، قسم خدا کے نام کی ہونا چاہیے۔ لیکن یہ قول ضعیف ہے اور مناسب وہی پہلا معنی ہے کیونکہ قرآن مجید میں خدا کے نام اور غیر خدا کے نام کی قسمیں بہت زیادہ ہیں۔

ما تبصرون وما لاتبصرون کا جملہ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو ان تمام چیزوں کو جنہیں انسان دیکھتے ہیں اور نہیں دیکھتے، گھیر لیتا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ سارے عالم ”شہود“ اور ”غیب“ کو شامل ہے۔ ان دو آیات کی تفسیر میں دیگر احتمال بھی دیئے گئے ہیں۔ منجملہ ان کے یہ ہے: ”ما تبصرون“ سے مراد عالم خلقت ہے اور ”ما لاتبصرون“ سے مراد خالق ہے، یا یہ کہ اس سے مراد ظاہری اور باطنی نعمتیں، یا انسان اور فرشتے، یا اجسام و ارواح یا دنیا و آخرت ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے ان دونوں تعبیروں کے مفہوم کی وسعت اس کے معنی کو محدود کرنے سے مانع ہے۔ اس بناء پر افق نگاہ میں جو کچھ آتا ہے اور جو نہیں آتا وہ سب اس سوگند و قسم میں داخل ہے لیکن اس کا شمول خدا کی نسبت بعید نظر آتا ہے، کیونکہ خالق کو مخلوق کے ساتھ قرار دینا مناسب نہیں ہے، خصوصاً ”ما“ کی تعبیر کے ساتھ کہ جو عام طور پر غیر ذوی العقول کے لیے آتی ہے۔

ضمنی طور پر اس تعبیر سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ جو کچھ انسان آنکھ سے نہیں دیکھتا وہ بہت کچھ ہے۔ موجودہ علم و دانش نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ محسوسات، موجودات کے ایک محدود دائرے کو ہی شامل ہوتے ہیں اور جو کچھ افق جس میں نہیں آتا، چاہے وہ رنگ ہوں یا آوازیں، ذائقے ہوں یا امواج وغیرہ، وہ کئی درجے زیادہ ہیں۔

وہ تارے جو کثرۃ ارض کے دونوں آدھے حصوں کے مجموعہ میں آنکھ سے دکھائی دیتے ہیں، ماہرین کے حساب کے مطابق تقریباً پانچ ہزار تارے ہیں جبکہ وہ تارے جو آنکھ سے دیکھے نہیں جاتے وہ اربوں کھربوں سے بھی زیادہ ہیں۔

وہ صوتی امواج (آواز کی لہریں) جن کا ادراک کرنے پر انسان کے کان قدرت رکھتے ہیں بہت ہی محدود لہریں ہیں جبکہ ہزار ہا دوسری ایسی صوتی لہریں موجود ہیں کہ جن کے سننے کی انسانی کان قدرت نہیں رکھتے۔ وہ رنگ جنہیں ہم دیکھ سکتے ہیں سات مشہور رنگ ہیں لیکن آج یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بنفشی اور قرمزی رنگوں کے علاوہ بے شمار دوسرے ایسے رنگ ہیں کہ جن کے مشاہدے کی ہماری آنکھ میں بالکل ہی قدرت نہیں ہے۔

ان چھوٹے چھوٹے جانداروں کی تعداد جو آنکھ سے دیکھے نہیں جاسکتے اس قدر زیادہ ہے کہ اس نے تمام دنیا کو مپر کر رکھا ہے، بعض اوقات وہ پانی کے ایک قطرے میں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہوتے ہیں۔ اس حال میں یہ بات کتنی دردناک ہے کہ ہم اپنے آپ کو محسوسات کے زندان میں قید کر لیں اور محسوسات کی دنیا کے باہر سے بے خبر ہو جائیں یا اس کا انکار کر دیں؟

عالم ارواح ایک ایسا عالم ہے جو دلائل عقلی بلکہ تجرباتی دلائل سے بھی ثابت ہو چکا ہے۔ وہ عالم ہمارے عالم جسم سے کہیں زیادہ وسعت رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں محسوسات کی چار دیواری میں کس طرح قید رہا جاسکتا ہے؟

اس کے بعد والی آیہ میں اس عظیم و بے نظیر سوگند و قسم کے نتیجہ اور جواب کو ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے :
 ”یہ قرآن ایک بزرگوار رسول کی گفت گو ہے“ (اندھ لفظوں رسول کو یہ)۔
 ”رسول“ سے مراد یہاں بلاشبک و شبہ اسلام کے پیغمبر گرامی ہیں نہ کہ جبریل، کیونکہ بعد والی آیات وضاحت کے ساتھ اس معنی کی گواہی دیتی ہیں۔

اور یہ جو کہتا ہے کہ یہ ایک بزرگوار رسول کی گفتگو ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر اس کی تبلیغ کرنے والے ہیں، خصوصاً جبکہ ان کی رسالت کے وصف کا ذکر ہوا ہے جیسا کہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ رسول جو کچھ لاتا ہے وہ بھیجنے والے کی بات ہوتی ہے، اگرچہ وہ رسول کی زبان سے جاری اور اس کے لب ہائے مبارک سے سنا جاتا ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے : ”یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔ لیکن تم بہت کم ایمان لاتے ہو“ (وما هو

(حاشیہ لے اگلے صفحہ پر)

بقول شاعر قلیلاً ما تؤمنون) یہ

اور یہ کسی کاہن کا قول بھی نہیں ہے، اگرچہ تم بہت ہی کم متذکر ہوتے ہو۔ (ولا بقول کاہن ما تذکرون)۔

حقیقت میں یہ دونوں آیات ان ناروا نسبتوں کی نفی ہیں، جو مشرکین اور مخالفین ذات پیغمبر کی طرف دیتے تھے۔ کبھی کہتے تھے کہ وہ شاعر ہے اور یہ آیات اس کے اشعار ہیں، کبھی کہتے کہ وہ کاہن ہے یہ آیات اس کی کہانت ہیں کیونکہ کاہن ایسے لوگ ہوتے تھے جو بعض اوقات جن یا شیاطین سے ارتباط بنا کر غیب کے بعض اسرار بیان کیا کرتے۔ اور خصوصیت کے ساتھ اپنے الفاظ کو سجع اور موزوں جملہ بندی کے ساتھ پیش کرتے تھے، چونکہ قرآن میں غیب کے اخبار بھی ہیں اور مخصوص نظم و ترتیب بھی ہے، لہذا وہ یہ تمتم لگاتے تھے، حالانکہ کہانت اور قرآن کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔

بعض نے ان آیات کے شان نزول میں نقل کیا ہے کہ جس شخص نے پیغمبر کی طرف شعر و شاعری کی نذر دی وہ اوجہل تھا اور کہانت کی نسبت دینے والا ”عقبہ“ یا ”عقبہ“ تھا اور دوسرے لوگ ان کی پیروی کرتے ہوئے ان تمتموں کی تکرار کرتے تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ قرآن کے الفاظ میں ہم آہنگی اور ایسی خوبصورت موزونیت ہے، جو کانوں کو بھلی لگا ہے اور روح کو سکون بخشتی ہے۔ لیکن یہ چیز نہ تو شاعروں کے شعر سے کوئی ربط رکھتی ہے اور نہ ہی کاہنوں کے سجع و قوافی سے اس کا واسطہ ہے۔

”شعر“ عام طور پر تخیلات کی پیداوار اور برافروختہ احساسات و عاطفی ہیجانات کو بیان کرنے والے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان میں شیب و فراز اور اٹھنے اور گرنے کا عمل زیادہ ہوتا ہے، جبکہ قرآن زیبائی اور جاذبیت کے باوجود، کامل طور پر استدلالی، منطقی اور عقلاتی مضامین کا حامل ہے۔ اگر بعض اوقات یہ آئندہ کی پیش گوئیاں کرتا ہے تو یہ پیش گوئیاں قرآن کی اصلیت نہیں ہیں، نیز یہ کاہنوں کی خبروں کے برخلاف سب کی سب سچی ہوتی ہیں۔

”قلیلًا ما تؤمنون“ اور ”قلیلًا ما تذکرون“ کے جملے ایسے افراد کی توبیخ و سرزنش کے لیے ہیں جو اس آسمانی وحی کو واضح نشانیوں کے ساتھ دیکھتے ہیں، لیکن کبھی اسے شعر قرار دیتے ہیں اور کبھی کہانت اور بہت کم ایمان لاتے ہیں۔

آخری زیر بحث آیت میں تاکید کے عنوان سے صراحت کے ساتھ کتا ہے: ”یہ قرآن عالمین کے پروردگار

(ما شیء صفہ سابقہ)

قلیلًا اس آیت اور اس کے بعد والی آیت میں ایک ممدون مفعول مطلق کی صفت ہے اور ما، زائد ہے تقدیر میں اس طرح ہے: (تؤمنون ایمانًا قلیلًا)

کی طرف سے نازل ہوا ہے: "تَنْزِيلٍ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ"۔
 اس بناء پر قرآن نہ شعر ہے نہ کہانت، نہ پیغمبر اسلام کے ذہن کی پیداوار اور نہ ہی جبریل کا کلام ہے، بلکہ
 وہ خدا کا کلام ہے جو بیشک وحی کے ذریعہ پیغمبر کے پاک دل پر نازل ہوا ہے، یہی تعبیر تھوڑے سے فرق کے
 ساتھ قرآن مجید میں گیارہ مقامات پر آئی ہے۔

❖ ❖ ❖

لہ تنزیل مصدر ہے، اسم مفعول کے معنی میں اور ایک محذوف بتداء کی خبر ہے، تقدیر میں اس طرح ہے
 "هو منزل من رب العالمین۔"

- ۴۳ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ۝
 ۴۴ لَا خَدْنًا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۝
 ۴۵ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۝
 ۴۶ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِرِينَ ۝
 ۴۷ وَإِنَّهُ لَتَذِكْرٌ لِّلْمُتَّقِينَ ۝
 ۴۸ وَإِنَّا لَنَعْلَمُ أَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِينَ ۝
 ۴۹ وَإِنَّهُ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِينَ ۝
 ۵۰ وَإِنَّهُ لِحَقُّ الْيَقِينِ ۝
 ۵۱ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ۝

ترجمہ

- ۴۳ اگر وہ ہم پر جھوٹ بانڈھتا
 ۴۴ تو ہم اسے پوری قدرت کے ساتھ پکڑ لیتے۔
 ۴۵ اس کے بعد ہم اس کے دل کی رگ کو کاٹ دیتے۔
 ۴۶ اور تم میں سے نہ کوئی روک سکتا نہ اس کی حمایت کرتا۔

یہ یقیناً پرہیزگاروں کے لیے ایک تذکرہ ہے۔
 اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے بعض اس کی تکذیب کرتے ہیں۔
 اور یہ کافروں کے لیے مایہ حسرت ہے۔
 اور وہ خالص یقین ہے۔
 (اب جبکہ ایسا ہے تو تم اپنے عظیم پروردگار کے نام کی تسبیح کرو۔)

تفسیر

اگر وہ ہم پر جھوٹ باندھتا تو ہم اسے مہلت نہ دیتے۔

قرآن سے مربوط مباحث کو جاری رکھتے ہوئے ان آیات میں اس کی اصالت پر ایک واضح دلیل پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اگر وہ ہم پر جھوٹ باندھتا ہے“ (ولو تقول علينا بعض الاقاویل)۔

❖ ❖ ❖
 ”تو ہم پوری قدرت کے ساتھ اس کو پکڑ لیتے“ (لاخذنا منه باليمين)۔

❖ ❖ ❖
 ”پھر ہم اس کے دل کی رگ کو کاٹ دیتے۔“ (نشؤ لقطعنا منه الوتين)۔

❖ ❖ ❖
 ”اور تم میں سے کوئی بھی اس کام میں مانع نہ ہوتا اور نہ ہی اس کی حمایت کرتا۔“ (فما منكم من احد عنده حاجزین)۔

اقاویل جمع ہے اقوال کی اور اقوال اپنی نوبت میں جمع ہے قول کی، تو اس بناء پر اقاویل جمع ہے اور یہاں اس سے مراد جھوٹی باتیں ہیں۔

”لَقَوْلٍ“ لَقَوْلٌ (بروزن تکلف) کے مادہ سے ان باتوں کے معنی میں ہے جنہیں انسان خود اپنی طرف سے گھڑے اور ان کی کوئی حقیقت نہ ہو۔

لاخذنا منه باليمين (ہم اسے دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے اور سزا دیتے۔ کیونکہ انسان بہت سے کاموں

لے ”من احد میں ”من“ زائدہ اور تاکید کے لیے ہے۔

کودائیں ہاتھ سے انجام دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں زیادہ قدرت ہوتی ہے، اس طرح "یمین" قدرت سے ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں اور احتمالات بھی دیئے ہیں، چونکہ وہ غیر مانوس اور غیر مؤثر لہذا ہم نے ان سے صرف نظر کیا ہے۔

"ویمین" "دل کی رگ" کے معنی میں ہے، یعنی شہ رگ جو تمام اعضاء میں خون پہنچاتی ہے۔ اگر وہ کٹ تو انسان کو فوراً اور ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر موت آجاتی ہے، یہ وہ سرلیح ترین سزا ہے جو کسی شخص کے میں انجام پا سکتی ہے۔

بعض نے اس کی تفسیر اس رگ سے کی جس کے ساتھ دل آویزاں ہوتا ہے یا اس رگ سے جو جگر خون پہنچاتی ہے، یا رگ شجاع جو مہروں کے ستون کے وسط میں ہوتی ہے۔ لیکن پہلی تفسیر سب سے میں آتی ہے۔

"حاجزین" حاجز کی جمع ہے جو مانع اور رکاوٹ کے معنی میں ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ اگر کوئی شخص خدا پر جھوٹ بولے اور خدا فوراً اس کو سزا دے اسے ہلاک کر دے تو پھر نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والوں کو تیزی کے ساتھ نابود ہو جانا چاہیے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، اور ان میں بہت سے سالہا سال زندہ رہے ہیں، یہاں تک کہ ان کا باطل مذہب ان کے باقی رہا ہے۔

اس سوال کا جواب ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن یہ کہتا کہ "ہر مدعی" بلکہ یہ کہتا ہے کہ اگر پیغمبر اسلام اس طرح کا کام کرے، یعنی وہ پیغمبر جسے خدا نے معجزہ دیا اور حقانیت کے دلائل نے اس کی تائید کی ہے، اگر وہ طریق حق سے منحرف ہو جائے تو ایک لمحہ کے لیے اُسے مہلت نہیں دی جائے گی، کیونکہ یہ چیز لوگوں کی گمراہی اور ضلالت کا سبب بنے گی۔

لیکن جو شخص باطل دعویٰ کرتا ہے اور کوئی معجزہ یا واضح دلیل اپنی حقانیت پر نہیں رکھتا تو کوئی ضرورت نہیں ہے کہ خدا اُسے فوراً ہلاک کرے۔ کیونکہ اس کی باتوں کا بطلان ہر اس شخص کے لیے جو حق کا طالب ہے اور روشن ہے۔ مشکل وہاں آپڑتی ہے جہاں نبوت کا مدعی دلائل و معجزات کے ہمراہ ہو اور وہ حق کی راہ سے منحرف ہو جائے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو بعض گمراہ فرقے اپنے پیشواؤں کے دعوے کے اثبات کے لیے اس

اپنے والدے جملہ میں "من" زائدہ اور تاکید کے لیے ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے۔ "لاخذناہ بالیمین"

یہ وہی چیز ہے جو علم کلام کی کتب میں جھوٹے کے ہاتھ میں معجزہ قرار دینے کے عنوان سے پیش ہوتی ہے اور اس کو قبیح قرار دیا جاتا ہے۔

آیت سے تمک کرتے ہیں وہ بالکل غلط ہے ، ورنہ میلہ کذاب جیسے افراد اور دوسرے جھوٹے مدعی بھی اس آیت سے اپنی حقانیت پر استدلال کر سکتے ہیں۔

❖ ❖ ❖

بعد والی آیت میں تاکید اور یاد آوری کے لیے فرماتا ہے : ”یہ قرآن یقینی طور پر پرہیزگاروں کے لیے ایک نصیحت ہے۔“ (وانه لتذکرة للمتقین)۔

ان کے لیے جو اپنے آپ کو گناہ سے پاک کرنے کے لیے تیار ہوں ، راہِ حق کو طے کرنے پر آمادہ ہوں ، ان کے لیے جو جستجو میں لگے رہتے ہیں ، حقیقت کے طالب ہیں ، قرآن ان کے لیے ذکر اور نصیحت ہے۔ لیکن جو لوگ تقویٰ کی یہ حد نہیں رکھتے وہ یقیناً قرآنی تعلیمات سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

اس لحاظ سے قرآن جو گمراہی ، عمیق اور حد سے زیادہ تاثیر رکھتا ہے وہ اس کی حقانیت کی ایک اور دلیل ہے۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد کہتا ہے : ”اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے ایک گروہ اس کی تکذیب کرتا ہے۔“ (وانا لنعلم ان منکم مکذبین)۔

لیکن ہٹ دھرم ٹھٹھلانے والوں کا وجود ان کے حق پر نہ ہونے کی دلیل میں رکاوٹ نہیں بن سکتا ہے ، کیونکہ پرہیزگار اور حقیقت کے طالب ہی اس سے مندرکرتے ہیں۔ وہ اس میں حق کی نشانیں دیکھتے ہیں اور راہِ خدا میں قدم رکھ دیتے ہیں۔

اس بناء پر جس طرح ایک روشن چراغ سے فائدہ اٹھانے کے لیے کم از کم یہ ضروری ہے کہ انسان اپنی آنکھ کو کھلا رکھے اسی طرح نورِ قرآن سے فائدہ اٹھانے کے لیے بھی دل کی آنکھ اس کے اوپر کھلی رکھنی چاہیے۔

❖ ❖ ❖

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے : ”اور یہ قرآن کافروں کے لیے حسرت کا باعث ہے۔“ (وانه لحسرة علی الکافرین)۔

آج یہ اس کی تکذیب کر رہے ہیں لیکن کل جو ”یوم الظہور“ اور ”یوم البروز“ ہونے کے ساتھ ساتھ ”یوم الحسرت“ بھی ہے وہ سمجھ لیں گے کہ انھوں نے ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے کتنی عظیم نعمت کو ہاتھ سے دے دیا ہے اور کیسے کیسے دردناک عذاب اپنے لیے خرید لیے ہیں ، وہ دن جس میں وہ مومنین کی بلندیاں اور پستیوں دیکھیں گے اور ان کا آپس میں موازنہ کریں گے تو حسرت کے ساتھ انگلی منہ میں داب لیں گے اور غصہ اور غصہ کی شدت سے اپنے ہاتھ دانتوں سے کاٹیں گے۔ ”ویوم یحضر الضالہ علی یدیبہ یقول یا لیتنی اتخذت مع الرسول سبیلاً۔“ اس دن کو یاد کرو جب ظالم اپنے دونوں ہاتھوں کو شدتِ حسرت سے کاٹنے کا اور کسے گا کہ اے کاش ! میں رسول کے راستے پر چلتا۔“ (فرقان - ۲۷)

اس بناء پر کہ کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ منکرین کا شک و تردید یا تکذیب، قرآن کے مفہیم کے لئے کی وجہ سے ہے، لہذا بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: ”یہ قرآن یقین خالص اور حق یقین ہے۔“ (والیقین)

بعض مفسرین کے قول کے مطابق حق یقین کی تعبیر کسی چیز کی اپنی ذات کی طرف نسبت کی قبیل سے کیونکہ ”حق“ عین یقین ہے اور یقین عین حق ہے، جیسا کہ ہم کہتے ہیں ”مسجد الجامع“ اور ”یوم الخمیس“ اور یہ اصطلاح کے مطابق اضافت بیانیہ ہے۔

لیکن بہتر ہے یہ کہا جائے کہ یہ موصوف کی صفت کی طرف اضافت کے قبیل سے ہے۔ یعنی قرآن خالص یقین ہے، یا دوسرے لفظوں میں یقین کے کئی مراحل ہوتے ہیں۔

کبھی وہ دلیل عقلی سے حاصل ہوتا ہے جیسا کہ ہم دھوئیں کو دور سے دیکھتے ہیں تو اس سے آگ کے کا یقین حاصل ہو جاتا ہے حالانکہ ہم نے آگ کو نہیں دیکھا، اس کو ”علم یقین“ کہتے ہیں۔

بعض اوقات ہم اور نزدیک جا کر آگ کے شعلوں کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیتے ہیں۔ اس سے یقین اور زیادہ محکم ہو جاتا ہے اور اس کو عین یقین کا نام دیتے ہیں۔

بعض اوقات ہم اس سے بھی زیادہ نزدیک چلے جاتے ہیں، آگ کے پاس یا آگ کے اندر داخل ہو جاتے ہیں اور اس کی سوزش کو اپنے ہاتھ سے لمس کرتے ہیں۔ یقیناً یہ یقین کا بالاتر مرحلہ ہے اور اس کو حق یقین کہتے ہیں۔

اوپر والی آیت کہتی ہے کہ قرآن یقین کے اس قسم کے مرحلہ میں ہے۔ لیکن اس کے باوجود دل کے اندر اس کا انکار کرتے ہیں۔

❖ ❖ ❖

پھر آخری زیر بحث آیت جو سورہ عاقہ کی آخری آیت ہے، اس میں فرماتا ہے: ”اب جبکہ ایسا ہے، تو اپنے عظیم پروردگار کی تسبیح کر اور اس کو ہر قسم کے عیب و نقص سے منزہ شمار کر (حسبک باسم ربک العظیم) قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت اور اس سے پہلے والی آیت کا مضمون تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ سورہ واقعہ کے آخر میں بھی آیا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ یہاں گفتگو قرآن مجید کے بارے میں ہے اور اس کی توصیف ”حق یقین“ کے ساتھ ہوئی ہے، لیکن سورہ واقعہ کے آخر میں قیامت میں نیکو کاروں کے مختلف گروہوں کے بارے میں گفتگو ہے۔

❖ ❖ ❖

ایک نکتہ

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان آیات میں قرآن کی توصیف چار صفات کے ساتھ کی گئی ہے۔
 پہلے کہتا ہے: یہ رب العلمین کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔
 اس کے بعد کہتا ہے: یہ متقین کے لیے یاد آوری اور تذکرہ ہے۔
 پھر کہتا ہے: کافروں کے لیے حسرت و ندامت کا باعث ہے۔
 اور آخری مرحلہ میں مزید کہتا ہے: یہ ”حق الیقین“ ہے۔
 ان میں سے پہلی صفت تمام لوگوں کے لیے ہے۔
 دوسری صفت پرہیزگاروں کے لیے ہے۔
 تیسری صفت کفار کے ساتھ مربوط ہے۔
 اور چوتھی صفت خاصانِ خدا اور مقربین سے مربوط ہے۔

❖ ❖ ❖

خداوندنا! تو خود جانتا ہے کہ کوئی چیز سرمایہ یقین سے برتر نہیں ہے۔ ہمیں ایسا ایمان اور یقین مرحمت
 فرما جو ”حق الیقین“ کا مصداق ہو۔
 پروردگار! قیامت کا دن یوم الحسرت ہے، ہمیں کم از کم ان لوگوں میں سے قرار دے کہ جنہیں طاعتوں
 کی کمی پر حسرت ہو، نہ کہ کثرتِ گناہ اور ترکِ طاعت پر حسرت و ندامت ہو۔
 ہاں اللہ! ہمارا نامہ اعمال ہمارے دائیں ہاتھ میں دینا اور ہمیں اپنی جنتِ عالیہ اور عیشہٴ راضیہ (پسندیدہ
 زندگی) میں داخل فرمانا۔ آمین یا رب العالمین۔

❖ ❖ ❖

سورہ حاقہ کا اختتام ۵ ذی القعدہ ۱۳۰۶ھ

تفسیر نمونہ جلد ۲۳ کا اختتام

اختتام ترجمہ

بروز اتوار بوقت ساڑھے پانچ بجے دوپہر

بتاریخ ۲۰ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۶ اگست ۱۹۸۷ء

بدست حقیرِ فقیرِ تفسیر سید صفدر حسین نجفی فرزند سید غلام سرور نقوی مرحوم

بر مکان سیٹھ نواز شعلی ۸۱، ای ماڈل ٹاؤن، لاہور

الحمد لله اولاً و آخراً وصلی الله علی محمد و آلہ و سلم

سُورَةُ مَعَارِجٍ

یہ سُورہ مکہ میں نازل ہوئی
اور
اس کی ۴۴ آیات ہیں

تاریخ شروع

۵ رزی قعدہ ۱۴۰۶ھ

سورہ

س

مفہ

الایات وال
کیکن
قرآن کے ہ
بعض مدنی سو
اس

اس
میں بیان کی ہ
بہ حال
اس سورہ میں کا
پہلا
کا تھا کہ اگر

دو
آیہ (آب
تیس

چونہ

ا

ایک

لہ الفدی

سورۃ معارج کے مطالب

مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ سورۃ معارج کی سورتوں میں سے ہے اور ”فہرست ابن ندیم“ و ”کتاب نظم الدرر“ و ”تناسق الایات والسور“ کی بنیاد پر، ابو عبد اللہ زنجانی کی ”تاریخ القرآن“ کے مطابق، یہ سورہ (۷۷) ستر ہواں سورہ ہے جو مکہ میں نازل ہوا۔ لیکن یہ چیز اس سے مانع نہیں ہے کہ اس کی بعض آیات مدینہ میں نازل ہوئی ہیں اور یہ بات سورہ معارج پر ہی منحصر نہیں ہے کیونکہ قرآن کے بہت سے سورے ایسے ہیں جو مکہ میں لیکن ان میں ایک یا کئی آیات ایسی ہیں جو مدینہ میں نازل ہوئی ہوں اور اسی طرح اس کے بعض حصہ مدنی سورتوں میں بھی آیات موجود ہیں۔

اس موضوع کے بہت سے نمونے ”علامہ امینی“ نے ”العقدیں“ میں پیش کیے ہیں۔ اس بات کی دلیل کہ اس سورہ کی ابتدائی آیات مدینہ میں نازل ہوئی ہیں، وہ بہت سی روایات ہیں جو ان شاء اللہ ان آیات کی تفسیر میں بیان کی جائیں گی۔

بہر حال کئی سورتوں کی خصوصیات، مثلاً اصول دین کے بارے میں بحث، خاص طور پر معاد اور مشرکین و مخالفین کو ڈرانے کے بارے میں اس سورہ میں کامل طور سے نمایاں ہے اور مجموعی طور سے یہ سورہ چار حصوں پر مشتمل ہے۔

پہلا حصہ: اس شخص کے لیے جلدی ہونے والے عذاب کی بات کرتا ہے جس نے پیغمبر کے بعض ارشادات کا انکار کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ اگر یہ بات حق ہے تو مجھ پر عذاب نازل فرما اور عذاب نازل ہو گیا۔ (آیہ ۳ تا ۱۳)

دوسرا حصہ: قیامت کی بہت سی خصوصیات اور اس کے مقدمات، اور اس دن کفار کے حالات کے بارے میں آیا ہے (آیہ ۱۴ تا ۱۸)۔

تیسرا حصہ: اچھے اور بُرے انسانوں کی صفات کے ان حصوں کو بیان کرتا ہے جو اسے جنتی اور دوزخی بنا دیتے ہیں۔

(آیہ ۱۹ تا ۲۲)

چوتھا حصہ: مشرکین و منکرین کو ڈرانے والی باتوں پر مشتمل ہے اور پھر دوبارہ مسرت قیامت کی طرف لوٹتا اور سورہ کو ختم کرتا ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر سے آیا ہے:

”من قرأ ”سأل سائل“ اعطاه الله ثواب الذين هم لاماناتهم وعهد هم راعون و
الذين هم على صلواتهم يحافظون“؛

”جو شخص سورہ ”سأل سائل“ کو پڑھے تو خدا سے ان لوگوں کا ثواب دے گا جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان
کی حفاظت کرتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں“

ایک اور حدیث میں امام باقرؑ سے منقول ہے :
”من اذ من قرأ آتہ بمسأل سائل“ لمریسألہ الله یوم القیامۃ عن ذنب عملہ واسکنہ
جنتہ مع محمد (ص)“؛

”جو ہمیشہ سورہ ”سأل سائل“ کو پڑھے تو خدا قیامت کے دن اس سے اس کے گناہوں کی باز پرس
نہیں کرے گا اور اس کو جنت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سکونت عطا فرمائے گا“

یہی مضمون امام صادقؑ سے نقل ہوا ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ وہ بات جو انسان کو ان سب عظیم ثوابوں کا مشمول قرار دیتی ہے، وہ ایسی تلاوت ہے جو عقیدہ و ایمان کے
ہو اور اس کے ساتھ ساتھ عمل بھی ہو، نہ یہ کہ وہ آیات اور سورہ کو تو پڑھے لیکن اس کی روح اور فکر و عمل میں کسی قسم کا انعکاس نہ ہو۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

۱۔ سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۝

۲۔ لِّلْكَافِرِیْنَ لَیْسَ لَهُ دَافِعٌ ۝

۳۔ مِّنَ اللّٰهِ ذِی الْمَعَارِجِ ۝

رحمن ورحیم خدا کے نام سے

ترجمہ

- ۱۔ ایک سوال کرنے والے نے عذاب کا سوال کیا جو واقع ہو گیا۔
- ۲۔ یہ عذاب کفار کے ساتھ مخصوص ہے اور کوئی بھی شخص اسے دفع نہیں کر سکتا۔
- ۳۔ یہ ذی المعارج خدا کی طرف سے ہے (وہ خدا جس کے فرشتے آسمانوں کی طرف چڑھتے ہیں)۔

شان نزول

بہت سے مفسرین اور محدثین نے ان آیات کی ایک شان نزول بیان کی ہے، جس کا حاصل اس طرح ہے:

”جب رسول خدا نے علیؑ کو ”غدیر خم“ کے دن خلافت پر نصب فرمایا تو ان کے بارے میں یہ ارشاد کیا من کنت مولاه فعلی مولاه“ جس جس کا میں مولیٰ و دلی ہوں، اس اس کے علی مولیٰ و دلی ہیں۔ زیادہ دیر نہ گزرنے پائی تھی کہ یہ بات سارے شہروں اور بستیوں میں پھیل گئی۔ نعمان بن حارث فہری، پیغمبرؐ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ آپ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم یہ گواہی دیں کہ خدا واحد و یگانہ ہے اور آپ اس کے بھیجے ہوئے رسول ہیں تو ہم نے گواہی دی۔ اس کے بعد آپ نے ہمیں جہاد، حج، روزہ، نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہم نے ان سب کو قبول کر لیا لیکن آپ ان سب چیزوں پر راضی نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ اس جوان کو (علیؑ کی طرف اشارہ کیا) اپنی جانشینی اور خلافت پر نصب فرمایا اور یہ کہا کہ ”من کنت مولاه فعلی مولاه“ کیا یہ بات خود آپ نے اپنی طرف سے کہی ہے یا یہ خدا کی جانب سے ہے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا: قسم ہے اس خدا کی جس کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے یہ بات خدا کی طرف سے ہے۔“

نعمان نے منہ پھیر لیا اور یہ کہتا جاتا تھا:

اللهم ان كان هذا هو الحق من عندك فامطر علينا حجارة من السماء:

خداوند! اگر یہ بات حق ہے اور تیری طرف سے ہے تو آسمان سے ہم پر پتھر برسائے

اسی وقت ایک پتھر آسمان سے اس کے سر پر گرا اور اسے مار ڈالا، اسی موقع پر آیہ سائل سائل بعد اب واقع للکافرین لیس لہ دافع نازل ہوئی۔

ہم نے جو کچھ اوپر بیان کیا ہے، یہ اس عبارت کا خلاصہ ہے جو مجمع البیان میں "الواقف اسم سکنی" سے اس کے سلسلہ سند کے ساتھ "امام صادق" سے نقل ہوئی ہے۔

اس مضمون کو اہل سنت کے بہت سے مفسرین اور روایان حدیث نے بھی مختصر فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔

مرحوم "علامہ امینی" نے "الغدير" میں اسے اہل سنت کے تین مشہور علماء سے نقل کیا ہے (حوالہ اور اصل عبارت کے ساتھ) منجملہ ان کے:

..... تفسیر "غریب القرآن" - حافظ ابو عبیدہ مردی -

..... تفسیر "شفاء الصدور" - ابو بکر نقاش موصلی -

..... تفسیر "الکشف والبيان" - ابواسحاق ثعالبی -

..... تفسیر "ابو بکر یحییٰ" - القریطی -

..... تذکرہ "ابواسحاق" - ثعلبی -

..... کتاب "فرائد السمطين" - صموئیلی -

..... کتاب "درر السمطين" - شیخ محمد زندی -

..... تفسیر "سراج المنیر" - شمس الدین شافعی -

..... کتاب "سیرہ حلبیہ" -

..... کتاب "نور البصار" - سید مومن شبلنجی -

..... کتاب "شرح جامع الصغیر سیوطی" - شمس الدین شافعی - وغیرہ

ان کتابوں میں سے بہت سی میں یہ تصریح ہوئی ہے کہ اوپر والی آیات اس سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں، البتہ اس سلسلہ میں کہ یہ شخص "حارث بن نعمان" تھا یا "جابر بن نذر" یا "نعمان بن حارث فہری" اختلاف ہے، اور ہم یہ جانتے ہیں کہ اس بات کا اصل مطلب پر کوئی مختلف اثر نہیں پڑتا۔

البتہ بعض مفسرین و محدثین جو علی کے فضائل کو خوشی سے قبول نہیں کرتے، انھوں نے اس شانِ نزول پر مختلف اعتراضات کیے ہیں جن کی طرف انشاء اللہ بحث کے آخر میں اشارہ ہوگا۔

تفسیر فوری عذاب

سورہ معارج یہاں سے شروع ہوتی ہے: ”ایک سوال کرنے والے نے عذاب کا تقاضا کیا جو واقع ہو گیا (سائل سائل بعد عذاب واقع)۔“

یہ سوال کرنے والا جیسا کہ ہم نے شانِ نزول میں بیان کیا ہے ”نعمان بن حارث“ یا ”نضر بن حارث“ جو علی کے ”غدير خم“ کے مقام پر خلافت و ولایت پر منصوب ہونے، اور اس خبر کے تمام شہروں میں منتشر ہونے پر بہت غصہ میں بھرا ہوا تھا، پیغمبر کی خدمت میں آیا اور کہا: کیا یہ بات آپ نے اپنی طرف سے کہی ہے یا یہ خدا کی طرف سے ہے؟ پیغمبر نے صراحت کے ساتھ فرمایا: یہ بات خدا کی طرف سے ہے تو وہ اس سے اور بھی زیادہ پریشان ہو گیا اور اس نے کہا: خداوند! اگر یہ بات حق ہے اور تیری طرف سے ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر نازل فرما، اسی وقت ایک پتھر گرا اور اس کے سر پر لگا اور اسے مار ڈالا۔

اس تفسیر کے مقابل میں ایک اور تفسیر بھی ہے۔ اس تفسیر کے مطابق مراد یہ ہے کہ کسی شخص نے پیغمبر سے سوال کیا کہ یہ عذاب جو آپ کتے میں کس پر واقع ہوگا تو بعد والی آیت جواب دیتی ہے کہ کافروں کے لیے ہوگا۔

اور تیسری تفسیر کے مطابق یہ سوال کرنے والے خود پیغمبر میں جنھوں نے کفار کے لیے عذاب کا تقاضا کیا اور وہ نازل ہوا۔ لیکن پہلی تفسیر علاوہ اس کے کہ خود آیت کے ساتھ سازگار ہے، ان مقدروایات پر منطبق بھی ہے جو شانِ نزول میں وارد ہوئی ہیں۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”یہ عذاب کافروں کے لیے مخصوص ہے اور کوئی بھی اسے نہیں روک سکتا“ (للكافرين ليس له دافع)۔

بعد والی آیت میں اس ذات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جس کی طرف سے یہ عذاب ہے، کہتا ہے: ”یہ عذاب اس خدا کی طرف“

لہٰذا اس تفسیر کے مطابق ”بعذاب واقع“ میں ”باء“ زائد اور تاکید کے لیے ہے اور بعض کے نظر پر کے مطابق ”عسن“ کے معنی میں ہے اور یہ دوسری تفسیر کے مطابق ہے (اس پر تو خبر ہے کہ اگر سوال، تقاضا اور درخواست کے معنی میں ہو تو پھر وہ مفعولوں کی طرف متوجہ ہوگا اور اگر ”استنخبار“ کے معنی میں ہو تو پھر اس کا دوسرا مفعول یقیناً ”عسن“ کے ساتھ ہوگا)

لہٰذا ”واقع“ عذاب کی صفت ہے اور ”للكافرين“ دوسری صفت ہے اور ”ليس له دافع“ تیسری صفت ہے یا احتمال بھی دیا گیا ہے کہ ”للكافرين“ ”عذاب“ سے متعلق ہو اور اگر ”لام“ ”علی“ کے معنی میں ہو تو پھر ”واقع“ سے متعلق ہوگا۔

سے ہے، جو ان آسمانوں کا مالک ہے جن کی طرف فرشتے صعود کرتے ہیں (من اللہ ذی المعارج)۔

”معارض“ ”معراج“ کی جمع ہے، جو سیڑھی یا اس جگہ کے معنی میں ہے جہاں سے صعود کرتے اور اُپر جاتے ہیں اور چونکہ خدا کے فرشتوں کے لیے مختلف مقامات قرار دیئے ہیں کہ وہ مراتب کے لحاظ سے قرب خدا کی طرف پیش رفت کرتے ہیں، لہذا خدا کی ”ذی المعارج“ کے ساتھ توصیف کی گئی ہے۔

ان فرشتے ہی کافروں اور مجرموں کے عذاب پر مامور ہوتے ہیں اور وہ بھی فرشتے ہی تھے جو ابراہیم خلیل پر نازل ہوئے تھے اور انھیں یہ خبر دی تھی کہ ہم قوم لوط کی بربادی پر مامور ہوئے ہیں اور صبح کے وقت انھوں نے اس آلودہ جرائم قوم کے شہروں کو تہ و بالا کر دیا لیکن وہی فرشتے دوسرے مجرموں پر عذاب نازل کرنے کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔

بعض مفسرین نے ”معارج“ کی فضائل و مواہب الہیہ کے معنی میں اور بعض نے ”فرشتوں“ کے بارے میں تفسیر کی ہے لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب اور اس لفظ کے لغوی معنی کے ساتھ زیادہ سازگار ہے،

ایک نکتہ

بہانہ تراشوں کے بے ہودہ اعتراضات

عام طور پر وہ موارد، جن میں آیات و روایات، امیر المؤمنین علیؑ کے مخصوص فضائل کی طرف اشارہ کرتی ہیں، ان میں بعض لوگ اتنا اصرار کرتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے مطلب کو اہمیت نہ دی جائے، یا تو اسے نظر انداز کر دیا جائے یا اس کی کوئی انحرافی توجیہ کر دی جائے اور ایک خاص دوسرے اور باریکی کے ساتھ مسئلہ کو بیان کیا جائے، حالانکہ اگر یہ فضائل دوسرے لوگوں کے ہوتے تو دریا دلی اور سہولت کے ساتھ انھیں قبول کرتے۔

اس بات کا زندہ ثبوت اور واضح نمونہ وہ سات اعتراضات ہیں جو ”ابن تیمیہ“ نے ”کتاب منہاج السنہ“ میں ان احادیث کے بارے میں کیے ہیں جو اوپر والی آیات کے شان نزول میں آئی ہیں، جنھیں ہم اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

۱۔ غدیر کا واقعہ، پیغمبر کے حجۃ الوداع سے لوٹنے کے بعد یعنی سن دس ہجری میں واقع ہوا جبکہ سورۃ معارج کی سورتوں میں سے ہے جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہیں۔

جواب: جیسا کہ ہم پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں بہت سے سورے ایسے ہیں جو مکی کے نام سے موسوم ہیں جبکہ ان کی بعض ابتدائی آیات مفسرین کی تصریح کے مطابق مدینہ میں نازل ہوئی ہیں اور اس کے برعکس کچھ سورتیں ایسی ہیں جو مدنی کے نام سے موسوم ہیں لیکن ان کی بعض آیات مکہ میں نازل ہوئی ہیں۔

۲۔ اس حدیث میں آیا ہے کہ ”حارث بن نعمان“ پیغمبر کی خدمت میں ”ابطح“ میں پہنچا اور ہم جانتے ہیں کہ ”ابطح“

زمین ایک درہ ہے اور یہ امر واقعہ غدیر کے بعد آیت کے نزول کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔
جواب :- اولاً: ”ابطح“ کی تعبیر صرف بعض روایات میں ہے نہ کہ سب میں، ثانیاً: ”ابطح“ و ”بطحاء“ ہر اس رگیزار زمین کے معنی میں ہے جس میں سیلاب کا پانی بہتا ہو اور اتفاقاً مدینہ کی سرزمین میں ایسے علاقے موجود ہیں جنہیں ”ابطح“ یا ”بطحاء“ کہا جاتا ہے اور شارح عرب اور روایات میں ان کی طرف بہت زیادہ اشارہ ہوا ہے۔

۲- آیت (و اذ قالوا اللهم ان كان هذا هو الحق من عندك فامطر علينا حجارة من السماء) (انفال — ۲۲) ستم طور پر جنگ بدر کے بعد نازل ہوئی اور یہ واقعہ غدیر سے کئی سال پہلے ہے۔
جواب: کسی نے یہ نہیں کہا ہے کہ مذکورہ آیت کا شان نزول واقعہ غدیر ہے، بلکہ بحث آیت رسال سائل بعد اب واقع) کے بارے میں ہے۔

لیکن سورۃ انفال کی آیت ۲۲ ایک ایسی چیز ہے جس سے حارث بن نعمان نے اپنے کلام میں استفادہ کیا ہے اور اس بات کا شان نزول کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے، لیکن افراطی تعصبات کے سبب سے، انسان ایسے واضح مطلب سے غافل ہو جاتا ہے۔

۴- قرآن مجید کہتا ہے: و ما كان الله ليعذبهم وانت فيهم و ما كان الله معذبهم و هم يستغفرون۔ خدا انہیں عذاب نہیں کرے گا جبکہ تم ان میں موجود ہو اور خدا انہیں عذاب نہیں کرے گا۔ درآنحالیکہ وہ استفادہ کرتے ہوں۔ (انفال — ۲۲)۔ یہ آیت کہتی ہے کہ: پیغمبر کی موجودگی میں ہرگز کوئی عذاب نازل نہیں ہوگا۔

جواب: وہ بات جو قابل قبول ہے، یہ ہے کہ پیغمبر کے ہوتے ہوئے عمومی اور سب لوگوں کے لیے عذاب نہیں تھا۔ لیکن خصوصی اور شخصی عذاب بار بار بعض لوگوں پر نازل ہوئے، جیسا کہ تاریخ اسلام گواہ ہے کہ کئی افراد مثلاً ”ابوزمعه“ و ”مالک بن طلحہ“ و ”حکم بن ابی العاص“ وغیرہ پیغمبر کی نفرین سے یا اس کے بغیر عذاب میں گرفتار ہوئے۔

ملاوہ ازیں اوپر والی آیت کی اور تفاسیر بھی ہیں، جن کے مطابق اس مقام پر اس آیت سے استدلال ممکن نہیں ہے (تفسیر نمونہ جلد ۱ ص ۱۵۴ میں اسی آیت ۲۲ انفال کے ذیل میں رجوع کیا جائے)۔

۵- اگر اس قسم کا شان نزول صحیح ہوتا تو اصحاب فیل کی داستان کی طرح مشہور ہوتا۔
جواب :- یہ شان نزول بقدر کافی مشہور و معروف ہے اور ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ کم از کم تیس کتب تفسیر و حدیث میں آیا ہے اور پھر تعقب کی بات یہ ہے کہ ہم یہ توقع رکھیں کہ ایک شخصی واقعہ، اصحاب فیل جیسے عمومی واقعہ کی طرح مشہور ہو، کیونکہ وہ داستان ایک عمومی پہلو رکھتی تھی سارا مکہ اس کی لپیٹ میں تھا اور ایک بہت بڑا لشکر اس کے اندر ناپود ہوا تھا۔ لیکن ”حارث بن نعمان“ کا واقعہ صرف ایک ہی شخص کے ساتھ مربوط تھا۔

۶- اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ”حارث بن نعمان“ کو صہبانی اسلام قبول تھے، تو کسی سلمان کا عصر پیغمبر میں، اس قسم کے عذاب میں گرفتار ہو جانا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

جواب :- یہ اعتراض بھی شدید تعصب کی پیداوار ہے کیونکہ اوپر والی احادیث اچھی طرح سے بتاتی ہیں کہ وہ نہ صرف پیغمبر کے ارشاد کو قبول نہیں کرتا تھا بلکہ خدا پر بھی معتزض تھا کہ اس نے اس قسم کا حکم علی کے بارے میں کیوں دیا، اور یہ کفر و ارتداد کا شدید ترین مرتبہ

شمار ہوتا ہے۔

۷۔ ”استیعاب“ جیسی مشہور کتاب، جن میں ”صحابہ“ کے نام آئے ہیں ”حارث بن نعمان“ کا نام نہیں ہے۔

جواب: اس کتاب میں یا اسی جیسی دوسری کتابوں میں صحابہ کے جتنے نام آئے ہیں وہ صحابہ کے صرف ایک حصہ کی تعداد کو ظاہر

ہیں۔ مثلاً کتاب ”اسد الغابہ“ میں جو ایک اہم ترین کتاب ہے جس نے اصحابِ پیغمبرؐ کو شمار کیا ہے صرف سات ہزار پانچ سو پچاس

افراد کے نام آئے ہیں۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ صرف حجۃ الوداع میں ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ افراد بارگاہِ پیغمبرؐ میں حاضر تھے۔ اس بنا

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بہت سے اصحابِ پیغمبرؐ کے نام ان کتب میں نہیں آئے ہیں۔

ترجمہ

۴۔ فرشتے

کریں۔

۵۔ اس

۶۔ کیونکہ وہ تو

۷۔ اور ہم

۸۔

۹۔

۱۰۔

۱۱۔

۱۲۔

۱۳۔

۱۴۔

۱۵۔

۱۶۔

۱۷۔

۱۸۔

۱۹۔

۲۰۔

۲۱۔

۱۵۔ اوپر والے جوابات کے سلسلے میں، اور ہر ایک کے تاریخی یا روایتی شواہد کے بارے میں کتاب ”تفسیر“ الغزیریہ کی جلد ۱ ص ۲۲۷

تا ۲۶۶ کا مطالعہ فرمائیں۔

۱۶۔

۱۷۔

۱۸۔

۱۹۔

۲۰۔

۲۱۔

۲۲۔

۴۔ تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ
أَلْفَ سَنَةٍ ۝

۵۔ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا ۝

۶۔ إِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا ۝

۷۔ وَنَرَاهُ قَرِيبًا ۝

ترجمہ

۴۔ فرشتے اور روح (مخصوص فرشتے) اس دن جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی۔ اس کی طرف عروج کریں گے۔

۵۔ اس بناء پر صبر جمیل اختیار کر۔

۶۔ کیونکہ وہ تو اس دن کو دور سمجھتے ہیں۔

۷۔ اور ہم اسے نزدیک سمجھتے ہیں۔

تفسیر

پچاس ہزار سال کے برابر دن

ایک شخص کے دنیاوی عذاب کے واقعہ کو بیان کرنے کے بعد۔ جس نے عذاب الہی کا تقاضا کیا تھا۔ معاذ اور مجرموں کے اس دن کے انخوری عذابوں کے مباحث کا بیان شروع کرتا ہے، پہلے فرماتا ہے: وہ فرشتے اور روح، اس دن جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی، اس (خدا) کی طرف عروج کریں گے (تعرج الملائكة والروح اليه في يوم كان مقداره خمسين الف سنة)۔

مسمیٰ طور سے "فرشتوں کے عروج" سے مراد جہانی عروج نہیں ہے بلکہ اس سے مراد روحانی عروج ہے، یعنی وہ خدا کے مقام قرب کی طرف بڑھیں گے، اور اس دن، جو قیامت کا دن ہے، فرمان خداوندی کو حاصل کرنے اور اس کے اجراء کے لیے آمادہ ہوں گے۔ جیسا کہ ہم نے سورہ "حاقہ" کی آیت، اکی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ "والمملك على ارجائها" (فرشتے آسمان کے اطراف میں قرار پائیں گے) کے جملے سے مراد یہ ہے کہ اس دن وہ آسمانوں کے گرداگرد کھڑے ہوں گے اور ہر قسم کے فرمان کو انجام دینے کے لیے

آمادہ ہوں گے یہ

”روح“ سے مراد وہی ”روح الامین“ ہے جو سب فرشتوں سے بزرگ ہے اور جس کی طرف سورہ ”قدر“ میں بھی اشارہ ہوا ہے، جہاں کہتا ہے: تَنْزِلُ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوحِ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ مَرٍ: ”شب قدر میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے حکم سے امور کی تقدیر کے لیے نازل ہوتے ہیں“ (قدر — ۴) البتہ ”روح“ کے مختلف معانی ہیں اور ممکن ہے کہ وہ ہر موقع پر موجود قرآن کی مناسبت سے ایک خاص مفہوم دے۔ روح انسان روح بمعنی قرآن، روح بمعنی روح القدس اور روح بمعنی فرشتہ دہی، یہ سب روح کے معانی ہیں۔ جن کی طرف قرآن کی دوسری آیات میں اشارہ ہوا ہے یہ

اب رہی پچاس ہزار سال کی تعبیر تو وہ اس لحاظ سے ہے کہ زیر بحث دن دنیا کے سالوں کے حساب سے اتنا طولانی ہوگا اور یہ بات اس چیز سے کہ جو سورہ سجہ کی آیت ۱۵ میں آئی ہے کہ اس کی مقدار ایک ہزار سال ہے، اختلاف نہیں رکھتی، کیونکہ جیسا کہ روایات میں وارد ہوا ہے — قیامت میں پچاس موقوف ہوں گے اور ہر موقوف ایک ہزار سال کی مقدار کے برابر ہوگا۔ بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ ”پچاس ہزار سال“ کا عدد تکثیر کے لیے ہے نہ کہ تعدد کے لیے، یعنی وہ دن بہت طولانی ہوگا بہر حال یہ مجرموں، ظالموں اور کافروں کے لیے ہوگا، اسی لیے ایک حدیث میں ”ابوسعید خدری“ سے آیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد کسی نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! وہ دن کتنا طولانی ہوگا؟۔ آپ نے فرمایا:

والذی نفس محمد بیدہ انه لیخف علی المؤمن حتی یکون اخف علیہ
من صلاة مکتوبۃ یصلیہا فی الدنیا

”اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمد کی جان ہے وہ دن مومن کے لیے بہت ہی ہلکا اور آسان ہوگا، یہاں تک کہ وہ ایک واجب نماز سے بھی زیادہ آسان ہوگا، جو وہ دنیا میں پڑھا کرتا تھا“۔

بعد والی آیت میں پیغمبر اکرم کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”صبر جمیل اختیار کر اور ان کے استنزاء، تکذیب اور آزار کے مقابل میں صبر سے کام لے (فاصبر صبراً جمیلاً)۔“

۱۰ ”فرشتوں کے عروج“ کی اور بھی تفاسیر بیان کی گئی ہیں جن میں سے کوئی بھی مناسب نظر نہیں آتی۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس سے مراد فرشتوں کے نزول و صعود کا زمانہ ہے جو آغاز دنیا سے لے کر اس کے اختتام تک ہے اور وہ مجموعی طور پر پچاس ہزار سال ہے، جو دنیا کی تمام عمر ہے لیکن بعد والی آیات اچھی طرح بتاتی ہیں کہ گفتگو قیامت کے دن کے بارے میں ہے نہ کہ دنیا کے متعلق (غور کیجئے)۔

۱۱ تفسیر منہ جلد ۱۲ ص ۲۵۰ تا ۲۵۲ کی طرف رجوع کریں۔

۱۲ یہ حدیث امامی شیخ میں امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے۔ بمطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۱۲

۱۳ ”مجمع البیان“ جلد ۱ ص ۲۵۲، اور ”قرطبی“ جلد ۱ ص ۶۷۱

”صبر جمیل“ کا معنی خوبصورت اور قابلِ توجہ صبر و شکیبائی ہے اور وہ وہی صبر و استقامت ہے جس میں دوام و استمرار ہو، جس میں دنا امید نہ ہو، اور وہ بے تابی، جزع و فزع و شکوہ اور آہ و نالہ سے توأم نہ ہو، اس صورت کے علاوہ وہ جمیل نہیں ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”کیونکہ وہ اس قسم کے دن کو لعید اور دور سمجھتے ہیں (انہم یرونہ بعیداً)۔“

اور ہم اسے قریب اور نزدیک سمجھتے ہیں (ونہ راہ قریباً)۔

وہ بالکل باور ہی نہیں کرتے کہ اس قسم کا دن بھی ہوگا جس میں تمام مخلوق کا حساب لیا جائے گا اور ان کی چھوٹی سے چھوٹی گفتار و رفتار کا بھی عالم ہوگا۔ وہ بھی ایسے دن میں جو پچاس ہزار سال طولانی ہوگا لیکن حقیقت میں ایسے لوگوں نے خدا کو پہچانا نہیں اور وہ اس کی قدرت میں شک اور زور رکھتے ہیں۔

وہ یہ کہتے ہیں: کیا یہ ممکن ہے کہ بوسیدہ بڑیاں اور وہ مٹی جس کا ہرزہ مختلف گوشوں میں پراگندہ ہو جائے گا، دوبارہ جمع ہو کر زندگی کا لباس زیب تن کر لیں گی۔ (جیسا کہ قرآن نے اپنی آیات میں یہ تعبیریں ان سے نقل کی ہیں)۔ اس کے علاوہ کیا پچاس ہزار سال کا دن ممکن ہے!؟

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کا علم یہ کہتا ہے کہ آسمانی کرات میں، دن کی مقدار ہر گزہ کی دوسرے گزہ سے مختلف ہے، کیونکہ وہ اس زمانہ کی مقدار کے تابع ہوتی ہے، جس میں وہ گزہ اپنے محور کے گرد ایک مرتبہ چکر لگاتا ہے، اسی لیے چاند کے گزہ کا دن زمین کے دو ہفتوں کے برابر ہے، یہاں تک کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ زمین زمانہ کے گزرنے کے ساتھ اپنی وضعی حرکت کی سرعت اور تیزی میں کمی کر دے اور اس کے ایک دن کی مقدار ایک ماہ یا ایک سال یا کئی سو سال کے برابر ہو جائے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ قیامت کا دن اس طرح ہوگا، بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ پچاس ہزار سال کے برابر دن، اس دنیا کے اندازوں کے ساتھ بھی کوئی عجیب و غریب چیز نہیں ہے۔

لہ ”صبر جمیل“ کے سلسلے میں ہم نے تفسیر نمونہ (جلد ۵) میں یعقوب دہلوی کی داستان میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

۸- یَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْمُهْلِ ۝

۹- وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۝

۱۰- وَلَا يَسْأَلُ حَمِيمٌ حَمِيماً ۝

۱۱- يَبْصُرُونَ لَهُمُ يَوْمَ الْمُجْرِمِ كَوْفِتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِ
بَيْنِيهِ ۝

۱۲- وَصَاحِبَتُهُ وَأَخِيهِ ۝

۱۳- وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤَيَّبُ ۝

۱۴- وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنْجِيهِ ۝

۱۵- كَلَّا إِنَّهَا لَأُظَى ۝

۱۶- نَزَّاعَةً لِّلشَّوَى ۝

۱۷- تَدْعُوا مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّى ۝

۱۸- وَجَمَعَ فَأَوْعَى ۝

ترجمہ

۸- اس دن آسمان کھلی ہوئی دھات کی طرح ہو جائے گا۔

۹- اور پہاڑ رنگین بھری ہوئی املن کی طرح ہو جائیں گے۔

۱۰- اور کوئی مخلص دوست اپنے دوست کی خبر گیری نہیں کرے گا۔

۱۱- وہ انہیں دکھائے جائیں گے (لیکن ہر شخص اپنے کام میں گرفتار ہوگا) گنہ گار چاہے گا کہ اس دن کے عذاب کے
بدلے میں اپنی اولاد کو فدا کر دے۔

۱
۱۱
۱۲
۱۳
۱۴
۱۵
۱۶
۱۷
۱۸
ان آایا
اس
اور پہاڑ
"مہ"
ان کی تہ میں
"عہ"
ہاں! ا
پھر تیز آنکھی سے
ہوتے ہیں، اس
سے سے جا
سے "یوم
ہو یا ایک

اور اپنی بیوی اور اپنے بھائی (کو بھی)
اور اپنے اس قبیلہ کو بھی جو ہمیشہ اس کی حمایت کرتا تھا۔
اور روئے زمین کے تمام لوگوں کو بھی، تاکہ وہ اس کی نجات کا سبب بن جائے۔
لیکن ہرگز ایسا نہیں ہوگا، آگ کے جلانے والے شعلے ہوں گے۔
جو ہاتھ پاؤں اور سر کے چمڑے کو اکھاڑ کر لے جائیں گے۔
اور وہ ان لوگوں کو، جنہوں نے حکم خدا کی طرف سے روگردانی کی تھی، پکاریں گے؛
اور انہیں بھی کہ جنہوں نے مال کو جمع کیا اور ذخیرہ کیا

تیسرا وہ دن کہ جس میں کوئی مخلص دوست اپنے دوست کی خبر گیری نہیں کریگا

ان آیات میں، قیامت کے بارے میں، گزشتہ بحث کو، مزید تشریح و توضیح کے ساتھ جاری رکھا گیا ہے، فرماتا ہے:
”اس دن آسمان پگھلی ہوئی دھات کے مانند ہو جائے گا (یوم تکون السماء کالمہل)۔“

اور پہاڑ دھکی ہوئی رنگین اون کے مانند ہو جائیں گے (وتکون الجبال کالعہن)۔
”مہل“ (بروزن قفل) پگھلی ہوئی دھات کے معنی میں ہے اور کبھی ایک خاص قسم کی لچھٹ کے معنی میں ہوتا ہے جو دیتوں کے
نکل کی تہ میں بیٹھ جاتا ہے اور یہاں وہی پہلا معنی ہی مناسب ہے، اگرچہ تشبیہ کے اعتبار سے آپس میں کوئی خاص فرق نہیں رکھتے۔
”عہن“ دھکی ہوئی رنگین اون کے معنی میں ہے۔

ہاں! اس دن آسمان ایک دوسرے سے جدا ہو کر پگھل جائیں گے اور پہاڑ ایک دوسرے سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور
پھر تیز آدھی سے فضائیں کچھ جائیں گے، اس اون کی طرح جسے تیز ہوا اپنے ساتھ اڑا کر لے جاتی ہے، اور چونکہ پہاڑوں کے مختلف رنگ
ہوتے ہیں، اس لیے انہیں رنگین اون سے تشبیہ دی گئی ہے اور اس ویرانی کے بعد، ایک نیا عالم ایجاد ہوگا اور انسان اپنی حیات نو کو نئے
سرے سے حاصل کرے گا۔

۱۲ ”یوم“ کے محل اعراب میں کئی احتمال دیکھ گئے ہیں لیکن ان میں سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ ”قریباً“ سے جو گزشتہ آیت میں آیا ہے بدل
ہو یا ایک فعل منصرف سے متعلق ہو، مثلاً ”اذکر“

جب اس جہانِ نو میں قیامت برپا ہوگی تو اس طرح سے حساب و کتاب اور اعمال کی جانچ پڑتال کی کیفیت وحشت ناک ہر شخص کو اپنی ہی فکر ہوگی، کوئی دوسرے کی خبر نہیں لے گا اور کوئی گمراہ اور مخلص دوست اپنے دوست کا حال نہیں پوچھے گا (ولاد حمیم حمیمًا)۔

سب کے سب اپنے کام میں مشغول ہوں گے، ہر ایک کو اپنی ہی نجات کی فکر ہوگی، جیسا کہ سورہ عبس کی آیت ۲۶ میں آیا (لکل امریٰ منہم یومئذ شأن یغنیہ) اس دن ان میں سے ہر ایک اس طرح گرفتار ہوگا کہ اسے صرف اپنی ہی فکر ہوگی۔

ایسا نہیں ہوگا کہ دوست و مل پر دوستوں کو پہچانیں گے نہیں بلکہ خصوصیت کے ساتھ "ان کے دوست انہیں دکھائے جائیں" لیکن اس کے باوجود ہر شخص اپنی ہی مصیبت میں مبتلا ہوگا " (یبصر و نہم) مسئلہ یہ ہے کہ ہول و وحشت اس سے کہیں زیادہ ہوگی کہ کوئی دوسرے کی فکر کر سکے۔ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے اور اس وحشت ناک منظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: حالت یہ ہوگی کہ مجرم و گنہگار گاکہ اپنی اولاد کو اس دن کے عذاب کے بدلے میں فدا کر دے (یؤد المجرم لو یفتدی من عذاب ربہ ببنیہ)۔

دو صرف اپنی اولاد کو، بلکہ وہ یہ چاہے گا کہ "اپنی بیوی کو بھی اور اپنے بھائی کو بھی فدا کرے" (وصاحبته و انھیہ)

اور اسی بنا پر اس خاندان اور قبیلہ کو بھی جو اس سے تعلق رکھتا تھا اور اس کی حمایت کیا کرتا تھا (وفصیلتہ التی تصویہ)

بلکہ تمام لوگوں کو جو روئے زمین میں ہیں، سب کو فدا کر دے تاکہ اس کی نجات ہو جائے (ومن فی الارض جمیعاً)

۱۷ "حمیم" جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، اصل میں گرم اور جلانے والے پانی کے معنی میں ہے، اس کے بعد یہ لفظ گرم جوشی دکھانے والے مخلص اور دلی دوستوں پر بھی بولا جائے گا۔

۱۸ اور پر والی آیت کے لیے اور دوسری تفسیر بھی بیان کی گئی ہیں، منجدان کے یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے حالات کے متعلق سوال نہیں کرے گا، کیونکہ سب کی وضع و کیفیت ان کے چہرے سے عیاں ہوگی (وآنجا کہ عیاں است چہ حاجت بہ بیان است)؛ دوسری یہ کہ کوئی شخص دوسرے سے یہ نہیں کہے گا کہ وہ اس کے اعمال کی ذمہ داری اٹھائے، کیونکہ یہ بات ممکن ہی نہیں ہے، لیکن صحیح دہی اور پر والی تفسیر ہے۔

۱۹ باوجود اس کے کہ "حمیم" دونوں مرحلوں میں مفرد کی صورت میں ہے، لیکن "یبصر و نہم" میں دونوں ضمیر جمع کی صورت میں آئی ہیں، کیونکہ وہ جنس کے معنی میں ہے۔

شعرینجیہ۔

ہاں! اس دن خدا کا عذاب اتنا ہونگا کہ انسان یہ چاہے گا کہ وہ اپنے عزیز ترین رشتہ داروں کو — جن کا یہاں چار گروہوں (اولاد، بیویاں، بھائی اور قریبی رشتہ دار جو اس کے یار و مددگار تھے) میں خلاصہ کیا گیا ہے — اپنی نجات کے لیے قربان کر دے، نہ صرف انہیں کو، بلکہ وہ تو اس بات کے لیے بھی تیار ہوگا کہ روئے زمین کے تمام انسان اس کی عذاب سے رہائی کے لیے قربان ہو جائیں۔!

”یود“ ”د“ کے مادہ سے (جو حب کے وزن پر ہے)۔ ”تمتی“ سے توأم ”دوست رکھنے“ کے معنی میں ہے اور بقول ”راغب“ ان دونوں معانی میں سے ہر ایک کے لیے (بلکہ دونوں معانی میں) بھی استعمال ہوتا ہے۔

”یفتدی“ ”فداء“ کے مادہ سے، کوئی چیز دے کر اپنے آپ کو مصائب و مشکلات سے محفوظ کرنے کے معنی میں ہے۔

”فصیلة“ بر معنی ”عشیرہ“ اس خاندان اور قبیلہ کو کہتے ہیں جس سے انسان منقصل اور جدا ہوا ہو۔

”تثویہ“ ”ایواء“ کے مادہ سے، ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ضم کرنے کے معنی میں ہے، اس کے بعد پناہ دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

بہت سے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ ”شعرینجیہ“ کے جملہ میں ”شعر“ کی تعبیر یہ بتاتی ہے کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ ان فدیوں اور قربانیوں کا اثر کرنا بہت بعید ہے (کیونکہ ”شعر“ عام طور پر، بعد، فاصلہ اور تراخی کے لیے آتا ہے)۔

لیکن ان تمام تمانوں اور آرزوؤں کے مقلدہ میں فرماتا ہے: ”ہرگز ایسا نہیں ہوگا“ کوئی فدیہ اور قربانی قبول نہیں کی جائے گی۔ (کلا)۔ ”وہ تو آگ کے جلانے والے شعلے ہیں“ (انہما لظلی)۔

ہمیشہ اس کے شعلے بھڑکتے رہتے ہیں اور جو چیز بھی اس کے پاس یا اس کی راہ میں آتی ہے اسے جلا دیتی ہے۔ ”ماٹھ، پاؤں اور سر کے چمڑے کو اکھاڑ کر اپنے ماٹھ لے جاتی ہے“ (نزاعۃ للشوی)۔

”ظلی“ آگ کے خالص شعلہ کے معنی میں ہے اور جہنم کے ناموں میں سے ایک نام بھی ہے، اور اوپر والی آیات میں دونوں معنی ممکن ہیں۔

”نزاعۃ“ اس چیز کے معنی میں ہے جو پے در پے جدا کرتی ہے۔

اور ”شوی“ ماٹھ، پاؤں اور اطراف بدن کے معنی میں ہے اور بعض اوقات بریاں کرنے اور بھوننے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ لیکن یہاں وہی پہلا معنی مراد ہے، کیونکہ جس وقت جلانے والی اور شعلہ در آگ کسی چیز کو لگتی ہے تو پہلے اس کے اطراف جو اناج اور شاخ و برگ کو جلاتی ہے اور اس سے جدا کرتی ہے۔

بعض مفسرین نے یہاں ”شوی“ کی بدن کی جلد کے معنی میں، اور بعض نے سر کی جلد کے معنی میں، بعض نے پتھر کی گوشت کے معنی میں تفسیر کی ہے، اور یہ سب معانی، اس وسیع مفہوم میں جو ہم نے بیان کیا ہے، جمع ہیں اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اس ساری مصیبت اور تکلیف کے باوجود موت اور مرنا درمیان میں نہیں ہے۔

نت ناک ہوگی

میں آیا ہے

نئے جائیں گے

گنہگار یہ چاہتے

ب یومئہ

صیہ۔

یہ۔

میعا

نے والے

سب کی

میں آئی

اس کے بعد ان لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، جو اس قسم کی آگ کا نغمہ ہیں، فرماتا ہے: ”یہ جلائے والا شعلہ ان لوگوں کے جنہوں نے حکم خدا سے پشت پھیری اور اس کی اطاعت سے روگردانی کی، آواز دیتا ہے اور اپنی طرف بلاتا ہے“ (قد دعواہم ادبر وتولوا)۔

اور انھیں بھی، کہ جنہوں نے مال جمع کیے اور ان کا ذخیرہ کیا، اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کیا (و جمع فاعوی) اس طرح سے یہ جلائے والی آگ، زبان حال سے، اور اس مخصوص کسب کے ساتھ، جو وہ مجرموں کے لیے رکھتی ہے، یا زبان حال سے جو خدا نے اسے دی ہے، مسلسل انھیں آواز دیتی ہے، اور انھیں اپنی طرف بلاتی ہے، انھیں کو جو ان دو صفات کے حامل ہیں، ایمان کی طرف سے پشت کیے ہوئے اور خدا و رسول کی اطاعت سے سرتابی کیے ہوئے، اور دوسری طرف سے، ہمیشہ حرام و حلال سے مال جمع کرنے اور اسے ذخیرہ کرنے میں لگے ہوئے تھے، اور فقراء و مساکین کے حقوق کی طرف کوئی توجہ نہیں کیا کرتے تھے، یا اصلاً اس نعمتِ الہی یعنی مال کے فلسفہ کو سمجھتے ہی نہ تھے۔

- ۱۹۔ إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۝
 ۲۰۔ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۝
 ۲۱۔ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ۝
 ۲۲۔ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ۝
 ۲۳۔ الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۝
 ۲۴۔ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ۝
 ۲۵۔ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُورِ ۝
 ۲۶۔ وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝
 ۲۷۔ وَالَّذِينَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُونَ ۝
 ۲۸۔ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ ۝

ترجمہ

- ۱۹۔ انسان حریص اور کم طاقت پیدا کیا گیا ہے۔
 ۲۰۔ جب اسے کوئی برائی پہنچے تو بے تاب کرنا ہے۔
 ۲۱۔ اور جب اسے کوئی بھلائی پہنچے تو دوسروں سے منع کرتا ہے۔
 ۲۲۔ سوائے نماز پڑھنے والوں کے۔
 ۲۳۔ جو نماز کو بلا ناغہ ہمیشہ بجالاتے ہیں۔
 ۲۴۔ اور (سوائے ان لوگوں کے) جن کے مال میں حق معلوم ہے۔
 ۲۵۔ سوال کر لے والوں اور محروموں کے لیے۔
 ۲۶۔ اور وہ لوگ جو جزا کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔

- ۲۷۔ اور وہ لوگ جو اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔
 ۲۸۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو پروردگار کے عذاب سے ہرگز امان میں نہیں سمجھتے۔

تفسیر شائستہ انسانوں کے اوصاف

قیامت کے عذابوں کے ایک گوشہ کا ذکر کرنے کے بعد، بے ایمان افراد کے اوصاف اور ان کے مقابلہ میں سچے مومنین کے اوصاف بیان کرتا ہے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ ایک گروہ اہل عذاب کیوں ہے اور ایک گروہ اہل نجات کیوں ہے؟ پہلے فرماتا ہے: "انسان حرص اور کم طاقت پیدا کیا گیا ہے" (ان الانسان خلق هلوعاً)۔

جب اسے کوئی برائی پہنچے تو جزع و فرزع اور بیٹابی کرتا ہے (اذا مسه الشر جزوعاً)۔

اور جب اسے کوئی بھلائی پہنچے تو دوسروں سے دریغ کرتا ہے (اور روکتا ہے)۔ (واذا مسه الخير منوعاً)۔

بہت سے مفسرین اور ارباب لغت نے "هلوع" کا معنی حرص کہا ہے اور ایک گروہ نے اس کی "کم طاقت" کے معنی کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ پہلی تفسیر کی بنا پر یہاں اس قسم کے انسانوں کے وجود میں تین منفی اخلاقی نکتوں کی طرف اشارہ ہوا ہے "حرص" "د" "جزع" "و" "بخل"؛ کیونکہ دوسری اور تیسری آیت "هلوع" کے معنی کی تفسیر ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اس لفظ میں دونوں معانی اکٹھے مراد ہوں، کیونکہ یہ دونوں صفات ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں، حرص افراد عام طور پر بخل ہوتے ہیں اور بڑے حوادث میں کم تحمل ہوتے ہیں اور اس کا عکس بھی صادق اور سچا ہے۔

یہاں ایک یا کئی سوالات سامنے آتے ہیں، کہ اگر خدا نے انسان کو سعادت و کمال کے لیے پیدا کیا ہے، تو پھر اس کی طبیعت میں شر اور بدی کو کیوں قرار دیا ہے؟

اور پھر یہ بات بھی ہے، کہ اگر خدا کسی چیز کو، کسی صفت کے ساتھ پیدا کرے، تو کیا یہ ممکن ہے کہ پھر اپنی خلقت کی مذمت بھی کرے؟

اور ان تمام باتوں سے قطع نظر، قرآن سورہ "تین" کی آیت ۴ میں صراحت کے ساتھ کہتا ہے: لقد خلقنا الانسان في احسن تقويم" ہم نے انسان کو بہترین شکل و صورت اور ساخت میں پیدا کیا ہے۔"

مسلمہ طور پر اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ انسان کا ظاہر تو اچھا ہے لیکن اس کا باطن قبیح اور بُرا ہے، بلکہ انسان کی تمام کی تمام خلقت "احسن تقویم" کی صورت میں ہے اور اسی طرح وہ دوسری آیات جو انسان کے بلند مقام کی تعریف کرتی ہیں، تو یہ سب کی سب آیات، زیر بحث آیت کے ساتھ کس طرح سازگار ہیں؟

ان تمام سوالات کا جواب ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا نے انسان میں ایسی قوتیں، غرائز اور صفات خلق فرمائی ہیں، جو اس کے مکمل دارلقاء اور سعادت کا بالقوہ ذریعہ شمار ہوتی ہیں۔ اس بناء پر مذکورہ صفات و غرائز ذاتی طور پر بری نہیں ہیں، بلکہ کمال کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں، لیکن جب یہی صفات انحرافی راہ اختیار کر لیں اور ان سے سوء استفادہ ہونے لگے، تو تکبت، بدبختی اور شر و فساد کا سبب بن جاتی ہیں۔

مثلاً یہ حرص ایک ایسی قوت ہے جو انسان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ جلدھی سعی و کوشش سے رُک جائے اور کسی نعمت نیک پہنچ کر سیر ہو جائے۔ یہ تو ایک بھڑکی ہوئی پیاس ہے، جو انسان کے وجود پر مسلط ہے۔ اگر یہی صفت تحصیل علم و دانش کی راہ میں استعمال ہو، اور انسان علم کے حصول میں حریص ہو جائے یا دوسرے لفظوں میں علم کا پیاسا اور عاشق بے قرار ہو جائے تو مسلمہ طور پر یہ بات، اس کے کمال کا سبب بنے گی، لیکن اگر وہ مادیات کی راہ میں استعمال ہونے لگے، تو پھر شر و بدبختی اور نخل کا سبب بنے گی۔

دوسرے لفظوں میں، یہ صفت حُب ذات کی ایک شاخ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ حُب ذات ایک ایسی چیز ہے، جو انسان کو کمال کی طرف لے جاتی ہے، لیکن اگر یہ انحرافی راہ پر پڑ جائے تو انحصار طلبی (خود غرضی) و نخل و حسد وغیرہ کی طرف لے جاتی ہے۔

دوسرے مواہب کے بارے میں بھی مطلب اسی طرح سے ہے، خداوند تعالیٰ نے ایم کے اندر ایک عظیم قدرت پیدا کی ہے، جو مسلمہ طور پر مفید اور سود مند ہے لیکن اگر ایم کی اس اندرونی قوت سے سوء استفادہ ہونے لگے اور اس سے دیران و تباہ کرنے والے ایم کم بنائے جانے لگیں، نہ کہ بجلی کے پاور ہاؤس اور دوسری صنعتوں کے وسائل، تو پھر یہی شر و فساد کا سبب بن جائے گا۔

اوپر والے بیان کی طرف توجہ کرتے ہوئے، ان تمام آیات کے معانی و مطالب کو جو قرآن مجید میں انسان کے بارے میں آئی ہیں، جمع کیا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد شائستہ اور لائق انسانوں کا بیان — ایک استثنائی صورت میں — نو (۹) عمدہ صفات کے ضمن میں پیش کرتے ہوئے کہتا ہے:

"مگر نماز پڑھنے والے" (الواصلین)۔

وہی نماز گزار جو اپنی نمازوں کو دوام بخشنے میں (الذین ہم علی صلاتہم دائمون)۔

۱۔ ہم نے تفسیر نمونہ جلد ۵ کے ص ۹۶ تا ۹۸ پر "انسان در قرآن کربیو" کے عنوان کے تحت (پوس آئیہ ۱۲ کے ذیل میں) ایک اور وضاحت بھی کی ہے۔

یہ ان کی پہلی خصوصیت ہے، جو خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں مسلسل اور دائمی طور پر ارتباط رکھتے ہیں اور یہ ارتباط نماز کے ذریعے پورا ہوتا ہے۔ وہ نماز جو انسان کو فحشاء و منکر سے روکتی ہے، وہ نماز جو انسان کی روح اور جان کی پرورش کرتی ہے، اور اس کو ہمیشہ خدا کی یاد دلاتی رہتی ہے۔ یہ مسلسل اور دائمی توجہ، غفلت و غرور اور دریائے شہوات میں ڈوب جانے، اور شیطان اور ہوائے نفس کے جنگل میں اسیر ہونے سے باز رکھتی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ نماز پر مداومت سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ حالت نماز میں رہیں، بلکہ مراد یہ ہے، کہ وہ معین اوقات نماز کو انجام دیتے ہیں۔

اصولی طور پر ہر کار خیر اسی وقت انسان میں مثبت اثر کرتا ہے، جب کہ اس کی مداومت ہو، اور اسی لیے پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث میں آیا ہے:

ان احب الاعمال الى الله ما دام وان قل

خدا کے ہاں محبوب ترین عمل وہ ہے کہ جس میں مداومت ہو، چاہے وہ کم ہی کیوں نہ ہو۔
قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں امام باقرؑ سے یہ آیا ہے کہ: ”اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی انسان نوافل میں سے کوئی چیز اپنے اوپر فرض کرے تو ہمیشہ اس کی مداومت کرتا رہے“۔

ایک اور حدیث میں اسی امام سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

یہ آیت نافر کی طرف اشارہ ہے اور آیه والذین هم علی صلاتهم یحافظون

(جو کچھ آیات کے بعد آئے گی) نماز فریضہ کو بیان کرتی ہے“۔

یہ فرق ممکن ہے اس بناء پر ہو کہ محافظت کی تعبیر تو واجب نمازوں کے ساتھ مناسب ہے اور انھیں خاص طور پر معین اوقات میں ہی انجام دینا چاہیے۔ باقی رہی مداومت کی تعبیر تو یہ مستحب نمازوں کے ساتھ مناسب ہے، کیونکہ انسان انھیں انجام بھی دے سکتا ہے اور کبھی چھوڑ بھی سکتا ہے۔

بہ حال نماز کے ذکر کے بعد جو بہترین عمل اور مومنین کی بہترین حالت ہے۔۔۔۔۔ ان کی دوسری خصوصیت پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: ”وہ لوگ کہ جن کے اموال میں ایک حق معلوم ہے“ (والذین فی اموالهم حق معلوم)۔

”سوال کرنے والوں اور محروموں کے لیے“ (للسائل والمحرور)۔

۱۔ المعجم المفسر من لفاظ الحدیث، جلد ۲ ص ۱۶۰ (مادہ دوام)

۲۔ نرائقین جلد ۵ ص ۴۱۵

۳۔ نرائقین جلد ۵ ص ۴۱۶

اس طرح سے وہ خالق سے اپنے ارتباط کی بھی حفاظت کرتے ہیں، اور مخلوق خدا کے ساتھ بھی اپنے رشتہ اور تعلق کو برقرار رکھتے ہیں۔

بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہاں ”حق معلوم“ سے مراد وہی ”زکات“ ہے۔ جس کی ایک مقدار معین ہے اس کے مصارف میں سے ”سائل“ اور ”محرور“ ہیں، جبکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ سؤرہ کئی ہے، اور زکوٰۃ کا حکم مکہ میں نازل نہیں ہوا تھا یا اگر نازل ہوا تھا تو اس کی کوئی مقدار معین نہیں تھی، لہذا بعض دوسروں کا نظریہ یہ ہے کہ ”حق معلوم“ سے مراد زکات کے علاوہ کوئی اور چیز ہے، جسے انسان اپنے اوپر لازم قرار دیتا ہے کہ وہ حاجت مندوں کو دے گا، اس تفسیر کا شاہد و گواہ وہ حدیث ہے جو امام صادقؑ سے نقل ہوئی ہے، کہ جس وقت لوگوں نے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا کہ کیا وہ زکات کے علاوہ کوئی چیز ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

”هو الرجل يؤتیه الله الثروة من المال فيخرج منه الالف والالفين
والثلاثة الاف والاقل والاكثر، فيصل به رحمه، ويحمل
به الكل عن قومه“

ہاں! یہ اس شخص کے بارے میں ہے، جسے خدا مال و ثروت عطا فرماتا ہے، اور وہ اس میں سے ایک ہزار، دو ہزار اور تین ہزار یا اس سے زیادہ یا کم انک کر دیتا ہے اور اس سے صلہ رحمی کرتا ہے، اور اس کے ذریعے اپنی قوم سے مشقت اور بوجھ کو اٹھالیتا ہے۔

”سائل“ اور ”محرور“ کے درمیان فرق یہ ہے کہ سائل تو اس شخص کو کہتے ہیں، جو اپنی حاجت پیش کر کے تقاضا اور سوال کرتا ہے اور ”محرور“ وہ شخص ہے جسے شرم دیا، سوال و تقاضا کرنے سے مانع ہوتی ہے، اور ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

”محرور“ وہ شخص ہے جو کسب و کار میں زحمت و تکلیف اٹھاتا ہے لیکن اس کی زندگی پچھیدہ ہوگئی ہے۔

مذکورہ حق کی مزید تشریح اور ”سائل“ و ”محرور“ کی تفسیر، تفسیر بیرونہ کی جلد ۱۲ ص ۵۷۲ میں آچھی ہے۔ (ذاریات آیہ ۱۹ کے ذیل میں)۔

بہر حال اس کام کا انجام دینا ایک طرف تو اجتماعی اثر رکھتا ہے اور فقر و فاقہ اور محرومیت کے ساتھ مبارزہ کرتا ہے، اور دوسری طرف ان لوگوں پر جو اس پر عمل کرتے ہیں، اخلاقی اثر چھوڑتا ہے اور ان کے دل و جان کو حرص و بخل اور دنیا پرستی سے پاک کرتا ہے۔

بعد االی آیت ان کی تیسری خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتی ہے: ”وہ لوگ جو روز جزا پر ایمان رکھتے ہیں“

(والذین یصدقون بیوم الدین)۔

اور چوتھی خصوصیت میں کہتا ہے: ”اور وہ لوگ جو اپنے پروردگار کے مذاب سے ڈرتے ہیں“ (والذین ہم من

- ۲۹۔ وَالَّذِينَ هُمْ لِأُوجِهِهِمْ حَافِظُونَ ۝
 ۳۰۔ إِلَّا عَلَىٰ أُنُوفِهِمْ أَوْ مَآمِدِكُمْ أَيَّمَانِهِمْ فَإِنَّهُمْ
 غَيْرُ مَلُومِينَ ۝
 ۳۱۔ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعُدُونَ ۝
 ۳۲۔ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رِعُونَ ۝
 ۳۳۔ وَالَّذِينَ هُمْ بِشَهَادَتِهِمْ قَائِمُونَ ۝
 ۳۴۔ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۝
 ۳۵۔ أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُّكْرَمُونَ ۝

ترجمہ

- ۲۹۔ اور وہ لوگ جو اپنے دامن کو بے عفتی سے محفوظ رکھتے ہیں۔
 ۳۰۔ اور اپنی بیویوں اور کنیزوں کے سوا (جو بیویوں کے حکم میں ہیں) وہ کسی سے جنسی آمیزش نہیں رکھتے، اور ان سے بہرہ مند ہونے پر ان کی کوئی ملامت نہیں ہوگی۔
 ۳۱۔ اور جو شخص اس سے زیادہ طلب کرے تو وہ تجاوز کرنے والا ہے۔
 ۳۲۔ اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور عہد کی رعایت کرتے ہیں۔
 ۳۳۔ اور وہ لوگ جو شہادتِ حق کے ادا کرنے کے لیے قیام کرتے ہیں۔
 ۳۴۔ اور وہ لوگ جو نماز کو پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔
 ۳۵۔ یہی لوگ جنت کے باغات میں عزت و محکرم سے رہیں گے۔

تفسیر بہشتیوں کی خصوصیات کا ایک اور حصہ

گزشتہ آیات میں مومنین اور ان لوگوں کی، جو قیامت میں اہل جنت ہوں گے، مخصوص اوصاف میں سے چار صفات کا بیان ہوا تھا اور ان آیات میں دوسری پانچ صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو مجموعی طور پر نوصفات ہو جاتی ہیں۔ پہلی توصیف کے بارے میں فرماتا ہے: ”وہ لوگ جو اپنی عفت سے کی حفاظت کرتے ہیں“ (والذین ہم لفر وجہم حافظون)۔

”مگر اپنی بیویوں اور کینیزوں کی نسبت، جن سے فائدہ اٹھانے میں انہیں کسی قسم کی ملامت اور سرزنش نہیں ہے (الاعلیٰ از واجہم او ماملکت ایمانہم فانہم غیر مملومین)۔“

اس میں شک نہیں ہے کہ خواہش جنسی، انسان کی سرکش خواہشات میں سے ہے اور بہت سے گناہوں کا سرچشمہ ہے، یہاں تک کہ بعض لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ تمام اہم جرائم کے اعمال ناموں میں، اسی خواہش کا اثر نظر آتا ہے، اس لیے اس پر کنٹرول کرنا اور اس کے حدود کی حفاظت کرنا، تعلیمی و پرہیزگاری کی اہم نشانیوں میں سے ہے، اسی بناء پر نماز، ضرورت مندوں کی مدد، قیامت کے دن پر ایمان اور عذاب الہی سے خوف کے ذکر کے بعد، اسی خواہش پر کنٹرول کا ذکر ہوا ہے۔

وہ استثنا جو اس کے ذیل میں بیان ہوا ہے، وہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلام کی سرگزشت منطقی نہیں ہے کہ یہ عزیزہ اور خواہش کلی طور پر محاورہ نابود ہو جائے اور کوئی شخص راہبوں اور پادریوں کی طرح قانون خلقت کے برخلاف قدم اٹھائے، کیونکہ یہ عمل غالباً غیر ممکن ہے اور یہ فرض امکان غیر منطقی ہے، اسی لیے راہب بھی اس خواہش کو زندگی کے منظر سے حذف نہیں کر سکے اور اگر وہ رسمی طور پر شادی بیاہ نہیں کرتے، تو ان میں سے بہت سے ”چون بخلوت می روند آں کار دیگری گم کند“ (جب تنہائی میں ہوتے ہیں تو پھر دوسرا ہی کام کرتے ہیں)۔

اور اس طریقہ سے جو سوایاں ہوئی ہیں وہ کم نہیں ہیں، سبھی مؤرخین ”دیل دورانت“ و غیرہ نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔ ”ازدواج“ کی تعبیر دائمی اور موقت دونوں بیویوں کے لیے استعمال ہوتی ہے اور یہ جو بعض نے گمان کیا ہے کہ یہ آیت ”ازدواج موقت“ (متعہ) کی نفی کرتی ہے، اس بناء پر ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ وہ (متعہ) بھی ازدواج (وشادی) کی ایک قسم ہے۔

بعد والی آیت میں اس موضوع پر مزید تاکید کے لیے اضافہ کرتا ہے: ”اور جو لوگ اس کے علاوہ طلب کریں وہ تجاوز کرنے والے، اور خدائی حدود سے خارج ہیں“ (فمن ابتغی وراء ذالک فاولئک ہم العادون)۔

لے ”فروج“ ”فرج“ کی جمع ہے۔ عضو تناسل کی طرف کنایہ ہے۔

اور اس طرح سے اسلام ایک ایسے معاشرے کی داغ بیل ڈالتا ہے کہ جس میں فطری عزائم و خواہشات کا جواب بھی مل سکے اور وہ فحشاء و فساد جنسی اور اس سے پیدا ہونے والے مفاسد سے بھی آلودہ نہیں ہے۔
البتہ کینزی اسلام کے نقطہ نظر سے بیوی کے بہت سے شرائط اور قانونی ضابطوں کی حامل ہیں، اگرچہ ہمارے زمانے میں ان کا موضوع نہ ہونے کے برابر ہے۔

اس کے بعد ان کے دوسرے اور تیسرے اوصاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ”وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کی رعایت کرتے ہیں (والذین ہم لاماناتہم وعہدہم راعون)۔“

البتہ ”امانت“ کا ایک وسیع معنی ہے، جو نہ صرف لوگوں کی ہر قسم کی مادی امانتوں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے، بلکہ خدا، پیغمبروں اور ائمہ مصہوبین کی امانتوں کو بھی شامل ہے۔

خدا کی نعمتوں میں سے ہر نعمت اس کی ایک امانت ہے، اجتماعی مناصب خصوصاً حکومت کا منصب اہم ترین امانتوں میں سے ہے، اسی لیے امام باقرؑ اور امام صادقؑ کی مشہور حدیث میں آیت ”ان اللہ یا مکرہ ان توؤد والامانات الخ اہلہا“ کی تفسیر میں صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ ”ولایت و حکومت کو اس کے اہل کے سپرد کرنا“

سورۃ احزاب کی آیت ۲، میں بھی یہ آیا ہے کہ تکلیف و مسؤلیت (فرائض و واجبات) کا مسد، خدا کی ایک عظیم امانت ہے: (انا عرضنا الامانۃ علی السماوات والارض) اور سب سے اہم ترین، خدا کا دین و آئین اور اس کی کتاب قرآن، اس کی عظیم امانت ہے، جس کی حفاظت کی کوشش کرنا چاہیے۔

”عہد“ بھی ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے، جو لوگوں کے عہد اور پیمانوں کو بھی شامل ہے اور خدا کے عہد اور پیمانوں کو بھی۔ کیونکہ ”عہد“ ہر وہ اقرار اور وعدہ ہے جو انسان دوسرے کے ساتھ کرتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ جو شخص خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاتا ہے، تو اس نے اس ایمان کے ساتھ ہی بہت وسیع ذمہ داریوں کو قبول کر لیا ہے۔

اسلام میں امانت کی حفاظت اور معاہدوں کا پابند ہونے کو بہت ہی زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور اسے اسلام کی اہم ترین نشانیوں میں سے بتایا گیا ہے۔

ہم اس سلسلہ میں تفسیر نمونہ کی جلد ۲، سورۃ نساء کی آیت ۵۸ کے ذیل میں، تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

چوتھی صفت کے بارے میں مزید کہتا ہے: ”وہ لوگ جو شہادتِ حق کی ادائیگی کے لیے قیام کرتے ہیں“ (والذین ہم بشہاد اتہم قاشمون)۔

کیونکہ عادلانہ شہادت کو قائم کرنا اور اس کو نہ چھپانا انسانی معاشرے میں قیامِ عدالت کی اہم ترین بنیادوں میں سے ہے۔

وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں، کہ ہم کسی کے خلاف گواہی دے کر ان کی عداوت و دشمنی مول کیوں لیں، اور اپنے لیے دردِ سر کیوں پیدا کریں لوگ حقوقِ انسانی کی طرف سے بے اعتناء، روحِ اجتماعی کے ناقذ اور اجراءِ عدالت کے سلسلہ میں غیر ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے مسلمانوں کو کئی آیات میں شہادتِ حق کی دعوت دی ہے اور شہادت کے چھپانے کو گناہ قرار دیا ہے۔ فقہائے اسلامیہ میں بھی شہادت ایک خاص اہمیت رکھتی ہے، اور بہت سے انفرادی اور اجتماعی حقوق کے اثبات کے لیے بنیاد شمار ہوئی ہے، اور ان کے لیے خاص احکام ہیں۔

آخری صفت میں جو حقیقت میں اس مجموعہ صفات کی نویں صفت ہے، پھر دوبارہ نماز کے مسئلہ کی طرف لوٹتا ہے، جیسا کہ ان کا آغاز بھی نماز ہی سے ہوا تھا، فرماتا ہے: ”وہ لوگ جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں (والذین ہم علیٰ صلاتہم یحافظون)۔ اور جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں، بعض قرآن کی طرف توجہ کرتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ”نماز“ واجب نماز کی طرف اشارہ ہے اور گزشتہ آیت میں ”نماز نافلہ“ کی طرف اشارہ ہے۔

البتہ پہلی صفت میں، نماز کے ہمیشہ قائم رکھنے کی طرف اشارہ تھا، لیکن یہاں اس کے آداب و شرائط، ارکان و خصوصیات کی حفاظت کے متعلق گفتگو ہے، ایسے آداب جو نماز کے ظاہر کو بھی اس چیز سے کہ جو باعثِ فساد ہے، محفوظ رکھتے ہیں اور روحِ نماز کو بھی، جو حضورِ قلب ہے۔ تقویت دیتے ہیں اور اخلاقی رکاوٹوں کو بھی جو اس کی قبولیت کی راہ میں مانع ہوتے ہیں، دور کر دیتے ہیں، تو اس بنا پر یہ ہرگز شمار نہیں ہوگا۔

یہ آغاز و اختتام اس بات کی نشاندہی کرتا ہے، کہ ان تمام اوصاف میں، نماز کی طرف توجہ، ان سب سے زیادہ برتر اور سب سے زیادہ اہم ہے، ایسا کیوں نہ ہو، جبکہ ”نماز تہذیب کا عالی مکتب“ اور تہذیبِ نفوس اور معاشرہ کی پاکسازی کا اہم ترین وسیلہ ہے۔ اور اس گفتگو کے آخر میں، ان اوصاف والوں کی اصلی راہ کو بیان کرتا ہے، جیسا کہ گزشتہ آیات میں مجرموں کی اصلی راہ کی تشریح کی تھی۔ یہاں ایک مختصر اور پر معنی جملہ میں فرماتا ہے: ”وہ لوگ جو ان اوصاف کے حامل ہیں، ان کا ٹھکانا جنت کے بانات ہیں اور انھیں ہر لحاظ سے عزت کے ساتھ رکھا جائے گا۔ (اولئک فی جنات مکرمون)۔“

وہ محترم اور معزز کیوں نہ ہوں؟ جبکہ وہ خدا کے مہمان ہیں اور خدائے قادر و رحمن نے، تمام ضروری وسائل ان کے لیے فراہم کر دیئے ہیں، اور حقیقت میں یہ دونوں تعبیریں (”جنات“ و ”مکرمون“) مادی و معنوی دونوں قسم کی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جو اس گروہ کے شامل حال ہوں گی۔

۱۔ بقرہ ۲۸۲ - ۱۳۰ ماائدہ ۱۰۶ د طلاق ۲

۲۔ ”فی جنات“، ”اولئک“ کی خبر ہے اور ”مکرمون“ دوسری خبر ہے، یا یہ کہ ”مکرمون“ خبر ہے اور ”فی جنات“ اس سے متعلق ہے (غور کیجئے)

۳۶۔ فَمَالِ الَّذِينَ كَفَرُوا قَبْلَكَ مُهْطِعِينَ ۝

۳۷۔ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ حِزْبَيْنِ ۝

۳۸۔ أَيُطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِنْهُمْ أَنْ يُدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيمٍ ۝

۳۹۔ كَلَّا إِتَّخَفْنَا لَهُمْ مِمَّا يَعْلَمُونَ ۝

۴۰۔ فَلَا أَقْسَمُ بِرَبِّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ إِنَّا لَقَادِرُونَ ۝

۴۱۔ عَلَى أَنْ نُبَدِّلَ خَيْرًا مِنْهُمْ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ۝

ترجمہ

۳۶۔ ان کفار کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ سرعت کے ساتھ تیرے پاس آتے ہیں۔

۳۷۔ دائیں طرف سے بھی اور بائیں طرف سے بھی (جنت کی طمع ہے)۔

۳۸۔ کیا ان میں سے ہر ایک کو یہ طمع ہے کہ وہ اللہ کی نعمتوں والی جنت میں داخل ہو جائے۔

۳۹۔ ہرگز ایسا نہیں ہوگا، ہم نے انھیں اس چیز سے پیدا کیا ہے، جس کا انھیں خود علم ہے۔

۴۰۔ مشرق اور مغربوں کے پروردگار کی قسم، ہم اس بات پر قادر ہیں۔

۴۱۔ کہ ہم ان کی جگہ ایسے لوگوں کو دے دیں، جو ان سے بہتر ہیں اور ہم ہرگز مغلوب نہیں ہوں گے۔

تفسیر

کس منہ سے جنت کی طمع؟

اس سورہ کی گزشتہ آیات میں، مومنین اور کفار کی نشانیوں اور ان دونوں گروہوں کی سرنوشت کے بارے میں مختلف مباحث آئے ہیں، اوپر والی آیات میں پھر کفار کی وضع و کیفیت اور مقدمات اسلام کے بارے میں ان کے استہزاء اور تنخر کی تفصیل کی طرف لوٹتا ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ آیات مشرکین کے ان گروہوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، اس وقت جبکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آیات کو

مسلمانوں کے سامنے پڑھتے تھے، تو وہ ہر گوشہ و کنار سے آجاتے تھے اور یہ کہتے تھے، کہ اگر معاد ہوئی تو ہماری وضع و کیفیت اس عالم میں ہے۔ ان افراد سے جو تھجہ پر ایمان لائے ہیں، بہتر ہوگی، جیسا کہ اس دنیا میں بھی ہماری وضع و کیفیت ان سے بہتر ہے۔

قرآن ان کے جواب میں اس طرح کہتا ہے،

”ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے، جو سرعت کے ساتھ تیرے پاس آتے ہیں۔ (فمال الذین کفروا قبلک مهطعین)۔“

دائیں طرف سے بھی اور بائیں طرف سے بھی گروہ درگروہ آتے ہیں اور جنت کی طح رکھتے ہیں۔“ (عن الیمین وعن الشمال عزیزین)۔

”کیا ان میں سے ہر ایک یہ طح رکھتا ہے کہ وہ خدا کی نعمتوں والی جنت میں داخل ہو جائے گا“ (ایطمع کل امرئ منہم ان یدخل جنۃ نعیم)۔

یہ کون سے ایمان اور کون سے عمل کی بناء پر اپنے لیے اس قسم کی شائستگی اور لیاقت کے قائل ہیں؟! ”مهطعین“ ”مهطع“ کی جمع ہے جو اس شخص کے معنی میں ہے، جو گردن اٹھا کر تیزی کے ساتھ چلتا ہے اور کسی چیز کی جستجو میں ہوتا ہے اور کبھی صرف خبر معلوم کرنے کے لیے گردن اٹھانے کے معنی میں آتا ہے۔

”عزیزین“ ”عزۃ“ (بروزن مہرب) کی جمع ہے، جو پراگندہ جماعتوں اور گروہوں کے معنی میں ہے اور اس کا ریشہ اور اصلی جڑ ”عزو“ (بروزن جذب) نسبت دینے کے معنی میں ہے اور چونکہ وہ گروہ جو ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہیں، وہ ایک دوسرے کے ساتھ نسبت اور ارتباط رکھتے ہیں، یا ان کا ہدف اور مقصد ایک ہی ہوتا ہے لہذا جماعت اور گروہ کو ”عزو“ کہا گیا ہے۔

بہر حال خود غرض اور خود پرست مشرکین اس قسم کے بہت سے بے بنیاد دعوے رکھتے تھے اور اپنی مادی زندگی کے مرفد اور خوش حال ہونے کو جو عموماً ناجائز اور لوٹ مار وغیرہ کے طریقوں سے حاصل ہوتی تھی، خدا کی بارگاہ میں اپنے مقام کی بلندی اور پروردگار کے نزدیک اپنی محبوبیت کی دلیل سمجھتے تھے، اور اس کے بعد ایک بے معنی موازنہ کے ساتھ قیامت میں اپنے لیے بلند مقامات کے قائل تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ وہ ”معاد“ پر اس طرح سے جیسا کہ قرآن بیان کرتا ہے، عقیدہ نہیں رکھتے تھے، لیکن کبھی کبھی احتمال کی بناء پر معاد پر بحث کیا کرتے تھے کہ اگر ایسا ہوا تو ہم اس دوسرے جہان میں اس طرح اور لیے ہوں گے، شاید وہ یہ بات استنزا اور تمسخر کے طور پر بھی کہتے تھے۔

یہاں قرآن ان کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے: ”ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ وہ بہشت میں داخل ہو جائیں، کیونکہ ہم نے انھیں جس چیز سے پیدا کیا ہے، اس کا انھیں خود علم ہے۔“ (کلّا انا خلقناہم مما یعلمون)۔

سہ اور پر والی آ

ساتھ پیدا کیا

یہ اہداف

لہذا اکثر مفسرین

مسلمانوں کے سامنے پڑھتے تھے، تو وہ ہر گوشہ و کنار سے آجاتے تھے اور یہ کہتے تھے، کہ اگر معاد ہوئی تو ہماری وضع و کیفیت اس عالم میں ان افراد سے جو تجھ پر ایمان لائے ہیں، بہتر ہوگی، جیسا کہ اس دنیا میں بھی ہماری وضع و کیفیت ان سے بہتر ہے۔

قرآن ان کے جواب میں اس طرح کہتا ہے،
 ”ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے، جو سرعت کے ساتھ تیرے پاس آتے ہیں۔ (فعال الذین کفروا قبلا مہطعین)۔“

دائیں طرف سے بھی اور بائیں طرف سے بھی گروہ درگروہ آتے ہیں اور جنت کی طمع رکھتے ہیں۔ (عن الیمین وعن الشمال عزیزین)۔

”کیا ان میں سے ہر ایک یہ طمع رکھتا ہے کہ وہ خدا کی نعمتوں والی جنت میں داخل ہو جائے گا“ (ایطمع کل امرئ منہ ان یدخل جنة نعیم)۔

یہ کون سے ایمان اور کون سے عمل کی بنا پر اپنے لیے اس قسم کی شائستگی اور لیاقت کے قائل ہیں؟
 ”مہطعین“ ”مہطع“ کی جمع ہے جو اس شخص کے معنی میں ہے، جو گردن اٹھا کر تیزی کے ساتھ چلتا ہے اور کسی چیز کی طرف میں ہوتا ہے اور کبھی صرف خبر معلوم کرنے کے لیے گردن اٹھانے کے معنی میں آتا ہے۔

”عزیزین“ ”عزوة“ (بروزن ہبہ) کی جمع ہے، جو پراگندہ جماعتوں اور گروہوں کے معنی میں ہے اور اس کا ریشہ اور اصلی جز ”عزود“ (بروزن جذب) نسبت دینے کے معنی میں ہے اور چونکہ وہ گروہ جو ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہیں، وہ ایک دوسرے کے ساتھ نسبت اور ارتباط رکھتے ہیں، یا ان کا ہدف اور مقصد ایک ہی ہوتا ہے لہذا جماعت اور گروہ کو ”عزود“ کہا گیا ہے۔

بہر حال خود غرض اور خود پرست مشرکین اس قسم کے بہت سے بے بنیاد دعوے رکھتے تھے اور اپنی مادی زندگی کے مزہ اور خوش حال ہونے کو جو عموماً ناجائز اور لوٹ مار و نیوہ کے طریقوں سے حاصل ہوتی تھی، خدا کی بارگاہ میں اپنے مقام کی بندی اور پروردگار کے نزدیک اپنی محبوبیت کی دلیل سمجھتے تھے، اور اس کے بعد ایک بے معنی موازنہ کے ساتھ قیامت میں اپنے لیے بلند مقامات کے قائل تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ وہ ”معاد“ پر اس طرح سے جیسا کہ قرآن بیان کرتا ہے، عقیدہ نہیں رکھتے تھے، لیکن کبھی کبھی احتمال کی بنا پر معاد پر بحث کیا کرتے تھے کہ اگر ایسا ہوا تو ہم اس دوسرے جہان میں اس طرح اور ایسے ہوں گے، شاید وہ یہ بات استہزاء اور تسخر کے طور پر بھی کہتے تھے۔

یہاں قرآن ان کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے: ”ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ وہ بہشت میں داخل ہو جائیں، کیونکہ ہم نے انھیں جس چیز سے پیدا کیا ہے، اس کا انھیں خود علم ہے۔“ (کلانا انا خلقناہم مما یعلمون)۔

میں بھی،

درحقیقت خدا یہ چاہتا ہے کہ پہلے تو اس جملہ کے ذریعہ ایمان کا مزور اور تکبر توڑ دے، کیونکہ وہ کہتا ہے: تم خود اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم نے تمہیں کس چیز سے پیدا کیا ہے؟ ایک بے قدر و قیمت لطفہ سے، ایک گندے اور لپت پانی سے، تو پھر یہ اتنا غرور و نخوت کس بناء پر ہے؟

لک

دوسرے معاد کا مذاق اڑانے والوں کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر تم معاد و قیامت کے بارے میں شک رکھتے ہو، تو جاؤ اور لطفہ کی حالت کی تحقیق کرو اور دیکھو کہ ہم ایک بے قدر و قیمت پانی کے قطرے سے کس طرح ایک نیا اور عمدہ وجود پیدا کر دیتے ہیں، جو جنین کی صورت میں ہر روز ایک نئی خلقت اختیار کرتا ہے۔

عن

تو کیا لطفہ سے انسان کو پیدا کرنے والا، اس بات پر قادر نہیں ہے، کہ وہ مٹی ہو جانے کے بعد، انسان کے بدن پر لباس حیات پہنا دے۔

نہم

”تیسرے“ یہ لوگ کس طرح جنت کی طمع رکھتے ہیں، جبکہ وہ اپنے صحیفہ اعمال میں اس قدر افعال گناہ رکھتے ہیں، کیونکہ وہ موجود جو ایک بے قیمت لطفہ سے پیدا ہوا ہے، مادی لحاظ سے تو کوئی شرافت و عظمت نہیں رکھتا، اگر کوئی شرف ہے تو وہ ایمان اور عمل صالح کی وجہ سے ہے اور وہ ان کے پاس نہیں ہے، تو پھر یہ لوگ کس طرح توقع رکھتے ہیں کہ وہ جنت کے بانوں میں قدم رکھیں گے۔ اس کے بعد اس مطلب کی تاکید کے لیے مزید کہتا ہے: ”مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار کی قسم ہم اس بات پر قادر ہیں.....“ (فلا أقسم برب المشارق والمغارب إنا لقادرون)۔

بزرگی جتو

سلی جڑ

کے

ن حال

کے

کے

پ معاد

پر

برے

”کہ ان کی جگہ ایسے لوگوں کو دے دیں جو ان سے بہتر ہیں، اور ہم ہرگز بھی اس کام میں مغلوب نہیں ہوں گے“ (علی ان نبدل خیرًا منهم ومانحن بمسبوقین)۔

یہ جملہ ممکن ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ ہم نہ صرف اس بات پر قادر ہیں کہ انہیں مٹی ہو جانے کے بعد نئی زندگی اور حیات کی طرف پلٹا دیں، بلکہ ہم انہیں ایک زیادہ کامل اور بہتر موجودات میں بھی تبدیل کر سکتے ہیں، اور اس کام میں کوئی چیز مانع نہیں ہوگی۔ اس طرح سے اوپر والی تعبیر قیامت کی بحث کو جاری رکھے ہوئے ہے۔

یا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ ہمارے لیے کوئی مانع نہیں ہے کہ ہم تمہیں تمہارے کیفر کردار کی بناء پر نابود کریں اور شائستہ آگاہ اور مومن افراد کو تمہارا جانشین بنادیں، تاکہ وہ ہمارے پیغمبر کے یار و مددگار ہوں، ہمیں اس کام سے کوئی چیز مانع نہیں ہوگی۔ اس بناء پر اگر ہم تم سے یہ اصرار کرتے ہیں کہ تم ایمان لے آؤ، تو وہ کسی حاجت یا عجز کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ یہ بشر کے لیے

سے اور پر والی آیت کی تفسیر میں دوسرے احتمال بھی دیئے گئے ہیں، بنجدان کے یہ ہے کہ ”مسا یعلنون“ نے جس سے مراد یہ ہے کہ ہم نے تمہیں نابود کر کے تمہارے جگہ نئے لوگوں کو بھیجا ہے، تاکہ وہ تمہارے جگہ آسائیں۔ دوسرا احتمال یہ ہے جس سے مراد یہ ہے کہ ہم نے تمہیں نابود کر کے تمہارے جگہ نئے لوگوں کو بھیجا ہے، تاکہ وہ تمہارے جگہ آسائیں۔ ایسے اہداف و مقاصد کے لیے جنہیں وہ خود جانتے ہیں۔ یعنی انہیں ذرا لگائی اور اطاعت کے لیے پیدا کیا ہے۔ لیکن یہ سب احتمال مبدل نظر آتے ہیں۔ لہذا اکثر مفسرین نے وہی معنی جسے ہم نے اوپر بیان کیا ہے، قبول کیا ہے۔

برابرت در بیت کی، مصلحت کلی کا تقاضا ہے۔

”رب المشارق والمغرب“ (مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار) کی تعبیر ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ

جو اس بات پر قادر ہے، کہ اتنے عظیم سورج کو ہر روز ایک نئے مشرق اور ایک نئے مغرب میں قرار دیتا ہے، اور یہ حساب کتاب اتنا وہ کئی طین سال سے اپنے سالانہ دورے کو بے کم و کاست طے کرے، تو وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ ایک دفعہ پھر انسان کو زندگی کی نئی لٹا دے، اور اسے ایک نئی زندگی بخش دے، یا ایک گروہ کو لے جائے اور کسی دوسرے شائستہ اور لائق کردہ کو ان کا جانشین بنا دے۔

ایک نکتہ

”مشارق“ و ”مغرب“ کا خدا

قرآن مجید کی آیات میں کبھی تو ”مشرق و مغرب“ کی تعبیر مفرد کی صورت میں آئی ہے، مثلاً سورۃ بقرہ کی آیت ۱۱۵ میں **وَاللّٰهُ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ** ”مشرق و مغرب خدا ہی کے لیے ہے اور کبھی تشبیہ کی صورت میں آئی ہے، مثلاً سورۃ رحمن کی آیت ۱۷ میں **”سُبْحٰنَ الْمَشْرِقِیْنَ وَرَبِّ الْمَغْرِبِیْنَ“** ”دو مشرقوں کا پروردگار اور دو مغربوں کا پروردگار“ اور کبھی ”جمع“ کی صورت میں **المشارق والمغرب** جیسے زیر بحث آیت ہے۔

بعض کوتاہ نظر لوگوں نے ان تعبیروں کو متضاد خیال کیا ہے، حالانکہ وہ سب ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں، اور ہر ایک کسی ایک طرف اشارہ ہے، اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ سورج ہر روز ایک نئے نقطہ سے طلوع اور ایک نئے نقطہ میں غروب کرتا ہے، اس بنا پر سال کی تعداد کے برابر مشرق و مغرب ہیں اور دوسری طرف ان تمام مشرقوں اور مغربوں میں دو مشرق اور دو مغرب متنازہ ہیں، جن میں سے ایک موسم گرما کے آغاز میں یعنی مدار شمالی میں، خورشید کی بلندی کی زیادہ سے زیادہ حد کے موقع پر، اور ایک موسم سرما کے آغاز میں، یعنی مدار جنوبی میں سورج کے پینچنے کی آخری حد (جن میں سے ایک کو ”مدار اسرطان“ سے اور دوسرے کو ”مدار اس الجدی“ سے تعبیر کرتے ہیں اور چونکہ یہ دونوں پورے طور پر ہیں لہذا خصوصیت کے ساتھ ان کی بات ہوئی ہے، ان کے علاوہ دوسری دو مشرقیں اور دو مغربیں بھی ہیں، جنہیں مشرق اعتدالی اور مغرب اعتدالی کہتے ہیں (اول بہار اور اول خزاں میں جبکہ ساری دنیا میں رات دن برابر ہوتے ہیں) یہ بھی مشخص ہیں اور بعض نے **رب المشارق والمغربین** کو اس کی طرف اشارہ سمجھا ہے، اور یہ بھی قابل توجہ ہے۔

لیکن جہاں یہ مفرد کی صورت میں ہے تو وہاں جنس کا معنی رکھتا ہے، کہ توجہ صرف اہل مشرق و مغرب پر رہے، قطع نظر اس سے کہ افراد پر نظر کی جائے، اس طرح سے اوپر والی مختلف تعبیروں میں ہر کوئی ایک نکتہ رکھتی ہے اور انسان کو سورج کے طلوع و غروب کے مختلف تفسیرات، اور سورج کے مداروں کے منظم تفسیرات کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

ترجمہ
۲۲- ان
وہ
۲۲- و
۲۲- در
ان
تفسیر
گویا
ان
ہے،
ملاقات
لے
باطر

۲۲۔ فَذَرَهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتَّىٰ يُلْقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي
يُوعَدُونَ ۝

۲۳۔ يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَأَنَّهُمْ إِلَىٰ نُصُبٍ
يُوفُونَ ۝

۲۴۔ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرَاهُمْ ذَلَّةً ذَلِكُمُ الْيَوْمَ الَّذِي
كَانُوا يُوعَدُونَ ۝

ترجمہ

۲۲۔ انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دے، تاکہ وہ اپنے باطل میں غوطہ زن رہیں اور کھیل کود میں لگے رہیں، یہاں تک کہ وہ اپنے یوم موعود سے ملاقات کریں۔

۲۳۔ وہی دن جب وہ اپنی قبروں سے تیزی کے ساتھ نکلیں گے، گویا وہ اپنے بتوں کی طرف دوڑ رہے ہیں۔

۲۴۔ در آنحالیکہ ان کی آنکھیں شدت و حشمت سے پینچے کی طرف بھکی ہوئی ہوں گی اور ذلت و خواری کے پردہ نے انہیں ڈھانپ رکھا ہوگا (اور ان سے کہا جائے گا) یہ وہی دن ہے، جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا تھا۔

تفسیر

گویا اپنے بتوں کی طرف دوڑ رہے ہیں

ان آیات میں جو سورہ معارج کی آخری آیات ہیں۔ مہٹ دھرم، مٹھہ کرنے والے اور سخت کافروں کو انداز و تہدید کے عنوان سے فرماتا ہے، ”انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دے، تاکہ وہ اپنے باطل مطالب میں ڈوب رہیں اور کھیل کود میں لگے رہیں یہاں تک کہ وہ اپنے یوم موعود سے ملاقات کریں“ (فذرہم یخوضوا ویلعبوا حتیٰ یلقوا یومہم الذی یوعدون)۔

۱۔ ”یخوضوا“ ”خوض“ (بروزن حوض) کے مادہ سے اصل میں پانی میں چلنے کے معنی میں ہے، اس کے بعد کنایہ کے طور پر ان موارد میں جہاں انسان باطل مطالب میں غوطہ زن ہو، استعمال ہوا ہے۔

اس سے زیادہ استدلال اور وعظ کی ضرورت نہیں ہے، وہ نہ تو اہل منطق میں اور نہ ہی بیدار ہونے کے لیے آمادگی رکھتے ہیں، وہ اپنی باطل اور بے ہودہ باتوں میں غوطہ زن ہیں اور بچوں کی طرح کھیل کود میں لگے رہیں، یہاں تک کہ ان کا موعود دن، قیامت کا دن اور وہ ہر چیز کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیں۔

یہ آیت اسی تیسیر کے ساتھ اور کسی قسم کی تبدیلی کے بغیر سورۃ زحرف کی آیہ ۸۲ میں بھی آئی ہے۔

اس کے بعد اس موعود دن کا تعارف کرتے ہوئے اس وحشت ناک اور ہونک دن کی نشانیاں بیان کرتا ہے، اور فرماتا ہے: "دن جس میں وہ اپنی قبروں سے تیزی کے ساتھ خارج ہوں گے اور اس طرح تیزی سے چل رہے ہوں گے، گویا کہ وہ اپنے بتوں کی طرف رہے ہیں" (یوم یخرجون من الاجداث سراغًا کأنهم الی نصب یوفضون)۔

کیسی عجیب تعبیر ہے؟ قیامت میں ان کی حالت کی کیفیت کی، جبکہ وہ تیزی کے ساتھ دادگاہ مدلل الہی کی طرف چل رہے ان کے کسی جشن یا عزاکے دن بتوں کی طرف، ہجوم کرنے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، لیکن وہ کہاں اور یہ کہاں؟ اور حقیقت میں بے ہودہ عقائد کے بارے میں، جو وہ دنیا میں رکھتے تھے، ایک تمخر اور استہزاء ہے۔

"اجداث" "جداث" (بروزن عبث) کی جمع ہے جو "قبر" کے معنی میں ہے۔

"سراع" "سریع" کی جمع ہے (جیسے ظراف و ظریف) اس شخص یا چیز کے معنی میں ہے، جو جلدی سے چلے

"نصب" "نصب" کی جمع ہے اور وہ بھی بعض کے قول کے مطابق "نصب" (بروزن سفوف) کی جمع ہے، یہ اصل میں

چیز کے معنی میں ہے جو کسی جگہ نصب ہوئی ہو اور ان بتوں کو بھی کہتے ہیں، جنہیں ایک پتھر کے ٹکڑے کی صورت میں کسی جگہ نصب کر کے پرستش کرتے تھے، اور اس کے اوپر قربانی کر کے اس کا خون اس پر ڈال دیتے تھے اور اس میں اور "صنم" میں یہ فرق تھا کہ "صنم" بڑا تھا، جس کی کوئی خاص شکل و صورت ہوتی تھی، لیکن "نصب" پتھر کے ایسے ٹکڑے ہوتے تھے جن کی کوئی شکل و صورت نہیں ہوتی جن کی وہ کسی سبب سے پرستش کرتے تھے، جیسا کہ سورۃ مائدہ کی آیہ ۲ میں آیا ہے کہ وہ حرام گوشتوں میں سے اس جانور کے گوشت کو بھی کھاتے تھے جو ان بتوں پر ذبح ہوتے تھے (وما ذبح علی النصب)

"یوفضون" "افاضہ" کے مادہ سے، تیز چلنے کے معنی میں ہے، پالی کے چپٹے سے چلنے کی تیزی سے مشابہ۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ زیر بحث آیت میں نصب سے مراد وہ پرچم ہیں جنہیں شکروں یا قافلوں کے درمیان کسی ایک جگہ نصب

دیتے ہیں اور ہر شخص تیزی سے اپنے آپ کو ان تک پہنچاتا ہے، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

اس کے بعد دوسری نشانیاں پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "یہ اس حالت میں ہوگا کہ ان کی آنکھیں ہول اور وحشت کی وجہ سے پینچے

کی طرف جھکی ہوئی ہوں گی اور وہ حضور کے ساتھ دیکھ رہے ہوں گے" (خاشعۃ ابصار ہم)۔

"اور ذلت و خواری کے پردہ نے انہیں ڈھانپ رکھا ہوگا" (ترہقہم ذلتاً)۔

لہ "ترہقہم" "رہق" (بروزن سفوف) کے مادہ سے، جبری طور پر ڈھانپنے کے معنی میں ہے۔

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "یہ وہی دن ہے جس کا انھیں وعدہ دیا جاتا تھا۔" (خالک الیوم الذی کانوا یوعدون)۔

ہاں! یہ وہی موعود دن ہے، جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے اور بعض اوقات یہ کہا کرتے تھے: فرض کریں کوئی ایسا دن ہو بھی تو پھر بھی ہماری حالت مومنین سے بہتر ہوگی، لیکن اس دن ان میں شدت خوف، وحشت و شرمساری کی وجہ سے سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوگی، ذلت کا گردوغبار ان کے سر اور چہرہ پر پڑا ہوا ہوگا، اور وہ غم و اندوہ کے مالے میں گھرے ہوئے ہوں گے، یقیناً اس دن وہ نارم و پشیمان ہوں گے، لیکن کیا فائدہ؟

خداوند! اس ہولناک دن ہمیں اپنی رحمت کے پردے میں ڈھانپ لینا۔
پروردگارا! شیطان کے جال سخت، ہوائے منفس غالب اور لمبی چوڑی آرزوئیں فریب دینے والی ہیں، تو خود ہی بیداری و آگاہی اور راہ ہدایت سے عدم انحراف کی ہمیں توفیق مرحمت فرما۔
بارالہا! ہمیں ان مومنین میں سے قرار دے، جنہوں نے اپنے عمد کو وفا کرنے، اور تیری اطاعت کے لیے کربت باندھی ہوئی ہے

آمین یا رب العالمین
اختتام سورۃ معارج - ۲۱ ذی الحجۃ الحرام

۱۴۰۶ھ

اختتام ترجمہ ۱۵ محرم ۱۴۰۸ مطابق ۹ ستمبر ۱۹۸۷ بروز بدھ
بوقت تقریباً ساڑھے سات بجے صبح - ۸۱، ای ماڈل ٹاؤن

لاہور
مصفر حسین نجفی

سُورَةُ نُوحٍ

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی

اور

اس کی ۲۸ آیات ہیں

تاریخ شروع

۲۲ ذی الحجۃ الحرام ۱۴۰۶ھ

سورۃ نوح کے مطالب و مضامین

یہ سورہ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے، نوح پیغمبر کی سرگزشت بیان کرتی ہے، قرآن مجید کی کئی سورتوں میں اس عظیم پیغمبر کی سرگزشت کی طرف اشارہ ہوا ہے، ان میں سے سورۃ شعراء، مومنون، اعراف اور انبیاء ہیں، اور سب سے زیادہ تفصیل سورۃ ہود میں آئی ہے، جس میں تقریباً ۲۵ آیات اس اولوالعزم پیغمبر کے بارے میں ہیں (آیہ ۲۵ تا ۴۹)۔

لیکن سورۃ نوح میں جو کچھ آیا ہے، وہ ان کی زندگی کا ایک خاص حصہ ہے، جو دوسری جگہ پر اس طرح سے نہیں آیا، اور یہ حصہ ان کی توحید کی طرف دعوت دینے، اس کی کیفیت، اس دعوت کے عناصر، اور ان جزئیات کے بارے میں جو اس اہم مسئلہ میں بروئے کار آئے ہیں۔ اور وہ بھی اس بہت دھرم، خود غرض اور تکبر قوم کے مقابلہ میں جو حق کے سامنے سر جھکانے کے لیے بالکل تیار نہ تھی۔ پے در پے اور مسلسل دعوت حق دینے کے ساتھ مربوط ہے۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور پیغمبر اکرمؐ اور اس زمانہ کے مٹھوڑے سے مسلمان، نوح اور ان کے اصحاب کے زمانہ کے حالات سے مشابہ حالات رکھتے تھے، انھیں بہت سے مسائل کی تعلیم دیتا ہے اور اس واقعہ کے بیان کرنے کے بہلاف مقاصد میں سے ایک یہی ہے، منجملہ ان کے :

۱۔ انھیں یہ بتانا ہے کہ منطقی استدلال کے طریق سے، جو دشمنوں کے ساتھ محبت اور مکمل دلسوزی سے تو اُم ہو، کس طرح تبلیغ کریں اور اس راہ میں ہر مفید اور موثر ذریعہ سے کیسے فائدہ اٹھائیں۔

۲۔ انھیں یہ سکھاتا ہے کہ خدا کی طرف دعوت دینے کی راہ میں ہرگز نہ چھکیں، چاہے سالہا سال گزر جائیں اور دشمن کتنا بھی مستحکم

کیوں نہ ہو۔

۳۔ انھیں یہ سبق دیتا ہے کہ ایک طرف تو شوق دلانے کے وسائل ہوں اور دوسری طرف ڈرانے کے عوامل، اور دعوت کرنے کے لیے دونوں طریقوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔

۴۔ اس سورہ کی آخری آیات، بہت دھرم مشرکین کے لیے ایک تشبیہ ہے کہ اگر وہ حق کے سامنے نہ جھکے اور خدا کے حکم کے سامنے انھوں نے گردن خم نہ کی، تو ان کا انجام بہت دردناک ہوگا۔

۵۔ ان سب باتوں کے علاوہ یہ سورۃ پیغمبر اور پہلے مومنین اور ان سے مشابہ افراد کے لیے دل کی تسلی کا سبب ہے کہ وہ خدا کے لطف و

کرم سے اپنے پر دگاروں میں سرگرم اور مشکلات اور سختیوں میں صابر و شکیبار ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یہ سورہ، حق و باطل کے طرف داروں میں دائمی مبارزہ کے بیان اور ان پر دگاروں کی، جن پر حق کے طرف داروں کو

اپنی راہ میں کار بند ہونا چاہیے، تصویر کشی کرتا ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلام سے آیا ہے:

”من قرأ سورة نوح كان من المؤمنين الذين تدر عليهم دعوة نوح“
”جو شخص سورہ نوح کو پڑھے گا، وہ ان مومنین میں سے ہو جائے گا جنہیں نوح کی دعوت کی شاع ڈھانپ لیتی ہے“۔

ایک اور حدیث میں امام صادق سے آیا ہے:

”من كان يؤمن بالله واليوم الآخر و يقرأ كتابه فلا يدع ان يقرأ سورة ”انا ارسلنا نوحًا“ فام عبد قرأها محتسبا صابراً في فريضة او نافلة اسكنه الله مساكن الابرار واعطاه ثلاث جنان مع جنته كرامة من الله“

جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اور اس کی کتاب کو پڑھتا ہے، وہ سورہ نوح کی تلاوت کو ترک نہ کرے، جو شخص اس سورہ کو، صبر و استقامت کے ساتھ، خدا کے لیے، واجب یا مستحب نماز میں پڑھے گا تو خدا اسے نیک افراد کی منازل میں جگہ دے گا اور جنت کے باغوں میں سے تین باغ، اس کے اپنے باغ کے علاوہ، اس کے احترام میں اسے مرحمت فرمائے گا۔

یہ بات کے بغیر واضح ہے کہ اس کی تلاوت کا ہدف اور مقصد یہ ہے کہ اس عظیم پیغمبر کے طور پر بقول، اور حق کی طرف دعوت کی راہ میں، ان کے بار و انصار کے صبر و استقامت سے ہدایت حاصل کرے اور اس کی دعوت کی شاع سے روشنی حاصل کرے، نہ کہ ایسا پڑھنا کہ جس میں غور و فکر نہ ہو، اور نہ ہی ایسا غور و فکر کہ جس میں عمل نہ ہو۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝
 ۱۔ اِنَّا اَرْسَلْنَا نُوحًا اِلَى قَوْمِهِ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ
 تَاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝
 ۲۔ قَالَ یَقَوْمِ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝
 ۳۔ اِنْ اَعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقَوْهُ وَاَطِیْعُوْنِ ۝
 ۴۔ یَغْفِرْ لَكُمْ مِنْ ذُنُوْبِكُمْ وَیُؤَخِّرْكُمْ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی اِنْ اَجَلَ
 اللّٰهَ اِذَا جَاءَ لَا یُؤَخَّرُ مَلُوْكُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ

رحمن ورحیم خدا کے نام سے

- ۱۔ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، اور ہم نے ان سے کہا: اس سے پہلے کہ دردناک عذاب ان کی طرف آئے، اپنی قوم کو ڈراؤ۔
- ۲۔ انھوں نے کہا: اے قوم! میں تمہارے لیے ایک واضح ڈرانے والا ہوں۔
- ۳۔ کہ تم خدا کی عبادت کرو اور اس کی مخالفت سے پرہیز کرو، اور میری اطاعت کرو۔
- ۴۔ اگر تم ایسا کرو گے تو خدا تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور ایک معین وقت تک کیلئے تمہیں زندہ رکھے گا، لیکن جب خدائی اجل آگئی تو پھر تاخیر نہیں ہوگی، اگر تم سمجھو!

تفسیر نوح کا پہلا پیغام

ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ سورۃ نوح کے حالات کے اس حصہ کو بیان کرتا ہے، جو ان کی دعوت سے مربوط ہے، اور وہ راہِ حق کی تمام راہِ روؤں کو، خصوصاً بہت دھرم قوموں کے مقابلہ میں، حق کی طرف دعوت کے سلسلہ میں، بہت سے عمدہ نکات کھاتی ہے۔ سب سے پہلے ان کی بعثت کے سلسلہ کو شروع کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، اور ہم نے ان کو کہا: اس سے پہلے کہ دردناک عذاب ان کی طرف آئے تم اپنی قوم کو ڈراؤ: (اتانا سلنا نوحًا الی قومہ ان انذر قومک من قبل ان یأتیہم عذاب الیم)۔“

یہ دردناک عذاب، ممکن ہے دنیا کا عذاب ہو، یا آخرت کا عذاب ہو، اور زیادہ مناسب یہ ہے کہ دونوں مراد ہوں، اگرچہ اس سورہ کی آخری آیات کے قرینہ سے زیادہ تر مراد دنیا کا عذاب ہے۔

”انذاس“ (اور ڈرانے) پر تکیہ، باوجودیکہ انبیاء ڈرانے والے بھی تھے، اور بشارت دینے والے بھی، اس بناء پر ہے کہ انذار اور ڈرانا، غالباً زیادہ قوی تاثیر رکھتا ہے، جیسا کہ تمام دنیا میں قوانین کے اجراء کی ضمانت کے لیے انذار اور سزا پر تکیہ ہوتا ہے۔

نوح ایک ”اولوالعزم“ پیغمبر، جو پہلی شریعت اور دین الہی کے حامل تھے، عالمی دعوت رکھتے تھے، یہ فرمان حاصل کرنے کے بعد اپنی قوم کی طرف آئے اور ان سے کہا: ”اے میری قوم! میں تمہارے لیے ایک واضح ڈرانے والا ہوں“۔ (قال یا قوم انی لکم نذیر مبین)۔

ہدف و مقصد یہ ہے کہ تم خدا کے کیتا و بیگانہ کی پرستش کرو، اور جو کچھ اس کے علاوہ ہے اسے دور بھینک دو، تقویٰ اختیار کرو اور میرے احکام کی جو خدا کے احکام ہیں اطاعت کرو (ان اعبدوا اللہ و اتقوه و اطیعون)۔ حقیقت میں نوح نے اپنی دعوت کے مضمون کا تین جملوں میں خلاصہ بیان کیا: خدائے کیتا کی پرستش، تقویٰ کی رعایت اور ان قوانین و احکام کی، جو وہ خدا کی طرف سے لائے تھے اور جو عقائد و اخلاق و احکام کا مجموعہ تھے، اطاعت۔

اس کے بعد انھیں شوق دلاتے ہوئے، اور اس دعوت کو قبول کرنے کے اہم نتائج کو دو مختصر سے جملوں میں بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: اگر تم میری دعوت کو قبول کرو تو خدا تمہارے گناہوں کو بخش دے گا (یعفر لکم من ذنوبکم)۔

لہ ”من“ اس جملہ میں نامزدہ اور تاکید کے لیے ہے، کیونکہ خدا پر ایمان تمام گزشتہ گناہوں کے بخش جانے کا (بقیہ جاثیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

حقیقت میں مشہور قاعدہ کبیرہ ”الاسلام یجب ما قبلہ“ (اسلام اپنے سے پہلے کی چیزوں پر پردہ ڈال دیتا ہے اور انہیں ختم کر دیتا ہے) ایک ایسا قانون ہے جو تمام توحیدی اور الہی دینوں میں ہے اور اسلام پر ہی منحصر نہیں ہے۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے، اور تمہیں ایک معین زمانہ تک تاخیر میں ڈالتا ہے اور تمہاری عمر کو طولانی کر کے تم سے عذاب کو دور رکھتا ہے (و یؤخرکم الی اجل مستقی)۔

- ”کیونکہ جب خدا کی طرف سے اصلی اور آخری اجل آجاتی ہے، تو اس میں تاخیر نہیں ہوتی، اگر تم جانتے ہو ”ان اجل اللہ اذا جاء لا یؤخر لکم لو کنتم تعلمون)۔

اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ ”اجل“ اور انسانی عمر کی مدت دو قسم کی ہے، ”اجل مستقی“ اور ”اجل نہائی یا آخری“ یا دوسرے لفظوں میں ”اجل ادنیٰ“ (نزدیک کی مدت والی) اور ”اجل اقصیٰ“ (دور کی مدت والی) یا ”اجل معلق“ (مشروط) اور ”اجل حتمی“ (مطلق)

پہلی قسم کی عمر کی مدت تو وہ ہے جو قابلِ تغیر ہے اور وہ انسان کے غلط اعمال کے نتیجے میں ممکن ہے کہ بہت جلدی آجائے جن میں سے ایک خدائی عذاب بھی ہے اور اس کے برعکس تقویٰ نیکو کاری اور تدبیر کی وجہ سے ممکن ہے کہ وہ بہت پیچھے اور تاخیر میں پڑ جائے۔

لیکن عمر کی اصلی اور آخری مدت کسی طرح بھی قابلِ تغیر نہیں ہے، اس موضوع کو ایک مثال کے ذریعے مشخص کیا جاسکتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان عمر جاودانی اور ہمیشہ کی زندگی کی استعداد نہیں رکھتا، اگر انسانی بدن کے تمام عمل پُرزے اور مشینری اچھی طرح سے کام کرتے رہیں تو آخر کار ایک ایسا وقت آجائے گا، جب کہ فرسودہ اور کھنڈ ہونے کی وجہ سے اس کا دل خود بخود کام کرنے سے رُک جائے گا، لیکن حفظِ صحت کے اصولوں کی رعایت، اور بیماریوں کو وقت پر روکنے سے، انسان کی عمر کو طولانی کر سکتے ہیں، جبکہ ان امور کی رعایت نہ کرنے سے ممکن ہے کہ اس کی عمر بہت کم ہو جائے اور بہت جلدی اس کو ختم کر دے۔

بیتہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا:

باعث ہے، مگر وہ کہ جو حق الناس سے مربوط ہے، لیکن گناہ کے لحاظ سے اور حرمت کے حکم کی وجہ سے بننا جانا اس کو بھی شامل ہے اور یہ جو بعض مفسرین نے (مثلاً فخر رازی نے تفسیر کبیر میں اور علامہ طباطبائی نے المیزان میں) احتمال دیا ہے کہ معن تبعیضیہ ہے۔ یہ گزشتہ گناہوں کے بارے میں ہے، نہ کہ آئندہ والے گناہوں کے بارے میں، یہ بعید نظر آتا ہے، کیونکہ آیت میں آئندہ کے گناہوں کے بارے میں تو بات ہی نہیں ہو رہی۔

لے حاشیہ صفحہ ۱۷۸: ”اجل نہائی“ اور ”اجل معلق“ کے بارے میں ہم نے سورہ انف کی آیت ۲ (جلد ۵ ص ۱۴۸) کے ذیل میں ایک اور بحث کی ہے۔

ایک تکتہ

عمر کی زیادتی اور کمی کے معنوی اسباب

ایک دوسرا تکتہ جو اس آیت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے، وہ عمر کے کم ہونے میں گناہوں کی تاثیر ہے، کیونکہ ارشاد ہوتا ہے، اگر تم ایمان لے آؤ اور تقویٰ اختیار کرو، تو خدا تمہاری عمر کو طوٹانی کر دے گا اور تمہاری موت کو تاخیر میں ڈال دے گا۔ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گناہ ہمیشہ انسان کے جسم اور روح پر ہولناک مزہبیں وارد کتے ہیں، اس مطلب کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

روایات اسلامی میں بھی اس معنی پر بہت زیادہ تاکید ہوئی ہے، ان میں سے ایک پر معنی حدیث میں امام صادق سے آیا ہے:

من یموت بالذنوب بہکثر ممن یموت بالاجال، ومن یعیش بالاحسان اکثر ممن یعیش بالاعمار۔

”وہ لوگ جو گناہ کے اثر سے مرتے ہیں وہ ان سے بہت زیادہ ہیں، جو خدائی موت سے دنیا سے رخصت ہوتے ہیں، اور وہ لوگ جو نیکو کاری کی بناء پر طوٹانی عمر پاتے ہیں، ان سے بہت زیادہ ہیں، جن کی عمر طبعی عوامل کی بناء پر زیادہ ہوتی ہے۔“

ترجمہ

-۵

-۶

-۷

-۸

-۹

-۱۰

-۱۱

-۱۲

-۱۳

-۱۴

-۱۵

- ۵۔ قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا ۝
 ۶۔ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَاؤِي إِلَّا فِرَارًا ۝
 ۷۔ وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي فُجُورِهِمْ أَسْتَكْبِرُوا ۝
 ۸۔ ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝
 ۹۔ ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنْتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا ۝

ترجمہ

- ۵۔ ”نوح“ نے کہا، پروردگارا! میں نے اپنی قوم کو رات دن (تیری طرف) دعوت دی۔
 ۶۔ لیکن میری دعوت نے حق سے فرار کے علاوہ ان میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا۔
 ۷۔ اور میں نے جب بھی انھیں دعوت دی کہ وہ ایمان لے آئیں تاکہ تو انھیں بخش دے، تو انھوں نے اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں، اور اپنے لباس سے چہروں کو ڈھانپ لیا، اور مخالفت پر اصرار کیا، اور شدت کے ساتھ استکبار کیا۔
 ۸۔ اس کے بعد میں نے انھیں ظاہر بظاہر (توحید اور تیری بندگی کی طرف) دعوت دی۔
 ۹۔ پھر میں نے علی الاعلان بھی اور پوشیدہ طور پر بھی انھیں تیری طرف بلا یا۔

تفسیر

ان کی ہدایت کیلئے ہر طرح سے کوشش کی، مگر.....

ان آیات میں، اپنی قوم کو دعوت دینے کے لیے، نوح کی رسالت اور ماوریت کے بیان کو جاری رکھتے ہوئے، خود انھیں کی زبان سے

کچھ باتیں نقل ہوئی ہیں، جو انھوں نے خدا کی بارگاہ میں شکایت کے طور پر کہی تھیں، جو بہت ہی سببی آموز ہیں۔

نوح کی باتیں ایسی باتوں کے سلسلہ میں ہیں، جو تمام دینی مبلغین کے لیے رہنما بن سکتی ہیں، ارشاد ہوتا ہے: ”نوح نے کہا: پروردگار! میں نے اپنی قوم کو رات دن تیری طرف دعوت دی ہے، (قال رب انی دعوت قومی لیلاً و نهاراً)۔ اور ان کی ہدایت و تبلیغ میں ایک لمحہ کے لیے بھی کوتاہی نہیں کی۔“

لیکن میری اس دعوت و ارشاد نے، حق سے ڈرا کرنے کے سوا، ان میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا“ (فلم یزدہم الا فراراً)۔

اور یہ عجیب بات ہے کہ کسی چیز کی دعوت، اسی سے بھاگنے کا سبب بن جائے، لیکن اس بات کی طرف توجہ کرنے سے کہہ سکتے ہیں کہ تاثیر، ایک قسم کی آمادگی اور کشش متقابل کی محتاج ہے، تعجب کی کوئی بات باقی نہیں رہ جاتی کہ وہ غیر آمادہ دلوں میں محکوس اور منفی اثر دوسرے لفظوں میں بہت دھرم اور حق کے دشمن افراد، جب مردان حق کی دعوت کو سنتے ہیں تو وہ اس کے مقابلہ میں اٹھ کھڑے ہو سکتے ہیں، اور ان کا یہی مقابلہ کے لیے کھڑے ہو جانا، انھیں راہ حق سے زیادہ دور کر دیتا ہے، اور ان کے کفر و نفاق کو اور بھی زیادہ راسخ بنا دیتا ہے۔

یہ بات ٹھیک اسی چیز کے مانند ہے جو سورۃ اسراء کی آیہ ۸۲ میں آئی ہے: ”و ننزل من القرآن ما هو شفاء و رحمة للمؤمنین و لا یزید الظالمین الا خساراً“ ہم نے قرآن میں ایسی آیات نازل کی ہیں جو مؤمنین کیلئے شفاء اور رحمت سبب ہیں، لیکن ظالموں میں سوائے خسارے اور نقصان کے کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتیں۔“

اور قرآنی آیات میں جو یہ آیا ہے کہ یہ آسمانی کتاب پر ہیزگاروں کے لیے باعث ہدایت ہے ”ہدیٰ للمتقین“ (بقرہ ۱۲۹) اسی درجے سے ہے کہ انسان میں کچھ نہ کچھ تقویٰ کا وجود ہونا چاہیے تاکہ وہ حق کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو، یہ مرحلہ ہی ”حقیقت جوئی کی روح“ اور حق کی گفتگو کو قبول کرنے کی آمادگی ہے۔

اس کے بعد نوح اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتے ہیں ”خداوند! میں نے جب بھی انھیں دعوت دی کہ وہ ایمان لے آئیں اور تم انھیں بخش دے، تو انھوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں، اپنے لباسوں کو اپنے اوپر لپیٹ لیا اور مخالفت کرنے اور ایمان نہ لانے پر اصرار کیا اور شدت کے ساتھ استکبار کیا“ (وانی کلماد دعوتہم لتغفرلہم جعلوا اصابعہم فی اذانہم و استغشوا ثیابہم و اصروا و استکبروا و استکباراً)۔

کانوں میں انگلیاں ڈالنا اس لیے تھا کہ حق کی آواز کو نہ سنیں، اور ان کا اپنے اوپر لباس لپیٹ لینا، یا تو اس معنی میں تھا کہ وہ لباس کو سر پر ڈال لیتے تھے تاکہ وہ کانوں میں ڈالی ہوئی انگلیوں کو ڈھانپ لیں اور آواز کی معمولی سے معمولی لہر بھی کانوں کے پردے سے نہ ٹکرانے، اور دماغ کوئی پیغام دماغ کی طرف منتقل نہ ہو، یا وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنے چہرے کو ڈھانپ لیں، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی نگاہیں اس بزرگ پیغمبر نوح کے ملکتی چہرے پر جا پڑیں۔ حقیقت میں انھیں یہ اصرار تھا، کہ نہ تو وہ اپنے کانوں سے ان کی کوئی بات نہیں، اور نہ ہی اپنی آنکھوں سے

ہیں دیکھیں۔

واقعاً یہ ایک حیرت انگیز چیز ہے کہ انسان حق کی عبادت اور دشمنی میں اس حد تک پہنچ جائے کہ خود کو دیکھنے، سننے اور سوچنے تک کی

ہمی اجازت نہ دے۔

بعض اسلامی تفاسیر میں آیا ہے کہ اس مخوف قوم میں سے بعض لوگ اپنے بیٹوں کے ہاتھ پیر کر نوحؑ کے پاس لے جایا کرتے تھے اور ان سے یہ کہتے تھے: اس شخص سے ڈرتے رہنا کہیں یہ تمہیں گمراہ نہ کر دے، یہ وہ وصیت ہے جو میرے باپ نے مجھے کی تھی اور میں اب ہی وصیت لے رہا ہوں (تا کہ میں وصیت اور خیر خواہی کا حق ادا کر دوں)۔

یہ آیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ نوحؑ اپنی طولانی عمر میں، کئی نسلوں کے درمیان اسی طرح دعوتِ الہی کی تبلیغ کرتے رہے تھے اور بالکل نہیں تھکے تھے۔

اور ضمنی طور پر اس بات کی بھی نشاندہی کرتی ہے کہ ان کی بدبختی کا ایک اہم عامل استکبار اور غرور تھا، کیونکہ وہ اپنے آپ کو اس سے بالاتر سمجھتے تھے کہ اپنے جیسے انسان کے سامنے تسلیمِ خم کریں، چاہے وہ خدا کا نمائندہ ہو اور اس کا دل علم و دانش اور تقویٰ پر سبز گاری کا مرکز ہو۔ یہ کبر و غرور ہمیشہ ہی حق کی راہ میں ایک اہم رکاوٹ رہا ہے اور ہم نے بشر کی تمام تاریخ میں اس کا شوم و منحوس نتیجہ، بے ایمان افراد کی زندگی میں مشاہدہ کیا ہے۔

نوحؑ اپنی باتوں کو پروردگار کی بارگاہ میں جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں:

”خداوند! میں نے انہیں آشکارا اور ظاہر طور پر تیری توحید اور عبادت کی طرف دعوت دی۔ (شع انی

دعوتہم جہاراً)۔

میں نے انہیں عمومی جلسوں میں اور بند آواز کے ساتھ ایمان کی طرف بلایا۔

اس پر ہی قناعت نہیں کی۔ ”آشکارا و پنهان، توحید و ایمان کی حقیقت ان سے بیان کی ہے۔ (شع انی اعلنت لهم

واسررت لهم اسراراً)۔

بعض مفسرین کے قول کے مطابق، نوحؑ نے اس ہٹ دھرم اور خود غرض جمعیت میں اپنی دعوت کے نفوذ کے لیے تین مختلف طریقے اختیار کیے۔ کبھی تو صرف مخفی طور پر دعوت کرتے تھے، تو چار قسم کے رد عمل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ (کانوں میں انگلیاں ڈال لیں، اپنے اوپر کپڑے پیٹ لیں، کفر پراصرار کیا اور استکبار و غرور سے کام لیا)۔ کبھی علی الاعلان اور آشکارا دعوت دیتے اور کبھی آشکارا اور پنهان دونوں طریقوں کی دعوت سے فائدہ اٹھاتے، لیکن ان میں سے کوئی بھی مؤثر ثابت نہیں ہوئی۔

۱۰ ص ۲۶۱

۲۰ ص ۱۲۶

اصولی طور پر انسان کی ساخت اور بناوٹ کچھ اس قسم کی ہے کہ اگر وہ باطل کی راہ میں اس قدر آگے بڑھ جائے، کہ فساد کی حد تک وجود میں مستحکم ہو جائیں، اور اس کے وجود کی گہرائیوں میں نفوذ کرتے ہوئے، طبیعت ثانوی کی شکل اختیار کر لیں، تو پھر نہ تو مردانِ حق کی دعوت اثر کرتی ہے اور نہ ہی خدا کے پیغامائے رسالان کے لیے فائدہ مند ہوتے ہیں۔

چند نکات

۱۔ تبلیغ کے طریقے:

اوپر والی آیات میں، نوح کی دعوت کے سلسلہ میں جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ پیغمبر اور مکہ میں رہنے والے ان تھوڑے سے مردوں کے لیے، جو آپ کے ساتھ مل گئے تھے، دلی تسلی کا ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ راہِ خدا کے تمام مبلغین کے لیے ایک عمومی پروگرام پیش کیا گیا ہے۔

نوح کو ہرگز اس بات کی توقع نہ تھی کہ لوگ آپ کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے شہر کے ایک عمومی مرکز میں جمع ہو جائیں گے، اطمینانِ قلب کے ساتھ، اس حالت میں کہ وہ سب کے سب آپ کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے اور کان آپ کی باتوں پر لگا ہوں گے اور پھر وہ خدا کا پیغام انہیں پہنچائیں گے، بلکہ آیات کے لب و لہجہ سے معلوم ہوتا ہے (اور بعض روایات میں آیا بھی ہے) کہ آپ نے اوقاتِ لوگوں کے گھروں میں ان کے پاس جاتے، یا کوچہ و بازار میں خصوصی طور پر انہیں آواز دیتے اور حوصلہ کے ساتھ اور محبت آمیز لب و لہجہ انہیں تبلیغ کرتے اور کبھی آپ ان عمومی مجالس میں، جو دوسرے مقاصد مثلاً جشن یا تعزیت کے لیے قائم ہوتی تھیں چلے جاتے اور بلند آواز میں آشکارا خدا کا فرمان ان کے سامنے پڑھتے، لیکن ہمیشہ نامطلوب رد عمل، توہین و استہزاء اور بعض اوقات مارنے اور زخمی کرنے کا سامنا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ ہرگز اپنے کام سے دستبردار نہیں ہوئے۔

یہ عجیب و غریب حوصلہ اور اتنی عجیب و مسوزی اور بے نظیر استقامت اور کام کی لگن، دینِ حق کی راہ میں دعوت کے لیے ان کا سرمایہ بھٹی۔

اور سب سے بڑھ کر تعجب انگیز بات یہ ہے کہ آپ کی دعوت و تبلیغ سے نو سو سال کی طویل مدت میں، تقریباً (۸۰) اسی افراد آپ پر ایمان لائے، اگر ہم ان دونوں اعداد کو ایک دوسرے پر تقسیم کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ ایک شخص کی ہدایت کے لیے اوسطاً تقریباً ۱۲ سال تبلیغ کی۔

اگر مبلغینِ اسلام اس قسم کی استقامت اور کام کی لگن رکھتے ہوں، تو کیا اسلام ایسے مالا مال اور عمدہ مطالب و مضامین کے سوتے ہوئے، عالمگیر نہیں ہو جائے گا؟!

۲۔ حقیقت سے فرار کیوں؟

بعض اوقات انسان اس بات پر تعجب کرتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اس آسمان کے نیچے ایسے لوگ بھی پیدا ہو جائیں، جو حق کی بات

سننے کے لیے تیار نہ ہوں، اور اس سے دور بھاگیں؟ بات قبول کرنے کی نہیں ہے، بات صرف سننے کی ہے۔
لیکن تاریخ بتلاتی ہے کہ اس قسم کے افراد بہت زیادہ تھے۔

صرف قوم نوح ہی ایسی نہیں تھی کہ جب آپ انہیں توحید کی دعوت دیتے تھے، تو وہ کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے تھے، اور سر اور چہرے پھرتے سے ڈھانپ لیتے تھے، تاکہ نہ تو سنی کی بات کو سنیں اور نہ ہی آپ کو دیکھیں، بلکہ قرآن کی صراحت کے مطابق، پیغمبر اسلام کے زمانہ میں بھی ایسا گروہ موجود تھا، جب پیغمبر بدل انگیز بننا آواز کے ساتھ آیات قرآنی کی تلاوت کرتے، تو وہ شور و غوغا کر کے اور سیٹیاں بجا کر اس قسم کا ہنگامہ کھڑا کر دیتے تھے کہ کوئی شخص آپ کی آواز کو نہ سُن پائے، وقال الذین کفرو لا تسمعوا لهذا القرآن و الغوا فیہ لعلکم تغلبون ”کافروں نے کہا: اس قرآن پر کان نہ دھرو اور اس کی تلاوت کے وقت شور و غوغا بلند کرو، تاکہ تم ہمایاب ہو جاؤ۔ (خم السجدہ ۴۰—۲۶)

کر بلا کی خونی تاریخ میں بھی یہ آیا ہے کہ جب امام حسینؑ سالار شہیدان نے منحرف اور کج فہم دشمنوں کو، ہدایت و ارشاد، اور بیدار کرنا چاہا، تو انہوں نے اس طرح شور و غوغا کیا، کہ امام کی آواز ان میں گم ہو کر رہ گئی۔
آج بھی یہ پروگرام اسی طرح جاری و ساری ہے، البتہ دوسری شکلوں اور صورتوں میں، باطل کے طرفداروں نے، قسم قسم کی غلط سرگرمیوں، فاسد اور خراب کرنے والی موسیقیوں، خراب مواد اور منشیات کے ذریعہ، اس قسم کی فضا فراہم کر رکھی ہے، کہ لوگ خصوصاً نوجوان، مردانِ حق کی دہلواؤ آواز سُن ہی نہ سکیں۔

۱۰۔ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ۝

۱۱۔ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا ۝

۱۲۔ وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَأَنْهَارٍ وَيَجْعَلْ لَكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْزِي

لَكُمْ أَنْهَارًا ۝

۱۳۔ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا ۝

۱۴۔ وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ۝

ترجمہ

۱۰۔ میں نے ان سے کہا، اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو، وہ بہت بخشنے والا ہے۔

۱۱۔ تاکہ وہ آسمان کی پُر برکت بارشیں پے درپے تم پر بھیجے۔

۱۲۔ اور تمہاری فراواں مال و دولت سے مدد کرے، اور تمہارے لیے سرسبز باغات اور نہریں جاری کرے

۱۳۔ تم خدا کی عظمت کے قائل کیوں نہیں ہوتے؟

۱۴۔ حالانکہ اس نے تمہیں مختلف مرحلوں میں پیدا کیا ہے۔

تفسیر

ایمان کی دنیاوی جزا

نوحؑ اس بہت دھرم اور سرکش قوم کی ہدایت کے لیے، اپنے مؤثر بیانات کو جاری رکھتے ہوئے، اس مرتبہ بشارت و تشویق پر توجیہ کرتے ہیں اور انہیں تاکید کے ساتھ یہ امید دیتے ہیں کہ اگر وہ شرک و گناہ سے توبہ کر لیں، تو خدا ان پر اپنی رحمت کے دروازے ہر طرف سے کھول دے گا۔ ارشاد ہوتا ہے: ”خداوندا! میں نے ان سے کہا ہے کہ تم اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو، وہ بہت ہی بخشنے والا ہے (فقلت استغفروا ربکم انہ کان غفارا)۔“

صرف یہ کہ وہ تمہیں گناہوں سے پاک کر دے گا، بلکہ ”اگر تم ایسا کرو تو وہ تم پر آسمان سے برکت والی بارشیں پے درپے نازل

نوحؑ

کا

خلاف

قابل

ہوگی

بٹ

اس

اور

کہا

اس

سیان کی آلودگی

(انسانی سرمایہ)

ہاں

بعض

کیرلیا، اور ان

ایمان لے آؤ تو

آخری عذاب آہ

اس

ہوتے؟ (۵)

”حالانکہ

”مد

استعا

”وقار“

معنی یہ۔

۱۰ "یرسل السماء علیکم مدراً"۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس کی معنوی رحمت کی بارش بھی، اور مادی برکت پر برکت بارش بھی تم پر نازل ہوگی۔
قابل توجہ بات یہ ہے کہ کہتا ہے: "آسمان کو تم پر بھیجے گا" یعنی اس قدر بارش ہوگی کہ گویا آسمان برس رہا ہے! لیکن چونکہ وہ رحمت کی بارش ہوگی، لہذا نہ تو اس سے کوئی دیرانی اور تباہی ہوگی، اور نہ ہی کوئی تکلیف پہنچے گی، بلکہ وہ ہر جگہ خوشی و خرمی اور سرسبزی و شادابی کا باعث ہوگی۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور تمہارے مال و اولاد میں زیادتی کرے گا" (ویمد دکم باموال و بنین)۔
"اور تمہارے لیے سرسبز و شاداب باغ، اور رواں پانی کی نہریں قرار دے گا" (و یجعل لکم جنات و یجعل لکم انہاراً)۔

اس طرح سے انھیں ایک عظیم معنوی نعمت، اور پانچ عظیم مادی نعمتوں کی وعید دی ہے۔ معنوی عظیم نعمت تو گن گن ہوں گی بخشش اور کفر و عصیان کی آلودگی سے پاک ہونا ہے۔ باقی رہی مادی نعمتیں تو وہ مفید، برواقع اور چر برکت بارشوں کا نازل ہونا، مال کی زیادتی، اولاد کی فراوانی (انسانی سرمایہ) پر برکت باغات اور جاری پانی کی نہریں۔

ہاں قرآن مجید کی گواہی کے مطابق، ایمان و تقویٰ، دنیا کی آبادی کا سبب بھی ہے اور آخرت کی آبادی کا موجب بھی۔
بعض روایات میں آیا ہے کہ جب اس مہلک و دھرم قوم نے نوح کی دعوت کو قبول کرنے سے منہ پھیر لیا، تو خشک سالی اور قحط نے انھیں گھیر لیا، اور ان کے بہت سے اموال و اولاد تباہ و ہلاک ہو گئے، عورتیں ہاتھ ہو گئیں اور ان کے کوئی بچہ پیدا نہ ہوا تو نوح نے ان سے کہا: اگر تم ایمان لے آؤ تو یہ تمام مصیبتیں اور بلائیں تم سے دور ہو جائیں گی، لیکن انھوں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور اسی طرح سے سختی پر قائم رہے، یہاں تک کہ آخری عذاب آپہنچا، جس نے سب کا خاتمہ کر دیا۔

اس کے بعد پھر دوبارہ ڈرانے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور کہتے ہیں: "تم خدا سے ڈرتے کیوں نہیں اور خدا کی عظمت کے قائل کیوں نہیں ہوتے؟" (مالکم لا ترجون الله و قاراً)۔

"حالاً کہ خدا نے تمہیں گوناگوں طریقے کی خلقیتیں دی ہیں" (وقد خلقکم اطواراً)۔

۱۱ "مدراء" "در" (بروزن جر) کے مادہ سے اصل میں پستان مادر سے "دودھ" کے گرنے کے معنی میں ہے اور پھر بارش برسنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ "مد راز" متوازن کا صیغہ ہے۔

۱۲ "وقار" وزن اور عظمت کے معنی میں ہے اور "ترجون" "رجاء" کے مادہ سے، امید کے معنی میں ہے جو بعض اذات خوف سے تو اُم ہوتا ہے اور مارے جملہ کا معنی یہ ہے کہ تم عظمت خدا کے مقابلہ میں خضوع کیوں نہیں کرتے۔

پہلے تم ایک بے قدر قیمت ”نطفہ“ تھے، زیادہ وقت گزرا تھا کہ تمہیں ”علقہ“ بنا دیا اور اس کے بعد ”مصغہ“ کی شکل میں لے آیا، اس کے بعد اس نے تمہیں انسانی شکل و صورت اور جسم عطا کیا، پھر تمہارے جسم کو لباس حیات پہنایا اور تمہیں روح اور حس و حرکت اور حواس و حواس کے ساتھ اسی طرح سے تم نے یکے بعد دیگرے مختلف جنینی مراحل طے کیے، یہاں تک کہ تم ایک مکمل انسان کی شکل و صورت میں، ماں سے پیدا ہو کر اس کے بعد زندگی کے مختلف اطوار اور زندگی کی مختلف شکلیں شروع ہو گئیں۔ تم ہمیشہ اس کی ربوبیت کے ماتحت رہے ہو اور ہمیشہ نئی نئی حالت اختیار کرتے ہو اور ایک جدید خلقت حاصل کرتے ہو، تو پھر تم اپنے خالق کے باعظمت آستانے پر تعظیم کیوں نہیں جھکا کر رکھتے؟ اور ہر سر میں ایک نیاز ذوق اور ہر دل میں ایک نیا شوق ہے اور تم سب کے سب ہمیشہ بدلتے رہتے ہو۔ پچھنے کے احساسات اور جوانی کو دے دیتے ہیں اور جوانی اپنے احساسات اور طبع اور بڑھاپے کے احساسات کے حوالے کر دیتی ہے۔ اس طرح وہ ہر جگہ تمہارے ساتھ ہے اور ہر قدم پر تمہاری رہبری اور ہدایت کرتا ہے اور اس کے اس سارے لطف و عنایت کے یہ کفران اور بے حرمتی کس بنا پر ہے۔؟

ایک نکتہ

”تقویٰ“ اور ”عمران و آبادی“ میں ربط :

قرآن کی مختلف آیات سے، منجملہ ان کے اوپر والی آیات سے یہ نکتہ اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے، کہ ایمان و عدالت، معاشروں کی اصلاح کا باعث ہیں اور کفر، ظلم اور گناہ دیرانی و تباہی کا سبب ہیں۔

سورہ اعراف کی آیہ ۹۶ میں آیا ہے: **وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرَىٰ اٰمَنُوْا وَتَقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَابَاتِ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ** ”اگر شہروں اور بستیوں میں رہنے والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم آسمان و زمین کی برکتوں کے دروازے ان پر کھول دیتے۔“

اور سورہ روم کی آیہ ۴۱ میں آیا ہے: **اَظْهَرَ الْفَسَادِ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ**۔ ”خسکی اور سمندر میں لوگوں کے اعمال کی وجہ سے فساد برپا ہو گیا ہے۔“

اور سورہ شوریٰ کی آیت ۲۰ میں آیا ہے: **وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مَّصِيْبَةٍ فَمَا كَسَبَتْ اَيْدِيكُمْ**۔ ”جو مصیبت بھی تمہیں پہنچتی ہے، وہ تمہارے اعمال کی وجہ سے ہوتی ہے۔“

اور سورہ ماائدہ کی آیہ ۶۶ میں آیا ہے: **وَلَوْ اَنَّكُمْ اَقَامُوا التَّوْرَةَ وَالانجِيلَ وَمَا نَزَّلْنَا عَلَيْكُمْ مِنَ الرِّبِّ لَكُلُوْا مِمَّنْ فَوْقَهُمْ وَاذْكُرُوْا اَنَّكُمْ كُنْتُمْ رِجَالًا مِّنْ اَرْضٍ** ”اگر وہ تورات اور انجیل کو اور جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوا ہے اسے قائم رکھتے، تو وہ آسمان و زمین سے روزی کھاتے۔“ (اور آسمان اور زمین کی برکتیں انہیں گھیر لیتیں)، اور اسی قسم کی دوسری آیات مزید ہیں۔

یہ ”رابطہ“ صرف ایک باطنی و معنوی رابطہ ہی نہیں ہے۔ بلکہ معنوی رابطہ کے علاوہ — جس کے آثار ہمیں اچھی طرح دکھائی دیتے ہیں — ایک واضح مادی رابطہ بھی ہے۔

کفر و بے ایمانی، مسؤلیت کے عدم احساس، قانون شکنی اور اخلاقی اقدار کو فراموش کرنے کا سرچشمہ بھی ہے اور یہ امور معاشروں کی وحدت کے ختم ہونے، اعتماد و اطمینان کے پاپوں کے متزلزل ہونے، اقتصاد و انسانی قوتوں کے ضائع ہونے، اور اجتماعی امتثال کے درہم برہم ہونے کا سبب بھی ہیں۔

واضح رہے کہ وہ معاشرہ جس پر ان امور کی حکمرانی ہو وہ بہت جلد تہمت چلا جاتا ہے، اور سقوط و نابودی کی راہ پر چل پڑتا ہے اور اگر ہم کچھ معاشروں کو دیکھتے ہیں، کہ وہ ایمان و تقویٰ کے نہ ہونے کے باوجود، مادی حالت کے سلسلہ میں، پیش رفت کر رہے ہیں تو اسے بھی بعض اخلاقی اصولوں کی رعایت کا سرمایہ منت سمجھنا چاہیے، جو گزشتہ انبیاء کی میراث اور ضرائع رہبروں، علماء اور دانش مندوں کی صدیوں کی طویل زحماتوں کا نتیجہ ہے۔

اوپر والی آیات کے علاوہ اسلامی روایات میں بھی اس معنی پر بہت زیادہ تکیہ ہوا ہے کہ استغفار اور ترک گناہ، روزی کی کثرت اور زندگی کی بہبود کا سبب میں، منجملہ ان کے :

ایک حدیث میں علیؑ سے آیا ہے، کہ آپ نے فرمایا :

اکثر الاستغفار تجلب الرزق
زیادہ استغفار کر، تاکہ تو روزی کو جلب کرے۔

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے اس طرح نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا :

من انعم الله عليه نعمة فليحمد الله تعالى ، ومن استبطأ
الرزق فليستغفر الله ، ومن حزنه امر فليقل ، لا حول
ولا قوة الا بالله

”جسے خدا نے کوئی نعمت بخشی ہے، وہ خدا کا شکر بجلائے، اور جن کی روزی میں کچھ تاخیر ہو تو وہ استغفار اور طلب بخشش کرے، اور جو کسی حادثہ کی وجہ سے غمگین ہو تو وہ ”لا حول ولا قوة الا بالله“ کہے۔“

نسخ البلاغہ میں بھی یہ آیا ہے کہ:

وقد جعل الله سبحانه الاستغفار سبباً لدرور الرزق ورحمة الخلق، فقال
سبحانه استغفر وار بكم انه كان غفارا يرسل السماء عليكم مدرارا.....“

”خداوند سبحان نے استغفار کو روزی کی زیادتی، اور مخلوق کے لیے رحمت قرار دیا ہے، اور فرمایا ہے کہ اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو، کہ وہ بہت بخشنے والا ہے، اور وہ آسمانوں کی برکتوں والی بارشس تم پر برساتا ہے“ ۱۱

حقیقت یہ ہے کہ بہت سے گناہوں کی سزا، اسی جہان کی محرومیاں ہیں اور جب انسان اس سے توبہ کر کے پاکیزگی اور تقویٰ اختیار کر لیتا ہے تو خدا اس غلاب اور سزا کو اس سے برطرف کر دیتا ہے ۱۲

۱۱-
۱۲-
۱۳-
۱۴-
۱۵-
۱۶-
۱۷-
۱۸-
۱۹-
۲۰-
۲۱-
۲۲-
۲۳-
۲۴-
۲۵-
۲۶-
۲۷-
۲۸-
۲۹-
۳۰-
۳۱-
۳۲-
۳۳-
۳۴-
۳۵-
۳۶-
۳۷-
۳۸-
۳۹-
۴۰-
۴۱-
۴۲-
۴۳-
۴۴-
۴۵-
۴۶-
۴۷-
۴۸-
۴۹-
۵۰-
۵۱-
۵۲-
۵۳-
۵۴-
۵۵-
۵۶-
۵۷-
۵۸-
۵۹-
۶۰-
۶۱-
۶۲-
۶۳-
۶۴-
۶۵-
۶۶-
۶۷-
۶۸-
۶۹-
۷۰-
۷۱-
۷۲-
۷۳-
۷۴-
۷۵-
۷۶-
۷۷-
۷۸-
۷۹-
۸۰-
۸۱-
۸۲-
۸۳-
۸۴-
۸۵-
۸۶-
۸۷-
۸۸-
۸۹-
۹۰-
۹۱-
۹۲-
۹۳-
۹۴-
۹۵-
۹۶-
۹۷-
۹۸-
۹۹-
۱۰۰-

۱۱ ”نہج البلاغہ“ خطبہ ۱۲۲

۱۲ ہم نے اس سلسلہ میں ”گناہ اور معاشرہ کی تباہی“ کے عنوان کے تحت، سورہ ہود کی آیہ ۲ کے ذیل میں، ایک دوسری تشریح بھی کی ہے

تفسیر نمونہ جلد ۹ ص ۱۲۱

- ۱۵۔ اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللهُ سَبْعَ سَمَوَاتٍ طِبَاقًا ۝
 ۱۶۔ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الشَّمْسُ سِرَاجًا ۝
 ۱۷۔ وَاللَّهُ أَنْبَتَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ۝
 ۱۸۔ ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًا ۝
 ۱۹۔ وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ بِسَاطًا ۝
 ۲۰۔ لِتَسْلُكُوا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۝

ترجمہ

- ۱۵۔ کیا تم دیکھتے نہیں، کہ خدا نے سات آسمانوں کو، ایک دوسرے کے اوپر کس طرح سے خلق کیا ہے ؟
 ۱۶۔ اور چاند کو آسمانوں کے درمیان روشنی کا باعث اور سورج کو چراغ فروزاں قرار دیا۔
 ۱۷۔ اور خدا نے تمہیں نباتات کی طرح سے زمین سے اگایا ہے۔
 ۱۸۔ پھر تمہیں اسی زمین کی طرف لوٹائے گا اور پھر تمہیں دوبارہ نکال کھڑا کرے گا۔
 ۱۹۔ اور خدا نے زمین کو مختارے لیے بچھا ہوا فرش قرار دیا ہے۔
 ۲۰۔ تاکہ تم اس کے وسیع راستوں اور ذروں سے گزرو (اور جہاں جانا چاہو..... چلے جاؤ)۔

تفسیر

باغبان ہستی نے تمہیں ایک بھول کی طرح پالا ہے

حضرت "نوح" بہت دھرم مشرکین کے مقابل میں، اپنے گھر سے اور استمدالی بیانات کے ذریعہ، پہلے تو ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کے وجود کی گہرائیوں میں لے گئے، تاکہ وہ آیات انفسی کا مشاہدہ کریں (جیسا کہ گزشتہ آیات میں گزر چکا ہے۔ اس کے بعد، جیسا کہ زیر بحث آیات میں بیان ہوا ہے، انہیں خلقت و آفرینش کے عالم بزرگ میں خدا کی نشانیوں کے مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں۔ اور انہیں آفاق کی سیر کی طرف لے جاتے ہیں۔

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

”سراج“ (چراغ) کی سورج کے لیے تعبیر اور ”نور“ کی ”چاند“ کے لیے تعبیر اس بنا پر ہے کہ ”سورج“ کی روشنی تو خود چراغ کی طرح اسی کے اندر سے چھوٹی ہے، لیکن چاند کا نور خود اسی میں سے نہیں ہے، بلکہ وہ اس عکس کے مشابہ ہے جو آئینہ سے منعکس ہوتا ہے اسی لیے لفظ ”نور“ جو ایک عام مفہوم رکھتا ہے اس کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔
تعبیر کا یہ فرق قرآن کی دوسری آیات میں بھی نظر آتا ہے۔
ہم اس سلسلے میں سورہ یونس کی آیہ ۵ کے ذیل میں (جلد ۶ ص ۶۰-۴۰) بہت زیادہ تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

اس کے بعد دوبارہ انسان کی خلقت کی طرف لوٹتا ہے اور مزید کہتا ہے: ”خدا نے تمہیں نباتات کی طرح زمین سے اگایا ہے“
(والله انبتکم من الارض نباتا)۔
انسان کے بارے میں ”انبات“ کی تعبیر اس بنا پر ہے کہ اولاً انسان کی پہلی خلقت مٹی سے ہے اور ثانیاً وہ تمام غذائیں جو انسان کھاتا ہے اور جن کی وجہ سے نشوونما پاتا ہے، وہ سب زمین سے ہیں۔ یا تو وہ براہ راست زمین سے ہوتی ہیں جیسے بنزیاں، نلے اور پھل یا غیر مستقیم طور پر مثلاً جانوروں کے گوشت اور نائٹا انسان اور نباتات کے درمیان بہت زیادہ مشابہت ہے اور بہت سے ایسے قوانین جو نباتات کی غذا، تولید مثل اور نشوونما میں کار فرما ہیں وہ انسان پر بھی لاگو ہیں۔
یہ تعبیر انسان کے بارے میں بہت پر معنی ہے اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ مسئلہ ہدایت میں خدا کا کام صرف ایک معلم و استاد کا کام ہی نہیں ہے، بلکہ اس کا کام ایک باغبان کی طرح ہے جو نباتات کے بیج کو ایک مائع ماحول میں قرار دیتا ہے تاکہ ان میں چھپی ہوئی استعداد ظہور میں آئے۔

سورہ آل عمران کی آیہ ۳۲ میں حضرت مریم کے بارے میں بھی یہ آیا ہے: ”وانبتھا نباتا حسنا“: ”خدا نے بہت ہی اچھے طریقے سے مریم کے وجود کو پیدا کیا اور اس کی پرورش کی“، یہ سب اسی لطیف نکتہ کی طرف اشارہ ہے۔
اس کے بعد مسئلہ معاد کی طرف، جو مشرکین کے لیے پیچیدہ مسائل میں سے ایک ہے، متوجہ ہوتا ہے اور فرماتا ہے: ”اس کے بعد وہ تمہیں اسی زمین کی طرف، جس سے اس نے تمہیں اگایا تھا، دوبارہ پٹا دے گا اور پھر دوبارہ تمہیں اس سے نکال کھڑا کرے گا (ثم يعيدکم فیہا و ینخرجکم اخراجا)۔

ابتداء میں بھی تم مٹی ہی تھے، پھر دوبارہ مٹی کی طرف لوٹ جاؤ گے اور وہی ذات جس میں یہ قدرت تھی کہ تمہیں ابتداء میں مٹی سے پیدا کرے، یہ قدرت رکھتی ہے کہ دوبارہ مٹی ہو جانے کے بعد تمہارے جسم پر دوبارہ لباس حیات پہنا دے۔
مسئلہ ”توحید“ سے ”معاد“ کی طرف یہ انتقال، جو اد پر والی آیات میں بہت ہی عمدہ طریقہ پر منعکس ہوا ہے، ان دونوں مسئلوں کے نزدیکی ربط کو بیان کرتا ہے اور اس طرح نوح، مخالفین کے مقابل میں، نظام آفرینش کے طریق سے، توحید پر بھی استدلال کرتے ہیں،

اس آیت میں ایک قاعدے کے لحاظ سے تو ”انباتا“ کہا جانا چاہیے تھا، لیکن آیت میں کچھ مقدر ہے اور وہ اس طرح ہے ”انبتکم من الارض فنبتکم نباتا“ (تفسیر فخر رازی و ابوالفتح رازی)

اور اسی طریقہ سے معاد پر بھی استدلال کرتے ہیں۔

اس کے بعد پھر نئے سرے سے آیات آفاقی اور عالم کبیر میں توحید کی نشانیوں کی طرف لوٹتا ہے اور زمین کے وجود کی نعمت کے متعلق گفتگو کرتا ہے، فرماتا ہے: ”خدا نے زمین کو مختارے لیے بچھا ہوا فرش قرار دیا، (و اللہ جعل لکم الارض بساطاً)۔“

یہ نہ تو ایسی سخت ہے کہ اس پر آرام اور آندورفت ہی نہ کر سکو اور نہ ایسی نرم کہ تم اس میں دھنس جاؤ اور اس پر چل پھری نہ سکو۔ اور نہ یہ ایسی گرم اور جلانے والی ہے کہ اس پر گرمی کی وجہ سے تکلیف اٹھاؤ اور نہ ایسی سرد اور بے حرارت ہے کہ اس پر زندگی بسر کرنا مختارے لیے مشکل ہو جائے۔ اس کے علاوہ وہ ایک ایسا وسیع آمادہ و تیار فرش ہے۔ جس میں مختاری زندگی کی تمام ضروریات موجود ہیں۔

نہ صرف ہوا زمینیں ہی فرش کی طرح کچی ہوئی ہیں بلکہ پہاڑ بھی، ان دروں اور شگافوں کی وجہ سے، جو ان کے درمیان موجود ہیں اور عبور کرنے کے قابل ہیں، پچھے ہوئے فرش ہی ہیں ”ہر ہدف و مقصد یہ ہے کہ تم ان وسیع راستوں اور دروں سے، جو اس زمین میں موجود ہیں، گزر سکو اور جس علاقہ میں جانا چاہو جا سکو“ (لتسلكوا منها سبلاً فجاجاً)۔

”فجاج“ (بروزن مزج) جمع ہے ”فج“ (بروزن حج) کی، اس درہ کے معنی میں ہے جو دو پہاڑوں کے درمیان بہتا ہے۔ اور وسیع و کشادہ راستہ کو بھی کہا جاتا ہے۔

اس طرح ”نوح“ اپنی گفتگو کے اس حصہ میں، کبھی تو آسمانوں اور آسمان کے ستاروں میں خدا کی نشانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور کبھی گڑھ زمین میں اس کی گونا گوں نعمتوں کی طرف، اور کبھی انسان کی ساخت اور اس کی حیات کے مسئلہ کی طرف جو خدا کی شناخت کی بھی ایک دلیل ہے اور مسئلہ معاد کے اثبات کے لیے بھی۔

لیکن نہ تو پہلے انذاروں، بشارتوں اور تشوہیوں نے اس بہت دھرم قوم کے سیاہ دل میں کوئی اثر کیا اور نہ ہی کسی منطقی استدلال نے، وہ اسی طرح سے مخالفت اور کفر پر تلے رہے اور حتیٰ کو قبول کرنے سے پہلو تھی کرتے رہے، جیسا کہ بعد والی آیات میں ان کی خیرہ سری کا انجام بیان ہوا ہے۔

۱۵ ”بساط“ ”بسٹ“ کے مادہ سے کسی چیز کو پھیلانے کے معنی میں ہے، اس لیے لفظ ”بساط“ ہر پھیلی ہوئی وسیع چیز کو کہا جاتا ہے جس کا ایک مصداق فرش ہے۔

۱۶ مفردات ”راغب“ مادہ ”فج“

- ۲۱۔ قَالَ نُوحٌ رَبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِي وَاَتَّبَعُوا مَن لَّمْ يَزِدْهُ مَالًا
وَوَلَدُهُ اِلَّا خَسَارًا ۝
- ۲۲۔ وَمَكَرُوا مَكْرًا كَبَّارًا ۝
- ۲۳۔ وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا
يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ۝
- ۲۴۔ وَقَدْ اَضَلُّوا كَثِيْرًا ۗ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ۝
- ۲۵۔ مِمَّا خَطِيْعَتِهِمْ اُغْرِقُوا فَاَدْخِلُوْا نَارًا ۗ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ۝

ترجمہ

- ۲۱۔ نوح نے (ان کی ہدایت سے مایوس ہونے کے بعد) عرض کیا : پروردگارا! انھوں نے میری نافرمانی کی اور ان لوگوں کی پیروی کی، جن کے مال اور اولاد نے خسارے کے سوا ان میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا۔
- ۲۲۔ اور (ان گمراہ راہبروں نے) ایک عظیم مکر کیا۔
- ۲۳۔ اور انھوں نے یہ کہا کہ : اپنے خداؤں اور بتوں سے دست بردار نہ ہونا، خصوصاً ”ود“ و ”سواع“ و ”یغوث“ و ”یعوق“ و ”نسر“ کو نہ چھوڑنا۔
- ۲۴۔ اور انھوں نے بہت سے گروہوں کو گمراہ کر دیا۔ خداوند! ظالموں میں ضلالت اور گمراہی کے علاوہ کسی چیز کا اضافہ نہ کرنا۔
- ۲۵۔ (ہاں! آخر کار) وہ سب کے سب اپنے گناہوں کی وجہ سے غرق ہو گئے اور جہنم کی آگ میں داخل ہوئے اور انھیں اپنے لیے خدا کے سوا اور کوئی یار و مددگار نہ ملا۔

تفسیر خدا کا لطف تجھ سے مدارات کرتا ہے

جب نوح نے سیکڑوں سال تک اپنی پوری پوری کوشش کر کے دیکھی اور وہ قوم ایک چھوٹے سے گروہ کے سوا، اسی طرف بت پرستی، گمراہی اور فساد پر ڈٹی رہی، تو وہ ان کی ہدایت سے مایوس ہو گئے اور بارگاہِ خدا کی طرف رخ کیا، اور ایک استدلالی مناجات ضمن میں خدا سے ان کے لیے عذاب کا تقاضا کیا، جیسا کہ زیر بحث آیت میں آیا۔

نوح نے کہا: پروردگارا! انھوں نے میری نافرمانی کی اور ایسے شخص کی پیروی کی جس کے مال و اولاد نے خسارے کے سوا اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا (قال نوح سب انھم عصوتی و اتبعوا من لعیزہ مالہ و ولدہ الا خساراً)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس قوم کے رہبر ایسے لوگ ہیں، جن کا امتیاز مال و اولاد کی زیادتی ہے اور وہ مال و اولاد بھی لے جو فساد و خسارے کے سوا کسی کام نہیں آتے، نہ تو وہ مخلوق ہی کی خدمت کرتے ہیں اور نہ ہی خالق کے سامنے خضوع و خشوع کرتے ہیں اور یہ لوگ رسائل و امکانات ان کے غرور و طغیان اور سرکشی کا سبب بن گئے ہیں۔

اگر ہم نوح بشر کی تاریخ کی طرف نگاہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ مختلف قوموں کے بہت سے رہبر اسی قماش کے تھے، وہ ایسے لوگ تھے جن کا تنہا امتیاز، مال حرام جمع کرنا اور غیر صالح اولاد کو وجود میں لانا اور اس کے بعد سرکشی اور طغیان اور آخر میں اپنے افکار و نظریات، مستضعف اور کمزور لوگوں پر لادنا اور انھیں زنجیروں میں جکڑنا تھا۔

اس کے بعد مزید کہنا ہے، ”ان گمراہ راہبروں نے مکرِ عظیم کیا“ (و مکر واکبر اکباراً)۔

”کبار“ جو ”کبر“ سے مبالغہ کا صیغہ ہے اور یہاں مکرہ کی صورت میں ذکر ہوا ہے۔ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ انھوں نے لوگوں کو گمراہ کرنے اور نوح کی دعوت کو قبول کرنے سے روکنے کے لیے بہت عظیم اور وسیع شیطانی منصوبے بنا رکھے تھے۔ لیکن وہ منصوبے کیا تھے، ٹھیک طور پر مشخص نہیں ہیں۔

احتمال یہ ہے کہ وہی بت پرستی کا مسئلہ ہوگا، کیونکہ بعض روایات کے مطابق، بت پرستی نوح سے پہلے موجود نہیں تھی۔ بلکہ نوح کی قوم نے ہی اسے ایجاد کیا تھا۔ اس مسئلہ کا سرچشمہ یہ تھا کہ آدم اور نوح کے درمیانی زمانہ میں کچھ ایسے نیک اور صالح افراد ہو گزرے تھے۔ جن سے لوگ اظہارِ محبت کیا کرتے تھے۔ شیطان (اور شیطان صفت انسانوں) نے لوگوں کے اس لگاؤ اور محبت سے سوءاستفادہ کیا اور انھیں ان بزرگوں کے محبت بنانے، اور ان مجسموں کی عزت و احترام کرنے کا شوق دلایا۔

لیکن کچھ زیادہ دقت نہ گزرا تھا کہ بعد میں آنے والی نسلیں اس موضوع کے رابطہ تاریخی کو بھول گئیں اور انھوں نے خیال کیا کہ یہ مجسمے ایسے محترم موجودات ہیں، جن کی پرستش اور عبادت کرنا چاہیے اور اس طرح سے وہ بتوں کی پرستش میں سرگرم ہو گئے اور ظالم مستبکرین نے انھیں عنفیت میں رکھ کر اس طریقے سے انھیں اپنی قید و بند میں لے لیا اور ایک عظیم مکر و فریب واقع ہوا۔

ہو سکتا ہے کہ بعد والی آیت اس مطلب کی گواہ ہو۔ کیونکہ اس عظیم مکر کی طرف ایک اجمالی اشارہ کرنے کے بعد مزید کہتا ہے، ”ان کے زمانے کہا، اپنے فلاؤں اور بتوں سے دست بردار نہ ہو (وقالوا لا تذرن الہتکم)۔ اور خدا نے یگانہ کے بارے میں نوح کی دعوت ہرگز قبول نہ کرنا، وہ خدا جو نہ تو دکھائی ہی دیتا ہے اور نہ ہی ہاتھ کے ساتھ چھونے کے قابل ہے۔

انہوں نے خصوصیت کے ساتھ انہیں پانچ بتوں کے بارے میں تاکید کی اور کہا: ”ود“، ”سواع“، ”یعوق“، ”یعوق“ اور ”نسر“ کو ہرگز نہ چھوڑنا اور زمان کے دامن کو چھوڑنا (ولا تذرن وذا ولا سواعا ولا یغوث و یعوق و نسرًا)۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پانچوں بت کچھ خاص امتیازات رکھتے تھے اور وہ گمراہ قوم ان کی طرف خاص طور پر متوجہ تھی اور اسی بناء پر ان کے فرصت طلب رہبر بھی ان کی عبادت پر تکیہ کرتے تھے۔

یہ بات کہ یہ پانچ بت کہاں سے آئے؟ اس سلسلہ میں گونا گوں روایات ہیں۔ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ پانچ نیک اور صالح افراد کے نام ہیں، جو نوح سے پہلے دنیا میں ہو گزرے ہیں۔ جب وہ دنیا سے چلے گئے تو انہیں کی تحریک پر لوگوں نے یادگار کے طور پر ان کے مجسمے بنائے اور ان کا احترام و عزت کرنے لگے اور آہستہ آہستہ بت پرستی کی صورت اختیار کر لی۔

۲۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ آدم کے پانچ بیٹوں کے نام ہیں، ان میں سے جب بھی کوئی دنیا سے جاتا تو اس کا مجسمہ یادگار کے طور پر بنالیتے، لیکن کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد یہ تعلقات فراموش ہو گئے اور نوح کے زمانہ میں ان کی پرستش کی لہر دوڑ گئی۔ بعض کا کہنا یہ ہے کہ یہ ان بتوں ہی کے نام ہیں جو خود نوح کے ہی زمانہ میں بنائے گئے تھے، اور یہ اس وجہ سے ہو کہ نوح لوگوں کو آدم کی قبر کے گرد طواف کرنے سے روکتے تھے تو ایک گروہ نے انہیں کی تحریک پر اس کے کچھ مجسمے بنائے اور ان کی پرستش میں مشغول ہو گئے۔

اتفاقاً یہ پانچوں بت زمانہ جاہلیت کے عربوں کی طرف منتقل ہو گئے، پھر ہر قبیلہ نے ان بتوں میں سے ایک کو اپنے لیے انتخاب کر لیا، البتہ یہ بات بہت بعید نظر آتی ہے کہ خود وہ بت منتقل ہوئے ہوں بلکہ ظاہر یہ ہے کہ ان کے نام منتقل ہوئے، اور انہوں نے ان ناموں کے بت بنالئے، لیکن بعض مفسرین نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ یہ پانچوں بت طوفانِ نوح میں دفن ہو گئے تھے اور عربوں کے زمانہ جاہلیت میں شیطان نے انہیں باہر نکالا اور لوگوں کو ان کی پرستش کی دعوت دی۔

پھر اس بارے میں کہ زمانہ جاہلیت کے عرب قبائل میں یہ بت کس طرح تقسیم ہوئے، اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ”ود“ بت تو ”بنی کلب“ کے قبیلہ سے متعلق تھا جو سرزمین ”دومتہ الجندل“ میں رہتا تھا (وہ شہر جو بتوک کے نزدیک ہے اور جسے موجودہ زمانہ میں ”جوف“ کہتے ہیں) اور ”سواع“ قبیلہ ”بذیل“ سے جو سرزمین ”رباط“ میں تھا، متعلق تھا، اور

۱۔ مجمع البیان، تفسیر علی بن ابراہیم، تفسیر ابوالفتوح رازی اور دوسری تفاسیر (زیر بحث آیات کے ذیل میں)

۲۔ تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۷۷

”یعوث“ بت ”بنی قطف“ کے قبیلہ سے یا ”بنی ندرج“ کے قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا اور ”یعوق“ قبیلہ ہمدان سے، اور ”نسر“ ذی القعدة سے جو حیر کے قبائل میں سے تھا۔

مجموعی طور پر ان پانچ بتوں میں سے تین بت (یعوث، یعوق اور نسر) سرزمین بین میں تھے، جو ”ذونواس“ کے مین پر تسلط سے ختم ہو گئے اور اس علاقہ کے لوگ دینِ یہود سے وابستہ ہو گئے۔

”واقدی“ مشہور مورخ کہتا ہے کہ ”ود“ بت مرد کی شکل میں تھا اور ”سواع“ عورت کی شکل میں ”یعوث“ شیر کی صورت میں اور ”یعوق“ گھوڑے کی شکل اور ”نسر“ ”باز“ کی صورت میں (جو ایک معروف پرندہ ہے)۔

البتہ زمانہ جاہلیت کے عربوں خصوصاً اہل مکہ کے پاس اور بت بھی تھے۔ جن میں سے ایک بت ”جل“ تھا، جو ان کے بتوں میں سے سب سے بڑا تھا اور وہ خانہ کعبہ کے اندر رکھا ہوا تھا۔ اس کا طول ۱۸ ماٹھ تھا۔ بت ”اساف“ حجر اسود کے مقابل تھا، اور بت ”ناملہ“ (خانہ کعبہ کے جنوبی کونہ میں) رکن یمانی کے سامنے تھا اور اسی طرح ”لات“ و ”عزی“ بت تھے۔

اس کے بعد نوح مزید کہتے ہیں: ”خداوند! ان گمراہ اور خود غرض رہبروں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا۔“ (وقد اضلوا کثیراً)۔
”خداوند! ظالموں میں ضلالت دگرہابی کے سوا کسی اور چیز کا اضافہ نہ کر“ (ولا تنزد الظالمین الا ضلالاً)۔
ظالموں اور گمراہوں میں ضلالت دگرہابی کو زیادہ کرنے سے مراد وہی ان سے توفیق الہی کا سلب ہونا ہے جو ان کی بدبختی کا سبب بن جاتا ہے جسے وہ اپنے ظلم کی وجہ سے پاتے ہیں، کیونکہ خدا نور ایمان کو ان سے چھین لیتا ہے اور کفر کی تاریکی کو اس کا جانشین بنا دیتا ہے۔
یہ ان کے اعمال کی خاصیت ہے، جس کی خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے، کیونکہ ہر موجود جو تاثیر بھی رکھتا ہے، وہ اسی کے حکم سے ہے (غور کیجئے)۔

جو کچھ بھی ہو، کفر و ایمان اور ہدایت و ضلالت کے سلسلہ میں وہ خداوند تعالیٰ کی حکمت کے ساتھ کسی قسم کی منافات نہیں رکھتا اور اختیار کے سلب ہونے کا سبب نہیں بنتا۔

آخر کا آخری زیر بحث آیت میں، اس سلسلہ میں آخری بات خدا یہ فرماتا ہے: ”وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے غرق ہو گئے اور انھیں لگ میں

۲۱ مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۲۶۳ و اعلام القرآن ص ۶۲۱

۲۲ مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۲۶۳

۲۳ ”اضلوا“ کی ضمیر اس گروہ کے دولت مند رؤسا اور رہبروں کی طرف لٹتی ہے اور قرینہ اس کا گزشتہ آیت ہے جو یہ کہتی ہے: وقالوا لا تذرن الہتکم“ انھوں نے کہا کہ اپنے بتوں کو نہ چھوڑو“ لیکن بعض مفسرین نے یہ احتمال دیا ہے کہ یہ ضمیر بتوں کی طرف لٹتی ہے کیونکہ وہی گمراہی کا سبب تھے (اور اسی کے مشابہ سورہ ابراہیم کی آیہ ۲۶ میں بھی آیا ہے، لیکن جمع مذکر کی صورت میں نہیں بلکہ جمع مؤنث کی صورت میں) لیکن یہ احتمال زیر بحث آیت میں بہت بعید نظر آتا ہے۔

۲۴ لہ ”م

۲۵ لہ ”ذ

۲۶ لہ ”نق

ج کر دیا گیا اور انھیں خدا کے سوا اور کوئی یار و مددگار نہ ملا۔ جو اس کے خشم و غضب سے ان کا دفاع کرنے۔ (مما خطیثا تھم
 ر قوا فادخلوا نارًا فلم یجدوا لھم من دون اللہ انصارا)۔

آیت کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ غرق ہونے کے بعد بلا فاصلہ آگ میں داخل کر دیئے گئے اور یہ عجیب بات ہے کہ
 آگ میں سے فوراً آگ میں داخل ہوں، اور یہ آگ وہی برزخ والی آگ ہے، چونکہ قرآن مجید کی آیات کی گواہی کے مطابق ایک گروہ کو موت کے
 بعد عالم برزخ میں سزا ملے گی اور بعض روایات کے مطابق ”قبر“ یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک
 گڑھ ہے۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ اس سے مراد قیامت کی آگ ہے لیکن چونکہ قیامت کا وقوع قطعی اور یقینی ہے اور اس میں کوئی زیادہ فاصلہ
 نہیں ہے، لہذا فعل ماضی کی صورت میں ذکر ہوا ہے۔

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ اس سے مراد دنیا کی آگ ہے، کہتے ہیں کہ خدا کے حکم سے، طوفان کی انھیں موجوں کے درمیان ایک
 آگ ظاہر ہوئی اور انھیں نگلی گئی۔

۱۔ ”مما خطیثا تھم“ میں ”من“ یا جمعیت یا لام تلیل کے معنی میں ہے اور ”ما“ یہاں زائدہ اور تائید کے لیے ہے۔

۲۔ ”فخر رازی“ نے اپنے تفسیر میں اسے ایک قول کے عنوان سے نقل کیا ہے جلد ۲۰ ص ۱۴۵

۳۔ تفسیر ”الوافیٰ نوح رازی“ جلد ۱۱ ص ۲۸۰

۲۶۔ وَقَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَيَّ الْأَرْضَ مِنَ الْكُفْرِيِّينَ

دَيَّارًا ۱

۲۷۔ إِنَّكَ إِن تَذَرَهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْا إِلَّا فَا

كْفَارًا ۱

۲۸۔ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيْ مُؤْمِنًا

وَاللِّمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِيْنَ إِلَّا

تَبَارًا ۱

ترجمہ

۲۶۔ نوح نے کہا: پروردگارا! روئے زمین پر کفار میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہ رہنے دے۔

۲۷۔ کیونکہ اگر تو انہیں رہنے دے گا، تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کر دیں گے اور ایک فاجر و کافر نسل کے سوا کچھ وجود میں نہیں لائیں گے۔

۲۸۔ پروردگارا! مجھے بخش دے، اور اسی طرح میرے ماں باپ کو اور ان تمام لوگوں کو، جو میرے گھر میں ایمان کے ساتھ وارد ہوئے، اور تمام مومن مرد اور مومن عورتوں کو بخش دے، اور ظالموں میں ہلاکت کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ فرما۔

تفسیر

اس فاسد و مفسد قوم کو چلے جانا چاہیے!

یہ آیات اسی طرح سے، نوح کی گفتگو اور خدا کی بارگاہ میں قوم کی شکایت اور ان کے بارے میں بددعا اور نفرین کو جاری رکھے ہوئے ہیں، فرماتا ہے: ”پروردگارا! کفار میں سے کسی کو روئے زمین پر زندہ نہ رہنے دے“ (وقال نوح رب لا تذر علی

رض من الکافرین دیارا۔

یہ بات انہوں نے اس وقت کہی جب وہ مکمل طور پر ان کی ہدایت سے مایوس ہو گئے تھے اور اپنی آخری کوشش ان کے ایمان لانے کے سلسلہ میں کر چکے تھے، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، اور صرف غمخوڑے سے لوگ ان پر ایمان لائے۔
 ”علی الارض“ (صغریٰ پر) کی تفسیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ نوح کی دعوت بھی عالمی اور جہانی تھی اور وہ طوفان اور آلاب بھی جو بد میں آیا عالمی تھا۔

”دیار“ (بروزن سیار) ”دار“ کے مادہ سے، اس شخص کے معنی میں ہے جو گھر میں رہائش رکھتا ہو، یہ لفظ عام طور پر نفی عموم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، مثلاً کہا جاتا ہے (ما فی الدار دیاسر) (گھر میں کوئی نہیں رہتا)۔

اس کے بعد نوح اپنی نفرین اور بد دعا کرنے کے بارے میں استدلال کرتے ہیں اور مزید کہتے ہیں: ”کیونکہ اگر تو انہیں چھوڑ دے گا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کر دیں گے اور ناجرود کافر نسل کے سوا اور کچھ وجود میں نہیں لائیں گے“۔ (انک ان تذرہم یضلو عبادک ولا یلدوا الا فاجرا کفارا)۔

یہ گفتگو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ انبیاء کی نفرین و بد دعا، جن میں نوح بھی ہیں، غیض و غضب، انتقام جوئی اور کینہ پروری کی بناء پر نہیں ہوتی تھی، بلکہ وہ ایک منطقی حساب کی صورت میں ہوتی تھی اور نوح کم حوصلہ افراد کی طرح نہیں تھے کہ تھوڑی سی بات کے لیے اپنے سے باہر ہو جائیں اور نفرین و بد دعا کرنے لگ جائیں، بلکہ آپ نے نو سو پچاس (۹۵۰) سال کی حکومت، صبر و شکیبائی اور خون دل پینے اور کھلے مایوسی کے بعد نفرین کے لیے زبان کھولی تھی۔

اس بارے میں کہ نوح نے یہ کیے سمجھ لیا کہ اب یہ ایمان نہیں لائیں گے اور اس کے ساتھ وہ ان بندگان خدا کو جو اس ماحول میں رہتے تھے گمراہ کریں گے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان کی آنے والی نسل بھی فاسد و مفسد ہوگی۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ اس غیب پر اطلاع و آگاہی کی بناء پر تھا جو خدا نے انہیں دیا تھا۔ یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ نوح نے اس مطلب کا وحی الہی سے استفادہ کیا تھا، جہاں فرماتا ہے: و اوحی الی نوح انه لن یؤمن من قومک الا من قد آمن۔ نوح کی طرف وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے کوئی بھی شخص سوائے ان کے جو ایمان لائے ہیں، ایمان نہیں لائیں گے۔
 سورہ ہود آیہ ۲۶

لیکن یہ احتمال بھی قابل قبول ہے کہ نوح نے، فطری عادت اور عمومی حساب سے اس حقیقت کو معلوم کر لیا تھا، کیونکہ وہ قوم سے سارے نو سو سال تک موثر ترین بیانات کے ساتھ تبلیغ کی گئی ہو، اور وہ پھر بھی ایمان نہ لائے ہوں، اس کی ہدایت کی امید نہ تھی اور چونکہ یہ کافر روہ

سے بعض کا کتابہ کے اصل میں ”دیوار“ (بروزن حیوان) تھا، اس کے بعد ”واؤ“ ”یاؤ“ میں بدل گئی، اور یاؤ کا یاؤ یاب اور نام ہو گیا، انہوں نے غرضتہاں سے
 جلد ۶ ص ۴۹۵ و تفسیر فخر رازی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

سے اس معنی کی طرف بہت سی روایات میں اشارہ ہوا ہے (نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۲۸)

معاشرے میں قطعی اکثریت رکھتا تھا اور تمام رسائل و امکانات ان کے اختیار میں تھے، لہذا بطحا وہ دوسروں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرے اور اس قسم کی قوم کی آئندہ نسل قطعی طور پر فاسد اور خراب ہوتی، ان تینوں احتمالات کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

”فاجر“ اس شخص کے معنی میں ہے جو بڑے اور قبیح گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اور ”کفار“ ”کفر“ میں مبالغ ہے، اس بنا پر ان دو الفاظ کے درمیان فرق یہ ہے کہ ان میں سے ایک عملی کاموں سے مربوط ہے اور دوسرا اعتقادی پہلوؤں سے۔

ان آیات کے مجموعہ سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا کے عذاب ”حکمت“ کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ وہ جمعیت جو فاسد و فاسد ہو ان کی آئندہ آنے والی نسلیں بھی فساد و گمراہی کے خطرے سے دوچار ہوں، وہ خدا کی حکمت میں زندگی اور حیات کا حق نہیں رکھتیں، طوفان (جہلی) یا زلزلہ یا کوئی اور دوسری بلانازل ہوگی اور انھیں صفحہ ہستی سے مٹا دے گی، جیسا کہ طوفان نوح نے زمین کو اس بری قوم کے وجود کی گواہی سے پاک کر دیا۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ قانون الہی کسی خاص زمانہ اور مکان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ہمیں متوجہ رہنا چاہیے کہ اگر اس وقت بھی کوئی فاسد و فاسد قوم اور اس کی اولاد ”فاجر“ ”کفار“ ہو تو انھیں بھی عذاب الہی کا منتظر رہنا چاہیے، کیونکہ ان امور میں کوئی تمیز نہیں ہے اور یہ ایک سنت الہی ہے۔

”یصلوا عبادک“ (تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے) کی تعبیر ممکن ہے اس چھوٹے سے زمین کے گروہ کی طرف اشارہ ہو، جو اس طویل مدت میں نوح پر ایمان لایا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ عامۃ الناس میں سے مستضعف لوگوں کی طرف اشارہ ہو جو گمراہ رہبروں کے دباؤ اور فشار سے ان کے دین و مذہب کی پیروی کرتے ہیں۔

آخر میں نوح اپنے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو ان پر ایمان لائے تھے اس طرح دعا کرتے ہیں: پروردگارا! مجھے بخش دے اور اسی طرح میرے ماں باپ اور ان تمام لوگوں کو جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں داخل ہوئے تھے اور تمام زمین و مومنات کو بھی بخش دے اور ظالموں کے لیے ہلاکت کے سوا کسی اور چیز کا اضافہ نہ کر۔ (رب اغفر لی ولوالدی وللمؤمنات والمؤمنات ولا تقلد الظالمین الا تبارا)۔

یہ طلب مغفرت اس لیے ہے کہ نوح یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگرچہ میں نے صد سال مسلسل تبلیغ کی ہے، اور اس راہ میں ہر قسم کی تکلیف اور مصیبت جھیلی ہے، لیکن چونکہ ممکن ہے کہ اس مدت میں مجھ سے کوئی ترک اولیٰ سرزد ہو گیا ہو، تو میں اس کے بارے میں بھی غفور بخشش کا تقاضا کرتا ہوں، اور تیری بارگاہ مقدس میں ہرگز خود کو بری قرار نہیں دیتا۔

اور ”اولیاء اللہ“ کی حالت اسی طرح ہے کہ وہ راہ خدا میں ہر قسم کی زحمت و تکلیف اور سعی و کوشش کے بعد بھی اپنے آپ کو مقصر سمجھتے ہیں اور ہرگز غرور و تکبر اور خود کو بڑا سمجھنے میں گرفتار نہیں ہوتے۔ نوح حقیقت میں چند افراد کے لیے طلب مغفرت کرتے ہیں۔

”تبار“ ہلاکت کے معنی میں ہے اور ”زبان اور خارے“ کے معنی میں بھی اس کی تفسیر ہوئی ہے۔

نوح
نہ
قرآ
ہوئی ہے
قرآ
میں حاصل کرے
م
دیا گیا ہے
کی مدت
تقریباً ۲۰۰
اپنی قوم کے
نور
بازگشت ا
بشرق اور
ا
یہ
نورات کی

اول: اپنے لیے، کہ ہمیں ایسا نہ ہو کہ کوئی قصور یا ترکِ دلی ان سے سرزد ہو گیا ہو۔

دوم: اپنے ماں باپ کے لیے، ان کی زحمات کی قدر دانی کے باعث اور حق شناسی کے پیشِ نظر۔

سوم: تمام ان لوگوں کے لیے جو ان پر ایمان لائے، اگرچہ وہ بہت تھوڑے تھے اور پھر وہ آپ کے ساتھ کشتی پر سوار ہوئے کہ وہ کشتی بھی نوح کا گھر تھی۔

چہارم: تمام جہان اور طول تاریخ میں ایمان لانے والے مردوں اور عورتوں کے لیے، اور یہاں سے اپنا رابطہ سارے عالم کے

مومنین سے برقرار کر رہے ہیں۔

لیکن آخر میں پھر ظالموں کی نابودی کی تاکید کرتے ہیں، جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے ظلم کی بناء پر اسی قسم کے عذاب

کے مستحق ہیں۔

چند نکات

نوح پہلے اولوا العزم پیغمبر

قرآن مجید بہت سی آیات میں نوح کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور مجموعی طور پر قرآن کی آیتیں سورتوں میں اس عظیم پیغمبر کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے، اور ان کا نام ۴۳ مرتبہ قرآن میں آیا ہے۔

قرآن مجید نے ان کی زندگی کے مختلف حصوں کی باریک بینی کے ساتھ تفصیل بیان کی ہے ایسے حصے جو زیادہ تر تعلیم و تربیت اور پند و نصیحت حاصل کرنے کے پہلوؤں سے مربوط ہیں۔

مورخین و مفسرین نے لکھا ہے کہ نوح کا نام "عبد النفار" یا "عبد الملک" یا "عبد اللہ" تھا اور "نوح" کا لقب انھیں اس لیے دیا گیا ہے، کیونکہ وہ سالہا سال اپنے اوپر یا اپنی قوم پر نوحہ گری کرتے رہے۔ آپ کے والد کا نام "لمک" یا "لامک" تھا۔ اور آپ کی عمر کی مدت میں اختلاف ہے، بعض روایات میں ۱۴۹۰ اور بعض میں ۲۵۰۰ سال بیان کی گئی ہے، اور ان کی قوم کے بارے میں بھی طوفانی عمریں تقریباً ۲۰۰ سال تک لکھی ہیں، جو بات مسلم ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے بہت طولانی عمر پائی ہے، اور قرآن کی صراحت کے مطابق آپ ۹۵۰ سال اپنی قوم کے درمیان رہے (اور تبلیغ میں مشغول رہے)۔

نوح کے تین بیٹے تھے "حام" "سام" "یا فث" اور مؤرخین کا نظریہ یہ ہے کہ کوزہ زمین کی اس وقت کی تمام نسل انسانی کی بازگشت انھیں تینوں فرزندوں کی طرف ہے۔ ایک گروہ "حامی" نسل ہے، جو افریقہ کے علاقہ میں رہتے ہیں۔ دوسرا گروہ "سامی" نسل ہے جو شرق اوسط اور شرق تخریب کے علاقوں میں رہتے ہیں اور "یا فث" کی نسل کو چین کے ساکنین سمجھتے ہیں۔

اس بارے میں بھی، کہ نوح طوفان کے بعد کتنے سال زندہ رہے، اختلاف ہے، بعض نے ۵۰ سال لکھے ہیں اور بعض نے ۶۰ سال۔

یہود کے منابع (موجودہ تورات میں بھی نوح کی زندگی کے بارے میں تفصیلی بحث آئی ہے، جو کئی لحاظ سے قرآن سے مختلف ہے، اور

تورات کی تحریف کی نشانیوں میں سے ہے۔

یہ مباحث تورات کے سفر ”مکون“ میں فصل ۶، ۷، ۸، ۹ اور ۱۰ میں بیان ہوئے ہیں۔
نوح کا ایک اور بیٹا بھی تھا، جس کا نام ”کنعان“ تھا۔ جس نے باپ سے اختلاف کیا، یہاں تک کہ کشتی نجات میں ان کے
بیٹھے کے لیے بھی تیار نہ ہوا، اس نے بڑے لوگوں کے ساتھ صحبت رکھی اور خاندان نبوت کی قدر و قیمت کو ضائع کر دیا اور قرآن کی صراحت
مطابق آخر کار وہ بھی باقی کفار کے مانند طوفان میں غرق ہو گیا۔

اس بارے میں کہ اس طویل مدت میں کتنے افراد نوح پر ایمان لائے، اور ان کے ساتھ کشتی میں سوار ہوئے، اس میں بھی اختلاف
بعض نے ۸۰ اور بعض نے، افراد کئے ہیں۔

نوح کی داستان عربی اور فارسی ادبیات میں بہت زیادہ بیان ہوئی ہے، اور زیادہ تر طوفان اور آپ کی کشتی نجات پر
ہوا ہے۔

نوح صبر و شکر اور استقامت کی ایک داستان تھے، اور محققین کا کہنا ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے انسانوں کی ہدایت کے لیے
منطق کے علاوہ عقل و استدلال کی منطق سے بھی مدد لی (جیسا کہ اس سورہ کی آیات سے اچھی طرح ظاہر ہے) اور اسی بناء پر آپ اس جہان کے
خدا پرستوں پر ایک عظیم حق رکھتے تھے۔

ہم نوح کے حالات کی تشریح کو امام باقرؑ کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: نوح غروب آفتاب اور صبح کے وقت
دعا اور مناجات پڑھا کرتے تھے۔

اٰمست اشهد انہ ما امسى ہى من نعمۃ فی دین او دنیا فاتھا من
اللہ وحدہ لا شریک لہ، لہ الحمد بہا علی والشکر کثیرا فانزل اللہ
”انہ کان عبدا شکورا“ فہذا کان شکرہ:

میں نے اس حالت میں شام کی ہے کہ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ دین و دنیا کی جو نعمت میں رکھتا
ہوں، وہ اس خدا کے یگانہ کی طرف سے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں ہے، اور میں اس کی نعمتوں پر اس کی
حمد و ثناء کرتا ہوں اور اس کا بہت بہت شکر کرتا ہوں۔

اسی بناء پر خدا نے قرآن میں یہ نازل فرمایا ہے کہ وہ شکر گزار بندہ تھا اور نوح کا شکر اسی طرح کا تھا۔

۲۔ مردب اغفر لی ولوالدی ولمن دخل بیتی مؤمنا ”پروردگارا! مجھے، میرے ماں باپ کو اور جو
شخص میرے گھر میں مومن وارد ہو بخش دے“ کے جملہ میں لفظ ”بیت“ کے معنی میں اختلاف ہے مجموعی طور پر اس کے چار معانی بیان کیے گئے ہیں
بعض نے اسے شخصی اور ذاتی گھر کے معنی میں لیا ہے

۱۔ ”اسلام القرآن“، فرہنگ قصص قرآن، ”دائرة المعارف دھند“ مادہ ”نوح“ و ”بمبارالانوار جلد ۱۱“

۲۔ بمبارالانوار جلد ۱۱ ص ۲۹۱ حدیث ۲

بعض مسجد کے معنی میں لیتے ہیں۔

بعض کشتی نوح کے معنی میں لیتے ہیں اور

بعض ان کے دین و آئین و شریعت کے معنی میں جانتے ہیں۔

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا :

”یہاں بیت سے مراد ولایت ہے، جو شخص ولایت میں داخل ہوا وہ انبیاء کے گھر میں داخل ہوا ہے۔“

”من دخل فی الولاية دخل فی بیت الانبیاء علیہم السلام“

خداوند! ہمیں تو فیض مرحمت فرما کہ ہم ولایت اکملہ اہل بیت کو قبول کرنے کے طریق سے بیت انبیاء میں داخل ہوں۔

پروردگارا! ہمیں ایسی استقامت عطا فرما کہ ہم نوحؑ کی بزرگی انبیاء کے مانند تیرے دین و آئین کی طرف دعوت کی راہ میں خستہ نہ ہوں،

اور ہرگز شک ہار کر نہ بیٹھ جائیں۔

بارالہ! جس وقت تیرے خشم و غضب کا طوفان آئے تو ہمیں اپنے لطف و رحمت کی نجات کی کشتی کے ذریعہ رمانی بخش دے۔

آمین یا رب العالمین

اختتام سورہ نوح

اول ماہ محرم الحرام ۱۴۰۷ھ

اختتام ترجمہ بوقت تقریباً پونے سات بجے صبح

۲۱ محرم الحرام ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۵ ستمبر ۱۹۸۷ء

۸۱۔ ای ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

صفدر حسین نجفی

سُورَةُ جِنِّ

یہ سُورہ مکہ میں نازل ہوئی

اور

اس کی ۲۸ آیات ہیں

شروع

۲، محرم الحرام ۱۳۰۷ھ

کتبہ
اعتقاد
آیات

جن کا

سورۃ جن کے مضامین و مطالب

یہ سورہ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے، زیادہ تر ایک دکھائی نہ دینے والی مخلوق کے بارے میں گفتگو کرتی ہے جسے ”جن“ کہتے ہیں۔ یہ گفتگو ان کے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے، قرآن مجید کے مقابلہ میں خضوع کرنے، معاد پر ان کے ایمان و اعتقاد، ان کے درمیان مومن و کافر گروہ کے وجود اور اسی قسم کے دوسرے مسائل سے متعلق ہے۔ سورہ کا یہ حصہ اٹھائیس آیات میں سے انیس آیات میں پھیلا ہوا ہے۔ اور ”جن“ کے بارے میں بہت سے بے ہودہ عقائد کی اصلاح کرتا ہے، اور انھیں باطل قرار دیتا ہے۔ اس سورہ کے دوسرے حصہ میں توحید و معاد کے مسئلہ کے بارے میں اشارہ آیا ہے۔ اور اس سورہ کے آخری حصہ میں علم غیب کے مسئلہ کے متعلق گفتگو ہے، کہ کوئی بھی شخص اس سے آگاہ نہیں ہے، سوائے اس قدر جن کا خدا نے ارادہ کر لیا ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلام سے آیا ہے:

”من قرأ سورۃ الجن اعطی بعدد کل جنی و شیطان صدق بمحمد و کذب بہ عتق رقبتہ“

”جو شخص سورہ جن کو پڑھے تو اسے ہر جن اور شیطان کی تعداد کے برابر جس نے محمد کی تصدیق یا تکذیب کی ہے، غلام آزاد کرنے کا ثواب دیا جائے گا“

ایک اور حدیث میں امام صادق سے آیا ہے:

”من اکثر قرأۃ قل اوحی لم یصبہ فی الحیوۃ الدنیاشیء من اعین الجن ولا نفثہم ولا سحرہم، ولا کیدہم، وکان مع محمد (ص) فیقول یاریب لا ارید منہ بدلا ولا ابغی عنہ خوفا“

”جو شخص سورۃ جن کو بکثرت پڑھے، تو وہ دنیا کی زندگی میں، ہرگز جنوں کی نظر بد، ان کے جادو، سحر اور
 لکڑ فریب سے نقصان نہیں اٹھائے گا، اور وہ محمدؐ کے ہمراہ ہوگا اور کہے گا: ”پروردگارا! میں اس کی
 بجائے کسی اور کو نہیں چاہتا اور نہ ہی اس سے کسی دوسرے کی طرف مائل ہوتا ہوں“۔
 البتہ یہ تلاوت، اس سورہ کے مضامین و مطالب پر آگاہ ہونے، اور پھر اس پر عمل کرنے کا ایک مقدمہ ہے۔

- بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝
- ۱۔ قُلْ اَوْحٰی اِلَیَّ اَنْهٗ اَسْتَمَعَ نَقْرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْا اِنَّا سَمِعْنَا
قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝
- ۲۔ یَّهْدِیْ اِلَی الرَّشٰدِ فَاَمْتَابِہٖ ۝ وَلٰنُ نُشْرِكَ بِرَبِّنَا
اَحَدًا ۝
- ۳۔ وَاِنَّہٗ تَعٰلٰی جَدْرٌ بَيْنَنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ۝
- ۴۔ وَاِنَّہٗ كَانَ یَقُوْلُ سَفِیْہُنَا عَلٰی اللّٰهِ شَطَطًا ۝
- ۵۔ وَاِنَّا ظَنَنَّا اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اللّٰهِ
کَذِبًا ۝
- ۶۔ وَاِنَّہٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ
فَزَادُوْهُمْ رَہَقًا ۝
- رحمن درحیم خدا کے نام سے

ترجمہ

- ۱۔ کہہ دیجیے کہ مجھے وحی ہوئی ہے کہ ”جن“ کی ایک جماعت نے کان دھر کے میری باتیں سنیں تو انہوں نے
کہا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے۔
- ۲۔ جو سیدھی راہ کی طرف ہدایت کرتا ہے، لہذا ہم اس پر ایمان لے آئے، اور ہم ہرگز کسی کو اپنے پروردگار کا شریک

نام ”مداس“ تھا، آنحضرتؐ پر ایمان لے آیا، آپ دنوں سے مکہ کی طرف لوٹے، رات ہوتے ایک کھجور کے درخت کے قریب پہنچے اور نماز میں مشغول ہو گئے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں سے ”نصبین“ یا ”یمین“ کے ”جنوں“ کا ایک گروہ گزر رہا تھا۔ انھوں نے صبح کی نماز میں آنحضرتؐ کی تلاوت کی آواز سنی تو وہ ایمان لے آئے۔

بہت سے مفسرین نے اسی قسم کے شان نزول سورہ جن کے آغاز میں بھی نقل کیے ہیں۔

لیکن یہاں ایک اور شان نزول بھی بیان کی گئی ہے، جو ان سب سے مختلف ہے، اور وہ یہ ہے کہ لوگوں نے ”عبداللہ بن مسعود“ سے پوچھا: کیا تم اصحاب پیغمبرؐ میں سے، کوئی شخص ”جن“ والی رات کے واقعہ میں، پیغمبرؐ کی خدمت میں تھا، اس نے کہا، کہ ہم میں سے کوئی نہیں تھا، ہم نے ایک رات مکہ میں پیغمبرؐ کو نہ پایا، اور جس قدر ہم نے جستجو و تلاش کی، آپ کا کوئی پتہ نہ چلا۔ ہم ڈرے کہ کہیں پیغمبرؐ کو دشمنوں نے قتل نہ کر دیا ہو، ہم پیغمبرؐ کو تلاش کرتے ہوئے مکہ کے دروں کی طرف گئے۔ اچانک ہم نے دیکھا کہ آپ کوہ ”حرا“ کی طرف سے آرہے ہیں۔ ہم نے عرض کیا، اے رسول خدا آپ کہاں تھے؟ ہم سخت پریشان تھے اور کل رات ہماری زندگی کی بدترین رات تھی، آپ نے فرمایا: جنوں کی طرف سے ایک دعوت کرنے والا میرے پاس آیا تھا اور میں ان کے لیے قرآن پڑھنے کے لیے گیا تھا۔

تفسیر ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے

اب جو کچھ بیان ہو چکا، اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے، آیات کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں۔

پہلی آیت میں فرماتا ہے: ”کہہ دیجئے کہ میری طرف وحی ہوئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے میری باتوں کو کان لگا کر سنا، تو انھوں نے کہا کہ ہم نے عجیب قرآن سنا ہے۔“ (قل اوحی الیّ انا استمع نقر من الجن فقالوا انا سمعنا قرآنا عجیباً)۔

”اوحی الیّ“ (میری طرف وحی کی گئی ہے) کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ پیغمبرؐ نے بذاتِ خود اس واقعہ میں جنوں کو مشاہدہ نہیں کیا تھا، بلکہ آپ وحی کے ذریعے آگاہ ہوئے ہیں کہ انھوں نے قرآن مجید کو کان دھر کے سنا ہے۔
ضمنی طور پر یہ آیت، اچھی طرح سے، اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ گروہ ”جن“ صاحبانِ عقل و شعور، فہم و ادراک والے اور تکلیف مند مسولیت کے حامل ہیں، اور زبان سے آشنائی اور اعجاز آمیز کلام میں فرق کو سمجھتے ہیں، اور اسی طرح سے خود کو تبلیغ حق کا ذمہ دار جانتے ہیں۔

۱۔ مجمع البیان، جلد ۹ ص ۹۲، دسیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۶۲، ۶۳ (تخصیص کے ساتھ)

۲۔ مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۶۸

۳۔ اربابِ لغت و تفسیر کے قول کے مطابق ”نقر“ ۳ سے ۹ افراد تک کو کہا جاتا ہے۔

اور قرآن کے خطاب کے مخاطب بھی ہیں۔

یہ اس زندہ نظر نہ آنے والے موجود کی خصوصیات کا ایک حصہ ہے، جو صرف اسی آیت سے معلوم ہوتا ہے، ان کی کچھ اور خصوصیات بھی ہیں، جنہیں ہم انشاء اللہ اسی بحث کے آخر میں تفصیل سے بیان کریں گے۔

انہیں اس بات کا حق تھا کہ وہ قرآن کو ایک عجیب بات شمار کریں، کیونکہ اس کا لب و لہجہ اور طرز و آہنگ بھی عجیب ہے اور اس کا نفوذ و اثر اور قوت جاذبہ بھی۔ اس کے مضمون و مطالب اور اس کی تاثیر بھی عجیب ہے اور اس کا لانے والا بھی کہ جس نے کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور وہ اہمیں میں سے مبعوث ہوا تھا۔

یہ ایک ایسا کلام ہے جو ظاہر و باطن میں عجیب ہے اور ہر دوسری گفتگو سے مختلف ہے، اور اس طرح سے انہوں نے قرآن کے معجزہ ہونے کا اعتراف کر لیا ہے۔

انہوں نے اس جملہ کے بعد کچھ اور باتیں بھی اپنی قوم سے کہیں، جنہیں قرآن نے بعد والی آیات میں بارہ جملوں میں بیان کیا ہے، جن میں سے ہر ایک ”ان“ کے ساتھ شروع ہوتا ہے، جو تاکید کی نشانی ہے۔

پہلے فرماتا ہے: انہوں نے کہا: یہ قرآن سب کو راہ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے، لہذا ہم اس پر ایمان لائے ہیں، اور ہم ہرگز کسی کو اپنے پروردگار کا شریک قرار نہیں دیتے۔ (یہدی الی الرشید فامنا بہ ولن نشرک بریتنا احدًا)۔

”رشید“ کی تعبیر بہت ہی وسیع اور ایک جامع تعبیر ہے، جو ہر قسم کا امتیاز اپنے اندر لیے ہوئے ہے، ایک ایسا صاف ستھرا راستہ ہے، جس میں کوئی تیج و خم نہیں ہے، روشن اور واضح جو طے کر نیوالوں کو سعادت و کمال کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔

ایمان کے اظہار اور ہر قسم کے شرک کی نفی کے بعد، انہوں نے صفات خدا کے بارے میں اپنی گفتگو کو اس طرح جاری رکھا: ”ہمارے پروردگار کا باعظمت مقام (مخلوق کے ساتھ مشابہت اور ہر قسم کے عیب و نقص سے) بلند ہے اور اس نے اپنے لیے بیوی اور اولاد کا ہرگز انتخاب نہیں کیا (وانہ تعالیٰ جدر بتا ماتخذ صاحبة ولا ولدًا)۔

”جد“ کے لغت میں بہت سے معانی ہیں منجملہ ان کے ”عظمت“، ”شرف“، ”جدیت“، ”حصہ و نصیب“، ”نیا ہونا“ اور اس کے مانند لیکن اس کا اصلی ریشہ اور جڑ، جیسا کہ ”راغب“ نے ”مفردات“ میں نقل کیا ہے ”قطع“ کے معنی میں ہے اور چونکہ ہر باعظمت وجود دوسرے

سے علماء نحو کے درمیان مشہور یہ ہے کہ ”ان“ جب مقول قول میں ہو تو اسے زبر کے ساتھ پڑھا جانا چاہیے اور پر دالی آیات میں پہلے مرحلہ میں تو زبر کے ساتھ ہے، لیکن بعد والی آیات میں جن کا اس پر عطف ہے زبر کے ساتھ ہے۔ اس لیے بہت سے مفسرین اس بات پر مجبور ہوئے ہیں کہ ان آیات میں مقدرات ضمن کریں یا کچھ اور تو جہیں کریں، لیکن اس بات میں کیا حرج ہے کہ ہم یہ کہیں کہ یہ نحوی قاعدہ استثناء بھی رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جن موارد میں مقول قول پر عطف ہو تو جائز ہے کہ اسے زبر کے ساتھ پڑھا جائے اور اس کی دلیل اس سورہ کی آیات ہیں۔

موجودات سے قطع اور جدا ہو جاتا ہے، لہذا یہ لفظ عظمت کے معنی میں آیا ہے۔

اسی طرح اس کے باقی معانی کے بارے میں اسی تناسب کو نظر میں رکھا جاسکتا ہے اور اگر دادا یا نانا کو جد کہا جاتا ہے تو وہ بھی اس کی بزرگی کا مقام اور اس کے واسطے سے ہے۔

بہت سے مفسرین نے یہاں ”جد کے بہت ہی محدود معانی ذکر کیے ہیں۔ بعض نے اس کی ”صفات“ کے معنی میں، اور بعض نے ”قدرت“ کے معنی میں، بعض نے ”ملک و حکومت“ کے معنی میں، بعض نے ”نعمت“ کے معنی میں اور بعض نے ”نام“ کے معنی میں تفسیر کی ہے جو سب کے سب عظمت کے معنی میں جمع ہیں۔

لیکن چونکہ یہ تعبیر ”جد“ کے مشہور معنی، جو وہی ”داوا“ اور ”نانا“ کا اظہار کرتی ہے۔ اس لیے بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ گروہ جن نے نادانی کی بناء پر اس قسم کی غیر مناسب تعبیر کو انتخاب کیا یعنی تم لوگ خدا کے بارے میں ہرگز اس قسم کی تعبیر نہ کرو۔ یہ حدیث ممکن ہے ایسے مواقع کے لیے ہو، جہاں اس قسم کا اظہار ہوتا ہو، ورنہ قرآن ان آیات میں، جنوں کی باتوں کو موافق لب و لہجہ میں نقل کرتا ہے اور انھیں صحیح و درست سمجھتا ہے۔ علاوہ ازیں نبی البلاغہ کے بعض خطبوں میں بھی یہ تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ جیسا کہ خطبہ ۱۹۱ میں آیا ہے۔

الحمد لله الفاشی فی الخلق حمدہ والغالب جندہ والتمتعالی جدہ
”حمد و ستائش اس خدا کے لیے مخصوص ہے، جس کی حمد و ثناء نے ہر جگہ کو گھیر رکھا ہے اور اس کا لشکر ہر جگہ کامیاب ہے اور اس کی مجد و عظمت بلند ہے۔

بعض روایات میں بھی یہ آیا ہے کہ ”انس بن مالک“ کہتے ہیں:

كان الرجل اذا قرء سورة البقرة جد في اعيننا
جب کوئی شخص سورہ بقرہ کو یاد کرتا تھا اور اس کی قرأت کیا کرتا تھا، تو وہ ہماری نظر میں بزرگ اور باعظمت دکھائی دیتا تھا۔

ہر حال مجد و بزرگی و عظمت کے معنی میں اس لفظ کا استعمال ایک ایسا مطلب ہے جو متون لغت کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے اور موارد استعمال کے ساتھ بھی۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان باتوں کے کہنے والے ”جن“ یہاں خصوصیت کے ساتھ اس مطلب پر تکیہ کرتے ہیں کہ خدا کی بیوی اور اولاد نہیں ہے اور احتمال یہ ہے کہ یہ تعبیر اس بے ہودگی کی طرف اشارہ ہو جو عربوں میں موجود تھی، جو یہ کہتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ ”ایک جن“ بیوی سے، جسے خدا نے انتخاب کیا ہے۔

یہی معنی ایک احتمال کے عنوان سے سورہ صافات کی آیت ۵۸ کی تفسیر میں بھی آیا ہے ”وجعلوا بینہ و بین الجنة نسبا“

لے مجمع البیان جلد ۱ ص ۳۶۸ و ”نور الثقلین“ جلد ۵ ص ۲۵۵ تفسیر ”علی بن ابراہیم“ میں اس تعبیر کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

لے ”تفسیر قرطبی“ جلد ۱ ص ۶۸۰

”وہ خدا اور جنوں کے درمیان رشتہ داری کے قائل تھے“

اس کے بعد انھوں نے مزید کہا: ”اب ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ہم میں سے کچھ بے وقوف لوگ خدا کے بارے میں ناروا اور حق سے دور بات کیا کرتے تھے“ (وانہ کان یقول سفیہتا علی اللہ شططا)۔

یہاں ممکن ہے ”سفیہ“ کی تعبیر جنسی اور جمع کے معنی میں ہو، یعنی ہمارے سفیہ اور بے وقوف لوگ خدا کے لیے بیوی اور اولاد کے تھے، اور انھوں نے شبیہ و شریک بنا لیا تھا اور راہِ حق سے منحرف ہو کر فضول اور بے ہودہ باتیں کہا کرتے تھے۔

بہت سے مفسرین نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہاں ”سفیہ“ کا مفہوم وہی ایک فز ہے اور ابلیس کی طرف اشارہ ہے، خدا کے فرمان کی مخالفت کرنے کے بعد، اس کی ساحت مقدس کی طرف بہت سی ناروا سبوتیں دیں، یہاں تک کہ اس نے آدم کے سجدہ کے بارے میں، پروردگار کے حکم پر علی الاعلان اعتراض کیا، اور اسے حکمت سے دُور سمجھا، اور اپنے آپ کو آدم سے

برتر خیال کیا۔

چونکہ ”ابلیس“ ”جن“ تھا۔ لہذا مومن جن اس سے نفرت کا اظہار کر رہے ہیں، اور اس کی بات کو فضول اور حق سے دور کہہ رہے ہیں۔ اگرچہ وہ ظاہراً عالم و عابد تھا۔ لیکن عالم بے عمل اور عابد خود خواہ و منحرف و مغرور، ”سفیہ“ کے واضح مصداق ہیں۔

”شطط“ (بروزن وسط) خدا حِدال سے خارج ہو کر دور جا پڑنے کے معنی میں ہے۔ اس لیے وہ باتیں جو حق سے دور بات اس

انھیں شطط کہا جاتا ہے اور اسی لیے ان بڑے دریاؤں کے کناروں کو جن کا فاصلہ پانی سے زیادہ دور ہو اور اس کی دیواریں بلند ہوں ”شطط“ کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد انھوں نے مزید کہا: ”ہم یہ گمان کیا کرتے تھے کہ انسان اور جن ہرگز خدا پر چھوٹ نہیں بانڈیں گے“ (وانا ظننا ان لن تقول الانس والجن علی اللہ کذبا)۔

ان کی یہ بات ممکن ہے اس اندھی تقلید کی طرف اشارہ ہو جو یہ گروہ اس سے پہلے دوسروں کی کیا کرتا تھا اور اس بناء پر وہ خدا کا شریک بناتے تھے اور اس کے لیے بیوی اور اولاد کے قائل تھے، لہذا وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے ان مسائل کو دوسروں سے بغیر کسی دلیل کے قبول کر لیا تھا تو وہ غلط فہمی کی بناء پر تھا۔ ہمیں یہ خیال ہی نہیں آیا کہ انسان اور جن اتنی جرات کریں گے کہ اتنا بڑا چھوٹ خدا پر بانڈیں گے، لیکن اب جبکہ ہم نے اس بات کی تحقیق کر لی ہے اور حق کو معلوم کر لیا ہے اور اس پر ایمان لے آئے ہیں۔ لہذا ہم اب اس ناروا تقلید کو غلط سمجھتے ہیں، اور اس طرح اپنی غلطی اور مشرکین جن کے انحراف کا اعتراف کرتے ہیں۔

اس کے بعد انھوں نے کہا: جنوں اور انسانوں کے انحرافات میں سے ایک یہ تھا کہ ”انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ کی پناہ لیا کرتے تھے اور وہ ان کی گراہی، گناہ اور ظنیان و سرکشی کی زیادتی کا سبب بنتے تھے“ (وانہ کان رجال من الانس

وَذَوْنَ بَرِّجَالٍ مِنَ الْجِنِّ فَزَادُوا هُمْ سَهْقًا۔

”سہق“ (بروزن شفق) اصل میں کسی چیز کو تھرو غلبہ کے ذریعے چھپانے کے معنی میں ہے اور چونکہ گمراہی، گناہ، طغیان اور خوف انسان کے قلب و روح پر مسلط ہو جاتے ہیں اور اس کو چھپا لیتے ہیں۔ اس لیے ان کا ان معانی پر اطلاق ہوا ہے۔

بہت سے مفسرین نے اس جملہ کو ایک دوسری بیہودہ اور فضول بات کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو زمانہ جاہلیت میں موجود تھی اور وہ یہ تھی کہ عربوں کے قافلے رات کے وقت کسی درہ میں داخل ہوتے تھے تو یہ کہا کرتے تھے۔

اعوذ بعزیز ہذا الوادی من شر سفہاء قومہ!

”میں اس سرزمین کے بزرگ دریس کی — اس کی قوم کے اور بے وقوفوں کے شر سے — پناہ مانگتا ہوں۔“

اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اس بات کے کہنے سے جنوں کا بزرگ اور رئیس، ان کی نادان اور بیوقوف جنوں کے شر سے حفاظت کرے گا۔ اور چونکہ خرافات اور بیہودہ باتوں سے اخطاط فکری خوف اور گمراہی بڑھتی ہے لہذا آیت کے آخر میں ”فزادوا ہم سہقا“ کہہ جایا ہے۔ ضمنی طور پر اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنوں میں بھی مرد اور عورتیں ہوتی ہیں، کیونکہ اس میں ”رجال من الجن“ کی تعبیر آئی ہے۔

لیکن آیت کا مفہوم بہ حال ایک وسیع مفہوم ہے، جو انسانوں کی جنوں سے ہر قسم کی پناہ لینے کو شامل ہے اور اوپر والی فضول اور بیہودہ بات اس کا ایک مصداق ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ عربوں کے درمیان کاہن بہت تھے، جن کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ جنوں کے ایک گروہ کے ذریعہ بہت سی مشکلات کو حل کرتے ہیں اور آنے والے واقعات کی خبر دیتے ہیں۔

۱۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱ ص ۳۶۹ و ”روح المعانی“ جلد ۲ ص ۲۸ ص ۸۵

۲۔ اوپر والی آیت کی تفسیر میں ایک اور بیان بھی آیا ہے جسے مفسرین کے ایک گروہ نے ایک احتمال کے عنوان سے آیت کی تفسیر میں ذکر کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسانوں کی ایک جماعت کا جنوں کی طرف پناہ حاصل کرنا، جنوں کے طغیان کا سبب بنا اور انھوں نے خود کو کاموں کا مبداء و منشاء خیال کر لیا۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے (پہلی تفسیر کے مطابق ”زادوا“ میں ضمیر ”جن“ کی طرف لٹتی ہے اور ”ہم“ کی ضمیر انسانوں کی طرف، دوسری تفسیر کے برعکس)۔

۷- وَ أَنَّهُمْ ظَنُّوا كَمَا ظَنَنْتُمْ أَن لَّنْ يَبْعَثَ اللَّهُ
أَحَدًا ۝

۸- وَ أَنَّا لَمَسْنَا السَّمَاءَ فَوَجَدْنَاهَا مُدَلَّتْ حَرَسًا شَدِيدًا
وَ شُهَبًا ۝

۹- وَ أَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَسْتَمِعِ الْآنَ
يَجِدْ لَهُ شُهَابًا رَّصَدًا ۝

۱۰- وَ أَنَّا لَأَنذَرْنَا أُمَّةً أُسِرْنَا أَنَّ رَبًّا مِّنْ فِي الْأَرْضِ أَمَّارًا بِهَمِّهِمْ
رَآبِئُهُمْ رَشَدًا ۝

ترجمہ

۷- اور انھوں نے بھی یہی گمان کر لیا تھا، جیسا کہ تم گمان کرتے تھے، کہ خدا ہرگز کسی کو (نبوت پر) مبعوث نہیں کرے گا۔

۸- اور ہم نے آسمان میں جستجو کی، تو ہم نے سب کو قوی محافظوں اور شہاب کے تیروں سے پُر پایا۔

۹- اور ہم اس سے پہلے چوری چھپے باتیں سننے کے لیے آسمانوں میں بیٹھ جایا کرتے تھے، لیکن اب اگر کوئی چوری چھپے سننا چاہتا ہے، تو وہ ایک شہاب کو اپنی گھات میں پاتا۔

۱۰- اور اب (ان حالات میں) ہم نہیں جانتے کہ اہل زمین کے بارے میں ان کے پروردگار نے کسی شمر اور برائی کا ارادہ کیا ہے، یا ان کی ہدایت کا ارادہ کیا ہے۔

ہم پہلے چوری چھپے سن لیا کرتے تھے، لیکن.....

یہ آیات اسی طرح سے ”جن مومنین“ کے بیان کو جاری رکھے ہوئے ہیں، جو اپنی قوم کو تبلیغ کرتے وقت بیان کر رہے تھے، اور مختلف طریقوں سے انھیں اسلام اور قرآن کی طرف دعوت دے رہے تھے۔ پہلے کہتے تھے: ”انہوں کا ایک گروہ، ہتھاری طرح ہی یگانہ کرتا تھا، کہ خدا کسی بھی انسان کو (موسیٰ و سحیح کے بعد) نبوت کے ساتھ مبعوث نہیں کرے گا“ (وانہم ظنوا کما ظننتم ان لن یبعث اللہ احداً)۔

لہذا وہ قرآن کے انکار اور پیغمبر اسلام کی نبوت کی تکذیب کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، لیکن ہم نے جب غور سے اس کتاب آسمانی کی آیات کو سنا، تو ہم نے اس کی حقانیت کا واضح طور پر ادراک کر لیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی مشرک انسانوں کی طرح کافر ہو جاؤ اور انھیں جیسی سزوشنت میں گرفتار ہو جاؤ۔

یہ تعبیر مشرکین کے لیے ایک تشبیہ ہے کہ وہ یہ جان لیں کہ جب جنوں کی منطق یہ ہے اور ان کا فیصلہ یہ ہے تو پھر وہ بیدار ہو جائیں اور قرآن اور پیغمبر اکرم کے دامن سے متمسک ہو جائیں۔

بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ ”ان لن یبعث اللہ احداً“ کا جملہ معاد کے انکار کی طرف اشارہ ہے، نہ کہ پیغمبر کی پشت کے انکار کی طرف، اور یہ بھی کہا ہے کہ یہ آیت اور اس سے پہلے والی آیت کلی طور پر خدا کا کلام ہے، نہ کہ مومنین ”جن“ کا اور یہ جملہ یا کے معترضہ کی صورت میں ان کی باتوں کے درمیان آیا ہے اور اس میں مخاطب مشرکین عرب ہیں۔

اس تفسیر کے مطابق آیت کا مفہوم اس طرح ہو گا کہ اے مشرکین عرب جن بھی ہتھاری طرح ہی اس طرح کا لگان رکھتے تھے کہ خدا کسی بھی رسول کو مبعوث نہیں کرے گا۔ لیکن قرآن کو سننے کے بعد وہ اپنی غلطی کو سمجھ گئے۔ لہذا اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تم بھی بیدار ہو جاؤ۔ لیکن یہ تفسیر بہت بعینہ نظر آتی ہے، بلکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ جن مومنین کی گفتگو ہی چل رہی ہے اور اس میں ”کافروں جن“ مخاطب ہیں۔ اس کے بعد مومنین جن، اپنی گفتگو کی صداقت کی ایک نشانی کی طرف جو عالم طبیعت میں تمام جنوں کے لیے قابل ادراک ہے۔ اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”ہم نے آسمانوں میں جستجو کی، تو ہم نے ان سب کو نگہبانوں اور قوی محافظوں اور شہاب کے تیروں سے بھر پور پایا“ (وانا لمسنا السماء فوجدنا ہا ملئت حرساً شدیداً و شہباً)۔

ہم اس سے پہلے چوری چھپے باتیں سننے کے لیے آسمانوں میں جا کر بیٹھ جایا کرتے تھے اور وہاں سے کچھ خبریں معلوم کر لیا کرتے تھے۔

۱۔ ”لمسنا“ ”لمس“ کے مادہ سے ہے، جن کا معنی مشہور ہے، لیکن یہاں طب و جستجو سے لگایا ہے (مفردات رانوب و

تفسیر کبیر فخر رازی اور تفسیر قرطبی)۔

۲۔ ”حرس“ (بروزن نفس) جمع ہے ”حارس“ کی۔ جو نگہبان کے معنی میں ہے اور بعض اس کو اسم جمع سمجھتے ہیں۔

اور اپنے دوستوں کو ان کی اطلاع دے دیا کرتے تھے، لیکن اب معاملہ ایسا ہو گیا ہے کہ اب اگر کوئی چوری چھپے کچھ سنا چاہتا ہے تو گھات میں ایک شہاب کو پاتا ہے جو اس کو نشانہ بنالیتا ہے۔ (و اتا کتا نقعد منها مقاعد للسمع فمن لیت الان یجد له شہاباً رصداً)۔

تو کیا یہ نئی وضع و کیفیت اس حقیقت کی دلیل نہیں ہے کہ اس پیغمبر کے ظہور اور اس کی کتاب آسمانی کے نزول سے عالم میں ایک تغیر پیدا ہو گیا ہے؟ آخر پہلے تم میں چوری چھپے سننے کی طاقت کیوں تھی اور اب تم میں سے کوئی بھی اس کام پر قدرت کیوں نہیں رکھتا؟ اس وضع جدید اور نئی کیفیت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ شیطنیت، کمانت اور مکرو فریب کا دور ختم ہو گیا ہے اور جہالت کی تاریک رات ختم ہو گئی ہے اور وحی و نبوت کا آفتاب عالم تاب طلوع ہو گیا ہے۔

”شہاب“ اصل میں اس شعلہ کے معنی میں ہے جو آگ میں سے بھڑک کر نکلتا ہے اور اس آتش بن شعلہ کو بھی جو ایک لمبے خنجر کی صورت میں آسمان سے ظاہر ہوتا ہے ”شہاب“ کہتے ہیں۔ موجودہ دور کے ماہرین کی تحقیقات کے مطابق وہ پتھروں کے چھوٹے ٹکڑے ہیں، جو کہ زمین سے باہر کی فضا میں حرکت کر رہے ہوتے ہیں، جب وہ زمین کے قریب آتے ہیں تو اس کی قوت کشش کے زیر اثر آجاتے ہیں، اور تیزی کے ساتھ زمین کی طرف گرتے ہیں، جب وہ فضا یعنی زمین کے گرد اگر دھپیلی ہوئی تہ بہ تہ ہوا میں داخل ہوتے ہیں، تو اس کے ساتھ شدید کراؤ کی وجہ سے بل کر آگ بن جاتے ہیں، اور جھلنے والے شعلہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، اور آخر کار ان کی راکھ پراگرتی ہے۔

قرآن مجید میں یہ مسئلہ بار بار بیان ہوا ہے کہ ”شہاب“ وہ تیر ہیں جو ان شیاطین کی طرف، جو چوری چھپے باتیں سننے کا ارادہ کرتے ہیں، پھینکے جاتے ہیں۔

اس بارے میں کہ چوری چھپے سننے سے مراد کیا ہے؟ اور جن اور شیاطین آسمان سے کس طرح بھگائے جاتے ہیں؟ ہم نے سورہہ کی آیہ ۱۸ کے ذیل میں (جلد ۶ ص ۱۴۴ کے بعد)، اور سورہہ صافات کی آیہ ۱۰ کے ذیل میں (جلد ۱۰ ص ۴۵۱ کے بعد) تفصیلی مباحث پیش کیے ہیں۔

بہر حال لفظ ”رصد“ (بروزن رصد) کسی چیز کے انتظار میں آگاہی کے معنی میں ہے، جسے فارسی (اور اردو) میں ”گھات لگا کر بیٹھے“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ لفظ بعض اوقات اسم فاعل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، یعنی وہ چیز یا وہ شخص جو گھات لگا کر بیٹھا ہو اوراد پر والی آیات میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اس کے بعد انھوں نے مزید کہا کہ ان اوضاع و حالات میں ہم نہیں جانتے، کہ کیا یہ چوری چھپے سننے کی ممنوعیت اس بات کی دلیل ہے کہ زمین پر رہنے والے لوگوں کے لیے کسی شر اور برائی کا ارادہ ہوا ہے، یا خدا یہ چاہتا ہے کہ انھیں اس طریقہ سے ہدایت کرنے (و اتا لاندری اشرا سید بمن فی الارض ام اراد بہم ساء شداً)۔

دوسرے لفظوں میں ہم نہیں جانتے کہ کیا یہ امر خدا کی طرف سے نزولِ عذاب و بلا کا مقدمہ ہے یا ان کی ہدایت کی تمہید ہے۔ لیکن مومنین جن کو اصولی طور پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ چوری چھپے سننے کی ممانعت، جو پیغمبر اسلام کے ظہور کے قریب ہوئی ہے، انسانوں کی

کا مقدمہ ہے اور کھانت کے اداروں اور اسی جیسی خرافات کے ختم ہونے کی تمہید ہے۔ اور یہ چیز تاریخی کے دور کے ختم ہونے اور ایک روشن دور کے آغاز کے اعلان کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتی۔

لیکن چونکہ ”جن“ چوری پھپھے سننے کے مسئلہ سے ایک خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ لہذا وہ آجی یہ باور نہیں کر سکتے تھے کہ یہ محرومیت ایک کی خیر و برکت ہے۔ ورنہ یہ بات واضح ہے کہ زمانہ جاہلیت کے کاہن اسی چوری پھپھے سننے کے مسئلہ پر تکیہ کرتے ہوئے، لوگوں کے ایک طبقے بڑے حصہ کو گمراہ کیا کرتے تھے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ اس جملہ میں ہدایت کی نسبت تو خدا کی طرف دیتے ہیں، لیکن شر کو فعلِ مجہول کی صورت میں، خدا کی طرف نسبت دیئے بغیر ذکر کرتے ہیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو کچھ آتا ہے وہ خیر و ہدایت ہوتی ہے۔ لیکن شر و فساد خود لوگوں کی طرف سے اور خدا کی نعمتوں اور مواہبِ آفرینش کے سوء استفادہ سے پیدا ہوتا ہے۔

م میں ایک عظیم
س رکھتا ہے کیا
ت واصل کی گئی

بے خط کی
ٹے ہوتے
ٹا آجاتے
س کے
اکھڑتین

ہکتے

رہ حجر

ٹا

لجھے

ن

۱۱- وَ أَنَا مِمَّا الصَّٰدِحُونَ وَمِمَّا دُونَ ذٰلِكَ كُنَّا طَرَآءِ
قِدْدًا ۝

۱۲- وَ أَنَا ظَنَنَّا أَن لَّن نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِي الْاَرْضِ وَلٰكِن نُّعْجِزُ
هَرَبًا ۝

۱۳- وَ أَنَا لَمَّا سَمِعْنَا اللّٰهَی اٰمَنَّا بِهٖ ۝ فَمَنْ یُّؤْمِنُ بِرَبِّهٖ فَلَا
یَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ۝

۱۴- وَ أَنَا مِمَّا الْمُسْلِمُونَ وَمِمَّا الْقٰسِطُونَ ۝ فَمَنْ اَسْأَلَ
فَاوْلٰئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ۝

۱۵- وَ اَمَّا الْقٰسِطُونَ فَكَانُوا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۝

ترجمہ

۱۱- اور یہ کہ ہمارے درمیان صالح اور غیر صالح افراد ہیں اور ہم مختلف گروہ میں -

۱۲- اور یہ کہ ہم یقین رکھتے ہیں کہ ہم زمین میں بہرگز خدا کے ارادہ پر غالب نہیں آسکتے، اور نہ ہی اس کے پنجہ قدرت سے فرار کر سکتے ہیں۔

۱۳- اور یہ کہ جب ہم نے قرآن کی ہدایت سنی تو ہم اس پر ایمان لے آئے، اور جو شخص اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے پھر وہ نہ تو نقصان سے ڈرتا ہے اور نہ ہی ظلم سے۔

۱۴- اور یہ کہ ہم میں سے ایک گروہ تو مسلمان ہے اور ایک گروہ ظالم ہے اور جو شخص اسلام کو اختیار کرے، اس نے سیدھی راہ کو انتخاب کر لیا ہے۔

۱۵- اور ظالم تو ہیں ہی دوزخ کا ایندھن۔

ہم نے حق کو سنا اور سر تسلیم خم کر لیا

یہ آیات اسی طرح جن مومنین کی باتوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں، یعنی وہ باتیں جو انہوں نے اپنی گمراہ قوم کو تبلیغ کرتے وقت کہی تھیں، پہلی آیت میں ان کی زبانی کتا ہے: ہمارے درمیان صالح اور غیر صالح افراد میں اور ہم میں مختلف گروہ ہیں (واتامنا الصالحون

ومن ادون ذالك كذا طرائق قددا)۔

احتمال یہ ہے کہ انہوں نے اس جگہ کو اس لیے کہا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ "ابیس" کا قبیلہ "جن" میں سے ہونا، ان میں سے ایک گروہ کے دل میں یہ تو ہم پیدا نہ کر دے، کہ جن کی طبیعت اور مزاج شر اور فساد، شیطنت پر ہے اور نور ہدایت ان کے دل میں ہرگز نہیں چمکتا۔ مومنین جن اس گفتگو سے یہ واضح کر رہے ہیں کہ اصل اختیار اور آزادی ارادہ ان پر بھی حکم فرما ہے، اور صالح اور غیر صالح دونوں قسم کے افراد ان میں موجود ہیں۔ اس بناء پر ہدایت کی استعداد ان میں بھی موجود ہے اور اصولی طور پر تبلیغ کی تاثیر کے عوامل میں سے ایک طرف مقابل کی شخصیت کو جاگ کر کے، اسے ہدایت و کمال کی استعداد کے موجود ہونے کی طرف توجہ دلانا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ جن مومنین نے، چوری چھپے سننے کے سلسلے سے، سوہا استفادہ کے موضوع سے، برادرت کے لیے کسی ہو۔ یعنی اگرچہ ہم میں سے بعض، وہ اخبار جو وہ چوری چھپے سنا کرتے تھے، انہیں شر پر انسانوں کے پاس پہنچا کر گمراہی کا سبب بنے تھے۔ لیکن ہم میں سے تمام جن ایسے نہیں تھے۔

یہ آیت ضمنی طور پر جنوں کے بارے میں ہم انسانوں کی ذہنیوں کی بھی اصلاح کرتی ہے۔ کیونکہ بہت سے لوگوں کے تصور میں لفظ "جن" شیطنت، فساد اور گمراہی کی ایک قسم کے ساتھ ہے۔ یہ آیت کہتی ہے کہ وہ بھی مختلف گروہ ہیں، صالح اور غیر صالح۔ لفظ "قد" (بروزن پسر) "قد" (بروزن ضد) کی جمع ہے۔ جس کا معنی کٹا ہوا کے ہیں۔ اور مختلف گروہوں پر بھی۔ چونکہ وہ ایک دوسرے سے الگ الگ گروہوں میں ہوتے ہیں۔ اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

جن مومنین اپنی باتوں کو جاری رکھتے ہوئے دوسروں کو خبردار کرتے ہیں اور کہتے ہیں: "ہمیں یقین ہے کہ ہم زمین میں، خدا کے ارادہ پر ہرگز غالب نہیں آسکتے، اور نہ ہی اس کے بیخبر قدرت سے فرار کر سکتے ہیں"۔ (واتاظنت ان لن نعجز اللہ فی الارض ولن نعجزہ ہربا)۔

اس بناء پر، اگر تمہارا یہ خیال ہو کہ تم خدا کے عذاب سے بھاگ کر زمین کے کسی گوشہ میں یا آسمانوں کے کسی مقام میں نجات پا جاؤ گے، تو تم سخت غلط فہمی میں مبتلا ہو۔

اس طرح سے پہلا جملہ تو زمین میں خدا کے بیخبر قدرت سے فرار کرنے کیلئے اور دوسرا جملہ مطلق فرار کرنے کی طرف اشارہ ہے، عام اس سے کہ وہ زمین میں ہو یا آسمان میں۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ پہلا تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم خدا پر غالب نہیں آسکتے، اور دوسرا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کے بیخبر عدالت سے فرار ممکن نہیں ہے۔ لہذا اس بنا پر کہ نہ تو غلبہ کی کوئی راہ ہے اور نہ ہی بھاگنے کی، تو پھر اس کے فزانِ ملامت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

جن مومنین اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں: ”ہم نے جب قرآن کی ہدایت کو سنا تو ہم اس پر ایمان لے آئے“ (واتقوا لقا سمعنا الہدیٰ امانا)۔

اور اگر ہم تمہیں قرآن کی ہدایت کی طرف بلاتے ہیں تو ہم نے خود پہلے اس پر دو گرام پر عمل کیا ہے۔ اس بنا پر ہم دوسروں کو کسی ایسی چیز کی دعوت نہیں دے رہے ہیں، جسے ہم نے خود چھوڑ رکھا ہو۔

اس کے بعد ایمان کے نتیجہ کو ایک مختصر سے جملہ میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”جو شخص اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے تو اسے نہ تو نقصان کا کوئی ڈر ہے اور نہ ہی ظلم کا“ (فمن یتو من بربہ فلا یخاف بخصا ولا رھقا)۔

”بخس“ (بروزن شخص) ظلم و ستم کے ذریعہ نقصان کے معنی میں ہے اور ”رھق“ (بروزن شفق) جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں: ”کسی چیز کے زور کے ساتھ چھپانے“ کے معنی میں ہے۔

بعض نے ان دو تعبیروں کے درمیان فرق کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ”بخس“ تو اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ ان کی ”حنات“ اور نیکیوں میں سے کسی چیز میں کمی نہیں کی جائے گی اور ”رھق“ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے ”سینات“ اور برائیوں میں اضافہ نہیں کیا جائے گا۔

بعض نے ”بخس“ کو ”حنات“ کی کمی اور ”رھق“ کو ”تکالیف شاقہ“ کے معنی میں لیا ہے۔

بہر حال مراد یہ ہے کہ مومنین جس چھوٹے اور بڑے کام کو انجام دیں گے، وہ اس کا اجر و ثواب، بے کم و کاست حاصل کریں گے۔ یہ درست ہے کہ پروردگار کی عدالت مومنین پر منحصر نہیں ہے، لیکن چونکہ غیر مومن کوئی عمل صالح رکھتے ہی نہیں، اس لیے ان کے اجر کی بات درمیان میں نہیں آئی۔

بعد والی آیت میں مومنوں اور کافروں کی سرنوشت کے بارے میں زیادہ وضاحت کے لیے کہتا ہے: ”ہم قرآن کی ہدایت کے ذریعہ یہ جانتے ہیں کہ ہم میں سے ایک گروہ مسلمان ہے اور ایک گروہ ظالم و بیداد گر ہے۔ (واتامتا المسلمون و متا القاسطون)۔

لیکن جو اسلام کو اختیار کر لیں تو انہوں نے راہِ راست کو انتخاب کیا ہے اور خدا کی ہدایت اور ثواب کی طرف قدم اٹھایا ہے۔

لے ”قاسط“ ”قسط“ کے مادہ سے عا دلانہ تقسیم کے معنی میں ہے۔ یہ مادہ جب باب ”افعال“ کی صورت میں ”اقساط“ آئے تو اجرائے عدالت کے معنی میں ہے اور جب ثلاثی مجرور کی صورت میں استعمال ہو۔ (مثلاً اوپر والی آیت) تو پھر ظلم اور راہِ حق سے انحراف کے معنی میں ہوتا ہے۔

رفعن اسلم فاو لئک تحروا و ارشدًا^۱۔

”باقی رہے ظالم تو وہ جہنم کا ایندھن ہیں“ (واما القاسطون فکانوا لجهنم حطبًا)۔
 قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان آیات میں ”سلم“، ”ظالم“ کے مقابل میں آیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کو جو چیز ظلم سے
 باز رکھتی ہے وہ ایمان ہی ہے۔ ورنہ ایک بے ایمان فرد تو بہر حال ظلم و ستم میں آلودہ ہو گا ہی، اور ضمنی طور پر بتاتا ہے کہ واقعی مومن وہ ہے جو ظلم و ستم
 سے ہرگز آلودہ نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے:

المؤمن من آمنه الناس على انفسهم واموالهم
 ”مومن وہ ہے کہ لوگ جس کی طرف سے اپنی جان و مال کے سلسلہ میں امان میں رہیں“^۲۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے:

المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده

”مسلمان وہ ہے کہ جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان آسودہ رہیں“^۳۔

”تحروا و ارشدًا“ کی تعبیر بتاتی ہے کہ مومنین، توجہ، قصد و ارادہ اور تحقیق کے ساتھ ہدایت حاصل کرتے ہیں، آنکھیں بند کر کے
 اندھی تقلید کے طور پر نہیں، اور ان کا بالاترین اجر حقیقت کو پالینا ہی ہے، جس کے زیر سایہ وہ خدا کی تمام نعمتوں کو حاصل کرتے ہیں جبکہ ستم گروں
 کی بدترین بدبختی یہ ہے کہ وہ دوزخ کا ایندھن ہیں یعنی آگ ان کے وجود کے اندر سے شعلہ در ہو گی۔

۱ لہ ”تحروا“ ”تحری“ کے مادہ سے کسی چیز کا قصد کرنے کے معنی میں ہے۔

۲ لہ تفسیر ”روح البیان“ جلد ۱ ص ۱۹۵

۳ لہ ”اصول کافی“ جلد ۲۔ باب المؤمن و علاماته و صفاته

- ۱۶- وَ أَنْ لَوْ اسْتَقَامُوا عَلَى الطَّرِيقَةِ لَأَسْقَيْنَهُمْ مَاءً غَدَقًا ۝
- ۱۷- لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۖ وَمَنْ يُعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِ يَسُدْ لَهُ عَذَابًا صَعَدًا ۝
- ۱۸- وَإِنَّ الْمَسْجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا ۝
- ۱۹- وَ أَنْتَ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللَّهِ يَدْعُوهُ كَادُوا يَكُونُونَ عَلَيْهِ لِبَدًا ۝

ترجمہ

- ۱۶- اور اگر وہ (جن وانس) ایمان کے طریقہ پر استقامت اختیار کریں، تو ہم انہیں فراواں پانی سے سیراب کریں۔
- ۱۷- مقصد یہ ہے کہ ہم انہیں اس فراواں نعمت کے ذریعے آزمائیں اور جو شخص اپنے پروردگار کے ذکر سے روگردانی کرے گا، تو وہ اسے شدید اور روز افزوں عذاب میں گرفتار کرے گا۔
- ۱۸- اور یہ کہ مساجد خدا ہی کے لیے ہیں، ان مساجد میں خدا کے علاوہ کسی کو نہ پکارو۔
- ۱۹- اور یہ کہ جب خدا کا بندہ (محمدؐ) عبادت کے لیے کھڑا ہوتا اور اسے پکارتا، تو کچھ لوگ بڑی شدت کے ساتھ اس کے گرد جمع ہو جاتے۔

تفسیر

ہم تمہیں ان فراواں نعمتوں کے ذریعے آزمائیں گے

یہ آیات ظاہر جن مومنین کی اپنی قوم سے گفتگو کو جاری رکھے ہوئے ہیں (اگرچہ کچھ مفسرین نے اسے خدا کا کلام سمجھا ہے، جو جملہ معترضہ کے طور پر پہلوں کی گفتگو کے درمیان آیا ہے)۔ لیکن چونکہ اس کا جملہ معترضہ ہونا خلاف ظاہر ہے اور آیات کی تعبیر گذشتہ آیات کے لب و لہجہ سے زیادہ

مشابہ ہے، جو جن مومنین کی گفتگو تھی، لہذا اس کا جنوں کا کلام نہ ہونا بعید ہے۔
 بہر حال گزشتہ آیات میں، قیامت میں مومنین کے لیے اجر و ثواب کے بارے میں گفتگو تھی، اور ان آیات میں ان کے ذمہ باری
 اجر و ثواب کی گفتگو ہے، فرماتا ہے، ”اگر وہ (جن و انس) ایمان کے طریقہ پر استقامت کریں، تو ہم انہیں فراواں پانی سے سیراب کریں گے۔“
 (وان لو استقاموا علی الطریقۃ لاسقیناھم ماء غدقا)۔

ہم ان پر اپنی رحمتوں کی بارش نازل کریں گے، اور حیات بخش پانی کے منابع اور چشمے ان کے اختیار میں دے دیں گے اور جہاں پانی
 کی فراوانی ہوتی ہے، وہاں پر ہر چیز کی فراوانی ہوتی ہے۔ لہذا اس طرح سے ہم انہیں انواع و اقسام کی نعمتوں سے نوازیں گے۔
 ”غدق“ (بروزن شفق) فراواں پانی کے معنی میں ہے۔

قرآن مجید نے اس مطلب پر کئی بار تاکید کیا ہے، کہ ”ایمان و تقویٰ“ نہ صرف معنوی برکات کا سرچشمہ ہیں، بلکہ مادی ارزاق کی زیادتی،
 نعمتوں کی کثرت، آبادی و عمران اور مادی برکت کی زیادتی کا موجب بھی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم ایک تفصیلی بحث، جلد ۴ میں سورہ نوح کی
 آیہ ۱۲ کے ذیل میں ”ایمان و تقویٰ کا عمران و آبادی سے رابطہ“ کے عنوان کے تحت کر چکے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس بیان کے مطابق، وہ چیز جو نعمت کی زیادتی کا سبب بنتی ہے، ایمان پر استقامت ہے، نہ کہ اصل ایمان
 کیونکہ وقتی اور جلدی گزر جانے والے ایمان سے اس قسم کی برکات ظاہر نہیں ہوتیں۔ لہذا اہم چیز ایمان، تقویٰ پر استقامت ہے، جس میں بہت
 سوں کے پاؤں ٹنگ کرنے لگتے ہیں اور لرزاں ہو جاتے ہیں۔

عبدالولی آیت میں اسی سلسلہ میں ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: ”مقصود یہ ہے کہ ہم انہیں ذمہ نعمت
 کے ذریعہ آزمائیں“ (لنفتنھم فیہ)۔

آیا نعمت کی زیادتی ان کے غرور و غفلت کا سبب بنتی ہے یا بیداری، شکرگزاری اور خدا کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کا
 سبب ہوتی ہے۔

اور یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ خدائی امتحان کے اہم اسباب میں سے ایک ذمہ نعمت ہے اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ نعمت کے
 ذریعہ جو آزمائش ہوتی ہے، وہ عذاب کے ذریعہ ہونے والی آزمائش سے زیادہ سخت اور زیادہ چسپیدہ ہوتی ہے۔ کیونکہ نعمت کی زیادتی کا
 مزاج، سستی، کاہلی، غفلت اور لذائذ و شہوات میں غرق ہوتا ہے، اور یہ ٹھیک ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو خدا سے دور کر دیتی ہے، اور

اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنہا وہ چیز جو اس بات کا سبب بنتی ہے کہ مفسرین کا یہ گروہ اسے خدا کا کلام اور حمد و معترفہ سمجھیں ”متکلم مع الخیر“ کی ضمیروں
 ہیں، جو ان آیات میں استعمال ہوئی ہیں، ایک جگہ کہتا ہے کہ ہم انہیں فراواں پانی سے سیراب کریں گے، ”وہ“ ہی جگہ فرماتا ہے کہ، ہر مقصد یہ ہے
 کہ ہم انہیں آزمائیں۔ لیکن اگر ہم ان تعبیروں کو نقل بالمعنی جان لیں تو پھر کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی، یہ ٹھیک اس بات کے مشابہ ہے کہ کوئی اپنے
 دوست سے نقل کرے اور کہے کہ، فلاں آدمی کا عقیدہ یہ ہے کہ میں اچھا آدمی ہوں۔ البتہ اس نے لفظ ”میں“ استعمال نہیں کیا۔ بلکہ اس نے ”وہ“
 کا لفظ استعمال کیا ہے، لیکن کہنے والا اس قسم کی تعبیر استعمال کرتا ہے۔

میدان کو شیطان کی فعالیت کے لیے آمادہ کر دیتی ہے۔ صرف وہی لوگ وفور نعمت کی زیادتی کے غیر مطلوب عوارض سے امان میں رہ سکتے ہیں، جو ہمیشہ خدا کی یاد میں رہیں اور اس کے ذکر کو فراموش نہ کریں اور دائمی یاد کے ذریعہ خانہ دل کو شیاطین کے نفوذ سے محفوظ رکھیں۔ لہذا اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”جو شخص اپنے پروردگار کے ذکر سے روگردانی کرے گا، تو وہ اسے شدید اور روز افزوں عذاب میں گرفتار کرے گا۔“ (ومن يعرض عن ذكر رباه يسلكه عذاباً صعباً)

”صعد“ (بروزن سفر) صعود کرنے اور اوپر جانے کے معنی میں ہے اور بعض اوقات ”گھاٹی“ کے معنی میں آتا ہے اور چونکہ گھاٹیوں سے اوپر جانے میں مشقت اٹھانی پڑتی ہے۔ اس لیے یہ لفظ ”مشقت اٹھانے والے کاموں“ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لہذا بہت سے مفسرین نے اوپر والی آیت کی اسی طرح تفسیر کی ہے کہ اس سے مراد ”مشقت والا عذاب“ ہے۔ اس کے مشابہ جو سورہ مدثر کی آیت ۷ میں آیا ہے جس میں بعض مشرکین کے بارے میں فرماتا ہے: ”سارھقہ صعوداً“۔ ”میں اسے مشقت والے عذاب میں ڈھانپ لوں گا۔“ لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اوپر والی تعبیر، اس عذاب کے مشقت بار ہونے کے بیان کے ضمن میں، اس کے روز افزوں ہونے کی طرف بھی اشارہ ہو۔

اس طرح اوپر والی آیات، ایک طرف تو ایمان و تقویٰ کا، زیادتی نعمت سے تعلق بیان کرتی ہے۔ اور دوسری طرف نعمت کی زیادتی کا، خدا کی آزمائشات کے ساتھ تعلق بیان کرتی ہیں اور تیسری طرف خدا کی یاد سے روگردانی کا سخت ترین اور روز افزوں عذاب سے تعلق ظاہر کرتی ہیں، اور یہ ایسے حقائق ہیں، جن کی طرف قرآن کی دوسری آیات میں بھی اشارہ ہوا ہے۔

جیسا کہ سورہ نملہ کی آیت ۲۴ میں آیا ہے: ”ومن اعرض عن ذكرى فان له معيشة ضنكاً“ ”جو شخص میری یاد سے روگردانی کرے گا تو اس کی زندگی تنگ اور سخت ہو جائے گی۔“

اور سورہ نملہ کی آیت ۴۰ میں حضرت سلیمان کی زبانی بیان ہوا ہے: ”هذا من فضل ربى ليبلونى عاشر اكرامك“ ”یہ میرے پروردگار کا فضل ہے، وہ مجھے آزمانا چاہتا ہے کہ میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں یا کفرانِ نعمت کرتا ہوں۔“ اور سورہ انفال کی آیت ۲۸ میں آیا ہے: ”واعلموا انما اموالكم واولادكم فتنه“ ”جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے آزمائش ہیں۔“

بعد والی آیت میں جن مومنین کی زبانی، دوسروں کو توحید کی طرف دعوت دینے کے موقع پر اس طرح کہتا ہے: ”مساجد خدا کے لیے ہیں، ان مساجد میں خدا کے ساتھ کسی کو نہ پکارو“ (وان المساجد لله فلا تدعوا مع الله احداً)۔ اس بارے میں کہ یہاں ”مساجد سے کیا مراد ہے، گوناگوں تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال دیا ہے کہ اوپر والی آیت میں ”طریقہ“ سے مراد وہی کفر کی راہ ہی ہے، اور اس راہ میں استقامت کے بعد نعمت میں جو زیادتی ہوتی ہے وہ حقیقت میں عذاب کا ایک مقدمہ اور نعمت میں استدرج کا مصداق ہوتا ہے، لیکن یہ تفسیر زیر بحث آیت اور اس سے قبل و بعد کی آیات کے لب و لہجہ سے بالکل مناسب نہیں سمجھتی۔

پہلی یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مکان اور جگہیں ہیں کہ جن میں خدا کے لیے سجدہ ہوتا ہے۔ جس کا مصداق اکمل، مسجد الحرام ہے اور اس کا دوسرا مصداق باقی مساجد ہیں اور زیادہ وسیع مصداق وہ تمام جگہیں ہیں جہاں انسان نماز پڑھتا ہے اور خدا کے لیے سجدہ کرتا ہے، اور پیغمبر کی معروف حدیث کے مطابق، جس میں آپ نے فرمایا:

جعلت لی الارض مسجداً وطهوراً

”تمام روئے زمین میرے لیے سجدہ گاہ اور تیمم کرنے کے لیے طہارت کا ذریعہ قرار دی گئی ہے۔“

اس میں ہر جگہ شامل ہے اور اس طرح سے یہ مشرکین عرب، اور ان جیسے لوگوں کے اعمال کا، جنہوں نے خانہ کعبہ کو بت کہہ بنا رکھا تھا، ایک جواب یہ ہے، اور مخرف عیسائیوں کے اعمال کا بھی، جنہوں نے ”تثلیث“ کو اپنایا تھا اور اپنے گرجوں میں تین خداؤں کی پرستش کرتے تھے قرآن کہتا ہے: تمام عبادت گاہیں خدا کے ساتھ مخصوص ہیں، اور ان عبادت گاہوں میں خدا کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کیا جاسکتا اور اس کے غیر کی پرستش ممنوع ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ مساجد سے مراد، سجدہ کے سات اعضاء ہیں۔ ان اعضاء کو صرف خدا کے لیے زمین پر رکھنا چاہیے اور اس کے غیر کی لیے جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ مشہور حدیث میں نوری امام محمد بن علی الجوادؑ سے نقل ہوا ہے کہ ”معتصم عباسی“ نے ایک مجلس میں جس میں اہل سنت کے علماء جمع تھے، سوال کیا کہ چور کا ہاتھ کہاں سے کاٹنا چاہیے؟ بعض نے کہا کہ کلائی سے، اور اس نے تیمم والی آیت سے استدلال کیا، بعض دوسروں نے کہا کہ کہنی سے اور انہوں نے وضو والی آیت سے استدلال کیا، معتصم نے آپ سے اس سلسلہ میں وضاحت کی درخواست کی تو پہلے تو حضرت نے اس سے خواہش کی کہ وہ اپنے سوال سے صرف نظر کرے، جب اس نے اصرار کیا تو آپ نے فرمایا کہ جو کچھ ان حضرات نے کہا ہے وہ سب غلط ہے صرف چار انگلیاں جڑ سے کاٹی جانی چاہئیں۔ ہاتھ کی ہتھیلی اور انگوٹھا چھوڑ دینا چاہیے۔ جب معتصم نے اس کی دلیل طلب کی تو امام نے پیغمبر کے اس ارشاد سے استدلال کیا کہ سجدہ سات اعضاء پر ہونا چاہیے۔ پیشانی، دو ہاتھ، دونوں گھٹنوں کے سرے اور پاؤں کے انگوٹھوں کے سرے اور اس کے بعد مزید فرمایا کہ اگر کلائی یا کہنی سے کاٹا جائے گا تو ہاتھ اس کے لیے باقی نہیں رہے گا کہ جس پر وہ سجدہ کرے۔ جبکہ خدا نے فرمایا ہے وان المساجد لله یعنی یہ سات اعضاء خدا کے لیے ہیں اور جو چیز خدا کے ساتھ مخصوص ہو اسے قطع نہیں کرنا چاہیے۔ اس بات پر معتصم کو بہت تعجب ہوا اور اس نے حکم دیا کہ آنحضرتؐ کے علم کے مطابق چور کا ہاتھ چاروں انگلیوں کی جڑ سے کاٹا جائے۔

اس مضمون کی اور دوسری احادیث بھی نقل ہوئی ہیں۔

لیکن جو احادیث اس سلسلہ میں نقل ہوئی ہیں وہ عام طور پر سند کے بغیر ہیں، یا ان کی سند ضعیف ہے اور اس سے قطع نظر ان میں ایسا نقص پایا جاتا ہے جن کا جواب آسان نہیں ہے۔ مثلاً ہمارے فقہاء کے درمیان یہ بات مستحکم ہے کہ اگر ”چور“ دوبارہ چوری کرے (جبکہ اس پر جہاد ہو چکی ہو) تو اس کے پاؤں کے اگلے حصہ و نطفہ کریں گے اور پاؤں کی اٹری کو سالم رہنے دیں گے۔ حالانکہ پاؤں کا انگوٹھا بھی سجدہ کے سات

۱۔ وسائل الشیخہ جلد ۲ ص ۹۰۰ حدیث ۲

۲۔ وسائل الشیخہ جلد ۱۸ ص ۲۹۰ (ابواب حدیث قراب ۴ حدیث ۵)

۳۔ نرائقین جلد ۵ ص ۲۲۹ ۲۳۰

مقامات میں سے ایک ہے اور اسی طرح "ممازب" (ڈر کے ڈرنے والے) کے بارے میں جس کی سزاؤں میں سے ایک اس کے پاؤں کے ایک حصہ کو قطع کرتا ہے۔

تیسرا یہ کہ "مساجد" سے مراد وہی مسجد ہے یعنی سجدہ ہمیشہ خدا کے لیے ہونا چاہیے اور اس کے غیر کو سجدہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ احتمال بھی آیت کے ظاہر کے برخلاف ہے، اور اس پر کوئی بھی شاہد موجود نہیں ہے۔

جو کچھ بیان ہو چکا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ آیت کے ظاہر کے موافق ہے وہ پہلی تفسیر ہی ہے اور توحید اور عبادت کے خدا کے ساتھ مخصوص ہونے کے بارے میں، قبل و بعد کی آیات سے مکمل مناسبت رکھتی ہے اور دوسری تفسیر آیت کے مفہوم میں وسعت کی قسم سے لیکن تیسری تفسیر پر کوئی شاہد نہیں ہے۔

اسی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے، قرآن مجید اور پیغمبر کی عبادت کی، حد سے زیادہ تاثیر کو بیان کرنے کے لیے مزید کہتا ہے: "جس وقت خدا کا بندہ ——— محمد ——— عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور خدا کو پکارتا ہے تو جنوں کا ایک گروہ شدت سے اس کے اطراف میں جمع ہو جاتا ہے" (و انہ لقا قام عبد اللہ یدعوہ کا دوا یكونون علیہ لبدًا)۔

"لبد" (بروزن پیر) اس چیز کے معنی میں ہے جس کے اجزاء ایک دوسرے کے اوپر تہہ بہ تہہ رکھے گئے ہوں، اور یہ تفسیر اس پہلی ملاقات میں، قرآن سننے کے لیے، جن مؤمنین کے عجیب و غریب جوم کو بیان کرتی ہے، اور اسی طرح پیغمبر کی نماز کے حد سے زیادہ قوت جذب کو بیان کرتی ہے۔

اس آیت کے لیے دو اور تفاسیر بھی بیان ہوئی ہیں پہلی یہ کہ مؤمنین جن پیغمبر کے اصحاب کی حالت کی تشریح کرتے ہیں کہ وہ آتی کم تولا ہونے کے باوجود جو مکہ میں ان کی تھی۔ پیغمبر کے ارشادات کو سننے کے لیے کس طرح سرا در کندھے سے بھی اوپر چلے جاتے تھے۔ اور اس کا مقصد یہ تھا کہ گروہ جن انھیں نمود نہا کر ایمان کی طرف آئیں۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہ مشرکین عرب کی حالت کا بیان ہے کہ جس وقت پیغمبر نماز اور قرآن میں مشغول ہوتے تھے تو وہ آپ کے اطراف کو سختی سے گھیر لیتے تھے اور استہزاء کرتے، مذاق اڑاتے اور آپ کو تکلیف و آزار پہنچاتے۔

لیکن آخری تفسیر جن مبلغین کے ہدف و مقصد کے ساتھ کچھ مناسبت نہیں رکھتی، کیونکہ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ دوسروں کو ایمان کا شوق دلائیں لہذا مناسب گزشتہ دو معانی میں سے کوئی ایک ہی ہے۔

ایک نکتہ

آیہ "ان المساجد لله" کی تفسیر میں تحریف

پیغمبر اور اولیاء دین سے "توسل" کا مسئلہ یعنی ان حضرات کو بارگاہِ خدا میں وسیلہ اور شفیع قرار دینا ایک ایسا مفہوم ہے جو نہ حقیقتِ توحید

اس تفسیر کے مطابق اور اس بناء پر کہ یہ جملہ جن مؤمنین کی گفتگو میں سے ہو، "مشکم" کی بجائے "غائب" کی صورت لانا باب "الانتہات" سے ہے۔ یہ اس لحاظ سے ہے کہ ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کی حالت کو بیان کر رہا تھا۔ (غور کیجیے)

انات رکھتا ہے اور نہ ہی قرآن مجید کی آیات سے، بلکہ یہ تو توحید پر ایک تاکید ہے اور یہ کہ ہر چیز خدا کی طرف سے ہے۔ قرآن مجید کی آیات میں یہ مسئلہ شفاعت اور اسی طرح مومنین کے لیے پیغمبر کی استغفار اور طلب بخشش کے مسئلہ کا بار بار اشارہ ہوا ہے۔

اس کے باوجود بعض ایسے لوگوں کا — جو اسلام اور قرآن کی تعلیمات سے دور ہیں — اصرار یہ ہے کہ ہر قسم کے توسل اور شفاعت ٹھیک اور کر دیں اور اپنے مقصود کو ثابت کرنے کے لیے کچھ دستاویز تلاش کریں۔ منجملہ ان کے اوپر والی آیت (وَ اِنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا) ہے وہ کہتے ہیں کہ اس آیت کے مطابق قرآن یہ حکم دیتا ہے کہ خدا کے نام کے ساتھ کسی شخص کا نام نہ لیا جائے اور اس کے علاوہ کسی کو نہ پکارو، اور کسی سے شفاعت طلب نہ کرو۔

لیکن انصاف یہ ہے کہ اس آیت کا اس مفہوم کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے، بلکہ اس کا ہدف اور مقصد شرک کی نفی ہے یعنی کسی چیز کو خدا کے ساتھ عبادت کرنے میں یا حاجت طلب کرنے میں شریک قرار دینا۔

دوسرے لفظوں میں اگر کوئی واقعی طور پر خدا کے کام غیر خدا سے چاہے اور اس کو صاحب اختیار اور ان کے انجام دینے میں مستقل شمار کرے تو تو وہ مشرک ہے۔ جیسا کہ لفظ ”مع“ (فلا تدعو مع اللہ) کے جملہ میں اس معنی کی گواہی دیتا ہے کہ کسی کو خدا کا شریک اور مستقل تاثیر کا ہدف نہیں جانا چاہیے۔

لیکن اگر کوئی خدا کے انبیاء سے شفاعت چاہے یا پروردگار کی بارگاہ میں وساطت کا تقاضا کرے، تو یہ نہ صرف اس کی نفی نہیں کرتا، بلکہ قرآن بعض اوقات خود پیغمبر کو اس بات کی دعوت دیتا ہے، اور کبھی دوسروں کو حکم دیتا ہے کہ وہ پیغمبر سے شفاعت طلب کریں۔

سورۃ توبہ کی آیہ ۱۰۳ میں آیا ہے: خذ من اموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم بها وصل عليهم ان صلاتك سكن لهم ان کے مال سے زکوٰۃ لے لو تا کہ تم اس کے ذریعہ انہیں پاک کر دو اور (زکات وصول کرتے وقت) ان کیلئے دعا کرو، کیونکہ تیری دعا ان کے سکون و آرام کا باعث ہے۔

اور سورۃ یوسف کی آیہ ۹ میں ان کے بھائیوں کی زبانی باپ کو خطاب کرتے ہوئے یہ آیا ہے: یا ابا اناس استغفر لنا ذنوبنا اتانا کنا خاطئين سے ابا جان! ہمارے لیے استغفار کیجیے کیونکہ ہم نے گناہ کا ارتکاب کیا۔

یعقوب نے بھی، اس تقاضے کا نہ صرف انکار نہیں کیا بلکہ ان کی درخواست کی موافقت میں یہ وعدہ دیا اور کہا: سوف استغفر لکم سبقتی“ میں بہت جلد تمہارے لیے بارگاہِ خدا سے بخشش کا تقاضا کروں گا۔

اس بناء پر توسل اور شفاعت طلب کرنے کا مسئلہ اس مفہوم کے ساتھ، جو بیان کیا گیا ہے، قرآن کے صریح احکام میں سے ہے۔

۱۔ ہم نے ”قرآن و حدیث کی نظر میں شفاعت“ کے مسئلہ کے بارے میں، پہلی جلد سورۃ بقرہ کی آیہ ۴۸ کے ذیل میں اور ”توسل“ کی حقیقت کے بارے میں سورۃ ماہدہ کی آیہ ۲۵ جلد ۳ میں، تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

- ۲۰۔ قُلْ إِنَّمَا أَدْعُوا رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِهِ أَحَدًا ۝
- ۲۱۔ قُلْ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا ۝
- ۲۲۔ قُلْ إِنِّي لَنْ يُجِيرَنِي مِنَ اللَّهِ أَحَدٌ وَلَنْ أَجِدَ مِنْ دُونِ مُلْتَحَدًا ۝
- ۲۳۔ إِلَّا بَلَاغًا مِّنَ اللَّهِ وَرِسَالَةً ۖ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَأَتَىٰ ذُنُوبَهُ فَلِلَّهِ نَارُ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا أَبَدًا ۝
- ۲۴۔ حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ أَضَعُفٌ نَّاصٍ ۖ وَأَقَلُّ عَدَدًا ۝

ترجمہ

۲۰۔ کہہ دیجیے : میں تو صرف اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں اور کسی کو بھی اس کا شریک قرار نہیں دیتا۔

۲۱۔ کہہ دیجیے ! میں تمہارے لیے کسی نقصان یا ہدایت کا مالک نہیں ہوں۔

۲۲۔ کہہ دیجیے ! (اگر میں بھی اس کے حکم کے خلاف کروں گا) تو کوئی بھی مجھے اس کے مقابلہ میں پناہ نہیں دے گا

اور اس کے علاوہ مجھے اور کوئی پناہ گاہ نہیں ملے گی۔

۲۳۔ میری ذمہ داری تو صرف خدا کی طرف سے ابلاغ رسالت اور اس کے پیغاموں کو پہنچانا ہے، اور جو شخص

خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، تو اس کے لیے جہنم کی آگ ہے۔ وہ اسی میں ہمیشہ ہمیشہ

رہے گا۔

۲۴۔ (کفار کی یہ کارکنی اسی طرح جاری رہے گی) جب تک کہ وہ اسے دیکھ نہ لیں، جس کا انھیں وعدہ دیا گیا ہے

اس وقت انھیں معلوم ہو جائے گا کہ کس کے مددگار زیادہ ضعیف ہیں اور کس کی جمیعت بہت ہی کم ہے۔

تفسیر کہہ دیجیے: میں کسی کے سود و زیاں کا مالک نہیں ہوں

ان آیات میں توحید کی بنیادوں کو مستحکم کرنے اور ہر قسم کے شرک کی نفی کے لیے — جس کی طرف گزشتہ آیات میں بھی اشارہ ہوا تھا — پہلے پیغمبر کو حکم دیا جاتا ہے: ”کہہ دیجیے میں تو صرف اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں اور صرف اسی کی عبادت کرتا ہوں، اور کسی کو بھی اس کا شریک قرار نہیں دیتا“ (قل انما ادعوا سربى ولا اشرك به احداً)۔

اس کے بعد حکم ہے: ”کہہ دیجیے میں تمھارے لیے سود و زیاں کا مالک نہیں ہوں اور ہدایت دوسرے کے ہاتھ میں ہے“۔ (قل انى لا املك لكم ضرراً ولا رشداً)۔

پھر مزید کہتا ہے: ”کہہ دیجیے: اگر میں بھی خدا کے حکم کے خلاف کام کروں گا تو کوئی بھی مجھے اس کے مقابلہ میں پناہ نہیں دے گا، اور میں اس کے علاوہ کوئی اور ملجاء اور پناہ گاہ نہیں پاؤں گا“ (قل انى لن يجيرنى من الله احد ولن اجد من دونہ ملتحداً)۔

اس طرح سے نہ تو کوئی مجھے پناہ دے سکتا ہے، اور نہ ہی کوئی پیغمبر میری پناہ گاہ بن سکتی ہے۔ یہ باتیں ایک طرف تو خدا کی بارگاہ میں مکمل عہدیت کا اعتراف ہے، اور دوسری طرف سے پیغمبر کے بارے میں ہر قسم کے غلو کی نفی کرتی ہیں اور تمہاری طرف سے یہ بتاتی ہیں کہ نہ صرف بتوں سے ہی کوئی کام نہیں ہو پاتا بلکہ خود پیغمبر بھی اس عظمت کے باوجود عذابِ خدا کے مقابلہ میں ملجاء اور مستقل پناہ نہیں ہو سکتے۔ اور جو حقّی طرف سے ان ہمانہ جوئیوں اور بے محل توقعات کو — جو سہٹ دھرم لوگ پیغمبر سے رکھتے تھے، اور ان سے خدائی کاموں کے تقاضے کرتے تھے — ختم کرتی ہیں اور یہ ثابت کرتی ہیں کہ توسل اور شفاعت بھی اذنِ خدا سے ہی ہے۔

”ملتحداً“ مطمئن پناہ گاہ کے معنی میں ہے اور اصل میں ”لحد“ (بروزن مہمد) کے مادہ سے اس گڑھے کے معنی میں ہے جو ایک کنارے پر بنایا گیا ہو، جیسا کہ لہروں کے لیے قبر کی گہرائی میں کھودا جاتا ہے، جو قبر کی گہرائی میں ایک طرف کو زیادہ مقدار میں کھودتے ہیں اور مردے کے جسم کو اس میں رکھتے ہیں تاکہ اس پر مٹی نہ گرے اور جانوروں کے آسیب سے بھی زیادہ محفوظ رہے، اس کے بعد دوسری مطمئن جگہ اور پناہ گاہ پر اس کا اطلاق ہوا ہے۔

جیسا کہ گزشتہ آیات میں بھی ہم نے اشارہ کیا ہے کہ ان تعبیرات کا مقصد یہ ہے کہ پیغمبر خدا کے مقابلہ میں اور مستقل طور پر کوئی نقش و اثر

۱۰ بعض نے اس آیت کے لیے ایک شانِ نزول بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ کفار قریش نے پیغمبر سے کہا کہ تم اپنے دین سے بچو جاؤ تاکہ ہم تمہیں پناہ دیں تو اوپر والی

آیت نازل ہوئی اور انھیں جواب دیا (تفسیر ابوالفتح رازی جلد ۱۱ ص ۲۹۳)

نہیں رکھتے، اس کے باوجود وہ خدا سے لوگوں کے لیے مشکلات کے حل کا تقاضا کر سکتے ہیں، یا شائستہ اور لائق افراد کے لیے ہدایت کی کر سکتے ہیں اور یہ مین توحید ہے نہ کہ شرک۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان آیات میں ”حصر“ (لفقان) کے مقابل میں ”رشد“ (ہدایت) کو قرار دیا گیا ہے، جو اس اشارہ ہے کہ حقیقی سود اور نفع ہدایت میں ہے۔ جیسا کہ جنات کی باتوں میں بھی گزشتہ آیات میں ”شر“ اور ”رشد“ کے مقابل میں قرار اور یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: ”میرا وظیفہ تو صرف خدا کی طرف سے ابلاغ اور اس کے پیغامات کو پہنچانا ہے“ (الابلاغ من اللہ ورسالاتہ)۔

یہ تعبیر اسی چیز کے مشابہ ہے جس کی طرف آیات قرآنی میں بار بار اشارہ ہوا ہے، جیسا کہ سورہ مائدہ کی آیت ۹۲ میں آیا ہے: (انما رسولنا البلاغ المبین) ”پیغمبر کے ذمہ تو صرف واضح طور پر ابلاغ کرنا (اور پہنچانا ہے)۔ اور سورہ اعراف کی آیت ۸۸ میں آیا ہے:۔

قل لا املك لنفسي نفعا ولا ضررا الا ما شاء الله ولو كنت اعلم الغيب لاستكثرت

من الخير وما مسنى السوء ان انا الا نذير ولبشير لقوم يؤمنون

”کہہ دیجیے کہ میں تو اپنے لیے بھی سود و زیاں کا مالک نہیں ہوں، اور اگر میں غیب کی خبر رکھتا ہوتا تو اپنے لیے بہت سا نفع جمع کر لیتا اور کوئی بھی خرابی مجھے نہ پہنچتی۔ میں تو صرف اس گروہ کے لیے جو ایمان لے آتے ہیں،

ڈرلنے والا اور بشارت دینے والا ہوں۔“

اس جملہ کے لیے بہت سے مشرین نے ایک اور تفسیر بھی بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ: میں اپنی نجات کے لیے دعوتِ حق کے ابلاغ اور اس کی رسالت کے ادا کرنے کے سوا، کسی قسم کی کوئی پناہ گاہ نہیں رکھتا۔

یہ بات کہ ”بلاغ“ اور ”رسالات“ میں کیا فرق ہے۔ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ ”بلاغ“ تو اصول دین کے ابلاغ کی طرف اشارہ ہے اور ”رسالات“ فروع دین کے بیان کی طرف۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ ”بلاغ“ احکامِ الہی کے معنی میں ہے اور ”رسالات“ ان کے اجراء کے معنی میں۔

لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی معنی کی طرف لوٹیں اور یہ ایک دوسرے کی تاکید ہوں، اور قرآن کی بہت سی آیات اس طرح ہیں، جو ان دونوں کو ایک ہی معنی کی صورت میں بیان کرتی ہیں، مثلاً سورہ اعراف کی آیت ۶۲، جو یہ کہتی ہے ”ابلغکم رسالاتِ ربی“

”چونکہ“ بلاغ ”صرف“ عن ”کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ اس لیے بعض نے ”من“ کو ”عن“ کے معنی میں لیا ہے اور بعض نے ”کانتا“ کا لفظ مقدر سمجھا ہے (الابلاغ کا کانتا من اللہ)

اس تفسیر کے مطابق یہ جہد گزشتہ ہے ولن اجد من دونہ ملتحدًا سے استثناء ہے اور پہلی تفسیر کے مطابق یہ گزشتہ آیات سے استثناء ہے۔

اپنے پروردگار کی رسالتیں نہیں پہنچاتا ہوں" (اور دوسری متعدد آیات)

بہر حال آیت کے آخر میں خبردار کرتا ہے کہ "جو شخص خدا اور اس کے رسول کی معصیت اور نافرمانی کرے گا، اس کے لیے جہنم کی آگ ہے ہمیشہ اسی میں رہے گا" (و من یعص الله ورسوله فان له نار جہنم خالدین فیہا ابداً)۔ یہ بات واضح ہے کہ اس سے مراد برگنہگار نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد مشرکین اور کافرین ہیں، کیونکہ ہر گنہگار ہمیشہ جہنم کی آگ میں رہنے کی نہیں ہے۔

اس کے بعد مزید کتاب ہے: کفار و مشرکین کی یہ وضع و کیفیت، کہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کا استہزاء کرتے اور انہیں ضعیف اور کمزور شمار کرتے ہیں وقت تک یونہی جاری رہے گی، جب تک کہ وہ اس چیز کو نہ دیکھ لیں جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اس وقت وہ جانیں گے کہ کس کے اور زیادہ ہیں، اور کس کی جہنیت کم ہے" (حتیٰ اذا رآوا ما یوعدون فسیعلمون من اضعف ناصراً و اقل عدداً)۔

اس بارے میں کہ "ہا یوعدون" کے جملہ سے دنیا کا عذاب مراد ہے یا آخرت کا یا دونوں؟ بہت سی تفسیریں بیان کی گئی ہیں لیکن مناسب یہ ہے کہ اس کا معنی عام اور وسیع ہو۔ خاص طور پر جبکہ تعداد کی زیادتی اور کمی، اور ناصر و مددگار کا ضعف و قدرت زیادہ تر دنیا کے ساتھ مربوط ہے۔ لہذا بہت سے مفسرین نے اس کی جنگِ بدر کے مسئلہ کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ جس میں مسلمانوں کی قدرت و قوت آشکار ہوئی تھی اور بہت سی روایات میں مہدی (ارواحنا فداه) کے ظہور کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے۔ اس بنا پر اگر ہم آیت کی اس کے معنی کے ساتھ تفسیر کریں تو یہ سب باتیں شامل ہوں گی۔

علاوہ ازیں سورہ مہم کی آیت ۵، میں بھی آیا ہے: حتیٰ اذا رآوا ما یوعدون اما العذاب و اما الساعة فسیعلمون من هو شر مکاناً و اضعف جنداً۔ یہ کیفیت اسی طرح برقرار رہے گی جب تک کہ وہ خدا کے وعدے کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لیں گے یا اس دنیا کا عذاب یا آخرت کا عذاب، اس دن وہ جان لیں گے کہ کس شخص کی حیثیت بدتر اور کس کا فکر زیادہ کمزور و ناتوان ہے۔

بہر حال آیت کا لب و لہجہ بتاتا ہے کہ دشمنانِ اسلام اپنے افراد کی قدرت اور کثرت پر ناز کیا کرتے تھے اور انہیں ضعیف و ناتوان سمجھتے تھے، قرآن اس ذریعہ سے مومنین کو تسلی دیتے ہوئے اور ان کی دلداری کرتے ہوئے انہیں خوشخبری دیتا ہے کہ آخر کار ان کی کامیابی اور ان کی شکست و ناتوانی کا دن آپہنچے گا۔

"حتیٰ" عام طور پر کسی چیز کی غایت اور نیابت کے لیے آتا ہے اور یہاں اس کے لیے دو وجہ بیان کیے گئے ہیں پہلا یہ کہ یہ ایک محدود جگہ کی نیابت ہے، اور تفسیر میں اس طرح ہے "ولایزالون یستہزءون ویستضعفون المؤمنین حتیٰ اذا رآوا ما یوعدون" اور دوسری یہ کہ "یکونون علیہ لبداً" کی غایت ہے، جو پہلے کی چند آیات میں آیا ہے، لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

چند نکات

۱۔ خدائی رہبروں کی صداقت

خدائی رہبروں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ”شیطانی رہبروں“ کے برخلاف ہرگز لمبے چوڑے دوسرے نہیں کرتے اور اپنے بڑا نہیں سمجھتے اور لشکر و مغرور نہیں ہوتے۔

جبکہ فرعون انار بکم الاعلیٰ، ”میں تمھارا اعلیٰ اور بلند تر خدا ہوں“ و ہذہ الانہار تجوی من تحتی، ”اور دریا کی بڑی بڑی شاخیں سب میری منظروں کے سامنے جاری ہیں“ کی احمقانہ فریاد بلند کرتا تھا، اور زہران الہی، تواضع اور فروتنی سے، اپنے آپ خدا کے بندوں میں سے ایک چھوٹا سا بندہ بتلاتے تھے، اور یہ کہتے تھے کہ وہ اس کے ارادہ کے مقابلے میں اپنی طرف سے کوئی کار نہیں رکھتے۔

سورہ کہف کی آیت ۱۱۰ میں آیا ہے: قل انما انا بشر مثکم یوحی الی: کہہ دیجیے میں تو تم جیسا ہی ایک بشر ہوں، سولے کی کہ میری طرف وحی ہوتی ہے۔

اور دوسری جگہ آیا ہے: وما ادری ما یفعل بی ولا بکم ان اتبع الا ما یوحی الی وما انا الا نذیر

مبین: ”میں نہیں جانتا کہ خدا میرے ساتھ اور تمھارے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ میں تو صرف اس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی ہوتی ہے اور میں ایک واضح ڈرانے والے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں“ (احقاف — ۹)

ایک اور دوسری آیت میں یہ آیا ہے: قل لا اقول لکم عتدی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب ولا اقول لکم انی ملک: کہہ دیجیے میں یہ نہیں کہتا کہ خدا کے خزانے میرے پاس ہیں میں تو غیب کا علم بھی نہیں رکھتا (سولے کے جس کی خلافت تعلیم دیتا ہے) اور نہ ہی میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں“ (انعام — ۵۰)

اگر وہ مادی قدرت کی انتہائی بلندی پر بھی پہنچ جاتے تو بھی ہرگز آپ سے باہر نہ ہوتے اور سلیمان کی طرح کہتے: ہذا من فضل ربی: یہ قدرت و شوکت میرے پروردگار کا فضل ہے“ (نمل — ۲۰)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں متعدد آیات میں سخت قسم کی تعبیریں نظر آتی ہیں، جن میں پیغمبر کی ذات کو مخاطب کرتے ہوئے انھیں عتاب کرتا ہے، اور اس بات کی تہنیت کرتا ہے کہ وہ اپنی تمام ذمہ داریوں کا خیال رکھیں۔

یہ آیت اور گزشتہ آیات کا مجموعہ جن کی تعداد قرآن میں کم نہیں ہے، اس پیغمبر کی حقانیت پر ایک زندہ مسند ہے۔ ورنہ اس میں کونسی رکاوٹ تھی کہ وہ ان لوگوں کے سامنے جو آپ کے لیے ہر قسم کے مقام اور منزلت کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے، اپنے لیے بڑے سے بڑے مقام کا دعویٰ کرتے، جو نیک بشر کی دسترس سے بھی بالاتر ہوتا اور ہر قسم کے چون و چرا سے دور بھی۔ جیسا کہ تاریخ نے شیطانی رہبروں کے بارے میں اس قسم کی بدست سی مثالیں پیش کی ہیں۔

ہاں! از ریخت آیات اور ان ہی جیسی آیات کی تعبیریں رسول اللہ کی دعوت کی حقانیت کے زندہ شواہد ہیں۔

۲۔ جمعیت کے افراد کا زیادہ ہونا اہم نہیں، جمعیت کا ایمان اہم ہے۔

قرآنی آیات میں یہ مطلب بہت زیادہ نظر آتا ہے کہ ہر زمانے کے طاغوت اپنی جمعیت اور افرادی قوت کی دوسروں پر زیادتی پر فخر کرتے تھے اور انبیاء کے مقابلے میں اترتے تھے۔

فرعون موسیٰ کے طرف داروں کی تحقیر کے لیے کہتا تھا: ”ان هؤلاء لشردمة قليلوت“ ”یہ بہت ہی تھوڑے سے آدمی ہیں“ (شعراء — ۵۴)

اور مشرکین عرب یہ کہا کرتے تھے: ”نحن اكثر اموالاً واولاداً ومانحن بمعذبين“ ”ہم بہت مال اور اولاد رکھتے ہیں اور ہمیں ہرگز عذاب نہیں ہوگا“ (سبا — ۲۵)

اور کبھی ایک بے ایمان آدمی ایک مومن آدمی کے مقابلے میں اپنی ثروت اور افرادی قوت پر فخر کرتے ہوئے کہتا: انا اكثر منك مالاً و احزن فقراً: ”میرے پاس تجھ سے زیادہ دولت و ثروت اور زیادہ قوی افراد ہیں“ (کہف — ۲۴) لیکن اس کے مقابلے میں، افراد مومن، انبیاء اور ضلّی رہبروں کی پیروی میں، جمعیت کی زیادتی اور افرادی قوت پر تکیہ نہیں کرتے تھے۔ ان کی منطق یہ تھی: کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله: ”کتے ہی چھوٹے گروہ ایسے ہوئے ہیں جو خدا کے حکم سے بڑے بڑے گروہوں پر کامیاب ہوئے ہیں“ (بقرہ — ۲۴۹)

ایہا الناس لا تستوحشوا فی طریق الہدی لقلۃ اہلہ

اے لوگو! ہدایت کی راہ میں افراد کی کمی سے ہرگز وحشت نہ کرو لیو

تاریخ انبیاء خصوصاً پیغمبر اسلام کی تاریخ زندگی، اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بے ایمان اور بکثرت جمعیتیں، بہر قسم کی قدرت رکھنے کے باوجود، مومنین کے تھوڑے سے یا دور انصار کے مقابلے میں کس طرح سے شکست اور درماندگی کا شکار ہوئے، قرآن مجید میں ”بنی اسرائیل“ و ”فرعون“ اور ”طاوت“ و ”جالوت“ کی داستان میں اور ”جنگ بدر“ و ”احزاب“ سے مربوط آیات میں بھی یہی اچھی طرح منعکس ہوئے ہیں۔

اب کا خدا
کیا کیا ہے
اب دینہ
کہہ د

یہ کوئی زمانہ نہ
یہ علم
آزمائش کا موہ
۱۱

اور امتہاء دونوں
اہل
دلت کو بھی شا
بہر حال
اس سے بے

ایک
انہوں نے آ

پہنچیں

اس

پہنچیں

۲۵۔ قُلْ إِنْ أَدْرِيْٓ أَقْرَبُٓ مَا تُوْعَدُونَ أَمْ يَجْعَلُ لَكَ سَرِيْرًا

أَمَدًا ۝

۲۶۔ عَلِيْمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ أَحَدًا ۝

۲۷۔ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّكَ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ

وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝

۲۸۔ لِيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسَالَتِ رَبِّهٖمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ

وَاَحْطٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ۝

ترجمہ

۲۵۔ کہہ دیجیے کہ میں نہیں جانتا، جس چیز کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ قریب ہے، یا میرا پروردگار اس کے لیے کوئی وقت قرار دے گا۔

۲۶۔ عالم الغیب وہی ہے اور وہ کسی شخص کو بھی اپنے غیب کے اسرار پر آگاہ نہیں کرتا۔

۲۷۔ مگر ان رسولوں کو، جنہیں اس نے منتخب کر لیا ہے، اور وہ ان کے لیے، ان کے آگے بھی اور پیچھے بھی نگران مقرر کر دیتا ہے۔

۲۸۔ تاکہ وہ جان لے کہ اس کے پیغمبروں نے اپنے پروردگار کے پیغامات کو پہنچا دیا ہے اور جو کچھ ان کے پاس ہے وہ اس پر احاطہ رکھتا ہے اور اس نے ہر چیز کا حساب کر رکھا ہے۔

تفسیر

عالم الغیب خدا ہے

چونکہ گزشتہ آیات میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا تھا کہ اس گروہ کا استہزاء اور سرکشی اسی طرح سے جاری رہے گی، جب تک کہ

عذاب کا خدائی وعدہ نہیں آپہنچتا اور اس سے یہ سوال اہمتر ہے کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ جیسا کہ مفسرین نے اس آیت کے شان نزول میں بیان کیا ہے، کہ بعض مشرکین نے ”نصر بن حارث“ کے مانند، گزشتہ آیات کے نزول کے بعد اسی سوال کو پیش کیا تھا، قرآن مجید اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے۔

”کہہ دیجیے! میں نہیں جانتا کہ وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے (دنیا کا عذاب اور قیام قیامت) قریب ہے یا میرا پروردگار، اس کے لیے کوئی زمانہ قرار دے گا“ (قل ان ادھر ہی اقرب ما توعدون امر یجعل لہ سراجی امدًا)۔
یہ علم خدا کی پاک ذات کے ساتھ مخصوص ہے، اور اس نے یہ چاہا ہے کہ یہ اس کے بندوں سے پوشیدہ رہے۔ تاکہ مخلوق کے امتحان اور آزمائش کا موضوع مکمل ہو، کیونکہ اگر وہ یہ جان لیں کہ وہ دور ہے یا نزدیک ہے تو دونوں صورتوں میں امتحان کا اثر کم ہو جائے گا۔
” امد “ (بروزان صمد) زمانہ کے معنی میں ہے، اس فرق کے ساتھ کہ ”مفردات“ میں ”راغب“ کے قول کے مطابق کہ ”زمان“ تو ابتداء اور انتہاء دونوں کو شامل ہوتا ہے، لیکن ”امد“ صرف کسی چیز کی انتہاء کے زمانہ کو کہتے ہیں۔

اہل لغت نے یہ بھی کہا ہے کہ ”امد“ اور ”ابد“ معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے کے نزدیک ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ ”ابد“ تو غیر محدود مدت کو بھی شامل ہوتا ہے جبکہ ”امد“ صرف محدود مدت چاہے وہ جتنی بھی طولانی ہو۔
بہر حال، قرآن مجید کی آیات میں بار بار یہ طلب ہمارے سامنے آتا ہے کہ جب بھی قیامت کے زمانہ کے بارے میں سوال ہوتا ہے تو پیغمبر اکرمؐ اس سے بے اطلاع ہونے کا اظہار فرمایا کرتے تھے اور یہ کہنا کرتے تھے کہ ”اس کا علم خدا کے ساتھ مخصوص ہے“
ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن ”جبریل“ ایک بدو عرب کی صورت میں پیغمبرؐ کے سامنے ظاہر ہوئے، اور ان سوالات میں سے جو انھوں نے آنحضرتؐ سے کیے، ایک یہ تھا کہ:

اخبرنی عن الساعة

”بتلائیے قیامت کب برپا ہوگی؟“

پیغمبرؐ نے فرمایا:

ما المسئول عنها باعلم من السائل

”جس سے سوال کر رہے ہو وہ (اس مسئلہ میں) سوال کرنے والے سے زیادہ آگاہ نہیں ہے۔“

اس مرد عرب نے دوبارہ بلند آواز میں کہا:

یا محمد متی الساعة؟

”اے محمد! قیامت کب آئے گی؟“

پیغمبرؐ نے فرمایا:

ویحک انها کائنۃ فما اعددت لہا؟

”وائے ہو تجھ پر قیامت تو آکر رہے گی، یہ تو بتا کہ تو نے اس کے لیے کون سی چیز تیار کر

رکھی ہے۔“

اعرابی نے کہا:

”میں نے نماز روزہ تو کوئی زیادہ فراہم نہیں کیا لیکن خدا اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہوں“

پیغمبر نے فرمایا:

فانت مع من احببت

”پس تو اس کے ساتھ رہے گا جسے تو دوست رکھتا ہے“

اصحاب پیغمبر میں سے ایک صحابی ”انس“ کہتے ہیں:

فما فرح المسلمون بشئ ع فرحهم بهذا الحدیث

”مسلمان کسی حدیث پر اتنا خوش نہیں ہوئے، جتنا کہ اس حدیث پر خوش ہوئے ہیں

اس کے بعد بحث کو جاری رکھتے ہوئے، علم غیب کے بارے میں ایک قاعدہ کلیہ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”عالم الغیب ہے وہ کسی کو بھی اپنے غیب کے اسرار سے آگاہ نہیں کرتا“ (عالم الغیب فلا یظهر علی غیبہ احداً) ۱

اس کے بعد اس کلی مسئلہ سے استثناء کے عنوان سے مزید کہتا ہے: ”مگر وہ رسول کہ جسے اس نے برگزیدہ کیا ہے اور اس سے راضی ہے“ (الا من ارتضی من رسول)۔

وہ اے جتنا چاہتا ہے علم غیب کی تعلیم دیتا ہے اور وحی کے ذریعہ اس تک پہنچاتا ہے۔

”پھر اس کے آگے اور پیچھے نگرانی کرنے والے نگہبان بھیجتا ہے“ (فانه یسلک من بین یدیہ ومن

خلفه رصداً)۔

”رصد“ اصل میں ”مصدری“ معنی رکھتا ہے اور کسی چیز کی نگرانی اور نگہبانی کے لیے آمادگی کے معنی میں ہے اور اسم فاعل اور ”منعول“ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور یہ مفروضہ جمع دونوں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی ایک نگرانی کرنے والا اور نگہبان فرد، یا نگرانی کرنے والے اور نگہبانوں کی ایک جماعت، دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور یہاں اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جنہیں خدا نزول وحی کے بعد حکم دیتا ہے کہ وہ اس کے پیغمبر کا ہر طرف سے احاطہ کیے رہیں۔ اور شیاطین، جن و انس اور ان کے دوسروں سے، اور ان چیزوں سے، جو وحی کی اصالت کو خدشہ دار کرتی ہیں، محافظت اور پاسداری کریں، تاکہ اللہ کا پیغام کمی و زیادتی اور کسی معمولی سے معمولی خدشہ کے بغیر بندوں تک پہنچ جائے۔ اور یہ بات خود پیغمبر کے معصوم ہونے کی ایک دلیل ہے کہ وہ شبی قوتوں اور خدائی امدادوں اور اس کے فرشتوں کی نگرانی کے ذریعہ مغز نشاں اور نظاؤں

۱۔ تفسیر ”مراغی“ جلد ۲۹ ص ۱۰۵

۲۔ ”عالم الغیب“ ایک مبتدائے مفروضہ کی خبر ہے اور تقدیر ”هو العالم الغیب“ ہے اور بعض نے اسے ”رَبِّی“ کی

صفت یا بدل قرار دیا ہے، جو گذشتہ آیت میں ہے۔

ماحول محفوظ ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں جو اس سورہ کی آخری آیت ہے، ان نگرانی کرنے والے نگہبانوں کے وجود کی دلیل کو اس طرح بیان کرتا ہے "مقصود یہ ہے کہ خدا جان لے کہ اس کے پیغمبروں نے اپنے پروردگار کے پیغامات بے کم و کاست پہنچا دیئے ہیں، اور جو کچھ ان کے پاس ہے، خدا اس پر احاطہ رکھتا ہے، اور اس نے ہر ایک چیز کا بارگاہی کے ساتھ شمار کیا ہے" (لیعلم ان قد ابلاغوا رسالات ربہم واحاط بما لذبہم واحصی کل شیء ععدداً)۔

یہاں "علم" سے مراد علم نعلی ہے اور دوسرے لفظوں میں آیت کا معنی یہ نہیں ہے کہ خدا اپنے پیغمبر کے بارے میں کسی چیز کو نہیں جانتا تھا اور بعد میں اس نے جانا ہے۔ کیونکہ خدا کا علم ازلی وابدی اور بے پایاں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ یہ علم الہی خارج میں تحقق پائے اور معنی صورت اختیار کرے۔ یعنی پیغمبر اس کی رسالت کی عملی طور پر تبلیغ کریں اور اتمام حجت کریں۔

چند نکات

علم غیب کے بارے میں ایک وسیع تحقیق

قرآن کی مختلف آیات میں غور کرنے سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ علم غیب کے سلسلہ میں دو قسم کی آیات موجود ہیں، پہلی قسم کی آیات تو وہ ہیں جو علم غیب کو خدا کے ساتھ مخصوص بتاتی ہیں، اور اس کے غیر سے اس کی نفی کرتی ہیں۔ مثلاً سورہ انعام کی آیہ ۵۹، و عندہ مفاتح الغیب لا یعلمہا الاہو، غیب کی چابیاں خدا ہی کے پاس ہیں، اس کے سوا کوئی شخص انھیں نہیں جانتا اور سورہ نمل کی آیہ ۶۵ قل لا یعلم من فی السماوات والارض الغیب الا اللہ، کہہ دیجیے کہ آسمانوں اور زمین میں سے کوئی شخص بھی غیب کو نہیں جانتا، سوائے خدا کے۔

اور پیغمبر کے بارے میں سورہ انعام کی آیہ ۵۰ میں جو کچھ آیا ہے، مثلاً قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب، کہہ دیجیے میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ خدا کے خزانے میرے پاس ہیں، اور میں غیب کو نہیں جانتا۔ اور سورہ اعراف کی آیہ ۸۸ میں آیا ہے: ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر: "اگر میں غیب کو جانتا ہوتا تو میں بہت سی خیر فراہم کر لیتا" اور آخر میں سورہ یونس کی آیہ ۲۰ میں یہ آیا ہے: فقل انما الغیب للہ

سہ بہت سے مفسرین نے "لیعلم" کی تفسیر کو پیغمبر اسلام کی طرف لٹایا ہے اور انھوں نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خدا اس راہی و رسالت کے لیے ملاحظہ اور نگہبان قرار دیتا ہے، تاکہ پیغمبر جان لے کہ انھوں نے وقت کے ساتھ، وحی الہی کو اس کے پاس پہنچا دیا ہے اور کسی قسم کا شک اور تردد وحی الہی کی رسالت میں نہ کرے لیکن تفسیر۔ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ رسالت تو پیغمبر کا کام ہے، نہ کہ فرشتوں کا اور رسول کی تفسیر گذشتہ آیت میں اور رسالت کی تفسیر چند گذشتہ آیات میں، خود پیغمبر کی ذات کے بارے میں آئی ہے۔ بعید نظر آتی ہے، اور حق وہی پہلی تفسیر ہے۔

”کہہ دیجئے کہ غیب تو خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے“

اور اسی قسم کی دوسری آیات -

دوسرا حصہ ان آیات کا ہے جو وضاحت کے ساتھ بتاتی ہیں کہ اولیاءِ خدا ”اجہالی طور پر“ علمِ غیب سے آگاہی رکھتے تھے، جیسا کہ ان کی آیت ۹۹ میں آیا ہے: **وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مَنْ يَشَاءُ** خدام کو تو اپنے غیب سے آگاہ نہیں کرے گا لیکن خدا اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے (غیب کے لیے) منتخب کر لیتا ہے (اور اسرارِ غیب کا ایک حصہ انھیں عطا کر دیتا ہے)۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں بیان ہوا ہے کہ انھوں نے فرمایا: **وَأَنْبَأَكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدْخُرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ** ”میں تمہیں اس کی جو تم کھاتے ہو یا اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو، خبر دیتا ہوں“ (آل عمران — ۴۹)

زیر بحث آیت بھی، اس استثناء کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو اس میں آیا ہے، اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ خدا علمِ غیب کا ایک حصہ اپنے برگزیدہ رسولوں کو عطا فرماتا ہے (کیونکہ نفعی سے استثناء ہمیشہ اثبات ہوتا ہے)۔

دوسری طرف قرآن کی وہ آیات جو غیب کی خبروں پر مشتمل ہیں، وہ بھی کم نہیں ہیں۔ مثلاً سورہ روم کی دوسری آیت سے لے کر چوتھی تک غلبت الروم فی ادنی الارض و ہم من بعد علیہم سیغلیون فی بضع سنین : ”رومی مغلوب ہو گئے ہیں، اور یہ شکست نزدیک کی سرزمین میں واقع ہوئی ہے، لیکن وہ اس مغلوبیت کے بعد شقرب غلبت غالب ہوں گے، چند ہی سالوں کے اندر اتریں۔“ اور سورہ قصص کی آیت ۸۵ جو کہتی ہے: **ان الذی فرض علیک القرآن لرادک الی معاد** ”وہ ہستی جس نے قرآن کو تجھ پر فرض کیا ہے، وہ تجھے تیری جگہ (مکہ) کی طرف دوبارہ پلٹائے گا“

اور سورہ فتح کی آیت ۲۷ جو کہتی ہے: **لتدخلن المسجد الحرام ان نشاء اللہ امنین**، ”انشاء اللہ تم مسجد الحرام میں انتہائی امن و امان کے ساتھ داخل ہو گے“۔

اور اسی قسم کی دوسری آیات -

اصولی طور پر آسمانی وحی جو پیغمبروں پر نازل ہوتی ہے، ایک قسم کا غیب ہی ہے جو انھیں عطا کیا جاتا ہے۔ یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ وہ غیب سے آگاہی نہیں رکھتے جبکہ ان کے اوپر وحی نازل ہوتی ہے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر ہمارے پاس بہت سی ایسی روایات موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ معصومینؑ اجمالی طور پر غیب کا علم رکھتے تھے اور بعض اوقات اس کی خبر دیا کرتے تھے۔ مثلاً فتح مکہ کی داستان اور دو حاطب بن ابی بلتعہ کے واقعہ میں جس میں مکہ کے لوگوں کو خط لکھا تھا اور وہ خط مشرکین مکہ کے پاس پہنچانے کے لیے ”سارہ“ نامی عورت کے حوالے کیا گیا تھا، تاکہ وہ انھیں لشکرِ اسلام کے قریب الوقوع جگہ سے آگاہ کر دے۔ اور وہ عورت اس خط کو اپنے گیسوؤں کے درمیان چھپا کر مکہ کی طرف چل پڑی تھی۔ پیغمبرؐ نے علیؑ اور کچھ دوسرے مسلمانوں کو اس کے پیچھے بھیجا، اور فرمایا: تمہیں ایک منزل گاہ پر جس کا نام روضہ ”خارج“ ہے ایک عورت ملے گی اس کے پاس ”حاطب“ کا خط ہے، جو مشرکین مکہ کے نام ہے، تم اس سے وہ خط لے لو، جب وہ سب کے سب وہاں پہنچے تو انھیں وہ

رت مل گئی، شروع میں اس نے سختی کے ساتھ انکار کیا، لیکن آخر کار اس نے اعتراف کر لیا اور انھوں نے وہ خط اس سے لے لیا۔ اس کے علاوہ جنگ "موتہ" کا واقعہ اور حضرت اورشکر اسلام کے بعض دوسرے کمانداروں کی شہادت کی خبر دینا۔ حکمی پیغمبر نے، مدینہ میں مسلمانوں، اسی لمحہ میں، جبکہ یہ واقعہ رونما ہوا تھا، خبر دی تھی۔ اور اس قسم کے اخبار غیب کی شائیں پیغمبر کی زندگی میں کم نہیں ہیں۔

نوح البلانہ میں بھی آئندہ کے واقعات کی بہت سی پیشین گوئیاں نظر آتی ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ علیؑ ان اسرار غیب کو جانتے تھے۔ مثلاً وہ باتیں جو خطبہ ۱۲ میں اہل بصرہ کی مذمت میں بیان ہوئی ہیں۔ جس میں آپ فرماتے ہیں:

كافي بمسجدكم كجؤ جؤ سفينة قد بعث الله عليها العذاب من

أفوقها ومن تحتها وغرق من في ضمنها

"گو یا میں دیکھ رہا ہوں کہ آسمان وزمین سے خدا کا عذاب تم پر نازل ہو رہا ہے اور تم سب کے سب اس میں

غرق ہو گئے ہو، صرف تمہاری مسجد کی چوٹی کشتی کے سینہ کی طرح پانی کے اوپر نمایاں ہے۔"

اور دوسری روایات میں بھی جو حملائے اہل سنت اور شیعہ کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں، آئندہ کے واقعات کے بارے میں آنحضرتؐ سے بہت سی پیشین گوئیاں آئی ہیں، جیسا کہ "بجربن قیس" کے بارے میں ہے کہ آپ نے فرمایا: تجھے میرے بعد لعنت کرنے پر مجبور کریں گے اور جو کچھ آپ نے "مردان" کے بارے میں فرمایا کہ وہ بڑھاپے کے بعد ضلالت و گمراہی کا پرچم کندھے پر اٹھائے گا۔ اور جو کچھ "کمال بن زیاد" نے حجاج سے کہا تھا کہ امیر المؤمنین علیؑ نے مجھے خبر دی ہے کہ تو میرا قاتل ہے۔ اور جو کچھ آپ نے خوارج نہروان کے بارے میں فرمایا تھا، کہ ان سے جنگ میں ہمارے گروہ کے دس آدمی بھی نہیں مارے جائیں گے، اور ان میں سے دس آدمی بھی نجات نہیں پائیں گے اور حقیقتاً اسی طرح واقع ہوا۔

اور جو کچھ امام حسینؑ کی قبر کی جگہ کے بارے میں سرزمین کربلا کے قریب سے عبور کے وقت "اصبغ بن نباتہ" سے فرمایا ہے کتاب فضائل الخمسة میں، اہل سنت کی کتابوں سے، علیؑ کے علم کی حد سے زیادہ وسعت کے بارے میں، بہت زیادہ روایات نقل ہوئی ہیں، ان سب کا یہاں بیان طول کا باعث ہو گا۔

۱۔ اس واقعہ کی تفصیل حوالہ کے ساتھ اسی جلد میں سورہ ممتحنہ کی تفسیر میں ہے۔

۲۔ "کامل ابن اثیر" جلد ۲ ص ۲۲۷ (واقعہ غزوة موتہ)

۳۔ مستدرک الصمیمین جلد ۲ ص ۲۵۸

۴۔ طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۰

۵۔ الاصابہ ابن حجر، جلد ۲ ص ۲۲۵

۶۔ "بیشی" نے "مجمع" جلد ۶ ص ۲۴۱ پر

۷۔ "الریاض النظرة" جلد ۲ ص ۲۲۲

۸۔ "فضائل الخمسة" جلد ۲ ص ۲۴۱ تا ۲۵۲

اہل بیت کی روایات میں بھی متعدد حدیثوں میں آئمہ معصومین کے لیے علم غیب کا اشارہ ہوا ہے۔ منجملہ ان کے کتاب کافی جلد اول
متعدد ابواب میں اس بارے میں تصریح یا اشارے نظر آتے ہیں۔

مرحوم علامہ مجلسی نے بحار الانوار کی جلد ۲۶ میں، اس سلسلہ میں بہت سی احادیث جو ۲۲ حدیثوں تک پہنچتی ہیں نقل کی ہیں۔
مجموعی طور پر بغیر اکرم اور آئمہ معصومین کے لیے اسرار غیب سے آگاہی کے سلسلہ میں روایات حد تو اتنے تک پہنچی ہوئی ہیں۔

اب بحث صرف یہ ہے کہ ان روایات و آیات کے درمیان، جن میں سے بعض غیر خدا سے علم غیب کی نفی کرتی ہیں اور بعض اثبات کرتی
ہیں کس طرح جمع کی جائے؟

یہاں جمع کے لیے مختلف طریقے موجود ہیں۔

جمع کے طریقوں میں سے مشہور ترین طریقہ یہ ہے کہ علم غیب کے خدا کے ساتھ اختصاص سے مراد علم ذاتی و استقلال ہے۔ اس بناء پر اس
غیر مستقل طور پر ہرگز علم غیب سے آگاہی حاصل نہیں کر سکتا، اور ان کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ خدا کی طرف سے ہے اور اس کے الطاف و عنایت سے
ہے اور تعجبی جنبہ رکھتا ہے۔

اس جمع کا شاہد یہی زیر بحث آیت ہے، جو کہتی ہے: خدا کسی کو بھی اپنے اسرار غیب سے آگاہ نہیں کرتا، مگر وہ رسول جس سے
وہ راضی ہے۔

”نوح البلاغہ“ میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ جب علیؑ آئینہ کے واقعات کی خبر دے رہے تھے (اور اسلامی ممالک
پر مغلوں کے حملہ کی پیشین گوئی کر رہے تھے) اور آپ کے اصحاب میں سے ایک نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین کیا آپ علم غیب جانتے
ہیں؟ حضرت ہنسے اور فرمایا:

لیس هو بعلم غیب، و انما هو تعلم من ذی علم
”یہ علم غیب نہیں ہے، یہ ایک ایسا علم ہے جو صاحب علم (پیغمبر) سے میں نے حاصل کیا ہے“۔
اس جمع کو بہت سے علماء و محققین نے قبول کیا ہے۔

۲۔ اسرار غیب دو قسم کے ہیں، ایک قسم تو خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے، اور اس کے علاوہ اسے کوئی نہیں جانتا۔ مثلاً
قیام قیامت اور اسی قسم کے دوسرے امور، اور ایک قسم وہ ہے کہ جس کی وہ انبیاء و اولیاء کو تعلیم دیتا ہے۔ جیسا کہ نوح البلاغہ میں اسی خطبہ کے
ذیل میں جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا ہے، آیا ہے کہ:

وانما علم الغیب علم الساعة و ما عدده الله سبحانه بقوله: ان الله عندہ
علم الساعة، وینزل الغیث و یعلم ما فی الارحام، و ما تدری نفس ما اذا
تکسب غدا و ما تدری نفس بائی ارض تموت
”علم غیب تو صرف قیامت کا علم ہے اور وہ ہے جسے خدا نے اس آیت میں شمار کیا ہے، جیسا کہ فرماتا

ہے، قیامت کے وقت سے آگاہی خدا کے ساتھ مخصوص ہے، اور وہی بارش کو نازل کرتا ہے، اور جو کچھ ماؤں کے رحم میں ہے، اسے جانتا ہے اور کوئی بھی شخص نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا، اور کس سرزمین میں مرے گا۔“

اس کے بعد امام نے اس معنی کی تشریح میں مزید فرمایا:

”خداوند اس سے جو رحموں میں برقرار ہے، آگاہ ہے کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی، بد صورت ہے یا خوبصورت، سخی ہے یا بخیل، سعادت مند ہے یا شقی و بد بخت، اہل دوزخ ہے یا اہل جنت؟..... یہ سب علوم غیب میں، جنہیں خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور ان کے علاوہ وہ علوم ہیں جن کی خدا نے اپنے پیغمبر کو تعلیم دی ہے اور انہوں نے ان کی مجھے تعلیم دی ہے۔“

۲۔ ان دونوں قسم کی آیات و روایات کے درمیان جمع کرنے کا ایک دوسرا راستہ یہ ہے کہ اسرار غیب دو جگہ مثبت ہیں ”لوح محفوظ“ (علم خدا کے مخصوص خزانہ) میں، جس میں کسی قسم کی تبدیلی اور تغیر رونما نہیں ہوتا، اور اس سے کوئی بھی شخص آگاہ نہیں ہے اور (لوح محفوظ و اثبات) جو تقضیات کا علم ہے نہ کہ علت نامہ کا، اور اسی بناء پر وہ تغیر اور تبدیلی کے قابل ہے اور جسے دوسرے نہیں جانتے وہ اسی حصے سے مربوط ہے۔

اسی لیے ایک حدیث میں امام صادق سے آیا ہے:

ان الله علم ما لم يعلمه الا هو، وعلما اعلمه ملائكتہ ورسله فما اعلمه ملائكتہ وانبياءه ورسله فنحن نعلمه
 ”خدا کا ایک علم تو ایسا ہے جسے اس کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا، اور ایک علم ایسا ہے جس سے اس نے فرشتوں اور انبیاء کو آگاہ کیا ہے، جو کچھ اس نے فرشتوں، انبیاء اور رسولوں کو دیا ہے، اسے ہم بھی جانتے ہیں۔“

امام علی بن الحسین سے بھی نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

لولا آية في كتاب الله لحدثتكم بما كان وما يكون الى يوم القيامة افقلت له آية آية؟ فقال قول الله: يمحوا الله ما يشاء ويثبت و عنده امر الكتاب

”اگر قرآن مجید میں ایک آیت نہ ہوتی تو میں تمہیں اس سے بھی جو کہ پہلے گزر چکا ہے، اور ان واقعات کی بھی جو قیامت تک ہونے والے ہیں خبر دے دیتا، راوی کہتا ہے، میں نے کہا: وہ کون سی آیت ہے؟“

۱۔ نوح البلاغہ، خطبہ ۱۲۸

۲۔ بحار الانوار جلد ۲۶ ص ۱۶۰ (حدیث ۵) اس سلسلہ میں دوسری مقدمہ روایات بھی اس ماخذ میں نقل ہوئی ہیں۔

فرمایا: خدا فرماتا ہے: **یعمھو اللہ ما یشاء** (خدا جس چیز کو چاہتا ہے محو کر دیتا ہے، اور جس چیز کو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے)، ام الكتاب (اور لوح محفوظ) اسی کے پاس ہے، لہذا اس جمع کے مطابق علوم کی تقسیم ان کے حتمی و یقینی ہونے یا نہ ہونے کی بنیاد پر ہے، اور گزشتہ جمع میں معلومات کی مقدار کی پر ہے۔ (غور کیجیے)

۴۔ ایک دوسرا راستہ یہ ہے کہ خدا تو تمام اسرارِ غیب سے بالفعل آگاہ ہے، لیکن انبیاء و اولیاء ممکن ہے بہت سے انرا علم کو بالفعل نہ جانتے ہوں، لیکن جب وہ ارادہ کرتے ہیں تو خدا انہیں ان کی تعلیم دے دیتا ہے، اور یقیناً یہ ارادہ بھی خدا کے اذن و رضائے ہی انجام پاتا ہے۔

اس بناء پر ان آیات و روایات میں جمع، جو یہ بتاتی ہیں کہ وہ نہیں جانتے، تو وہ بالفعل نہ جاننے کی طرف اشارہ ہے، اور جو یہ کہتی ہیں کہ وہ جانتے ہیں وہ ان کے جاننے کے امکان کی طرف اشارہ ہے

اس کی مثال ٹھیک اس طرح ہے کہ کوئی شخص ایک خط کسی آدمی کو دے کہ وہ اسے دوسرے تک پہنچا دے، تو یہاں یہ کہا جاسکتا ہے اسے خط کے مضمون کا کوئی علم نہیں ہے، حالانکہ وہ خط کو کھول کر پڑھ سکتا ہے، کبھی تو صاحبِ خط نے اسے مطالعہ کی اجازت دی ہوئی ہوتی ہے۔ اس صورت میں اسے ایک لحاظ سے خط کے مضمون کا عالم سمجھا جاسکتا ہے اور کبھی اسے اجازت دی ہوئی نہیں ہوتی۔

اس جمع کی شاہدہ روایات ہیں جو کتاب کافی کے ایک باب میں ان الاثمۃ اذا شہلوا ان یعلموا علموا: ”آئمہ جب کسی چیز کو جاننا چاہتے ہیں تو انہیں اس کا علم دے دیا جاتا ہے“ کے عنوان کے تحت وارد ہوئی ہیں: ”مخبر ان کے ایک حدیث میں امام صادق سے آیا ہے:

اذا مراد الامام ان یعلم شیئاً علمہ اللہ بذالک

”جب امام کسی چیز کو جاننا چاہتا ہے تو خدا اسے اس کی تعلیم دے دیتا ہے“

جمع کی یہ وجہ، پیغمبر اور امام کے علم کے سلسلہ میں بہت سی مشکلات کو حل کر دیتی ہے۔ مخبر ان کے یہ ہے کہ وہ اس پانی اور کھانے کو جس میں زہر ملا ہوا ہوتا ہے، کس طرح کھا لیتے ہیں، حالانکہ یہ بات جائز نہیں ہے کہ انسان کوئی ایسا کام کرے جو اس کے لیے خطرے کا موجب ہو، ایسے مواقع کے لیے یہ کہنا چرے گا کہ پیغمبر یا امام کو اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ وہ اس کا ارادہ کریں کہ اسرارِ غیب ان پر آشکار ہوں اسی طرح بعض اوقات مصلحت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ پیغمبر یا امام کسی مطلب پر آگاہ نہ ہوں، یا کوئی امتحان اور آزمائش ایسی صورت پذیر ہو جو ان کے تکامل و ارتقاء کا موجب بنے، جیسا کہ ”لیلۃ المبعیث“ کی داستان میں آیا ہے کہ علیؑ پیغمبر کے بستر پر سوئے، حالانکہ خود آنجناب سے نقل ہوا ہے کہ آپؐ نہیں جانتے تھے کہ صبح کے وقت جب مشرکین قریش اس بستر پر حملہ کریں گے تو تشدید ہو جائیں گے یا جان سلامت رہے گی۔ یہاں مصلحت یہ ہے کہ امام اس کام کے انجام سے آگاہ نہ ہو، تاکہ خدائی آزمائش اور امتحان پورا ہو جائے اور اگر امام جانتے کہ وہ پیغمبر کے

لہ نور الثقلین جلد ۲ ص ۵۱۲ (حدیث ۱۶۰)

لہ کتاب کافی باب ان الاثمۃ اذا شہلوا ان یعلموا علموا (حدیث ۲) اسی مضمون کی دوسری روایات بھی اسی باب میں نقل ہوئی ہیں۔

بستر پر سوئیں گے اور صبح کو صبح و سالم اٹھیں گے، تو یہ کوئی فخر کی بات نہیں تھی اور آیات قرآنی اور دیگر روایات میں اس ایثار و قربانی کی اہمیت کے سلسلہ میں جو کچھ وارد ہوا ہے کچھ زیادہ قابل توجہ نظر نہیں آتا۔
نال علم ارادی کا مسئلہ، اس قسم کے تمام اشکالات و اعتراضات کا جواب ہے۔

۵۔ علم غیب کے سلسلہ میں مختلف روایات کے لیے جمع کی ایک اور صورت بھی موجود ہے (الگرچہ یہ راہ ان روایات کے ایک حصہ پر بھی صادق آتی ہے) اور وہ یہ ہے کہ ان روایات میں مخاطب مختلف تھے، وہ لوگ جو آئمہ کے بارے میں علم غیب کے مسئلہ کی قبولیت کی استعداد اور قابلیت رکھتے ہیں، انھیں تو حق مطلب بیان کر دیا جاتا تھا لیکن مخالف یا ضعیف و کم استعداد افراد کے لیے، سننے والے کی سمجھ کے مطابق بات کی جاتی ہے۔

مثلاً ایک حدیث میں آیا ہے کہ ابو بصیر اور امام صادق کے بزرگ اصحاب میں سے کچھ اور افراد ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ امام غصہ میں بھرے ہوئے مجلس میں وارد ہوئے، جب آپ بیٹھے گئے تو حاضرین مجلس سے فرمایا:

يا عجب الاقوام ينعمون انا نعلم الغيب! ما يعلم الغيب الا الله عز وجل، لقد هممت
بضرب جاريتي فلانة، فهديت مني فما علمت في اي بيوت الدار هي
"تجرب ہے کہ بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم علم غیب جانتے ہیں (حالا نہ کہ خدا کے سوا کوئی بھی علم غیب نہیں
جانتا۔ میں اپنی ایک کینز کو تادیب کرنا چاہتا تھا، وہ میرے آگے سے بھاگ گئی اور مجھے یہ علم نہ ہوا کہ وہ گھر
کے کس کمرے میں ہے"۔

حدیث کا راوی کہتا ہے کہ جس وقت امام اس مجلس سے اٹھے، تو میں اور کچھ دوسرے اصحاب آپ کی منزل میں داخل ہوئے اور ہم نے کہا:
ہم آپ پر قربان ہوں، آپ نے اپنی کینز کے بارے میں اس طرح فرمایا ہے، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ آپ کے پاس بہت سے علوم ہیں، اور ہم
علم غیب کا تو کوئی نام نہیں لیتے؟

امام نے اس کے بعد اس سلسلہ میں تشریح کی جس کا مفہوم اسرار غیب پر آپ کی آگاہی تھا۔
 واضح رہے کہ اس مجلس میں کچھ ایسے افراد تھے، جو ان معانی کے ادراک اور مقام امام کی معرفت کے لیے ضروری استعداد نہیں
رکھتے تھے۔

اس بات پر توجہ رکھنا چاہیے کہ ان پانچوں طریقوں میں آپس میں کوئی منافات نہیں ہے اور سب ہی صادق ہو سکتے ہیں۔
(غور کیجیے)

۲۔ آئمہ کے علم غیب کو ثابت کرنے کی ایک اور راہ

یہاں اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے کہ پیغمبر اور آئمہ معصومین اجمالی طور پر اسرار غیب سے آگاہ تھے دوا اور راستے بھی موجود ہیں:

۱۔ اصول کافی جلد ۱ باب نادر فیہ ذکر الغیب حدیث ۲

پہلے یہ کہہ کر ان کی ماموریت کسی خاص مکان و زمان میں محدود نہیں تھی، بلکہ پیغمبر کی رسالت اور آئمہ کی امامت جہانی اور جاودانی سے
یہ کہے ہو سکتے ہیں کہ کوئی شخص اس قسم کی وسیع ماموریت اور ذمہ داری رکھتا ہو، اور وہ اپنے محدود زمانہ اور ماحول کے سوا کسی قسم کی آگاہی نہ
ہو؛ کیا وہ شخص، جو شکر کسی ملک کے ایک بہت بڑے حصہ کی امارت اور گورنری پر مامور ہو، اس علاقہ سے بے خبر ہو سکتا ہے اور پھر یوں
اپنی ماموریت کو اچھی طرح انجام دے سکتا ہے؟

دوسرے الفاظ میں: پیغمبر اور امام کو اپنی مدتِ حیات میں، احکامِ الہی کو اس طرح بیان و اجراء کرنا چاہیے کہ وہ ہر زمانہ اور
مکان کے تمام انسانوں کی ضروریات کے لیے جواب دہ ہوں اور یہ ممکن نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اسرارِ غیب کے ایک حصہ کو جانتے ہوں۔
دوسرا یہ کہ: قرآن مجید میں تین آیات ایسی ہیں کہ اگر ہم انھیں ایک دوسری کے ساتھ رکھ دیں تو اس سے پیغمبر اور آئمہ کے علم کا مسئلہ واضح
ہو جاتا ہے۔ پہلی یہ کہ قرآن اس شخص کے بارے میں جو ”ملکہ سبا“ کا تخت آنکھ بھینکنے میں سلیمان کے پاس لے آیا (یعنی آصف بن
بریاء) کہتا ہے:

قال الذی عندہ علم من الکتاب انا اتیک بہ قبل ان یرتد الیک طرفک فلما
راه مستنقلاً عنده قال هذا من فضل ربی

”اُس شخص نے، جو کتاب میں سے کچھ علم رکھتا تھا، کہا: میں اس کو آنکھ بھینکنے سے پہلے تیرے پاس لے آؤں گا، جب
سلیمان نے اسے اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو کہا: یہ میرے پروردگار کے فضل سے ہے“ (مثل — ۴۰)

دوسری آیت میں یہ آیا ہے:

قل کفی باللہ شہیداً بینی و بینکم ومن عندہ علم الکتاب
”کہہ دیجیے میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے خدا اور وہ شخص جس کے پاس علم کتاب ہے کافی
ہے“ (رعد — ۴۲)

دوسری طرف بہت سی احادیث میں، جو اہل سنت اور شیعہ کتابوں میں نقل ہوئی ہیں، اس طرح آیا ہے کہ ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ میں نے
رسولِ خدا سے ”الذی عندہ علم من الکتاب“ کے معنی پوچھے، تو آپ نے فرمایا: وہ میرے بھائی سلیمان بن داؤد کا وہی تھا
تو میں نے کہا ”و من عندہ علم الکتاب“ کون ہے، تو آپ نے فرمایا:

ذالک انحی علی بن ابی طالب

”وہ میرے بھائی علی بن ابی طالب ہیں“

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ”علم من الکتاب“ جو ”آصف“ کے بارے میں آیا ہے، علم جزئی کو بیان کرتا ہے، اور
”علم الکتاب“ جو علی کے بارے میں آیا ہے، وہ علم کلی کو بیان کرتا ہے، اس سے ”آصف“ اور علی کے مقام علمی کے درمیان
فرق واضح ہو جاتا ہے۔

لے ”احقاق الحق“ جلد ۲ ص ۲۸۰-۲۸۱ اور ”نور الثقلین“ جلد ۲ ص ۲۲۵ کی طرف رجوع کریں۔

تیسری طرف سورۃ نحل کی آیہ ۸۹ میں آیا ہے: **وَتَوَلَّنا عَلَیْكَ الْکِتَابَ تَبِیْئًا لِّاَلْکَلِ شَیْءٍ**، ”ہم نے قرآن کو تجھ پر نازل ہے، جو ہر چیز کو بیان کرتا ہے“
 واضح رہے کہ جو شخص اس قسم کی کتاب کے اسرار کا عالم ہو اسے غیب کے اسرار کو جاننا چاہیے اور یہ اس چیز پر ایک واضح اور آشکار دلیل ہے
 اولیاء خدا میں سے کوئی انسان حکم خدا سے اسرار غیب پر آگاہ ہو سکتا ہے۔
 علم غیب کے سلسلہ میں ہم نے سورہ انعام کی آیہ ۵۰، ۵۹ جلد ۳ اور آیہ ۸۸ سورہ اعراف جلد ۴ کے ذیل میں بھی بحث کی ہے۔

۳۔ ”جن“ کی خلقت کے بارے میں تحقیق

”جن“ جیسا کہ اس لفظ کے لغوی مفہوم سے معلوم ہوتا ہے ایک ایسا نظرنہ آنے والا موجود ہے جس کے بہت سے مشخصات قرآن میں ذکر ہوئے ہیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں:

- ۱۔ ایک ایسا وجود ہے جو آگ کے شعلہ سے پیدا ہوا ہے، انسان کے برخلاف جو مٹی سے پیدا ہوا ہے (وخلق الجن من نار من نار علیہا) (الرحمن — ۱۵)
- ۲۔ وہ علم و ادراک اور حق و باطل کی پہچان، اور منطق و استدلال کا حامل ہے (سورۃ جن کی مختلف آیات)
- ۳۔ وہ تکلیف و مسئولیت (فرائض و وظائف) رکھتا ہے، (سورۃ جن اور سورۃ الرحمن کی آیات)
- ۴۔ ان میں سے ایک گروہ مومن و صالح اور ایک گروہ کافر ہے۔ (و اتّامنا الصّالِحِیْنَ و منّا و منّا کافرین) (جن — ۱۱)
- ۵۔ وہ حشر و نشر اور معاد و قیامت رکھتے ہیں (واما القاسطون فکانوا الجہنم حطبًا) (جن — ۱۵)
- ۶۔ وہ آسمانوں میں نفوذ کرنے، اور وہاں سے خبریں لینے اور چوری چھپے سننے کی قدرت رکھتے تھے، لیکن پھر انھیں روک دیا گیا۔ (وانا کنا نقعد منها مقاعد للسمع فمن یشتمع الا ان یجد له شہابًا رصداً) (جن — ۹)
- ۷۔ وہ بعض انسانوں کے ساتھ رابطہ پیدا کر لیا کرتے تھے، اور اس محدود آگاہی کے ذریعہ جو وہ بعض پوشیدہ اسرار کے بارے میں رکھتے تھے، انسانوں کو گمراہ کرتے تھے۔ (وانہ کان رجال من الانس یعودون برجال من الجن فزادوهم رهقا) (جن — ۶)
- ۸۔ ان میں کچھ ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں، جو بہت زیادہ طاقت رکھتے ہیں، جیسا کہ انسانوں میں بھی ایسے افراد ہیں (قال عفريت من الجن انا اتیک به قبل ان تقوم من مقامک) ایک سرکش جن نے سلیمان سے کہا: ”میں ملکہ سبأ کا تخت، اس سے پہلے کہ تو اپنی جگہ سے اٹھے (دربار درخواست کر کے) اس کی سرزمین سے یہاں لے آؤں گا“ (نمل — ۲۹)

اسے قبول کیوں نہ کریں؟

بہر حال ایک طرف تو قرآن نے، جو کلام ناطق صادق ہے، جنات کے وجود کی ان خصوصیات کے ساتھ، جو اوپر ذکر ہوئی ہیں، خبر دی ہے، اور دوسری طرف کوئی عقلی دلیل اس کی نفی پر موجود نہیں ہے، لہذا اس کو قبول کر لینا چاہیے اور غلط و ناروا توجیہات سے بچنا چاہیے، اور اسی طرح سے عوام کے خرافات سے اس سلسلہ میں اجتناب کرنا چاہیے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ”جن“ کبھی ایک زیادہ وسیع مفہوم پر بولا جاتا ہے، جو نظر نہ آنے والے کئی موجودات کے انواع کو شامل ہے۔ عام اس سے کہ وہ عقل و ادراک کے حامل ہو یا عقل و ادراک نہ رکھتے ہوں۔ یہاں تک کہ حیوانات کا وہ گروہ بھی، جو آنکھ سے نظر آتا ہے اور عام طور پر گھونسلوں میں چھپا رہتا ہے، اس وسیع معنی میں داخل ہے۔ اس بات کی شاہدہ روایت ہے جو پیغمبر سے نقل ہوئی ہے، آپ نے فرمایا:

خلق الله الجن خمسة اصناف، صنف كالريح في الهواء، و صنف حیات و صنف عقارب، و صنف حشرات الارض، و صنف كبنی آدم علیہم الحساب و العقاب

”خدا نے جنوں کو پانچ اقسام میں پیدا کیا ہے: ایک صنف تو ہوا کی طرح فضا میں ہے (جو نظر نہیں آتی)۔ ایک صنف سانپوں کی صورت میں ہے، ایک صنف پھوڑوں کی صورت میں ہے، ایک صنف حشرات زمین ہیں اور ایک صنف ان میں سے انسان کی مانند ہے، جس پر حساب و عتاب ہے۔“

اس روایت اور اس کے وسیع مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے بہت سی مشکلات، جو روایات و حکایات میں، جنات کے بارے میں بیان کی جاتی ہیں، حل ہو جائیں گی۔

مثلاً بعض روایات میں امیر المؤمنین علی سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

لا تشرب الماء من ثلثة الاناء ولا من عر و ته فان الشيطان يقعد على العروة والثلثة

برتن کے ٹوٹے ہوئے حصّہ اور اس کے دستے والی طرف سے پانی نہ پو، کیونکہ شیطان اس کے دستہ اور ٹوٹے ہوئے حصّہ پر بیٹھا ہوا ہوتا ہے۔“

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ”شیطان“ جنوں میں سے ہے، اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ برتن کی ٹوٹی ہوئی جگہ، اور اسی طرح اس کا دستہ، انواع و اقسام کے جراثیم کی اجتماع کی جگہ ہوتا ہے۔ یہ بعینہ نظر نہیں آتا کہ ”جن و شیطان“ عام مفہوم کے لحاظ سے اس قسم کے موجودات کو بھی شامل ہوں، اگرچہ اس کا ایک خاص معنی بھی ہے، جو ایک ایسا موجود ہے جو فہم و شعور اور مسئولیت

۱۔ ”سفینۃ البحار“ جلد اول ص ۱۸۶ (مادہ جن)

۲۔ ”کتاب کافی“ جلد ۶ ص ۲۸۵ کتاب الاشرار باب الادانی حدیث ۵

تکلیف (فرائض و وظائف) رکھتا ہے، اور اس سلسلہ میں روایات بہت زیادہ ہیں۔ اس پروردگار! اس دن جس میں جن وانس تیری دادگاہ عدل میں حاضر ہوں گے، اور سب بدکار اپنے کیے پر پشیمان ہوں گے، تو تیرے سایہ لطف میں قرار دے۔

خداوند! تیرہ ملک کا دامن وسیع اور کشادہ ہے اور ہماری معلومات اور ہماری معرفت محدود ہے، ہمیں لغزشوں، خطاؤں اور فیصلے کرنے سے مصنون و محفوظ رکھ۔

بارِ ارحم! تیرے پیغمبر کا مقام اتنا بلند ہے کہ اس کی دعوت کو انسانوں کے علاوہ جن و پری نے بھی قبول کیا ہے، ہمیں اس پر ایمان لانے والوں میں سے قرار دے۔

آمین یا رب العالمین

اختتام سورۃ جن

روز جمعہ ۲۱ محرم الحرام ۱۴۰۷ھ

۱۳۶۵/۷/۴

اختتام ترجمہ

بروز جمعہ یکم صفر ۱۴۰۸ھ

مطابق ۲۵ ستمبر ۱۹۸۷ء

بوقت تقریباً ساڑھے پانچ بجے صبح

۸۱، رای ماڈل ٹاؤن - لاہور

سُورَةُ الْمَزْمَلِ

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی

اور

اس کی بیس آیات ہیں

تاریخ شروع

۲۲ محرم الحرام ۱۳۰۶ھ

۱۳۶۵/۴/۵

سُورَةُ مَزْمَلٍ کے مضامین و مطالب

سُورہ کی آیات کا لب و لہجہ یہ بتاتا ہے کہ یہ ”مکی“ سورتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اس طرح اس کے ”مدنیہ“ میں نزول کا احتمال جیسا کہ بعض نے کہا ہے، بعید نظر آتا ہے۔ لیکن آغاز و انجام کی آیات کے لب و لہجہ کا فرق یہ بتاتا ہے کہ ان آیات کے درمیان قابل ملاحظہ زمانہ کا فاصلہ تھا۔ جسے بعض مفسرین نے ”آٹھ ماہ“ بعض نے ”ایک سال“ اور بعض نے ”دس سال“ تک لکھا ہے۔

اس سُورہ کی بہت سی آیات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ اس وقت نازل ہوا جب پیغمبر اپنی اعلانیہ دعوت کا آغاز کر چکے تھے اور مخالفین آپ کے مقابلہ میں مخالفت اور تکذیب کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ لہذا پیغمبر کو یہ حکم ملا ہے کہ اس مرحلہ میں نرمی اور مدارت سے کام لیں۔

اس لیے یہ احتمال کہ تمام سُورہ پیغمبر کی دعوت کے آغاز میں نازل ہوا ہے، بہت بعید نظر آتا ہے۔ ممکن ہے اس کی ابتدائی آیات اس طرح کی ہوں، لیکن سطر طور پر اس کی تمام آیات اس طرح کی نہیں ہیں، کیونکہ اس کی تعبیر میں، اسلام کے پھیلنے اور کم از کم مکہ کی حد تک مخالفت کی مخالفت اور مبارزہ کے لیے قیام کی نشاندہی کرتی ہے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ آغاز دعوت کے تین سالوں میں، اسی قسم کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔

وہ ثانی نزول، جو اس سُورہ یا اس کی آیات کے ایک حصہ کے لیے، روایات میں بیان کی گئی ہے وہ بھی مختلف ہے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ جب پیغمبر پر سب سے پہلی وحی ہوئی اور پیغام الہی پہنچا، آپ وحشت زدہ ہو کر خدمتِ بچہ کے پاس آئے (چونکہ جسمانی ناراحتی محسوس کر رہے تھے لہذا کچھ آرام کرنا چاہا) اور فرمایا: ”مجھے کوئی کپڑا اور صاف“ اس موقع پر جبرئیل نازل ہوئے اور ”یا ایہا المرسل“ کا پیغام پیغمبر کے لیے لائے۔

جب دوسری آیات میں یہ آیا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جبکہ پیغمبر اپنی دعوت کو آشکار اور ظاہر کر چکے تھے، اور ”قریش“ دارالسنۃ میں جمع ہوئے تاکہ وہ پیغمبر کے معاملہ میں منور و فکر کریں اور ان سے مقابلہ کرنے کے لیے کسی نام اور شعار (نعرہ) کا انتخاب کریں، بعض نے کہا کہ وہ ”کابن“ ہے۔ لیکن ایک گروہ نے اس پیش نہاد کی مخالفت کی، بعض دوسروں نے کہا وہ ”مجنون“ ہے۔ لیکن پھر ایک گروہ نے مخالفت کی بعض نے ”ساحر“ کے عنوان کو ترجیح دی، تو اسے بھی انہوں نے قبول نہ کیا۔

آخر کار انہوں نے کہا، جو کچھ بھی ہے ”وہ دوستوں کے درمیان جدائی ڈالتا ہے (اس بناء پر ساحر ہے) اس کے بعد شریکین اس جلسہ سے

۱۔ تفسیر ”المنثور“ جلد ۶ ص ۲۶۶ و ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۲۶۶

۲۔ ”روح المعانی“ جلد ۲ ص ۱۰۱، اور نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۲۶

منتشر ہو گئے۔

یہ بات پیغمبر تک پہنچی تو آپ نے اپنے آپ کو ایک چادر میں لپیٹ لیا اور آرام کرنے لگے، اس وقت جبریل آئے ”یا ایہا المزمّل“ اور ”یا ایہا المدثر“ کو آپ کے پاس آکر پڑھا۔
نتیجہ یہ ہے کہ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، یہ سورہ ظہر مکہ میں نازل ہوئی ہے، اور یقینی طور پر اس کا ایک حصہ اسلام کے اعلانیہ اظہار، اور نبیؐ مکہ میں نفوذ کے بعد نازل ہوئی ہے، اگرچہ یہ احتمال بھی ہے کہ سورہ کی کچھ ابتدائی آیات اول بعثت میں نازل ہوئی ہوں۔

بہر حال اس سورہ کے مضامین کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا حصہ :- سورہ کی ابتدائی آیات ہیں، جو پیغمبرؐ کو عبادت اور تلاوت کے لیے رات کو قیام کی دعوت دیتی ہیں، اور ایک سنگین اور سخت پروگرام کو قبول کرنے کے لیے آمادگی پر آمادہ کرتی ہیں۔
دوسرا حصہ :- انھیں صبر و شکیبائی اور اس خاص علاقہ میں مخالفین کے ساتھ مقابلت و مقابلہ اور مدارات و نرمی کی دعوت دیتا ہے۔

تیسرے حصہ میں :- معاد و قیامت کے بارے میں مباحث ہیں، اور موسیٰ بن عمران کو فرعون کی طرف بھیجنے اور اس کی سرکشی اور پھر اس کے دردناک عذاب کو بیان کیا گیا ہے۔
چوتھے حصہ میں :- ان سخت احکام کو، جو سورہ کی ابتداء میں، رات کے وقت قیام کے سلسلہ میں آئے تھے مسلمانوں کی مشکلات کی بناء پر ان میں تخفیف کرنا ہے۔
اور پانچویں حصہ میں :- یعنی اس سورہ کے آخری حصہ میں دوبارہ تلاوت قرآن، نماز پڑھنے، زکوٰۃ دینے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور استغفار کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے آیا ہے:

من قرأ سورة المزمّل رفع عنه العسر فی الدنیا والأخرۃ
”جو شخص سورہ مزل کو پڑھے گا تو دنیا و آخرت کی سختیاں اس سے اٹھ جائیں گی۔“

۱۰ "نور الثقلین" جلد ۶ ص ۲۶۶

۱۱ "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۲۶۵

اور ایک دوسری حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

من قرأ سورة المزمل في العشاء الآخرة، أو في آخر الليل كان له الليل والنهار شاهدين

مع السورة وأحياه الله حياة طيبة وأماته ميتة طيبة

”جو شخص سورۃ مزمل کو دوسری نماز عشاء (نماز عشاء ہی مراد ہے، کیونکہ بعض اوقات مغرب کو پہلی عشاء

کہا جاتا ہے) یا آخر شب میں پڑھے، تو رات اور دن اور اسی طرح یہ سورہ قیامت کے دن اس کے گواہ

ہوں گے اور خدا سے پاکیزہ زندگی اور پاکیزہ موت دے گا“۔

یقیناً یہ عظیم فضائل اس صورت میں ہیں جبکہ سورت کے مضامین، رات کے قیام، قرآن کی تلاوت، صبر و استقامت، ایثار و قربانی اور

انفاق پر عمل کیا جائے گا نہ کہ وہ تلاوت جو عمل سے خالی ہو۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

- ۱- یَاٰیہَا الْمُرْمِلُ ۝
- ۲- قُمْ اِلَیْكَ اِلَّا قَلِیْلًا ۝
- ۳- نِصْفَةً اَوْ اَنْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا ۝
- ۴- اَوْ نِزْدُ عَلَیْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِیْلًا ۝
- ۵- اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝

ترجمہ

رحمن ورحیم خدا کے نام سے

- ۱- اے پنے اوپر کپڑا لپٹنے والے۔
- ۲- رات کو، تھوڑے سے حصہ کے سوا، قیام کیا کر۔
- ۳- آدھی رات یا اس میں سے تھوڑا کم کر دے۔
- ۴- یا آدھی رات پر کچھ اضافہ کر دے، اور قرآن کو دقت و تامل کے ساتھ پڑھا کر۔
- ۵- کیونکہ ہم عنقریب ایک سنگین و ثقیل بات کا تجھ پر القاء کریں گے۔

تفسیر

اے پنے اوپر کپڑا لپٹنے والے کھڑا ہو جا

جیسا کہ اس سورہ کے آغاز کے لب و لہجہ سے پتہ چلتا ہے، یہ پیغمبر کو استقامت کے لیے اور ایک عظیم و سنگین ذمہ داری کو قبول کرنے

کے لیے آمادگی کی ایک آسانی دعوت ہے کہ جسے پہلے سے خود کو تیار کیے بغیر انجام دینا ممکن نہیں ہے، فرماتا ہے: ”اے اپنے اور کپڑا پیٹنے والے“ (یا ایہا المزمحل)۔

”رات کو تھوڑے سے حصہ کے سوا قیام کیا کر“ (قم اللیل الاقلیلاً)۔

”آدھی رات یا اس میں سے تھوڑا سا کم کر دے“ (نصفہ او انقص منہ قلیلاً)۔

”یا آدھی رات پر کچھ اضافہ کر دے“ (او نزد علیہ)۔

”اور قرآن کو انتہائی غور و خوض سے اور انتہائی وضاحت و فصاحت کے ساتھ تلاوت کیا کر“ (ورتل القرآن ترتیلاً)۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان آیات میں مخاطب پیغمبر ہیں لیکن ”یا ایہا الرسول“ اور ”یا ایہا النبی“ کے عنوان سے نہیں بلکہ ”یا ایہا المزمحل“ کے عنوان سے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اپنے اور کپڑا پیٹ کر گوشہ تنہائی میں بیٹھ رہنے کا دور نہیں ہے، بلکہ یہ کھڑے ہونے اور خود کو تیار کرنے اور عظیم رسالت کو انجام دینے کے لیے آمادگی کا دور ہے۔

اور اس کام کے لیے رات کا انتخاب اس بناء پر ہے کہ:

اولاً دشمنوں کی آنکھ اور کان نیند کی حالت میں ہیں، اور

ثانیاً زندگی کے کاروبار بند ہیں، اور اس بناء پر انسان غور و فکر اور تربیت نفس کے لیے زیادہ سے زیادہ آمادگی رکھتا ہے۔

اسی طرح اس پروگرام کے لیے متن اصلی کے عنوان سے ”قرآن“ کا انتخاب اس بناء پر ہے کہ یہ اس سلسلہ کے تمام ضروری اسباق

کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور یہ ایمان کی تقویت، استقامت، تقویٰ اور پرورشِ نفوس کا بہترین وسیلہ ہے۔

”ترتیل“ کی تعبیر جو اصل میں موزوں ”تنظیم“ و ”ترتیب“ کے معنی میں ہے اور یہاں آیات قرآنی کو تانی (ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا) ضروری نظم، حروف کی صحیح ادائیگی، الفاظ کو وضاحت کے ساتھ پڑھنا، آیات کے مفاہیم میں دقت و تاثر اور ان کے نتائج میں غور و فکر کرنا ہے۔

واضح رہے کہ قرآن کی اس طرح سے تلاوت انسان کو معنوی نشوونما، اخلاقی شہادت اور تقویٰ و پرہیزگاری سرعت کے ساتھ بخشن سکتی ہے اور اگر بعض مفسرین نے اس کی نماز پڑھنے کے معنی میں تفسیر کی ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز کا ایک اہم حصہ ”تلاوت قرآن“ ہی ہے۔

”قم اللیل“ کے جملہ میں ”قیام“ کی تعبیر، سونے کے مقابلہ میں کھڑا ہونے کے معنی میں ہے، نہ کہ صرف پاؤں پر

سے ”مزل“ اصل میں ”متزل“ تھا۔ ”مزل“ کے مادہ سے جس کا معنی اپنے اور کپڑا پیٹنا ہے اور ”زویل“ جو ہم ردیف کے معنی میں ہے (وہ شخص جو کسی کے پیچھے سواری پر ہو) اور اس کے بعد نین اور سامتی کے معنی میں آیا ہے۔ یہ اس بناء پر ہے کہ وہ ارتباط اور قریبی تعلق رکھتا ہے۔

کھڑا ہونے کے معنی میں ہے۔

لیکن ان آیات میں ”شب زندہ داری“ کی مقدار کے بارے میں جو مختلف تعبیریں آئی ہیں، وہ حقیقت میں ”اختیار“ کو بیان کرنے کے لیے ہیں، اور وہ پیغمبر کو یہ اختیار دیتی ہیں کہ آدھی رات یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ بیدار رہیں اور قرآن کی تلاوت کریں، پہلے مرحلہ میں ”ماری رات“ سوائے مٹوڑی سی مقدار کے ذکر کرتا ہے، اور اس کے بعد اس میں تخفیف کر کے آدھی رات تک پہنچاتا ہے، اور اس کے بعد آدھے سے بھی کم۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے ”دو تہائی“، ”آدھی“ اور ”ایک تہائی“ رات کے درمیان تخییر مراد ہے۔ اس آیت کے قرینہ جو اسی سورہ کے آخر میں آئے گی جس میں فرماتا ہے: (ان سربك يعلم انك تقوم اذنی من ثلثی اللیل و نصفہ و ثلثہ)

صنعتی طور پر سورہ کے آخر کی اسی آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ پیغمبر اس رات کے قیام میں اکیلے نہیں تھے، بلکہ مومنین کا ایک گروہ بھی اس خود سازی و تربیتی اور آمادگی کے پروگرام میں پیغمبر کے ساتھ تھا اور انھوں نے اس راہ میں آپ کو ایک اسوہ اور نمونہ کے طور پر قبول کیا ہوا تھا۔

بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ ”قعر اللیل الا قلیلاً“ کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ بعض راتوں کے سوا تمام راتوں میں قیام کیا کر، اور اس طرح سے استثناء رات کے حصوں میں نہیں ہے، بلکہ راتوں کے افراد میں ہے۔ لیکن یہ تفسیر ”کے مفرد ہونے اور“ نصف“ (آدھی) اور اس سے کتر کی تعبیر کے ساتھ درست نظر نہیں آتی۔

اس کے بعد اس سخت اور اہم حکم کے ”ہدف تہائی“ اور ”مفصلہ صلی“ کو اس طرح بیان کرتا ہے: ”ہم عنقریب ایک سخت بات تجھ کو القاء کریں گے“ (اذا سئل علیک قولاً ثقیلاً)۔

اگرچہ مفسرین ”قول ثقیل“ کے بارے میں الگ الگ بیان رکھتے ہیں، جو سٹک کے ایک ہی پہلو کو پیش کرتے ہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قول کا سنگین ہونا، جس سے بلاشک و شبہ قرآن مجید مراد ہے، مختلف پہلوؤں سے ہے۔ آیات کے مفہوم اور مطالب کے لحاظ سے سنگین۔

دلوں پر تحمل کے لحاظ سے سنگین، یہاں تک کہ خود قرآن کہتا ہے: لو انزلنا ہذا القرآن علی جبل لسنایتہ خاشعاً متصدعاً من خشیۃ اللہ: ”اگر ہم اس قرآن کو پہاڑوں پر نازل کرتے، تو تو اسے خاشع اور شگانتہ دیکھتا (حشر—۲۱) و عدول اور وعیدوں، دمدار یوں اور سؤلیتوں کے بیان کے لحاظ سے سنگین۔

تبلیغ اور دعوت کی راہ کی مشکلات کے لحاظ سے سنگین۔

تزاز و نئے عمل اور عرصہ قیامت میں سنگین

اور آخر میں پروگرام پیش کرنے اور اس کے مکمل اجراء کے لحاظ سے سنگین۔

ہاں! اگرچہ قرآن کا پڑھنا سہل و آسان اور زیبا و دلنشین ہے لیکن اس کے مفاد اور معانی کو عمل میں لانا اسی نسبت سے سنگین اور مشکل ہے

خصوصاً پیغمبر کی دعوت کے آغاز میں، اور آپ کے مکہ میں قیام کرنے کے وقت، جب ماحول کو جہالت، بت پرستی اور خرافات کے تیر و تار بادلوں نے گھیر رکھا تھا، لیکن پیغمبر اکرمؐ اور ان کے تھوڑے سے ساتھی، قرآن مجید کی تربیت سے مدد لیتے ہوئے، اور نماز شب سے امتداد طلب کرتے ہوئے اور پروردگار کی پاک ذات کے تقرب سے استفادہ کرتے ہوئے ان تمام مشکلات پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے اور اس "قول ثقیل" کے بار کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر اسے منزل مقصود تک پہنچا دیا۔

چند نکات

۱۔ تلاوت قرآن اور دعا و عبادت کے لیے رات کو اٹھنا

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اگرچہ ان آیات میں مخاطب پیغمبر کی ذات اقدس ہے۔ لیکن سورہ کا متن اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مومن بھی اس پر وگرام میں پیغمبر کی ذات کے ساتھ ہیں۔

اب بحث صرف یہ ہے کہ کیا یہ قیام اور شب زندہ داری، پیغمبر کی دعوت کے آغاز میں سب پر واجب تھی یا نہیں؟ بعض مفسرین کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ امر واجب تھا، بعد میں سورہ کی آخری آیت نے اس حکم کو منسوخ کر دیا اور اس میں تفسیراً ایک سال کا فاصلہ تھا۔

یہاں تک کہ بعض کا عقیدہ تو یہ ہے کہ یہ حکم پنجگانہ نمازوں کی تشریح سے پہلے تھا اور جب پنجگانہ نمازیں مشروع قرار دے دی گئیں تو اس کے بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

لیکن جیسا کہ مرحوم "طبرسی" نے بھی "مجمع البیان" میں نقل کیا ہے۔۔۔۔۔ اس سورہ کی آیات کے ظاہر میں کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی جو "نسخ" کے ادب پر دلیل ہو اور بہتر یہی ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ قیام و عبادت مستحب اور سنت مؤکدہ ہے اور اس میں ہرگز وجوب کا پہلو تھا ہی نہیں، سوائے پیغمبر اکرمؐ کی ذات کے لیے، کیونکہ قرآن کی بعض دوسری آیات کے مطابق نماز شب آپ پر واجب تھی اور اس میں کوئی مانع اور حرج نہیں ہے کہ یہ سلسلہ پیغمبر کے لیے واجب اور مسلمانوں پر مستحب ہو، اور اس سے قطع نظر ادنیٰ آیات میں جو کچھ آیا ہے "نماز شب" میں منحصر نہیں ہے۔ کیونکہ نماز شب تو ادھی رات یا دو تہائی رات یا ایک تہائی رات تک کو بھی شامل نہیں رکھتی۔ جو کچھ آیت میں بیان ہوا ہے وہ تو تسبیح قرآن کے لیے اٹھنا ہے۔

اس بناء پر یہ کام ابتداء میں مستحب مؤکدہ کی صورت میں تھا اور اس کے بعد اس میں تخفیف کر دی گئی اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ہر کام کے آغاز میں، خصوصاً ایک عظیم انقلاب کی ابتداء میں، ہمیشہ زیادہ قوت و توانائی کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ لہذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ پیغمبر اور مسلمانوں کو، اس قسم کا فوق العادہ حکم دیا گیا ہو کہ وہ رات کا زیادہ حصہ بیدار رہیں اور اس جدید پروگرام اور اس کی انقلابی تعلیمات سے آشنا ہوں، اور اس سے آگاہی کے علاوہ خود کو اس پر عمل کرنے کے لیے روحانی طور پر تیار کریں۔

۲۔ ترتیل کا معنی

اوپر والی آیات میں جس چیز پر تکیہ کیا گیا ہے وہ قرآن کی قراءت کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ”ترتیل“ کا مسئلہ ہے۔
 ”ترتیل“ کی تفسیر میں معصومینؑ سے بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں، جن میں سے ہر ایک اس کے وسیع الالباح و جہات میں سے کسی ایک جہت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔
 ایک حدیث میں امیر المؤمنین علیؑ سے آیا ہے:

بینہ بیانا ولا تہذہ ہذا الشعر ولا تنثرہ نثر الرمل، ولكن اقرح بہ القلوب
 القاسیة ولا یكونن ہما احدکم اٰخر السورۃ

”ترتیل“ یعنی اس کو واضح طور پر بیان کر، نہ تو اشعار کی طرح جلدی اور یکے بعد دیگرے پڑھ، اور نہ ہی ریت کے ذروں کی طرح اس کو کھیر دے۔ لیکن اس طرح پڑھ کہ اس سے سخت اور سنگین دلوں کو نرم کر دے، اور انہیں بیدار کر دے، ہرگز بظہار مقصد یہ نہ ہو کہ تم لازمی اور حتمی طور پر آخر سورہ تک پہنچو اور اسے ختم کر کے رہو (بلکہ اہم بات یہ ہے کہ تم آیات کے مطالب اور معانی کو سمجھو) ۱؎

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے ”ترتیل“ کی تفسیر میں یہ آیا ہے:

اذا امرت بأیة فیہا ذکر الجنة فاسأل اللہ الجنة، واذا امرت بأیة فیہا ذکر
 النار فتعوذ باللہ من النار

”جس وقت تم کسی ایسی آیت سے گزرو جس میں جنت کا ذکر ہو تو تڑک کر خدا سے جنت کا سوال کرو (اور اپنی اس کے لیے اصلاح کرو) اور جب تم کسی ایسی آیت سے گزرو جس میں جہنم کا ذکر ہو، تو خدا سے اس کے پناہ مانگو (اور خود کو اس سے دور رکھو) ۲؎

ایک اور روایت میں اسی امام سے آیا ہے کہ آپ نے ”ترتیل“ کی تفسیر میں فرمایا:

ہوان تتمکت فیہ وتحسن یہ صوتک

”ترتیل“ یہ ہے کہ تو آیات کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھے اور انہیں اچھی آواز میں پڑھے“ ۳؎

ایک اور حدیث میں انہیں حضرت سے اس طرح نقل ہوا ہے:

ان القرآن لا یقرأ ہذرمة، ولكن یرتل ترتیلا اذا امرت بأیة فیہا

۱؎ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۲۷۸، یہ حدیث اصول کافی جلد ۲۔ باب ”ترتیل القرآن بالصوت الحسن“ اور دوسری

کتابوں میں بھی مختصر فرق کے ساتھ آئی ہے۔

۲؎ وہی مددک

۳؎ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۲۷۸

ذکر النار وقفت عندها وتعوذت بالله من النار

”قرآن کو جلدی جلدی، سرعت اور تیزی کے ساتھ نہیں پڑھنا چاہیے۔ جس وقت تم کسی ایسی آیت سے گزر دو جس میں جہنم کا ذکر ہو، تو وہاں رک جاؤ، اور خدا سے جہنم کی آگ سے پناہ مانگو۔“

اور آخری بات یہ ہے کہ پیغمبر کے حالات میں نقل ہوا ہے کہ آنحضرتؐ آیات کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر کے پڑھتے اور اپنی آواز کو کھینچ کھینچ کر پڑھتے تھے۔

یہ روایات، اور وہ دوسری روایات جو اسی مفہوم کی اصول کافی، نور الثقلین، درمنثور اور حدیث تفسیر کی تمام کتابوں میں نقل ہوئی ہیں، وہ سب کی سب اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ آیات قرآنی کو اس طرح نہیں پڑھنا چاہیے، جو مطالب و مضامین اور پیام سے خالی ہو بلکہ ان تمام امور کی طرف توجہ رکھنی چاہیے، جو پڑھنے اور سننے والوں میں اس کی تاثیر کو گہرا کر دے، اور اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ اللہ کا پیام ہے اور اس کا مقصد اس کے مطالب و مضامین کو تحقق بخشنا (اور عملی جامہ پہنانا ہے)

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلمان اس واقعیت سے بہت دور ہو گئے ہیں، اور انہوں نے قرآن کے صرف الفاظ پر اکتفا کر لیا ہے، اور ان کا مقصد صرف سورت اور قرآن کو ختم کرنا ہوتا ہے۔ بغیر اس کے کہ وہ یہ جانیں کہ یہ آیات کس مقصد کے لیے نازل ہوئی ہیں؟ اور کس پیام کی تبلیغ کر رہی ہیں؟ یہ ٹھیک ہے کہ یہ قرآن کے الفاظ بھی محترم ہیں، اور ان کو پڑھنا بھی فضیلت رکھتا ہے؛ لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ الفاظ اور تلاوت ان کے مطالب و مضامین کو بیان کرنے کا مقدمہ اور تمہید ہے۔

۳۔ نماز شب کی فضیلت

یہ آیات دوبارہ شب زندہ داری، نماز شب، اور اس وقت — جبکہ غافل لوگ خواب غفلت میں پڑے سوئے ہوئے ہوتے ہیں — قرآن کی تلاوت کی اہمیت کو گوشہ زد کرتی ہیں، اور جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ رات کو عبادت کرنا، خصوصاً سحر کے وقت، اور طلوع فجر کے نزدیک، روح کی صفائی، تہذیب نفوس اور انسان کی معنوی تربیت، پاکیزگی قلب، دل کی بیداری، ایمان و ارادہ کی تقویت اور انسان کے دل و جان میں تقویٰ کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں حد سے زیادہ اثر رکھتا ہے، یہاں تک کہ ایک ہی مرتبہ کی آزمائش سے، انسان اس کے آثار، واضح طور پر اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔

اسی بناء پر آیات قرآنی کے علاوہ روایات اسلامی میں بھی اس مطلب پر بہت زیادہ تاکید ہوئی ہے۔ منجملہ ان کے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

ان من روح الله تعالى ثلاثة، التهجد بالليل و افطار الصائم

۱؎ ”نور الثقلین“ جلد ۵ ص ۴۴

۲؎ ”مجمع البیان“ زیر بحث آیت کے ذیل میں

ولقاء الاخوان

” تین چیزیں خدا کی مخصوص عنایات میں سے ہیں، شبانہ عبادت (نماز تہجد) روزہ داروں کو افطار کرانا اور
سلمان اور مؤمن بھائیوں کی زیارت و ملاقات کرنا“ لے

ایک اور حدیث میں انھیں جناب سے آیا ہے کہ آپ نے آیہ ”ان الحسنات یذہبن السیئات“ (نیک کام برے
کاموں کے اثر کو زائل کر دیتے ہیں) کی تفسیر میں فرمایا:

صلاة اللیل تذهب بذنوب النهار

” نماز تہجد دن کے گناہوں کو ختم کر دیتی ہے“ لے

سورہ اسراء کی آیہ ۹ کے ذیل میں بھی ہم اس سلسلہ میں ایک تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ اور ہم نے وہاں پر نماز تہجد کی اہمیت کے بارے
میں بہت عمدہ روایات نقل کی ہیں۔ لے

لے، لے ”بیمار الانوار“ جلد ۸۷ ص ۱۲۲

لے ”تفسیر نمونہ“ جلد ۱۲ ص ۲۲۷

۶۔ اِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْأً وَاَقْوَمُ قِيْلًا ۝

۷۔ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝

۸۔ وَاذْكُرْ اِسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝

۹۔ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا اِلَهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْ

وَكِيْلًا ۝

۱۰۔ وَاَصْبِرْ عَلٰی مَا يَقُوْلُوْنَ وَاَهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝

ترجمہ

۶۔ یقیناً شبانہ (عبادت) کا پروگرام زیادہ مضبوط اور زیادہ استقامت والا ہے۔

۷۔ اور دن میں تو تمہارے لیے مسلسل اور طولانی کوششیں جاری رہیں گی۔

۸۔ اپنے رب کے نام کا ذکر کیے جاؤ اور صرف اسی کے ساتھ دل کو لگائے رکھو۔

۹۔ وہی مشرق و مغرب کا پروردگار ہے جسکے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ پس تم اسی کو اپنا نگہبان اور کارساز مانو۔

۱۰۔ اور جو کچھ وہ (دشمن) کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور شائستہ طور پر ان سے دُوری اختیار کرو۔

تفسیر
رات کے وقت کی عبادت کا اثر

یہ آیات اسی طرح رات کی عبادت اور رات کی تاریکی میں قرآن کی تلاوت کے ذریعے، معنوی تعلیمات کے سلسلہ میں، بحث کو جاری رکھے ہوئے ہیں، اور حقیقت میں جو کچھ گزشتہ آیات میں بیان ہوا ہے، یہ اس کی دلیل کے طور پر آئی ہیں، ”یہ عبادت اور رات کی تلاوت کا حکم اس بنا پر ہے کیونکہ (عبادت اور تعلیم کا) یہ پروگرام زیادہ مضبوط اور زیادہ استقامت والا ہے (اِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْأً وَاَقْوَمُ قِيْلًا)۔“

۱۔ ”ناشئة“ اسم فاعل ہے لیکن یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ یہ مصدر ہو ”عافیة“ کی طرح۔

”ناشئة“ ”نشئ“ (بروزن نثر) کے مادہ سے ”حادثہ“ کے معنی میں ہے، اور یہ بات کہ یہاں اس سے کیا مراد ہے اس کے تین تفاسیر بیان ہوئی ہیں۔

پہلی یہ ہے کہ اس سے مراد رات کی گھڑیاں ہیں، جو یکے بعد دیگرے حادث ہوتی ہیں، یا خصوصیت کے ساتھ آخر شب اور صبح کی گھڑیاں ہیں۔

دوسری یہ ہے کہ اس سے مراد نماز و عبادت اور تلاوت کے لیے قیام کا پروگرام ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں امام باقرؑ اور امام صادقؑ نے نقل ہوا ہے کہ انھوں نے فرمایا:

ھی القیام فی آخر اللیل الی صلاة اللیل

اس سے مراد آخر شب میں نماز تہجد کے لیے قیام کرنا ہے۔

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے اس آیت کی تفسیر میں آیا ہے:

قیامہ عن فراشہ لایرید الا اللہ

اس سے مراد بستر سے کھڑا ہونا ہے جس کا مقصد خدا کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

تیسری یہ ہے کہ اس سے مراد ”معنوی و روحانی حالات“ اور ”ملکوتی نشاط و جذبہ“ ہے، جو انسان کے دل و جان میں رات کی ان مخصوص گھڑیوں میں پیدا ہوتا ہے جس کے اثرات روح انسانی میں زیادہ گہرے ہوتے ہیں اور ان کا دوام زیادہ سے زیادہ ہوتا ہے۔

البتہ تفسیر اور اس سے پہلے والی تفسیر ایک دوسرے کی لازم و ملزوم ہیں اور یہ مناسب ہے کہ یہ دونوں ہی آیت میں جمع ہوں۔

”وطئاً“ اصل میں قدم رکھنے اور اسی طرح موافقت کرنے کے معنی میں ہے۔

”اشد و طئاً“ کی تعبیر یا تو مشقت و زحمت کے معنی میں ہے جو شبانہ قیام اور عبادت میں ہوتی ہے یا بھڑکتا و راسخ

تأثیرات کے معنی میں ہے جو ان عبادات کے سایے میں انسان کی روح اور جان میں پیدا ہوتی ہے (البتہ دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے)

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ اس زیادہ موافقت کے معنی میں ہے جو ان لحاظ میں انسان کے دل آنکھ اور کان کے درمیان ہوتی ہے اور ان سب

کے اجتماع سے عبادت کی راہ پیدا ہوتی ہے۔

”اقوم“ ”قیام“ کے مادہ سے محکم و مضبوط اور زیادہ صاف کے معنی میں ہے اور ”قیل“ بات کرنے کے معنی میں ہے، یہاں

ذکر خدا اور تلاوت قرآن کی طرف اشارہ ہے۔

مجموعی طور پر یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو ”شبانہ عبادت“ اور سحرگاہی دعا ثنا، اور ایسے لحاظ میں جبکہ ہر وقت کی نسبت، دلی

فرانفت کے اسباب زیادہ فراہم ہوتے ہیں۔ محبوب کے ساتھ راز و نیاز کی رساترین باتوں کو اپنی معنی خیز تعبیروں کے ساتھ بیان کرتی

ہے اور اسی طرح سے انسان کی تہذیب نفس، اور روح جان کی پرورش میں اس کی تاثیر کو بیان کرتی ہے۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ

انسان کی روح، ان لمحات میں دعا و مناجات اور ذکر و فکر کے لیے ایک خاص قسم کی آمادگی رکھتی ہے۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: یہ اس بنا پر ہے کہ دن میں تو تمہیں مسلسل اور بہت زیادہ سعی و کوشش اور جہد و جدوجہد کرنی پڑے گی (ان لك في النهار سببًا طويلاً)۔

تم ہمیشہ مخلوق کی ہدایت اور پروردگار کی رسالت کی تبلیغ اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے مشکلات کو حل کرنے میں لگے رہتے ہو، اور عبادت اور مناجات کے لیے کافی وقت نہیں ملتا، لہذا اس کی بجائے رات کو عبادت کیا کرو۔

ایک اور احتمال بھی جو آیت کی تفسیر میں موجود ہے اور کئی جہات سے زیادہ بہتر اور قبل و بعد کی آیات کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے یہ ہے کہ چونکہ تم دن بھر میں سنگین ذلالت، بھاری ذمہ داریوں اور بہت زیادہ جدوجہد کا بوجھ اپنے کانڈھوں پر اٹھاتے ہو، لہذا تمہیں رات کی عبادت کے ساتھ خود کو تقویت دینی چاہیے اور ان عظیم فعالیتوں کے لیے اس قیام شب کے ذریعہ ضرورتاً تیار ہونا چاہیے۔

”سبح“ (بروزن ”مدح“) اصل میں حرکت اور آمد و رفت کے معنی میں ہے اور بعض اوقات تیرنے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ وہ مسلسل حرکت میں رہتا ہے

گویا وہ انسانی معاشرے کو ایک بے کراں سمندر سے تشبیہ دیتا ہے، جس میں ایک گردہ کثیر غرق ہونے کی حالت میں ہے، اسکی انواع و اقسام ہر طرف حرکت میں ہیں، سرگرداں کشتیاں اس میں پناہ گاہ تلاش کرتی پھرتی ہیں اور پیغمبر اسلام اس سمندر میں غرق ہونے والوں کے لیے، اکیلے نجات دہندہ ہیں اور آپ کا قرآن اس سمندر میں ایسی نجات کی کشتی ہے۔

اس عظیم تیراک کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اپنی شانہ عبادت کے ذریعہ اس روزانہ کی عظیم ماموریت اور رسالت کے لیے آمادہ کرے۔

رات کی عبادت کے قیام کے حکم، اور اس کے عمیق اور گہرے آثار کی طرف اجمالی اشارہ کرنے کے بعد پانچ احکام کا، جو ان کی تکمیل کرتے ہیں، ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اپنے پروردگار کے نام کو یاد کرو اور اس کا ذکر کرو (واذکرو اسم ربك)۔“

مسلمہ طور پر اس سے مراد صرف خدا کے نام کا ذکر کرنا نہیں ہے بلکہ معنی کی طرف توجہ ہے، کیونکہ لفظی ذکر قلبی یاد کا ایک مقدمہ اور تمہید ہے اور قلبی ذکر روح و جان کو صفا بخشتا ہے اور دل میں معرفت و تقویٰ کے نہال کی آبیاری کرتا ہے۔

”رب“ کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس وقت تم اس کے مقدس نام کا درددل کرو تو اس کی بے پایاں نعمتوں اور اپنے لیے اس کی مسلسل تربیت کی طرف توجہ رکھو۔

ایک مفسر نے پروردگار کے ذکر کے کچھ مراحل بیان کیے ہیں۔

پہلا مرحلہ اس کے نام کے ذکر کا ہے، جس کی طرف زیر بحث آیت میں اشارہ ہوا ہے۔

اس کے بعد والے مرحلے میں اس کی پاک ذات کی دل میں یاد آوری کی نوبت آتی ہے، جو سورہ اعراف کی آیت ۲۰۵ میں بیان

ہوئی ہے ”واذکرو ربك في نفسك تضرعاً وخيفة“ ”اپنے پروردگار کو اپنے دل میں تضرع اور خوف کے

ماخذ یاد کرو۔

آخر کار تیسرا مرحلہ آن پہنچتا ہے، اس مرحلہ میں خدا کی ربوبیت کے مرحلہ سے اوپر چلا جاتا ہے اور خدا کے صفات جمال و جلال کے مجموعہ کے مقام تک۔ جو ائمہ میں جمع ہے۔ پہنچ جاتا ہے، جیسا سورہ احزاب کی آیت ۴۱ میں فرماتا ہے:

يا ايها الذين امنوا اذكروا الله ذكرا كثيرا
”اے ایمان لانے والو! خدا کو کثرت سے یاد کیا کرو“

اور اس طرح سے یونہی یہ ذکر جاری و ساری رہے گا اور مرحلہ بہ مرحلہ تکمال وار تقاء پیدا کرتا رہے گا اور ذکر کرنے والوں کو اور حج کمال تک پہنچا دے گا۔

دوسرے حکم میں فرماتا ہے: ”خدا ہی کے ساتھ اپنے دل کو لگاؤ اور اس کے غیر سے امید کو قطع کر لو اور خلوص کے ساتھ عبادت کے لیے کھڑے ہو جاؤ“ (و تبتل اليه تبتلا)۔

”تبتل“ ”بتل“ (بروزن حتم) کے مادہ سے اصل میں انقطاع کے معنی میں ہے اور اسی لیے مریم کو ”بتول“ کہا گیا ہے کیونکہ انہوں نے اپنے لیے کوئی شوہر انتخاب نہیں کیا اور اگر بانو نے اسلام فاطمہ زہرا (سلام اللہ علیہا) کو بھی بتول کہا جاتا ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ کی تمام عورتوں سے اعمال و رفتار اور معرفت کے لحاظ سے جدا اور برتر تھیں اور انقطاع الی اللہ کی حالت تک پہنچی ہوئی تھیں۔

بہر حال ”تبتل“ یہ ہے کہ انسان اپنے پورے دل کے ساتھ خدا کی طرف متوجہ ہو اور اللہ کے سوا ہر کسی سے منقطع ہو جائے، اور اپنے اعمال صرف اسی کے لیے بجلائے اور اخلاص میں غرق ہو۔

اور اگر ایک روایت میں پیغمبر گرامی اسلام سے یہ نقل ہوا ہے کہ:

لا رهبانية، ولا تبتل في الاسلام

اسلام میں نہ تو رهبانیت ہے اور نہ ہی تبتل۔

تو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح سے ترک دنیا کرنا، جو عیسائی راہبوں میں رائج ہے، وہ اسلام میں موجود نہیں ہے وہ ترک دنیا کے لیے شادی بیاہ کو بھی ترک کرتے ہیں اور ہر قسم کی اجتماعی فعالیت کو بھی، لیکن اگر واقعی اور حقیقی مسلمان، قلب اجتماع میں زندگی بسر کرنے کے باوجود تمام تر خدا ہی طرف متوجہ رہتا ہے۔

۱۔ ”تفسیر فخر رازی“ جلد ۲۰ ص ۱۷۷ (اقتباس)

۲۔ قاعدہ کے مطابق یہاں ”مفعول مطلق“ ”تبتل“ ”بتل“ کا مصدر ہے، لیکن اس کی جگہ یہاں پر باب تفعیل کا مصدر آیا ہے۔ اور اس بات کے علاوہ کہ یہ آیات کے آخر میں ہم آہنگی کو محفوظ رکھتا ہے، ممکن ہے ایک لطیف نکتہ کی طرف اشارہ بھی ہو اور وہ یہ ہے کہ ”انقطاع الی اللہ“ نہ صرف اللہ سے الگ ہونا ہے اور نہ ہی تمام کا تمام ہو جانا۔ کیونکہ اس میں ایک طرف تو پہنچنا اور بندہ کی سعی و کوشش شرط ہے اور دوسری طرف سے پروردگار کا لطف۔

۳۔ ”مفردات“ و ”معجم البحرین“ مادہ ”تبتل“

بعض روایات میں، آئمہ معصومین سے نقل ہوا ہے کہ ”تبنتل“ کا معنی حالت نماز میں ہاتھ کو بلند کرنا ہے۔ لیکن یہ بات ہے کہ یہ حقیقت میں اخلاص اور انقطاع الی اللہ کے ایک منظر کا بیان ہے۔
بہر حال پروردگار کی وہ یاد اور یہ اخلاص، مخلوق خدا کی ہدایت کے سنگین دستخت پر و گرام میں مردان خدا کا عظیم سرمایہ ہے۔

اس کے بعد تیسرے حکم کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”وہی مشرق و مغرب کا پروردگار، جس کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں ہے، اپنا محافظ اور کارساز مانو“ (رب المشرق والمغرب لا اله الا هو فاتخذہ وکیلاً)۔
یہاں ”ذکر اللہ“ اور ”اخلاص“ کے مرحلہ کے بعد، توکل اور تمام کاموں کو خدا کے سپرد کرنے کا مرحلہ آتا ہے، یعنی جہان سارا مجموعہ، اسی کی حکومت و ربوبیت کے زیر تسلط ہے اور پرستش کے لائق وہی یک و تنها معبود ہے، یہ تعبیر حقیقت میں، توکل پر خدا کے سپرد، ایک دلیل کے طور پر آئی ہے، انسان اس پر توکل کیسے نہ کرے اور اپنے معاملات کو اس کے سپرد کیوں نہ کرے، حالانکہ اس وسیع عالم ہستی اس کے علاوہ کوئی اور حاکم، فرمانروا، منعم، مرئی اور معبود نہیں ہے۔

آخر جو تھے اور پانچویں حکم میں فرماتا ہے: ”دشمن جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر و شکیبائی اختیار کرو، اور ان سے شائستہ اور عمدہ طریقہ دوری اختیار کرو“ (واصبر علی ما یقولون و اھجرھم وھجر اجمیلاً)۔
اور اس طرح سے یہاں ”صبر“ اور ”ہجران“ کا مقام آپہنچتا ہے، کیونکہ حق کی طرف دعوت کی راہ میں، دشمنوں کی بدگوئی اور اذیت و آزار پہچانا بہت زیادہ، اور اگر باغبان کوئی بھول توڑنا چاہتا ہے تو اسے کانٹے کی زبان کے مقابلہ میں صبر کرنا پڑے گا۔
اس کے علاوہ بعض اوقات یہاں بے اعتنائی اور دُوری ضروری ہو جاتی ہے، تاکہ ایک تو ان کے شر سے محفوظ رہے، دوسرے ان طرح سے انھیں ایک سبق بھی دے، لیکن یہ ہجران و دُوری، تربیتی پروگراموں اور خدا کی طرف تبلیغ و دعوت کے قطع کرنے کے معنی میں نہیں ہونی چاہیے۔

اس طرح سے اوپر والی آیات، پیغمبر اسلامؐ اور ان تمام لوگوں کے لیے جو آپ کی پیروی کرتے ہیں ایک جامع اور کامل نسخہ دیتی ہیں کہ وہ رات کی عبادات اور بوقت سحر پروردگار سے دعا و مناجات سے مدد حاصل کریں اور پھر اس پودے کی یاد خدا، اخلاص، توکل، صبر اور ہجران کے پانی سے آبیاری کریں۔ کیسا جامع اور عمدہ نسخہ ہے؟
”رب المشرق والمغرب“ (مشرق و مغرب کے پروردگار) کی تعبیر تمام عالم ہستی پر اس کی حاکمیت و ربوبیت کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ ہم روزمرہ کی تعبیروں میں کہتے ہیں: فلاں شخص نے زمین کے مشرق و مغرب پر اپنا تسلط جا لیا ہے، یعنی تمام روئے زمین کو، نہ کہ صرف مشرق و مغرب کے نقطہ کو۔

”ہجران جمیل“ (شائستہ دوری و جدائی)، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے کہ دلسوزی اور حق کی طرف دعوت و تبلیغ سے تو اہم ہجران و دوری کے معنی میں ہے، جو خاص خاص علاقوں میں ایک تربیتی روش شمار ہوتی ہے اور دوسرے علاقوں میں ”جہاد“ کے مسئلہ کے

ساتھ بالکل منافات نہیں رکھتی، کیونکہ ہر ایک کی ایک جگہ ہے اور ہر نقطہ کا ایک مقام ہے، دوسرے لفظوں میں یہ دوری بے اعتنائی نہیں ہے، بلکہ خود ایک قسم کی امتناء اور پرواہ کرتا ہے، بہر حال یہ جو بعض نے اوپر والی آیت کو آیات جہاد سے منسوخ سمجھا ہے، صحیح نہیں ہے۔
مرجوم "طبری" "مجمع البیان" میں اس آیت کے ذیل میں کہتے ہیں:

وفي هذا دلالة على وجوب الصبر على الاذى، لمن يدعوا الى الدين و
والمعاشرة باحسن الاخلاق واستعمال الرفق ليكونوا اقرب الى الاجابة

"یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مبلغین اور قرآن کی طرف دعوت دینے والے تکالیف اور
اذیتوں میں صبر اختیار کریں، اور حسن خلق و مدارات کے ساتھ لوگوں میں معاشرت کریں، تاکہ ان کی باتیں
جلدی قبول ہوں"۔

- ۱۱- وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِيَ النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا ۝
- ۱۲- إِنَّ لَدَيْنَا أَنْكَالًا وَجَحِيمًا ۝
- ۱۳- وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا ۝
- ۱۴- يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَهِيلًا ۝
- ۱۵- إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۝
- ۱۶- فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْدًا وَبِئْسَ ۝
- ۱۷- فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ۝
- ۱۸- السَّمَاءُ مِنْ فِطْرِهِ ۝ كَانَ وَعْدُهُ مَفْعُولًا ۝
- ۱۹- إِنَّ هَذِهِ تَذْكَرَةٌ ۝ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذْ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ۝

ترجمہ

- ۱۱- مجھے ان جھٹلانے والے صاحبانِ نعمت (سے بدلہ لینے کے لیے) چھوڑ دو اور انھیں مٹھوڑی سی مہلت دے دو۔
- ۱۲- کیونکہ ہمارے پاس نل و زنجیر اور (جہنم کی آگ) ہے۔
- ۱۳- اور گلوگیر غذا اور دردناک عذاب ہے۔

- ۱۴۔ اس دن زمین اور پہاڑ شدت سے لرز رہے ہوں گے اور پہاڑ (اس طرح ریزہ ریزہ ہوں گے کہ) ریت کے تودوں کی شکل میں نرم ہو جائیں گے
- ۱۵۔ ہم نے تمہاری طرف ایسا ہی ایک پیغمبر گواہ بنا کر بھیجا ہے، جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا۔
- ۱۶۔ فرعون اس رسول کی مخالفت اور نافرمانی کے لیے کھڑا ہو گیا تو ہم نے اسے سخت سزا دی۔
- ۱۷۔ تو اگر تم بھی کافر ہو گئے، تو تم (خدا کے شدید عذاب سے) اس دن جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا، کس طرح خود کو بچاؤ گے۔
- ۱۸۔ اس دن آسمان پھٹ پڑے گا اور اس کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔
- ۱۹۔ یہ تو ایک تنبیہ اور نصیحت ہے پس جو شخص چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کر لے۔

تفسیر ان مستکبرین کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دے

گزشتہ آیات میں سے آخری آیت میں دشمنان اسلام کی کارکنیوں، ناروا باتوں اور اذیت و آزار کی طرف اشارہ تھا۔ زیر بحث آیات میں انہیں خدا کی طرف سے، دنیا و آخرت کے عذابوں کی شدید تہدیدیں اور دھمکیاں دی گئی ہیں اور انہیں اپنے شوم و منحوس پروگراموں میں تجدید نظر کی دعوت دی ہے اور صدر اول کے مسلمانوں کی ان دشمنوں کے سخت هجوم کے مقابلہ میں دلداری کی ہے اور انہیں پامردی بخشی ہے۔

پہلے فرماتا ہے: ”بجھ ان تکذیب کرنے والے، شرور مند اور صاحبانِ نعمت افراد کے ساتھ (بدلہ لینے کے لیے) چھوڑ دے اور انہیں تھوڑی سی مہلت دے دے“ (وذرنی والمکذبین اولی النعمۃ ومہلہم قلیلاً)۔

یعنی ان کا مقابلہ تو نہیں ہے، میں ہوں! ان کی سزا و عذاب کا معاملہ خود مجھ پر چھوڑ دے، اور تھوڑی سی انہیں مہلت دے دے، تاہم تمام جنت بھی ہو جائے اور وہ اپنی ماہیت کو ظاہر و آشکارا بھی کر دیں، اور اپنی پشت کو بارگاہ سے سسگین اور بوجھل کر لیں، تو اس وقت میرا عذاب ان کا گلہ دالے گا۔

اور ہم جانتے ہیں کہ تھوڑی مدت ہی گزری تھی کہ مسلمان طاقت ور ہو گئے اور انہوں نے جنگ ” بدر “ و ” خین “ و ” احزاب “ وغیرہ میں اپنی سخت اور توڑنے والی ضربیں دشمن کے پیکر پر لگائیں، نیز زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ یہ سرکشی کرنے والے دنیا سے چلتے بنے اور برزخ میں عذابِ الہی میں گرفتار ہوئے اور قیامت کا عذاب بھی ان سے کچھ زیادہ دُور نہیں ہے۔

ضمنی طور پر ” اولی النعمۃ “ (صاحبانِ نعمت) کی تعبیر مال و دولت اور مادی امکانات و وسائل کی زیادتی سے پیدا ہونے والے غرور و غفلت کی طرف اشارہ ہے، جو ایسے لوگوں کو اکثر دامن گیر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کی طول تاریخ میں ————— جیسا کہ قرآن شامد گواہ

ہے۔ یہ گروہ ہمیشہ مخالفین کی صفِ اول میں رہا ہے۔

حقیقت میں یہ آیت سورۃ سبأ کی آیت ۲۴ کے مشابہ ہے، جو کہتی ہے: وما ارسلنا فی قریۃ من نذیر الا فرقا متفرقا، انا بما ارسلنا من قبلك لعلکم تتقون، ”ہم نے کسی شہر و دیار میں کوئی انذار کرنے والا نہیں بھیجا، مگر یہ کہ ان کے مترنین (مومنین) میں مست تھے، تم جس چیز کے ساتھ بھیجے گئے ہو ہم اس سے کافر ہیں، انکار کرتے ہیں“۔
حالانکہ اس قسم کے افراد کو دوسروں سے پہلے منادیانِ حق کی دعوت پر لبیک کہنا چاہیے، تاکہ اس طریقے سے ان سب غلامانِ شکر بجلائیں۔

اس کے بعد اسی تہدید کو جاری رکھتے ہوئے اور زیادہ صریح صورت میں کہتا ہے: ”ہمارے پاس نخل و زنجیر اور جہنم کی آگ (ان لدینا انکالاً و جمعیمًا)۔“

”انکال“ ”نکل“ (بروزنِ فکر) کی جمع ہے اور بھیل زنجیروں کے معنی میں ہے اور اصل میں ”نکول“ کے مادہ سے ہے، ضعف و ناتوانی کے معنی میں یا گیب ہے اور چونکہ وہ زنجیر جو ہاتھ پاؤں اور گردن میں ڈالتے ہیں، انسان کو حرکت کرنے سے روک دیتی ہے، ناتواں بنا دیتی ہے، اس لیے یہ لفظ ”زنجیر“ کے معنی میں استعمال ہوا ہے، ہاں! بے قید و شرط آزادی اور اس ناز و نعمت کے مقابلہ میں جو وہ اس دنیا میں رکھتے تھے، وہاں ان کا حصہ قید اور آگ ہی ہوگی۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”اور گلوگیر ہونے والی غذا اور دردناک عذاب“ (و طعاماً اذا غصۃ و عذاباً الیمًا)۔

وہ غذا، ان کی دنیا کی چرب و شیریں غذاؤں سے جو آسانی کے ساتھ گلے سے نیچے اتر جاتی تھیں اور مزے دار ہوتی تھیں برعکس ہوگی اور اس جہان کے خود غرض، مغروروں اور مستکبروں کی بے حساب آسائش کے مقتاب میں دردناک زندگی ہوگی۔ اگرچہ سخت اور گلوگیر غذا خود ایک دردناک عذاب ہے لیکن اس کے بعد عذابِ الیم کو الگ ذکر کرتا ہے اور یہ چیز اس بات کی نشاندہ کرتی ہے کہ آخرت کے عذابِ الیم کے ابعاد و جہات اور مختلف پہلو، شدت و عظمت کے لحاظ سے خدا کے علاوہ کسی اور شخص کو معلوم نہیں۔ اسی لیے ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن ایک مسلمان اس آیت کی تلاوت کر رہا تھا، اور پیغمبر کان دھر کر سن رہے تھے کہ اچانک اس شخص نے بیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔

ایک اور حدیث میں یہ آیا ہے کہ خود پیغمبر اس آیت کی تلاوت کر رہے تھے اور آپ کی ایسی حالت ہوئی کہ یہ غذا گلوگیر کیوں نہ ہوگی؟ جبکہ سورۃ ناشیہ کی آیہ ۶ میں یہ آیا ہے: لیس لهم طعام الا من ضریع

ان کی غذا جاگداز کانٹوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوگی۔ اور سورہ دھان کی آیہ ۴۳، ۴۴ میں یہ آیا ہے: ان شجرت الزقوم طعام الاثیم: ”زقوم کا درخت (دی تلخ، بدبودار بد ذائقہ، کڑوا اور مار ڈالنے والا پودا) گنہگاروں کی غذا ہے۔“

اس کے بعد اس دن کی تشریح کرتے ہوئے جس میں یہ عذاب ظاہر ہوں گے فرماتا ہے: ”یہ اس دن ہوگا جس دن زمین اور سب پہاڑ شدت کے ساتھ لرزے لگیں گے اور پہاڑ اس طرح سے ریزہ ریزہ ہو جائیں گے کہ ریت کے تودوں کی طرح نرم ہو جائیں گے، (یوم تنجیف الارض والجبمال وکانت الجبال کثیباً مہیلاً)۔“

”کثیب“ تہ بہ تہ پڑھی ہوئی ریت (ٹیلہ) کے معنی میں ہے اور ”مہیل“ ہیل (بروزن کیل) کے مادہ سے، ریت اور آٹے جیسی کسی نرم چیز کو دوسری چیز پھڑانا، یہاں وہ نرم ریت مراد ہے جسے کبھی قرار نہیں ہوتا۔ اس معنی کی بنا پر قیامت میں اس طرح سے بکھر جائیں گے کہ ایسی نرم ریت کی صورت اختیار کر لیں گے کہ اگر اس پر پاؤں رکھیں گے تو وہ اس میں دھنس جائیں گے۔

قیامت کے دن کے لیے قرآن نے پہاڑوں کی قیمت کے بارے میں مختلف تعبیریں بیان کی ہیں جو سب کی سب ان کی نابودی اور ان کے نرم خاک میں تبدیل ہوجانے کی حکایت کرتی ہیں (پہاڑوں کی نابودی کے مختلف مراحل کی مزید تشریح اور اس سلسلے میں قرآن کی مختلف تعبیریں سورہ طہ کی آیہ ۱۰۵ کے ذیل میں آئی ہیں)۔

اس کے بعد پیغمبر کی بعثت اور منہ زور عربوں کی مخالفت کا موسیٰ بن عمران کے فرعون کے مقابلہ میں قیام سے موازنہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”ہم نے تمہاری طرف ایسا ہی پیغمبر بھیجا ہے، جو تم پر گواہ ہے، جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا“ (انا ارسلنا الیکم رسولاً شاہداً علیکم کما ارسلنا الی فرعون رسولاً)۔

اس کا ہدف مقصد تمہاری ہدایت اور تمہارے اعمال پر نظر رکھنا ہے، جیسا کہ موسیٰ بن عمران کا ہدف فرعون اور فرعونوں کی ہدایت اور ان کے اعمال پر نظر رکھنا تھا۔

”لیکن فرعون اس رسول کی مخالفت کے لیے کھڑا ہو گیا تو ہم نے بھی اسے شدید عذاب اور سزا میں گرفتار کر دیا“ (فعصى فرعون الرسول فاتخذناہ اتخذاً و بیلاً)۔

نہ تو اس کا عظیم لشکر ہی اسے خدا کے عذاب سے بچا سکا اور نہ ہی مملکت کی وسعت اور حکومت کی قدرت اور ان کے دولت مند اس کام کو روک سکے، اور آخر کار وہ سب کے سب نیل کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجوں میں جن پر وہ ٹخریا کرتے تھے غرق ہو گئے، تو تم جو ان سے بہت ہی پیست سطح پر ہو اور تعداد اور تیاری کے لحاظ سے فرعون اور فرعونوں سے کئی درجے زیادہ ضعیف ہو اپنے بسے میں

کی سوچتے ہو؟ اور اس مختصر سے مال اور افراد پر کس طرح سے مغرور ہوتے ہو؟

”و بیل“ ”دبل“ کے مادہ سے اصل میں شدید اور سنگین بارش کے معنی میں ہے اور اس کے بعد شدید سنگین چیز ہوا ہے۔ خصوصاً عذاب کے بارے میں اور زیر بحث آیت میں بھی شدت عذاب کی طرف ہی اشارہ ہے، گویا لوگوں کو شدید بارش کی طوفان اور بارش میں قرار دیتا ہے۔

اس کے بعد غیر اسلام کے زمانہ کے کفار کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے، انھیں اس طرح خبردار کرتا ہے: ”اگر تم کافر ہو گے آپ کو خدا کے شدید عذاب سے کس طرح بچا سکو گے، وہ دن تو ایسا ہوگا جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا“ (فکیف تتقون ان کفر یومًا یجعل الولدان شیبًا)۔

ہاں! اس دن کا عذاب اتنا زیادہ سنگین، شدید، ہولناک اور کمر شکن ہے، جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا، اور یہ اس کی سے کنا یہ ہے۔

آخرت کا عذاب تو آسان ہے، بعض نقل کرتے ہیں کہ اسی دنیا میں بعض اوقات جب انسان حد سے زیادہ شدید سختی اور تنگی سے گزرے تو محسوس ہوتا ہے کہ بہت جلدی اس کے بال سفید ہو گئے ہیں۔

بہر حال اوپر والی آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بالفرض اگر تم اس جہان میں فرعونوں کی طرح نابود کرنے والے عذاب میں نہ بھی ہوئے، تب بھی قیامت اور قیامت کے عذاب کا ذکر کیا کر دو گے۔

بعض والی آیت میں اس وحشت ناک دن کے بارے میں مزید حال بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ”اس دن آسمانی کڑے پھٹ جائیں اور خدا کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا (السماء منقطرہ بہ کان وعدہ مفعولاً)۔

قیامت اور ”انشر اط الساعة“ کی بہت سی آیات (وہ واقعات جو اس جہان کے اختتام اور قیامت کے آغاز میں صورت پذیر ہوں گے) عظیم انفجارات، شدید زلزلوں اور سرخ تبدیلیوں کا حال بیان کرتی ہیں جبکہ زیر بحث آیت انکھڑے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جب آسمان اور آسمانی کڑے، اس عظمت کے باوجود اس دن کے عظیم حوادث کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکے تو اس ضعیف و ناتواں انسان کی ہوسکتا ہے۔

۱۰ ”یومًا“ ”تتقون“ کا مفعول ہے، اور اس دن سے بچنے کا معنی اس دن کے عذاب سے بچنا ہے۔ یعنی نے یہ احتمال دیا ہے کہ ”تتقون“ کا ظرف یا کفر ہے کا مفعول ہے، لیکن یہ دونوں بیید نظر آتے ہیں۔

۱۱ ”شیب“ (بروزن سب) ”اشیب“ کی جمع ہے جو ”بوڑھے“ کے معنی میں ہے اور اصل میں شیب (بروزن سب) کے مادہ سے لیا گیا ہے اور شیب بالوں کے سفید ہونے کے معنی میں ہے۔

۱۲ ”منقطر“ ”انقطار“ کے مادہ سے اشتقاق اور پھٹ جانے کے معنی میں ہے اور ”بہ“ کی ضمیر بوم کی طرف لوٹتی ہے، یعنی آسمان اس دن کی وجہ سے پھٹ جائے گا (تو جہاں سے کہ مارتا کر کی صورت میں بھی اور ٹوٹت جازئی کی صورت میں بھی استعمال ہوتا ہے)۔

اس بحث کے آخر میں تمام گزشتہ تبتیہوں اور اندازوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”جو کچھ بیان کیا گیا ہے، یہ نصیحت اور یاد دلانے کے لیے ہے“ (ان ہذہ تذکرۃ)۔
 تم راستہ کا انتخاب کرنے میں آزاد ہو: ”اور جو شخص چاہے کہ اس کی ہدایت ہو اور وہ سعادتِ ابدی کا طالب ہو تو وہ اپنے پروردگار کی طرف راستہ انتخاب کر لیتا ہے“ (فمن شاء اتخذ الی ربہ سبیلاً)۔
 اگر اس راستہ کو طے کرنا جبر و اکراہ کے ذریعہ ہو تو وہ نہ کوئی افتخار کی بات ہے اور نہ ہی فضیلت کی، فضیلت کی بات تو یہ ہے کہ انسان اپنے ارادہ و اختیار سے اس راستہ کا انتخاب کرے اور پھر اسے طے کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا نے راہ اور جاہ کی نشاندہی کر دی ہے اور دیکھنے والی آنکھ اور روشنی منخشے والا سورج اختیار میں دے دیا ہے اور لوگوں کو یہ صلاحیت بخش دی ہے کہ وہ اس کے فرمان کی اطاعت میں ارادہ و اختیار کے ساتھ عمل کریں۔
 اس بارے میں کہ ”ان ہذہ تذکرۃ“ (یہ نصیحت اور یاد آوری ہے) کا جملہ کس چیز کی طرف اشارہ ہے؟ مفسرین نے کئی احتمال دیئے ہیں: کبھی تو انہوں نے یہ کہا ہے کہ یہ ان مواعظ کی طرف اشارہ ہے جو گزشتہ آیات میں آئے ہیں اور کبھی یہ کہا گیا کہ یہ پوری سورت کی طرف اشارہ ہے یا تمام قرآن کی طرف اشارہ ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ممکن ہے یہ حکم نماز اور رات کی عبادت کی طرف اشارہ ہو جو اس سورہ کی پہلی آیات میں آئے ہیں، اور اس میں مخاطب پیغمبر تھے، یہ جملہ چاہتا ہے کہ اسے باقی مسلمانوں کے لیے وسعت دے کہ عام کر دے، اس بناء پر بعد والے جملے میں بھی ”سبیلاً“ (راستہ) سے مراد نماز تہجد ہی ہے، جو پروردگار کی طرف اہم راستوں میں سے ہے، جیسا کہ سورہ دہر کی آیت ۶ میں رات کی عبادت کا حکم دینے کے بعد (ومن اللیل فاسجد لہ وسبحہ لیلاً طویلاً) مختصر سے فاصلہ کے بعد فرماتا ہے (ان ہذہ تذکرۃ فمن شاء اتخذ الی ربہ سبیلاً) جو بالکل وہی زیر بحث آیت ہے۔
 یقیناً یہ ایک مناسب تفسیر ہے لیکن زیادہ مناسب یہ ہے کہ آیت کا مفہوم وسیع ہو اور اس سورہ میں جتنے انسان ساز پروردگار میں تمام کو احاطہ کیے ہوئے ہو، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔

ایک نکتہ

عذابِ الہی کے چار مرحلے

اوپر والی آیات میں مغرور اور نعمت میں مست تکذیب کرنے والوں کو چار دردناک عذابوں کی تہدید کرتا ہے:

طوق اور زنجیریں: (انکال)

جہنم کی جلانے والی آگ (جحیم)

سخت لگو گیر ہونے والی مرگبار غذا میں: (و طعاماً ذا غصۃ)
 اور دوسرے انواع و اقسام کے دردناک عذاب جو انسانی فکر میں بھی نہیں آسکتے: (وعذاباً الیماً)
 یہ سزائیں حقیقت میں اس دنیاوی زندگی میں ان کی وضع و کیفیت کا نقطہ مقابل ہیں۔

ایک طرف ایسی آزادی کا ملنا جس کی کوئی حد اور سرحد نہ ہو

دوسری طرف سے مرنہ اور خوشحال زندگی

تیسری طرف خوشگوار غذا میں اور کھانے

چوتھی طرف سے انواع و اقسام کے آرام اور آسائشیں

اور چونکہ ان تمام چیزوں کو دوسروں کے حقوق پر ظلم و تجاوز اور کبر و غرور اور خدا سے غفلت کی قیمت پر حاصل کیا ہے، لہذا وہ قیامت

میں اس قیمت کی سرزدشت میں گرفتار ہوں گے۔

۲۰۔ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُومُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثِي اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثِيَهُ
وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ عَلِمَ
اَنْ لَّنْ تَحْصُوهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ
عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي
الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاَقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ
اَتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا وَاَمَّا تَقَدَّمُوا
لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا
وَاسْتَغْفِرُوا لِلّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

ترجمہ

۲۰۔ تیرا پروردگار جانتا ہے کہ تو اور ان لوگوں میں سے ایک گروہ جو تیرے ساتھ ہے، رات کی دو تہائی کے قریب
یا آدھی رات یا اس کی ایک تہائی قیام کرتے ہیں اور خدایات اور دن کا اندازہ رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تم
اس کی مقدار کا (دقت کے ساتھ) اندازہ نہیں کر سکتے، اس لیے اس نے تمہیں بخش دیا، اب تم قرآن کی صرف
اتنی ہی مقدار جو تمہارے لیے میسر ہو، تلاوت کرو، وہ جانتا ہے کہ عنقریب تم میں سے ایک گروہ بیمار بھی ہو جائے
گا اور ایک گروہ فضل خدا حاصل کرنے (اور روزی کمانے کے لیے) سفر پر جائے گا اور ایک گروہ راہِ خدا میں
جہاد کرے گا۔ پس جتنی مقدار تمہارے لیے ممکن ہو، اس کی تلاوت کرو اور نماز قائم کرو اور زکات ادا کرو،
اور خدا کو قرضِ حسنہ دو (اس کی راہ میں خرچ کرو) اور (یہ جان لو) کہ جو کارِ خیر تم اپنے لیے آگے بھیجتے ہو، تم
اس کا خدا کے ہاں بہترین صورت میں عظیم ترین اجر پاؤ گے اور خدا سے طلبِ مغفرت کرو کہ خیر و غفور و رحیم

تفسیر جتنا تمھارے لیے ممکن ہے اتنا قرآن پڑھو

یہ آیت جو اس سورہ کی طویل ترین آیت ہے بہت سے ایسے مسائل پر مشتمل ہے جو گذشتہ آیات کے مضامین کی تکمیل کرتے ہیں۔ اس بارے میں کہ یہ آیت اس سورہ کی ابتدائی آیات کے احکام کی ناسخ ہے، یا یہ ان کی توضیح و تفسیر ہے، اور اسی طرح یہ کہ یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی ہے یا مدینہ میں مفسرین کے درمیان شدید اختلاف ہے۔ ان سوالات کا جواب آیت کی تفسیر کے بعد واضح ہو جاتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: ”تیرا پروردگار جانتا ہے کہ تو اور ان لوگوں میں سے ایک گروہ جو تیرے ساتھ ہیں، تقریباً رات کی دو تہائی یا آدھی رات یا اس کی ایک تہائی قیام کرتا ہے۔ خدا اس سے آگاہ کیوں نہ ہوگا، جبکہ رات اور دن کا اندازہ دہی کرتا ہے۔ (ان ربك يعلم انك تقوم ادنى من ثلثي الليل ونصفه وثلثه وطائفة من الذين معك والله يقدر الليل والنهار)۔“

یہ اسی حکم کی طرف اشارہ ہے، جو سورہ کے آغاز میں پیغمبر کو دیا گیا ہے صرف ایک چیز جس کا یہاں اضافہ کیا گیا ہے یہ ہے کہ اس عبادت شبانہ میں مومنین کا ایک گروہ بھی پیغمبر کے ہمراہ ہونا تھا (ایک استجابی حکم کے عنوان سے یا احتمالاً ایک وجوبی حکم کی بناء پر، کیونکہ آغاز اسلام کے حالات کا تقاضا ہی یہ تھا کہ وہ تلاوت قرآن کے ذریعہ، جو انواع و اقسام کے اعتقادی، عملی اور اخلاقی درسوں پر مشتمل ہے، اور اسی طرح عبادت شبانہ کے ذریعہ اپنی تربیت اور اصلاح کریں، اور اسلام کی تبلیغ اور اس کے دفاع کے لیے خود کو آمادہ اور تیار کریں) لیکن جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے، بہت سے مسلمان ایک تہائی، آدھی رات اور دو تہائی رات کا حساب رکھنے میں مشکل اور دوسری میں گرفتار ہو جاتے ہیں (کیونکہ اس زمانے میں وقت کی مقدار اور اندازہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا) اور اسی بناء پر وہ مجبوراً احتیاط سے کام لیتے تھے اور اس وجہ سے کبھی تو وہ ساری رات بیدار رہتے تھے اور عبادت میں مشغول رہتے تھے، یہاں تک کہ ان کے پاؤں عبادت شبانہ کے قیام میں درم کر جاتے ہیں۔

لہذا خدا نے ان پر اس حکم میں تخفیف کر دی اور فرمایا: وہ جانتا ہے کہ تم مذکورہ مقدار کا پورے طور پر اندازہ نہیں لگا سکتے، اس بناء پر اس نے تمہیں بخش دیا ہے۔ لہذا قرآن میں سے جتنی مقدار تمھارے لیے میسر اور آسان ہوتی تلاوت کرو“ (علم ان لن تحصوه فتاب عليكم فاقربوا ما تيسر من القرآن)۔

اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ ”نصفه“ اور ”ثلثه“ کا معنی ”ادنی“ پر ہے نہ کہ ”ثلثی اللیل“ پر اس بناء پر اس جملہ کا مفہوم یہ ہے تقریباً رات کی دو تہائی یا ٹھیک آدھی رات کی مقدار یا ایک تہائی رات، ضمنی طور پر توجہ کرنی چاہیے کہ لفظ ”ادنی“ عام طور پر نزدیک مکان کے لیے بولا جاتا ہے، لیکن یہاں قریبی زمانہ کی طرف اشارہ ہے۔

”لن تحصوه“ ”احصاء“ کے مادہ سے شمار کرنے کے معنی میں ہے، یعنی تم پورے طور پر دقت کے ساتھ رات کا وقت دو تہائی، آدھی رات اور ایک تہائی کی مقدار کے لحاظ سے تعین نہیں کر سکتے اور زحمت میں پڑ جاتے ہو۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم اس کام پر سال کے سارے دنوں میں مداومت نہیں کر سکتے۔ یہاں تک کہ موجودہ زمانہ میں بھی جب کہ کئی وسائل کے ذریعہ موقع پر نیند سے بیدار ہو سکتے ہیں۔ سارے سال میں ان مقداروں کی دقت کے ساتھ تعین خصوصاً رات اور دن میں مسلسل فرق پڑتے رہنے کے ساتھ کوئی آسان کام نہیں ہے۔

”تاب علیکم“ کے جملہ کو اکثر مفسرین نے ”اس تکلیف اور ذمہ داری کی تخفیف“ کے معنی میں بیان کیا ہے، نہ کہ ”گناہ سے توبہ“ کے معنی میں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ جب وجوب کا حکم اٹھ جائے تو پھر کوئی گناہ نہیں ہوتا اور نتیجہ میں خدا کی بخشش کے مانند ہوگا۔ اس بارے میں کہ ”فاقر و ما تیسر من القرآن“ جو کچھ قرآن میں سے تمہارے لیے میسر ہو چکا ہے، اس کا بہت زیادہ انکشاف ہے۔ ایک جماعت نے اس کی نماز تہجد سے تفسیر کی ہے، کیونکہ اس میں حتی طور پر قرآنی آیات پڑھی جاتی ہیں اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد وہی تلاوت قرآن ہے، چاہے وہ نماز کے اندر نہ ہو، اس کے بعد بعض نے اس کی مقدار پچاس آیات بعض نے سو آیات اور بعض نے دو سو آیات کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ لیکن ان میں سے کسی بھی تعداد کے لیے کوئی خاص دلیل موجود نہیں ہے۔ بلکہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ سختی مقدار سے انسان زحمت و تکلیف میں نہ پڑے اس قدر قرآن پڑھے۔

یہ بات واضح ہے کہ ”تلاوت قرآن“ سے مراد یہاں وہ تلاوت ہے، جو درس و خود سازی اور ایمان و تقویٰ کی پرورش میں تعلیم کے عنوان سے ہو۔

اس کے بعد اس تخفیف کے لیے ایک اور دلیل کے بیان کو پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: ”خدا جانتا ہے کہ تم میں سے ایک گروہ بیمار بھی ہوں گے اور دوسرا گروہ تحصیل معاش اور خدا کے فضل کی تلاش میں سفر کی راہ اختیار کرے گا اور تیسرا گروہ راہ خدا میں جہاد کرے گا۔ یہ امور اس چیز سے مانع ہوں گے کہ رات کی عبادت کو اس حساب اور نصاب سے جو پہلے معین ہوا ہے، ہمیشہ کے لیے انجام دیتے رہیں“ (رِ عِلْمِ اَنْ سِيَكُونُ مِنْكُمْ مَرْضًى وَاٰخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُونَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاٰخَرُونَ يِقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ)۔

اور یہی چیز اس پروگرام میں تخفیف کا ایک سبب ہے لہذا دوبارہ تکرار کرتا ہے: ”اب جبکہ ایسا ہے تو جس قدر تمہارے لیے ممکن ہے اور جتنی تم میں طاقت ہے بس اتنا رات کو قرآن کی تلاوت کرو“ (فاقر و ما تیسر منہ)۔

یہ بات واضح ہے کہ بیماری اور ضروری سفروں اور اللہ کی راہ میں جہاد کا ذکر، نمایاں عذروں کی تین مثالوں میں سے ہے۔ لیکن انہیں تک منحصر نہیں ہے۔ مراد یہ ہے کہ چونکہ خدا جانتا ہے کہ تم دن میں زندگی کے مختلف مشکلات میں گرفتار ہو گے اور یہ چیز اس سنگین پروگرام کو ڈالنی رکھنے میں مانع ہے۔ لہذا اس نے تمہارے لیے اس میں تخفیف کر دی ہے۔

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا یہ حکم، اس چیز کو، جو سورہ کے آغاز میں آئی ہے، منسوخ کرتا ہے؟ یا اس کے لیے استثنائی صورت میں ہے؟ آیات کا ظاہر حکم سابق کے نسخ کو بتاتا ہے۔ حقیقت میں یہ بات ضروری تھی کہ یہ پروگرام ایک مدت تک جاری رہے، اور وہ

جاری رہا، اور اس حکم کا مقصد جو ایک موقت اور فوق العادہ پہلو رکھتا تھا وہ حاصل ہو گیا اور اس مدت کے ختم ہونے کے بعد تہجد کی صورت میں باقی رہ گیا، کیونکہ آیت کا ظاہر یہ ہے۔ ہے کہ معذور افراد کے موجود ہونے کی وجہ سے، اس حکم کی سب کے لیے تخفیف ہو گئی، نہ کہ معذور لوگوں کے لیے، اس طرح سے یہ استثنا نہیں ہو سکتی، بلکہ اسے نسخ ہونا چاہیے (غور کیجیے)

یہاں ایک اور سوال سامنے آتا ہے کہ: کیا قرآن میں سے ممکن مقدار کی تبادلت، جس کا اس آیت میں دو مرتبہ امر ہوا ہے، واجب ہے، یا مستحب ہے؟

بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ یقینی طور پر مستحب ہے اور بعض نے وجوب کا احتمال دیا ہے، کیونکہ قرآن کی تبادلت، توحید کے دلائل، اور اس رسل اور اس آسمانی کتاب کے اعجاز سے آگاہی اور باقی واجبات دین کی تعلیم حاصل کرنے کا سبب ہوتا ہے۔ اس بناء پر تبادلت قرآن مستحب واجب ہے لہذا یہ واجب ہو گیا۔

لیکن اس بات پر تو تجربہ رکھنی چاہیے کہ اس صورت میں ضروری نہیں ہے کہ قرآن کو رات کو ہی پڑھے، یا نماز تہجد کے درمیان پڑھے۔ بلکہ ہر کثرت (بالغ و عاقل) پر واجب ہے کہ بمقدار لازم، تعلیم و تربیت اور اصول و فروع اسلام سے آگاہی کے لیے، اور اسی طرح قرآن کو محفوظ رکھنے اور اسے آنے والی نسوں تک پہنچانے کے لیے، تبادلت کرے، بغیر اس کے کہ کوئی خاص وقت اور زمانہ اس میں پیش نظر ہو۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ "فاقرعوا"..... کے جملہ میں ظاہر امر واجب ہے (جیسا کہ اصول فقہ میں بیان ہوا ہے)۔ مگر یہ کہ یہ کہا جائے کہ یہ "امر" عدم وجوب پر فقہاء کے اجماع کی بناء پر ایک امر استجابی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ آغاز اسلام میں تو حالات و شرائط کی بناء پر یہ تبادلت اور شبانہ عبادت واجب تھی اور بعد میں مقدار کے لحاظ سے بھی اور حکم کے لحاظ سے بھی اس میں تخفیف کر دی گئی ہے اور اس نے ایک استجابی حکم کی صورت اختیار کر لی ہے اور وہ بھی اتنا جتنا کہ آسانی سے ہو سکے، لیکن بہر حال بغیر اسلام پر نماز تہجد کا وجوب آخر عمر تک ثابت رہا۔ (تمام آیات قرآن اور روایات کے قرینہ سے)۔

ایک روایت میں امام باقر سے آیا ہے:

"دو تہائی رات یا آدھی رات یا ایک تہائی رات سے مربوط حکم منسوخ ہو گیا ہے، اور اس کی جگہ
"فاقرعوا ما تیسر من القرآن" قرار پایا ہے"۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں تین قسم کے نذر بیان کیے گئے ہیں۔ جن میں سے ایک تو صہانی پہلو رکھتا ہے (بیاری) اور دوسرا مالی پہلو رکھتا ہے (معاش کے لیے مسافرت) اور تیسرا دینی جنبہ رکھتا ہے (راہ خدا میں جہاد) لہذا بعض نے یہ کہا ہے کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ معاش کی تلاش اور اس کے لیے کوشش کرنا، جہاد فی سبیل اللہ کے ہم ردیف ہے۔

اور اس جملہ کو اس بات کی بھی ایک دلیل سمجھا ہے کہ خاص یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ مکہ میں جہاد کا وجوب نہیں تھا، لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ وہ فرماتا ہے: سیکون (غنقریب ہو گا)۔ ممکن ہے یہ جہاد آئندہ زمانہ میں تشریح جہاد کی خبر ہو سکتی چونکہ کچھ مدت تو تم زمانہ حال میں رکھتے ہو اور کچھ اور مقرر آئندہ تمہارے لیے پیدا ہوں گے۔ اس لیے یہ حکم دائمی صورت میں نہیں آیا اور اس صورت میں

چند نکات

عقیدت کے ساتھ علمی آمادگی کی ضرورت

اہم اجتماعی کاموں کو انجام دینے کے لیے ——— خاص طور پر زندگی کے تمام حالات میں ایک وسیع و عریض انقلاب پیدا کرنے کے لیے ——— ہر چیز سے پہلے ایک انسانی پختہ اور مصمم طاقت کی ضرورت ہے، جو اس کام کے لیے، راسخ اعتقاد، کمال آگاہی، ضروری علمی و فکری تعلیمات اور اخلاقی تربیت کے ساتھ بنی ہو۔

اور یہ ایسا دینی کام تھا جسے پیغمبر اسلام نے، مکہ میں بعثت کے ابتدائی سالوں میں، بلکہ اپنی عمر کے سارے عرصہ میں انجام دیا اور اسی بنا پر، اور اسی حکم بنیاد کی وجہ سے، اسلام کے پورے نے سرعت کے ساتھ نشوونما پائی، کونپلین چھوٹیں اور شاخ و برگ نکالے۔

جو کچھ اس سورہ میں آیا ہے، وہ اس حساب شدہ اور پختے سے پروگرام کا ایک زندہ اور بہت ہی منہ بولتا نمونہ ہے، دو تہائی رات یا کم از کم ایک تہائی رات کے حکم عبادت نے ——— جو تلاوت اور قرآن مجید کی آیات میں غور و خوض کے ساتھ توام تھی ——— مسلمانوں کی روح میں عیب و غریب تاثیر پیدا کر دی اور انھیں "قول ثقیل" اور "سجل طویل" کو قبول کرنے کے لیے آمادہ کر دیا۔ یہ رات کی حرکات اور "تنباتہ ناشات" جو قرآنی تعبیر کے مطابق "اشد و طعنا" اور "اقومر قیلا" تھیں، آخر کار انھوں نے اپنا کام دکھایا اور محروم عوام اور مستضعف طبقات کا ایک چھوٹا سا گروہ اس طرح کا بن گیا کہ انھوں نے جہان کے ایک عظیم حصہ پر حکومت کرنے کی بیعت پیدا کر لی۔

اور آج بھی اگر ہم مسلمان چاہیں کہ اپنی دیرینہ عظمت و قدرت کو دوبارہ حاصل کر لیں تو وہ راستہ ہی راستہ ہے اور وہ پروگرام یہی پروگرام ہے ہمیں ہرگز یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ہم ایسے افراد کے ساتھ، جو فکر و نظر اور ایمان کے لحاظ سے ضعیف و ناتواں ہیں، ایسے افراد جنہوں نے ضروری علمی اور اخلاقی تربیت حاصل نہیں کی ہے، "یہودیوں" کے تسلط اور غلبہ کو اسلامی ممالک کے اندر سے باہر نکال بیٹھیں گے اور جھوٹی جنا پتکار سپر طاقتوں کے ہاتھ کو اسلامی ممالک تک نہیں پہنچے دیں گے۔ یہ ایک لمبی داستان ہے، لیکن آجنا کہ اس استیک حرف بن است

۲۔ غور و فکر کے ساتھ تلاوت قرآن

روایات اسلامی سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ تلاوت قرآن کی فضیلت زیادہ پڑھنے سے نہیں ہے بلکہ اچھی طرح سے پڑھنے اور اس میں سوچ بچار اور غور و فکر کرنے سے ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیت کے ذیل میں، جو یہ حکم دیتی ہے کہ قرآن میں سے جتنا تمہارے لیے میسر ہے، اتنا پڑھو "فاقرءوا ما تیسر متہ" ایک روایت امام علی بن موسیٰ رضا سے آئی ہے کہ آپ نے اپنے بڑا بچہ سے اس طرح نقل فرمایا ہے:

ما تیسر متہ لکم فیہ خشوع القلب و صقاء السر

"بس اتنا پڑھو جس میں خشوع قلب، صفائے باطن اور روحانی و معنوی نشاط حاصل ہو۔"

ایسا کیوں نہ ہو جبکہ تلاوت کا ہدف اور مقصد اصلی تعلیم و تربیت ہے۔

اور اس سلسلہ میں روایات بہت ہیں۔

۳۔ معاش کی تلاش جہاد کے ہم درلیف

اد پر والی آیت میں ————— جیسا کہ ہم نے دیکھ لیا ہے ————— زندگی بسر کرنے کے لیے تلاش معاش کو ”جہاد فی سبیل اللہ“ کے ساتھ قرار دیا ہے اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلام اس موضوع کے لیے بہت زیادہ اہمیت کا قائل ہے اور ایسا کیوں نہ ہو۔ حالانکہ ایک فقیر، مہوکی اور دوسروں کی محتاج قوم ہرگز استقلال، عظمت اور سر بلندی حاصل نہیں کر پائے گی اور اصولی طور پر ”جہاد اقتصادی“ دشمن کے ساتھ جہاد کا ایک حصہ ہے۔

اس سلسلہ میں مشہور صحابی عبداللہ بن مسعود کا ایک جملہ نقل ہوا ہے، وہ فرماتے ہیں:

ایما رجل جلب شیئا الی مدینة من مدائن المسلمین، صابرا محتسبا، فباعه بسعریومہ، کان عند اللہ بمنزلة الشهداء، ثم قرأ
”وآخرون یضربون فی الارض“۔۔۔۔۔

جو شخص کچھ مال مسلمانوں کے کسی شہر میں لے جائے اور اس راہ میں اپنی زچمتوں کو خدا کے لیے محسوب کرے اور پھر اس کو اس دن کی مادانہ قیمت میں فروخت کر دے تو ایسا شخص خدا کی بارگاہ میں شہیدوں کی منزلت رکھتا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے سورہ نزل کی آخری آیت کے اس جملہ کو شاہد کے عنوان سے تلاوت کیا ”وآخرون یضربون فی الارض“

خداوند! ہمیں تمام اہل جہاد و جہالت میں جہاد کرنے کی توفیق عطا فرما۔

بارالہا! ہم سب کو رات کے قیام، اور قرآن کریم کی تلاوت اور اس آسمانی کتاب کے نور کے سایہ میں اپنی اصلاح کی توفیق مرحمت فرما۔
پروردگارا! ہمارے اسلامی معاشرے کو اس مضامین سے پر، سورہ سے ہدایت حاصل کرنے کے ساتھ شائستہ مقام اور درجہ عظمت تک پہنچا!

آمین یا رب العالمین

اختتام سورہ مزل

اول ماہ صفر ۱۴۰۷ء، ۱۲/۷/۸۵

اختتام ترجمہ

بروز منگل بوقت تقریباً ساڑھے چار بجے سہ پہر ۵ صفر ۱۴۰۷ھ

مطابق ۲۹ ستمبر ۱۹۸۷ء - ۸۱ مای ماڈل ٹاؤن - لاہور

لے ”مجمع البیان“، ”تفسیر ابوالقاسم رازی“، ”تفسیر قرطبی“، ”تفسیر ابن کثیر“ کے ذیل میں، ضمنی طور پر ایک دوسری حدیث سے جو اس حدیث کے مشابہ ہے اور تفسیر قرطبی میں رسول کریم سے نقل ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن مسعود نے یہ بات اپنی طرف سے نہیں کہی تھی، بلکہ یہ پیغمبر سے لی تھی۔

سُورَةُ مَدَّيْنٍ

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی

اور

اس کی ۵۶ آیات ہیں

تاریخ شروع

۲ صفر ۱۴۰۷ ہجری

سورہ مذثر کے مضامین

اس میں شک نہیں کہ یہ سورہ ان سورتوں میں سے ہے جو مکہ میں نازل ہوئی ہیں، لیکن اختلاف اس مسئلہ میں ہے کہ کیا یہ وہ پہلی سورت ہے جو پیغمبر پر نازل ہوئی ہے یا یہ سورہ اقرآن کے بعد نازل ہوئی ہے۔

لیکن سورہ "اقرآن" اور "سورہ مذثر" کے مضامین میں غور و غرض کرنے سے اس بات کا پتہ چل جاتا ہے کہ "اقرآن" آغاز دعوت میں نازل ہوئی تھی، اور سورہ مذثر اس زمانہ کے ساتھ مربوط ہے جب پیغمبر شکار دعوت پر معمور ہوئے، اور پوشیدہ اور پنہاں دعوت کا دور ختم ہوا، لہذا بعض نے کہا ہے کہ سورہ "اقرآن" وہ پہلا سورہ ہے جو آغاز بعثت میں نازل ہوئی اور سورہ "مذثر" وہ پہلا سورہ ہے جو آشکارا دعوت کے بعد ہے اور یہ بات بہت اچھی نظر آتی ہے۔

بہر حال کئی سورتوں کا مزاج و طبیعت۔ جو مبداء و محاد کی دعوت اور شرک سے مبارزہ اور ظالمین کو عذاب الہی کا انذار اور تہدید ہے۔ اس سورہ میں مکمل طور سے منعکس ہے۔

اس سورہ کے مباحث مجموعی طور سے سات محوروں کے گرد گردش کرتے ہیں:

- ۱۔ پیغمبر کو قیام، انذار، آشکارا تبلیغ کی دعوت اور اس راہ میں صبر و استقامت اور اس کام کے لیے ضروری آمادگیوں کی تیاری۔
- ۲۔ قیامت کی طرف اشارہ، دوزخیوں کی صفات، وہی جو قرآن سے مقابلہ کے لیے کھڑے ہوئے اور جنہوں نے حق کا مذاق اڑایا۔
- ۳۔ کافروں کو ڈرانے کے ساتھ دوزخ کی خصوصیات کا ایک حصہ۔
- ۴۔ بار بار کی قسموں کے ذریعہ امر قیامت پر تاکید۔
- ۵۔ ہر انسان کی سرنوشت کا اس کے اعمال کے ساتھ ربط اور اس سلسلہ میں ہر قسم کے غیر منطقی انکار کی نفی۔
- ۶۔ جنتیوں اور دوزخیوں کی بعض خصوصیات اور ان میں سے ہر ایک کی سرنوشت۔
- ۷۔ جاہل، بے خبر، مغرور اور خود غرض لوگوں کے حق سے فرار کی کیفیت۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

پیغمبر گرامی اسلام سے ایک حدیث میں آیا ہے:

من قرأ سورة المذثر اعطى من الاجر عشر حسنات بعدد من صدق بمحمد
(ص) وکذب به بمکة

”جو شخص سورہ مدثر کو پڑھے گا، اسے ان لوگوں کی تعداد میں جنہوں نے مکہ میں پیغمبر اسلام کی تصدیق یا تکذیب کی تھی، دس نیکیاں دی جائیں گی۔“
ایک اور دوسری حدیث میں امام باقرؑ سے آیا ہے :

من قرأ فی الفریضۃ سورۃ المدثر کان حقاً علی اللہ ان یجعلہ مع محمد
(ص) فی درجتہ، ولایدرکہ فی حیاء الدنیا شقاء ابداً

”جو شخص سورہ مدثر کو واجب نماز میں پڑھے تو خدا پر حق ہے کہ اس کو پیغمبر کے ہمراہ ان کے جوار میں اور ان کے درجہ میں قرار دے اور دنیاوی زندگی میں بدبختی اور رنج و تکلیف اسے دامن گیر نہ ہو۔“

یہ بات واضح ہے کہ اس قسم کے نتائج صرف سورہ کے الفاظ پڑھنے پر مترتب نہیں ہوں گے بلکہ ضروری ہے کہ سورہ کے مضامین کو مد نظر رکھ کر پڑھا جائے۔ اس پر پوری طرح عمل کیا جائے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

- ۱۔ یٰۤاٰیہَا الْمُدَّثِّرُ ۝
- ۲۔ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝
- ۳۔ وَرَبِّكَ فَكَبِّرْ ۝
- ۴۔ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝
- ۵۔ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝
- ۶۔ وَلَا تَمُنْ تُسْتَكْثِرْ ۝
- ۷۔ وَرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝
- ۸۔ فَاِذَا تَقَرَّرَ فِي السَّاقُوطِ ۝
- ۹۔ فَاِنَّكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ۝
- ۱۰۔ عَلٰی الْكٰفِرِيْنَ غَيْرٍ يَسِيْرٌ ۝

ترجمہ

شروع اللہ رحمن ورحیم کے نام سے

- ۱۔ اے بسترِ خواب میں آرام کرنے والے
- ۲۔ اٹھ کھڑا ہو اور انداز کر (اور عالمین کو ڈرا)
- ۳۔ اور اپنے پروردگار کی بزرگی بیان کر
- ۴۔ اور اپنے لباس کو پاک کر

- ۵۔ اور پیدگیوں سے پرہیز کر۔
- ۶۔ اور کسی پر منت نہ رکھ اور زیادتی کا مطالبہ نہ کر۔
- ۷۔ اور اپنے پروردگار کے لیے صبر کر۔
- ۸۔ جس وقت صور پھونکا جائے گا۔
- ۹۔ وہ دن بہت ہی سخت دن ہوگا۔
- ۱۰۔ اور کافروں کے لیے آسان نہیں ہوگا۔

تفسیر

اٹھ اور عالمین کو ڈرا !

اس میں شک نہیں کہ ان آیات میں مخاطب خود پیغمبر کی ذات ہے۔ اگرچہ اس بات کی ان میں صراحت نہیں ہوئی ہے۔ لیکن ان آیات میں موجود قرآن اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔
 پہلے فرماتا ہے: "اے بے تر خواب میں آرام کرنے والے اور اے چادر اڑھ کر سونے والے" (یا ایہا المندثر)۔

"اٹھ کھڑا جو اور انذار کر اور عالمین کو ڈرا" (قر فائدہ)۔

کیونکہ سونے اور آرام کرنے کا وقت گزر گیا ہے اور قیام و تبلیغ کا زمانہ آ گیا ہے۔
 خصوصیت کے ساتھ انذار پر مکیہ، حالانکہ پیغمبر "بشیر" بھی ہیں اور "نذیر" بھی۔ اس بنا پر ہے، چونکہ "انذار" خصوصیت کے ساتھ کام کے آغاز میں، سوئی ہوئی ارواح کو بیدار کرنے میں، زیادہ سچی اور گہری تاثیر رکھتا ہے۔
 اس بارے میں کہ پیغمبر بستر میں کیوں آرام کر رہے تھے، کہ اس خطاب نے آپ کو قیام کی دعوت دی، مفسرین نے بہت سے احتمال دیئے ہیں۔

۱۔ مشرکین عرب موسم حج کے قریب جمع ہوئے اور ان کے سرداروں مثلاً ابو جہل، ابوسفیان، ولید بن مغیرہ، نضر بن حارث وغیرہ نے آپس میں مشورہ کیا کہ باہر سے مکہ میں آنے والے لوگوں کے سوالات کے مقابلہ میں، جنھوں نے ادھر ادھر سے پیغمبر اسلام کے ظہور کے سلسلہ میں مختلف مطالبے کیے ہیں کیا کہیں؟

اگر ہر ایک الگ الگ جواب دینا چاہے، ایک اے کاہن کے، دوسرا مجنون کے، تیسرا ساحر کے تو یہ اختلاف رائے اچھا اثر نہ چھوڑے گا۔ لہذا ضروری ہے کہ پیغمبر کے برخلاف پر دیگر لوگوں کی زبانیں متحد ہو کر کھڑے ہو جائیں۔ بحث و گفتگو کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ سب سے بہتر یہ ہے

کہ سب کے سب اسے ”ساحر“ کہیں، کیونکہ ”جادو“ کے واضح آثار میں سے ایک بیوی اور شوہر اور باپ اور بیٹے کے درمیان جبرائی ڈالت ہے اور پیغمبر نے دینِ اسلام کو پیش کر کے اس قسم کا کام انجام دیا ہے۔

یہ بات پیغمبر کے کان تک پہنچی تو آپ کو بہت دکھ ہوا اور بیماروں کی طرح ٹنگن حالت میں گھر میں آئے اور بستر میں لیٹ گئے، تو اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور آپ کو قیام اور بارزہ کی دعوت دی۔

۲۔ یہ آیات وہ پہلی آیات تھیں جو پیغمبر اکرم پر نازل ہوئیں، کیونکہ ”جابر بن عبد اللہ“ کے واسطے سے پیغمبر سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا: ”میں کوہِ حرا پر تھا کہ ایک آواز بلند ہوئی اور کہا، اے محمد! ”تو خدا کا رسول ہے“۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا تو مجھے کوئی چیز نظر نہ آئی، میں نے اپنے سر کے اوپر دیکھا، تو ایک فرشتے کو عرش پر آسمان وزمین کے درمیان دیکھا، میں ڈر گیا اور خدا بھ کی طرف لوٹ آیا، اور میں نے کہا: ”مجھ پر کپڑا ڈال دو، مجھ پر کپڑا ڈال دو اور ٹھنڈا پانی مجھ پر ڈالو“، یہ وہ منتر تھی کہ جبرئیل مجھ پر نازل ہوئے اور ”یا ایہا المدثر“ لائے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس سورہ کی آیات آشکارا دعوت کو بیان کر رہی ہیں، اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ یہ آیات کم از کم تین سال تک پوشیدہ طور سے دعوت کرنے کے بعد نازل ہوئی ہیں، اور یہ بات اس چیز سے جو اوپر والی روایت میں بیان کی گئی ہے سازگار نہیں ہے۔ مگر یہ کہ یہ کہا جائے کہ اس سورہ کی چند ابتدائی آیات آغاز دعوت میں نازل ہوئی تھیں اور بعد والی آیات چند سال کے بعد سے تعلق رکھتی ہیں۔

۳۔ پیغمبر سوئے ہوئے تھے اور اوپر چادر لی ہوئی تھی کہ جبرئیل نازل ہوئے اور آپ کو بیدار کیا اور یہ آیات آپ کے سامنے پڑھیں کہ اٹھ جائیے اور ستر اور زیندہ سے کنارہ کشی کیجیے اور رسالت اور پیغامِ الہی کو انجام دیجیے۔

۴۔ کپڑا اڑھنے سے مراد ظاہری کپڑا نہیں ہے، بلکہ لباسِ نبوت و رسالت ہے۔ جیسا کہ پرہیزگاری کو ”لباسِ التقویٰ“ کہا گیا ہے۔

۵۔ ”مدثر“ سے مراد ایسا شخص ہے جس نے گوشہٴ عزلت اختیار کر لیا ہو اور علیحدگی اور تنہائی میں زندگی بسر کرتا ہو، اس بناء پر آیت یہ کہتی ہے کہ عزلت اور گوشہ نشینی سے باہر نکل آؤ اور مخلوق کو انداز اور خدا کے بندوں کو ہدایت کرو۔ ان سب تفاسیر میں سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ”فاتحہ“ (انذار کرو) کا جملہ یہ بیان کرتا ہے کہ کس چیز سے ڈراؤ؟ اور کس موضوع میں انداز کرو؟ اور یہ حقیقت میں عمومیت کے بیان کے لیے ہے، یعنی بت پرستی، شرک و کفر، ظلم و بیداری اور فساد و عذابِ الہی اور حسابِ محشر وغیرہ کے بارے میں لوگوں کو خبردار کرو، (اور اصطلاح کے مطابق متعلقہ بات کا مخدوف ہونا، عمومیت پر دلالت کرتا ہے) ضمنی طور پر یہ عذاب دنیا کو بھی شامل ہے اور عذابِ آخرت کو بھی اور انسان کے اعمال کے بُرے نتائج کو بھی جو اسے دامن گیر ہوں گے۔

اور قیام و انداز کی دعوت کے بعد پیغمبر اسلام کو پانچ حکم دیتا ہے، جو دوسروں کے لیے ایک نمونہ ہیں، ان میں سے پہلا حکم توحید کے بارے میں ہے۔ فرماتا ہے: ”صرف اپنے پروردگار کو بڑا سمجھ“ (وسم تک)

فکتر (۱)

وہی خدا جو تیرا مالک و مربی ہے اور جو کچھ تیرے پاس ہے وہ اسی کی طرف سے ہے۔
 تو اس کے غیر کو بالکل بھول جا اور تمام جھوٹے معبودوں پر سرخ لکیر پھیر دے، اور ہر قسم کے شرک اور بت پرستی کے آثار کو محو کر دے۔
 لفظ ”رب“ پر تکیہ اور اس کو ”کبیر“ پر مقدم رکھنا انحصار کی دلیل ہے، اس مختصر سی عبارت میں مسئلہ توحید کو دلیل کے ذکر کے ساتھ
 پیش کرتا ہے، قرآن کی تعبیریں کتنی عمدہ اور مضامین سے پُر ہیں کہ ایک مختصر سی عبارت میں یہ سب معنی بیان ہو گئے ہیں۔
 ”فکتر“ کے جملے سے مراد صرف ”اللہ اکبر“ کہنا نہیں ہے۔ اگرچہ اللہ اکبر بھی کہنا اس کا ایک معنی ہے، جس کی طرف
 روایات میں بھی اشارہ ہوا ہے۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے خدا کو اعتقاد کے لحاظ سے بھی، عمل کے لحاظ سے بھی اور گفتگو میں بھی بڑا سمجھو،
 اور اس کو اوصافِ جمال کے ساتھ متصف اور ہر قسم کے نقص و عیب سے منزہ جان، بلکہ اس کو اس سے بڑھ کر سمجھو کہ اس کی تعریف و توصیف ہو سکے جیسا کہ
 روایات الہیہ میں آیا ہے کہ ”اللہ اکبر“ کا معنی یہ ہے کہ خدا اس سے بڑھ کر اس کی توصیف ہو سکے، اور وہ فکر انسانی میں سما سکے، اس بنا پر
 ”تکبیر“، ”تسبیح“ کی نسبت زیادہ وسیع مفہوم رکھتی ہے جو صرف ہر قسم کے نقص و عیب سے تنزیہ کو شامل ہوتی ہے۔
 مسئلہ توحید کے بعد دوسرا حکم آلودگیوں سے پاکیزگی کے بارے میں دیتے ہوئے مزید کہتا ہے، ”اور اپنے لباس کو پاک کر۔“

(و ثيابك فطهر)۔

”لباس“ کی تعبیر ممکن ہے انسان کے عمل سے کہنا یہ ہو، کیونکہ ہر شخص کے اعمال، اس کے بمنزلہ لباس ہیں، اور اس کا ظاہر اس کے

باطن کو بیان کرتا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں لباس سے مراد دل، روح اور جان ہے، یعنی اپنے دل کو ہر قسم کی آلودگی سے پاک کر، جہاں لباس کو پاک ہونا

چاہیے، تو صاحبِ لباس اذیت رکھتا ہے کہ وہ پاک ہو۔

بعض نے اسی ظاہری لباس کے ساتھ اس کی تفسیر کی ہے۔ کیونکہ لباس کے ظاہر کی پاکیزگی کسی کی شخصیت کے اہم ترین ہونے اور انسان کی
 تربیت اور تمدنی و تمدن کی نشانی ہے۔ خصوصاً زمانہ جاہلیت میں بہت کم لوگ غلاظت سے اجتناب کرتے تھے اور بہت ہی گندے لباس رکھتے تھے
 خصوصاً معمول یہ تھا (جیسا کہ اس آخری زمانہ جاہلیت میں گرفتار شدہ افراد میں بھی یہی معمول ہے) کہ لباس کے دامن کو بہت بڑا کرتے ہیں، اس طرح کہ
 وہ زمین پر کھینچتا ہے اور آلودہ ہو جاتا ہے، اور یہ جو بعض روایات میں امام صادق سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا: آیت کا معنی یہ ہے کہ ثيابك
 فقصر (اپنے لباس کو چھوٹا کر) یہ بھی اسی معنی کو بیان کرتا ہے۔

بعض نے اس کی بیویوں کے ساتھ تفسیر کی ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے تم اپنی بیویوں کا لباس ہوا اور وہ بھی تمہارا لباس ہیں (کیونکہ تم ایک دوسرے
 کی آبرو کی حفاظت کرتے ہو اور ایک دوسرے کی زینت ہو)۔ (ہن لباس لکم و انتم لباس لهن) (لقرہ آیہ ۱۸۷)

۱۷ ”فکبیر“ میں ”فا“ بعض کے نظریہ کے مطابق زائدہ ہے اور تاکید کے لیے آیا ہے اور بعض کے نظریہ کے مطابق ”شرط“ کے معنی کا فائدہ حاصل کرنے کے لیے اور جملہ کا معنی

اس طرح ہے، چاہے جو واقعہ اور حادثہ پیش آئے، خدا کے بڑا ہونے کو نہ بھول جانا (بعد دلی آیات کے بارے میں بھی یہی گفتگو ہے)

ان معانی کے درمیان جمع کرنا بھی ممکن ہے۔
حقیقت میں آیت کا اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ ہے کہ رہبرانِ الہی کی باتیں اسی وقت نفوذ کر سکتی ہیں جبکہ ان کا دامن ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہو اور ان کا تقویٰ و پرہیزگاری ہر لحاظ سے مسلم ہو، اسی لیے قیام و انداز کے بعد پاکدامنی کا حکم دیتا ہے

تیسرے حکم میں فرماتا ہے: "ناپاکیوں سے اور ان چیزوں سے جو عذابِ الہی کا موجب ہیں پرہیز کرو" والرجز فاجر۔
رجز (پلیدیگی) کے مفہوم کی وسعت کے سبب اس کے لیے گونا گوں تفسیریں بیان کی گئی ہیں۔
کبھی اس کی بتوں کے ساتھ، کبھی ہر قسم کی مصیبت و نافرمانی کے ساتھ، کبھی قبیح و ناپسندیدہ اخلاق کے ساتھ، کبھی محبت دنیا کے ساتھ جو ہر گناہ اور خطا کا سرچشمہ ہے، کبھی عذابِ الہی کے ساتھ جو شرک و مصیبت کا نتیجہ ہے اور کبھی ہر اس چیز کے معنی میں جو انسان کو خدا سے غافل کر دیتی ہے، تفسیر کی ہے۔ نکتہ اصلی یہ ہے کہ "رجز" اصل میں اضطراب و تزلزل کے معنی میں ہے۔ اور اس کے بعد ہر قسم کے گناہ، شرک، بت پرستی، شیطانی دوسوں، اخلاقِ ذمیرہ اور عذابِ الہی کے لیے — جو انسان کے اضطراب کا سبب بنتے ہیں اور اس کو صحیح راستے سے منحرف کر دیتے ہیں، اطلاق ہونے لگا۔

حالا کہ بعض اس لفظ کا معنی "عذاب" کرتے ہیں۔ اور چونکہ شرک و گناہ، برے اخلاق اور دنیا کی محبت عذابِ الہی کو جلب کرتے ہیں، لہذا ان پر بھی "رجز" کا اطلاق ہونے لگا۔

یہ بات بھی یاد رکھنی ضروری ہے کہ قرآن مجید میں لفظ "رجز" (بروزن شرک) عام طور پر عذاب کے معنی میں آیا ہے۔ بعض یہ نظریہ بھی رکھتے ہیں کہ "رجز" اور "رجس" جو "پلیدیگی" کے معنی میں ہیں، دونوں مترادف اور ہم معنی ہیں۔
یہ تینوں معانی اگرچہ آپس میں مختلف ہیں، لیکن پھر بھی ایک دوسرے کے ساتھ قریبی ارتباط رکھتے ہیں۔ بہر حال آیت ایک جامع مفہوم رکھتی ہے جو ہر طرح کے انحراف، پلیدی اور قبیح عمل اور ہر اس کام کو جو دنیا و آخرت میں خدا کے غضب و غضب اور اس کے عذاب کا موجب ہو، شامل ہے۔
مسئلہ طور پر پیغمبر اسلامؐ نبوت سے پہلے بھی ان امور سے پرہیز کرتے تھے اور ان سے دوری رکھتے تھے اور آپ کی زندگی کی تاریخ بھی جس کے درست دشمن سب ہی معترف ہیں، اس پر گواہ ہیں، لیکن یہاں دعوتِ الٰہی کی راہ میں ایک اساسی اور بنیادی اصل کے عنوان سے بھی اور سب کے لیے ایک نمونہ اور اسوہ کے عنوان سے بھی، اس پر تکیہ ہوا ہے۔

۱ "مفردات" راجح
۲ "المیزان" و "فی ظلال القرآن" (زیر بحث آیت کے ذیل میں)
۳ سورۃ اعراف کی آیہ ۱۲۴، ۱۳۵ - اور سبکی آیہ ۵، اور جاثیہ کی آیہ ۱۱ اور بقرہ کی آیہ ۵۹، اور اعراف کی آیہ ۱۶۲، اور شکوت کی آیہ ۲۴ کی طرف رجوع کریں۔
۴ فخر رازی کی تفسیر میں یہ معنی ایک احتمال کی صورت میں بیان ہوا ہے۔ (جلد ۲ ص ۱۹۲)

چوتھے حکم میں فرماتا ہے: "احسان نہ جتلاؤ اور زیادتی کا مطالبہ نہ کرو" (ولا تمنن تستكثر)۔ اس بارے میں کہ احسان جتلانے اور زیادتی طلب کرنے سے نہی کن موارد میں ہے۔ یہاں پر آیت کا مفہوم پھر کلی اور وسیع ہے، اور خالق اور مخلوق پر ہر قسم کے احسان جتلانے کو شامل ہے، نہ تو پروردگار پر احسان جتلاؤ کہ تم اس کے لیے جہاد اور سعی و کوشش کرتے ہو، کیونکہ یہ تو اس نے تم پر احسان کیا ہے کہ یہ بلند مقام تمہیں عطا کیا ہے۔

اسی طرح اپنی عبادت، اطاعت اور نیک اعمال کو زیادہ شمار نہ کرو، بلکہ ہمیشہ اپنے آپ کو "کمی" اور "تقصیر" میں سمجھو اور عبادت کو اپنے لیے ایک قسم کی بہت بڑی توفیق شمار کرو۔

دوسرے لفظوں میں تمہیں اپنے قیام شب و انداز، توحید کی نشر و اشاعت، پروردگار کی عظمت کو بیان کرنے، کپڑوں کو پاک رکھنے اور ہر قسم کے گناہ سے پرہیز کرو، خدا پر احسان شمار نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی انہیں کوئی بڑا کام سمجھنا چاہیے بلکہ انہیں اپنے پروردگار کے گراں بہا مدد سے سمجھنا چاہیے اور ان کی وجہ سے خدا کا ممنون رہنا چاہیے، اس کے عشق و محبت میں اس طرح غرق رہنا چاہیے، کہ تم ان اہم کاموں کو بہت ہی ناچیز سمجھو۔

اور اگر تم مخلوق کی بھی کوئی خدمت کرتے ہو، چاہے وہ معنوی جہات میں ہو، جیسے تبلیغ و ہدایت، اور چاہے مادی جہات میں ہو مثلاً انفاق و بخشش، ان میں سے کسی چیز کو بھی احسان جتانے یا تلافی کی توقع سے اور وہ تلافی ہی زیادتی کے ساتھ توام نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ احسان جتلاؤ نیک اعمال کو باطل اور بے اثر کر دیتا ہے۔ (یا ایہا الذین امنوا لا تبطلوا صدقاتکم باليمن والاذی) (بقرہ — ۲۶۴)

"لا تمنن" "منت" کے مادہ سے، ایسے موارد میں ایسی گفتگو کے معنی میں ہے جو اس نعمت کی اہمیت کو بیان کرے جو انسان نے کسی دوسرے کو دی ہے اور یہاں سے اس کا رابطہ "استکثار" (زیادہ طلب کرنے) کے مسئلہ کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے، کیونکہ اگر انسان اپنی خدمت کو ناچیز اور حقیر سمجھے، تو پھر وہ کسی اجر کی توقع نہیں رکھتا، چہ جائیکہ وہ زیادتی کا مطالبہ کرے، اس طرح سے احسان جتلاؤ ہمیشہ "استکثار" کا سرچشمہ بنتا ہے اور یہ ایک ایسا عمل ہے جو نعمت کی قدر و قیمت کو کلی طور پر ختم کر دیتا ہے۔

اور یہ جو بعض روایات میں آیا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ: لا تعط تلتمس اکثر منها، تو کسی کو کوئی ایسی چیز نہ دے جس سے بیشتر کی توقع رکھتا ہو۔ حقیقت میں یہ آیت شریفیہ کے کلی مفہوم کی ایک شاخ کا بیان ہے۔ جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ امام صادق نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

لا تستكثر ما عملت من خیر لله
جونیک کام تم اللہ کے لیے انجام دیتے ہو اسے ہرگز زیادہ نہ سمجھنا۔ یہ بھی اس مفہوم کلی کی ایک شاخ ہی ہے۔

۱۰۔ تو جرح کیے کہ "تستكثر" یہاں حال ہے نہ ہی ہی کا جواب (کیونکہ مروج صورت میں آیا ہے) اس بنا پر آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا: "احسان نہ جتلاؤ ورنہ ایک تم زیادتی طلب کرتے ہو یا اپنے عمل کو بڑا اور زیادہ سمجھتے ہو۔"

بعد والی آیت میں اس سلسلہ کے آخری حکم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ”اور اپنے پروردگار کے لیے صبر و شکیبائی اختیار کر۔

(ولربك فاصبر)۔

ہمیں یہاں پر پھر ”صبر و استقامت اور شکیبائی کے ایک وسیع مفہوم کا سامنا ہے، جو ہر چیز کو شامل ہے۔ یعنی اس عظیم رسالت کی ادائیگی کی راہ میں صبر و شکیبائی کر، مشرکین اور جاہل دنادان دشمنوں کی تکلیف کے مقابلہ میں صابر رہ، فرمانِ خدا کی اطاعت کی عبودیت میں استقامت دکھا اور نفس سے جہاد اور دشمن کے ساتھ میدانِ جنگ کے جہاد میں صابر و شکیبارہ۔

مسئلہ طور پر صبر و استقامت تمام گزشتہ پروگراموں کے اجراء کی بنیاد اور ضامن ہے۔ اصولی طور پر تبلیغ و ہدایت کی راہ میں اہم ترین سرمایہ یہی صبر و استقامت ہے۔ لہذا قرآن مجید میں بار بار اس پر تکیہ ہوا اور اسی وجہ سے امیر المؤمنین علیؑ کے ارشاداتِ گرامی میں آیا ہے۔

الصبر من الایمان كالرأس من الجسد

”صبر و استقامت کی ایمان کے مقابلہ میں وہی حیثیت ہے جو سر کی بدن کے مقابلہ میں پہلے

اور اسی بناء پر انبیاء اور مردانِ خدا کا ایک اہم ترین پروگرام ہی صبر و استقامت کا پروگرام تھا۔ جسے زیادہ سخت اور سنگین حوادثِ الٰہی پر پڑتے جاتے تھے آٹا ہی ان کا صبر و استقامت بڑھتا جاتا تھا۔

ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلامؐ سے آیا ہے کہ آپ نے صابریں کے اجر کے سلسلہ میں فرمایا:

قال الله تعالى: اذا وجهت الى عبد من عبيدي مصيبة في بدنه

او ماله او ولده، ثم استقبل ذلك بصبر جميل استحيت منه

يوم القيامة ان انصب له ميزانا او النسر له ديوانا

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے: جس وقت میں اپنے بندوں میں سے کسی بندے کی طرف اس کے بدن یا مال یا اولاد کے

لیے مصیبت لانا ہوں اور وہ صبرِ جمیل کے ساتھ اس کا سامنا کرتا ہے تو مجھے شرم آتی ہے کہ میں اس کے لیے قیامت

کے دن اعمال تو لے کے لیے میزان نصب کروں یا میں اس کے نام عمل کو کھولوں۔

اس حکم کے بعد جو قیام و انداز کے سلسلہ میں گزشتہ آیات میں آیا ہے، زیر بحث آیات میں انذار کو ایک بہت ہی تاکید اور رسایان

کے ساتھ شروع کرتا ہے اور فرماتا ہے: ”جب صور میں پھونکا جائے گا“ (فاذا نقر في الناقور)۔

”وہ دن ایک بہت ہی سخت دن ہوگا“ (فذلك يوم عسير)۔

”وہ بہت ہی پرشقت دن ہوگا، جو کافروں کے لیے آسان نہیں ہوگا“ (حلی الکافرین عنبر یسیر)۔
 قابل توجہ بات یہ ہے کہ ”ناقصوم“ اصل میں مادہ ”نقر“ سے اس طرح دبانے کے معنی میں ہے، جس سے سوراخ ہو جاتا ہے اور ”منتقار“ بھی، جو پرندوں کی چوچ ہے، جس سے پرندے دبا کر سوراخ کرتے ہیں اسی معنی سے لی گئی ہے، اسی بنا پر پہلے کو، جس کی آواز گویا انسان کے کان میں سوراخ کرتی ہے اور دماغ میں اتر جاتی ہے ”ناقصوم“ کہا جاتا ہے۔
 قرآن کی آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی انتہا اور قیامت کی ابتداء میں دو مرتبہ صور پھونکا جائے گا یعنی دو صد سے زیادہ وقت تک ایگڑ اور ہار دینے والی صدائیں۔ جن میں سے پہلی موت کی صدا ہے اور دوسری بیداری اور حیات کی صدا ہوگی۔ پوری دنیا گھبرائے گی۔ جنہیں ”نقحہ صور اول“ اور ”نقحہ صور دوم“ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور زیر بحث آیت ”نقحہ دوم“ کی طرف اشارہ ہے جس سے قیامت برپا ہو جائے گی اور وہ کافروں پر سخت اور سنگین دن ہوگا۔
 ہم ”صور“ اور ”نقحہ صور“ کے بارے میں تفصیلی بحث سورۃ زمر کی آیت ۶۸ جلد ۱۱ میں کر چکے ہیں۔
 بہر حال اوپر والی آیات اس واقعیت کو بیان کرتی ہیں کہ قیامت کے نقحہ میں کافروں کی مشکلات یکے بعد دیگرے نمایاں ہوں گی، وہ بہت ہی دردناک دن ہوگا اور ایسا مصیبت بار اور طاقت فرما ہوگا کہ وہ طاقت ور ترین انسان کے بھی گھٹے ٹھکانے کا۔

- ۱۱۔ ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ۱
 ۱۲۔ وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا ۱
 ۱۳۔ وَبَنِينَ شُهُودًا ۱
 ۱۴۔ وَمَهْدتُّ لَهُ تَمْهِيدًا ۱
 ۱۵۔ ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ ۱
 ۱۶۔ كَلَّا إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا ۱
 ۱۷۔ سَأُرْهِقُهُ صَعُودًا ۱

ترجمہ

- ۱۱۔ مجھے اس شخص کے ساتھ جسے میں نے اکیلا پیدا کیا ہے چھوڑ دے۔
 ۱۲۔ وہی شخص جس کے لیے میں نے وسیع مال قرار دیا ہے۔
 ۱۳۔ اور ایسے بیٹے جو ہمیشہ اس کے پاس (اور اس کی خدمت میں) رہتے ہیں۔
 ۱۴۔ اور میں نے ہر لحاظ سے اس کے لیے زندگی کے وسائل فراہم کیے ہیں۔
 ۱۵۔ پھر بھی وہ یہی طمع رکھتا ہے کہ میں اس میں اور اضافہ کر دوں۔
 ۱۶۔ ہرگز ایسا نہیں ہوگا کیونکہ وہ ہماری آیات کے بارے میں دشمنی کرتا ہے۔
 ۱۷۔ عنقریب ہم اسے مجبور کر دیں گے کہ وہ زندگی کی چوٹی کے اوپر جاٹے، (پھر ہم اسے نیچے پھینک دیں گے)

مشانِ نزول

ان آیات کے لیے دو مشانِ نزول بیان کی گئی ہیں۔

۱۔ قریش "دارالندوہ" (مسجد الحرام کے قریب ایک مرکز تھا جس میں وہ اہم مسائل میں مشورہ کرنے کے لیے جمع ہوتے تھے) میں جمع ہوئے۔ "ولید" (ملک کا ایک مشہور اور جانا پہچانا شخص تھا، جس کی عقل اور سمجھ کے مشرکین قائل تھے اور اہم مسائل میں اس سے مشورہ لیا کرتے تھے)

نے ان کی طرف رخ کر کے کہا: تم بلند نسب اور عقل و خرد کے مالک ہو، اور عرب ہر طرف سے (خانہ کعبہ کی زیارت اور دوسرے لیے) تمہارے پاس آتے ہیں، اور وہ تم سے مختلف جواب سنتے ہیں، تم اپنی بات کو (متفق ہو کر) ایک کرو۔

پھر اس نے ان کی طرف رخ کر کے کہا: تم اس شخص کے بارے میں (پیغمبر اکرمؐ کی طرف اشارہ ہے) کیا کہتے ہو؟ انھوں نے ہم کہتے ہیں: وہ ”شاعر“ ہے۔ ولید نے مزہ چڑھا کر کہا: ہم نے شعر بہت سنے ہیں؛ لیکن اس کی باتیں شعر کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتے۔ اس نے کہا: ہم کہتے ہیں کہ وہ ”کابن“ ہے۔ اس نے کہا: جب تم اس کے پاس جاتے ہو تو وہ باتیں جو کابن (انجانی کی صورت میں) کہتے ہیں اس میں بھین نہیں ملتیں، انھوں نے کہا: ہم کہتے ہیں کہ وہ ”دیوانہ“ ہے۔ اس نے کہا جب تم اس کے پاس جاؤ گے تو تم اس میں جنون کا کوئی نشانہ نہیں پاؤ گے۔

انھوں نے کہا: ہم کہتے ہیں وہ ”ساحر“ ہے۔ اس نے کہا ساحر کس معنی میں؟ انھوں نے کہا: ایسا شخص جو دشمنوں اور دوستوں کے دشمنی پیدا کرتا ہے، وہ کہنے لگا: ہاں! وہ ”ساحر“ ہے، اور وہ ایسا کرتا ہے، (کیونکہ ان میں سے بعض مسلمان ہو جاتے ہیں اور اپنی راہوں سے الگ کر لیتے ہیں)۔

اس کے بعد ”دار الندوة“ سے باہر نکلے اور حالت ان کی یہ تھی کہ جو بھی ان میں سے پیغمبر اکرمؐ سے ملتا تھا تو کتا تھا؛ اے ساحر! اے ساحر!

یہ مطلب پیغمبرؐ پر بہت گراں گزرا تو خدا نے اس سورہ کی ابتدائی آیات اور اپر والی آیات (آیہ ۲۵ تک) نازل فرمائیں (اور پیغمبرؐ کی دلداری کی)۔

۲۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ جس وقت سورہ السجدہ (سورہ غافر) کی آیات نازل ہوئیں تو پیغمبرؐ مسجد الحرام میں (نماز میں) کھڑے تھے اور ”ولید بن مغیرہ“ حضرت کے قریب تھا اور آپ کی تلاوت کو سن رہا تھا، جب پیغمبرؐ نے اس بات کی طرف توجہ کی، تو آپ نے ان آیات کی تلاوت کو دہرایا۔

”ولید“ اپنی قوم ————— قبیلہ بنو مخزوم ————— کی مجلس میں آیا اور کہا، خدا کی قسم ابھی میں نے محمدؐ سے ایسا کلام سنا ہے جو نہ انسانوں کے کلام کے مشابہ ہے اور نہ جنوں کی باتوں کے۔

وان له لحوۃ وان علیہ لطلاۃ وان اعلاہ لمثمر، وان اسفلہ لمعقد

وانہ لیعلو وما یعلی

اس کی گفتگو میں ایک خاص شیرینی ہے اور اس میں ایک خاص زیبائی اور طراوت ہے، اس کی شاخیں پھولوں سے پُر ہیں اور اس کی جڑیں قوی اور طاقتور ہیں، وہ ایسا کلام ہے جو دوسرے ہر کلام سے برتر ہے، اور

کوئی کلام اس پر برتری حاصل نہیں کر سکتا۔

یہ کہہ کر وہ اپنے گھر کی طرف پلٹ گیا، قریش نے ایک دوسرے سے کہا: خدا کی قسم! وہ محمدؐ کے دین کا فریفتہ ہو گیا ہے، اور ہمارے دین سے نکل گیا ہے اور وہ تمام قریش کو مخرف کر دے گا، اور وہ ولید کو ”ریحانۃ قریش“ (قریش کا گل سرسبز) کہتے تھے۔

ہو جہل نے کہا: میں اس کام کا کوئی علاج کرتا ہوں وہ اٹھ کر چل پڑا، اور غلگین چہرے کے ساتھ ولید کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ ولید نے کہا: اے بھتیجے! تو کس لیے غلگین ہے؟ اس نے کہا: قریش اس سن و سال کے باوجود تجھ پر عیب لگاتے ہیں اور وہ یہ لگان کرتے ہیں کہ محمد کی بات کو زینت بخشی ہے۔ وہ ابو جہل کے ساتھ اٹھا اور اپنے قبیلہ کی مجلس میں آیا اور کہا: کیا تمھارا لگان یہ ہے کہ محمد دیوانہ ہے؟ کیا تم بھی جنون کے آثار اس میں دیکھتے ہیں؟ انھوں نے کہا: نہیں!

اس نے کہا: کیا تمھارا خیال یہ ہے کہ وہ کاہن ہے؟ کیا تم نے اس میں بھی کمانت کے آثار دیکھے ہیں؟ انھوں نے کہا: نہیں! کیا تم یہ رتے ہو کہ وہ شاعر ہے۔ کیا تم نے کبھی اسے شعر کہتے ہوئے دیکھا ہے؟۔ انھوں نے کہا: نہیں۔

اس نے کہا: پھر کیا تمھارا خیال یہ ہے کہ وہ جھوٹا ہے؟ کیا تم نے اسے ماضی میں کبھی جھوٹ بولتے ہوئے دیکھا ہے؟ انھوں نے کہا: نہیں! وہ دعوائے نبوت سے پہلے بھی ہمارے ہاں ہمیشہ ”صادق مین“ کے عنوان سے پہچانا جاتا تھا۔

اس مرحلہ پر قریش نے ”ولید“ سے کہا: تیرے نظریہ کے مطابق ہم اسے کیا کہیں؟ ولید سوچ میں پڑ گیا، نگاہ کی اور منہ چڑا کر بولا: وہ ایک جادوگر ہے، کیا تم نے دیکھا نہیں کہ وہ مرد اور عورت، اولاد اور دوستوں کے درمیان جدائی ڈال دیتا ہے؟ (ایک گروہ اس پر ایمان لاتا ہے اور اپنے خاندان سے جدا ہو جاتا ہے)۔

اس بناء پر وہ جادوگر ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے ایک عمدہ جادو ہے۔

تفسیر ولید: ایک حق ناشناس مغرور ثروت مند

گزشتہ آیات کے بعد، جن میں کافروں کو مجموعی طور پر ڈرایا گیا ہے۔ زیر بحث آیات، خصوصیت کے ساتھ ان کے بعض افراد پر، جو وہ موثر تھے، انگلی رکھتے ہوئے، اس پر گویا وناطق، رسا اور سرکوبی کرنے والی تعبیروں کے ساتھ، شدید ترین اندازوں کی بوچھاڑ کیا ہیں۔

پہلے کتاب ہے: مجھے اس کے ساتھ جسے میں نے اکیلے ہی پیدا کیا ہے، چھوڑ دے (ذہانی ومن خلقت وحیداً)۔ یہ آیت اور بعد والی آیات — جیسا کہ ہم نے شان نزول میں بیان کیا ہے — ولید بن مغیرہ مخزومی — جو قریش کے مشہور اہل میں سے تھا — کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

”وحیداً“ (ایکلا) کی تفسیر ممکن ہے خالق کی توصیف میں ہو یا مخلوق کی، پہلی صورت میں بھی دو احتمال ہیں: پہلا یہ کہ مجھے اس کے ساتھ پہلے سے کہ میں خود اس کو شدید سزا دوں، یا یہ کہ میں خود تمہا نے اسے پیدا کیا ہے، اور یہ سب نعمتیں اسے بخشی ہیں، لیکن اس نے

”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۲۸۶۔ اس شان نزول کو بہت سے مفسرین مثلاً ”قرطبی“ و ”مراغی“ و ”فخر رازی“ و ”فی ظلال القرآن“ اور البرزاق وغیرہ نے (کچھ اختلاف کے ساتھ) نقل کیا ہے۔

نمک حرامی کی ہے۔

اور دوسری صورت میں بھی دو احتمال ہیں: ممکن ہے کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ مال کے پیٹ میں بھی اور پیدائش کے بعد ذننا تھا، نہ اس کے پاس مال مخفانہ اولاد، اور یہ سب کچھ ہم نئے سے بعد میں بخشا ہے۔
یا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ”وحید“ (بے مثل و بے مثال)، (عربوں میں بے نظیر شخص) کا
اور وہ یہ کہا کرتا تھا:

انا الوحيد ابن الوحيد، لیس لی فی العرب نظیر، ولا لابی نظیر
”میں وحید عصر ہوں اور وحید عصر کا بیٹا ہوں، عرب میں نہ کوئی میرا مثل و نظیر ہے اور نہ ہی میرے
باپ کا“

اس مطلب کا استہزاء کے عنوان سے آہ میں تکرار ہوا ہے۔
لیکن ان چاروں تفسیروں میں سے پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ ”میں نے اس کیلئے بہت ہی زیادہ وسیع مال قرار دیا“ (وجعلت له ما لا معدوداً)۔
”ممدود“ اصل میں کھینچنے ہوئے کے معنی میں ہے، جو یہاں اس کے مال کی وسعت اور حجم کے بیان کے لیے آیا ہے،

مکان کے لحاظ سے کشش کے معنی میں ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس کے اموال اس قدر وسیع تھے کہ اس کے پاس مکہ اور طائف کے درمیان کے فاصلہ میں بہت سے اونٹن
اور زرعی زمینیں تھیں۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کے پاس اتنے باغات اور کھیت تھے کہ ان میں سے ایک کا غلہ ابھی ختم نہیں ہوتا تھا کہ دوسرا تیار
علاوہ انہیں وہ ایک لاکھ دینار طائفی کا مالک تھا، اور یہ تمام معانی لفظ ”ممدود“ میں جمع ہیں۔

اس کے بعد اس کی افرادی قوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: میں نے اس کے لیے ایسی اولاد قرار دی ہے جو ہمیشہ
پاس اور اس کی خدمت میں حاضر رہتی ہے۔ (و بنین شہوداً)۔

وہ ہمیشہ اس کی مدد اور خدمت کے لیے تیار رہتے ہیں اور ان کی موجودگی اس کے انس اور راحت کا سبب تھی اور وہ تنگی و معیشت کی
ہرگز مجبور نہیں تھے کہ ان میں سے کوئی بھی دور دراز کے علاقے کی طرف سفر کرے اور باپ کو دُوری، ہجر اور تنہائی کا رنج پہنچائیں۔ بعض روایات

سہ تفسیر ”غزازی“ و ”کشاف“ و ”مراغی“ اور ”قرطبی“ زیر بحث آیات کے ذیل ہیں، بعض روایات نے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ”وحید“
کے اور نظیر شرعی بیٹے کے معنی میں ہے، لیکن اس روایت میں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں ہے جس سے وہ اوپر والی آیت کی تفسیر میں سکے۔ علاوہ ان
سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ معنی اوپر والی آیت کے ساتھ مناسب نہیں ہے۔

کہ اس کے دس بیٹے تھے۔

اس کے بعد ان تمام نعمتوں کی طرف، جو اس نے اسے دے رکھی تھیں، کلی طور پر اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "میں نے اس کے لیے ہر لحاظ و مسائل زندگی فراہم کیے" (وصفہ ت لہ تمہیداً)۔
صرف مال اور آبرو مند بیٹے ہی، بلکہ وہ اجتماعی اور جہانی پہلوؤں سے بھی، ہر لحاظ سے نعمتوں میں غرق تھا۔
"تمہید" "مہد" کے مادہ سے اصل میں اس جگہ کے معنی میں ہے جسے چھوٹے بچے کے لیے تیار کرتے ہیں (گنوارہ اور اسی قسم کی کوئی چیز) اس کے بعد ہر قسم کے راحت و آرام، پیش رفت اور اجتماعی عمدہ مقام و حیثیت پر اس کا اطلاق ہونے لگا اور مجموعی طور پر اس کا ایک وسیع معنی ہے، جو زندگی کی انواع و اقسام کی نعمتوں، اور پیش رفت و موفقیت کے مسائل کو شامل ہے۔

لیکن وہ ان تمام نعمتوں کے بخشے والے کے آگے تسلیم ختم کرنے اور اس کے آستانہ پر پیشانی جھکانے کے بجائے کفرانِ نعمت کرنے اور زیادہ طلب کرنے لگا: "اور اس قدر مال اور نعمت رکھنے کے باوجود، پھر بھی یہ لالچ رکھتا ہے کہ ہم اس کی نعمتوں میں اضافہ کریں" (ثم یطمع ان انزید)۔
یہ بات "ولید بن مغیرہ" میں ہی مختصر نہیں تھی، بلکہ تمام دنیا پرست ایسے ہی ہوتے ہیں، ان کی پیاس بزرگ نہیں بھتی اور اگر سہفت اقلیم بھی ان کے زیرِ نگین دے دی جائیں تو وہ پھر بھی ایک اور اقلیم کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

لیکن بعد والی آیت پوری شدت کے ساتھ اس نامحرم کی خواہشات کو رد کرتے ہوئے کہتی ہے: "ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ ہم اس کی نعمت میں اور اضافہ کریں، کیونکہ وہ ہماری آیات سے دشمنی رکھتا ہے" (کلّا انہ کان لایاتنا عنیداً)۔
اور باوجود اس کے کہ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ یہ قرآن نہ تو جن کا کلام ہے اور نہ ہی یہ بشر کا کلام ہے، اور یہ طاقتور جڑی، پرثمر شاخیں اور بے مثال شش رکھتا ہے۔ پھر بھی وہ اس کو "سحر" کا نام دیتا تھا اور اس کے لانے والے کو ساحر کہتا تھا۔
"عنید" "عنناد" کے مادہ سے، بعض کے قول کے مطابق اس قسم کی مخالفت اور دشمنی کے لیے بولا جاتا ہے، جو جانتے بوجھتے صورت پذیر ہو، یعنی انسان کسی چیز کی حقانیت کو رد کرے، اور پھر اس کی مخالفت کے لیے کھڑا ہو جائے اور "ولید" اس معنی کا روشن مصداق تھا۔
"کان" کی تعبیر بتاتی ہے کہ اس کا حق کے ساتھ عناد ایک امر مستبر اور ہمیشگی کا تھا، ٹوٹنے والا اور جلدی گزر جانے والا نہیں تھا۔

آخر میں آخری زیر بحث آیت میں اس کی دردناک سرفروخت کی طرف مختصر اور پر معنی عبارت کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ہم عنقریب اسے مجبور کریں گے کہ وہ زندگی کی "صعب العبور" (جس سے گزرنا مشکل ہے) چوٹی سے اوپر جائے" (اور پھر ہم اس چوٹی کی بلندی سے اسے نیچے پھینک دیں)۔ (سارہقہ صعوداً)۔

”سارہقہ“ ”اسہاق“ کے مادہ سے، اصل میں کسی چیز کو سختی کے ساتھ ڈھانپ لینے کے معنی میں ہے اور سختی کے برعکس کرنے اور انواع و اقسام کے عذاب میں مبتلا کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

”صعود“ (بروزن کبود) اس جگہ کے معنی میں ہے جس سے اوپر جاتے ہیں اور ”صعود“ (بروزن قعود) اور پر جانے کے معنی میں ہے۔

اور چونکہ بند چوٹیوں سے اوپر جانا بہت ہی مشکل کام ہے، اس لیے یہ تمیز ہر مشکل اور زحمت والے کام کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ یعنی بعض نے اس کی عذابِ الہی کے ساتھ تفسیر کی ہے اور بعض نے یہ کہا ہے کہ ”صعود“ جہنم میں آگ کا ایک پہاڑ ہے، اسے عبور کیا جائے کہ وہ اس کے اوپر چڑھے، یا یہ ایک ایسا پہاڑ ہے جسے عبور کرنا سخت مشکل ہے، جس کی دھلان تیز اور زیادہ ہے، جب وہ اس کے اوپر جائے گا جائے گا اور پیچھے آڑھے گا اور اس بات کا بار بار تکرار ہوگا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ آیت اس جہان میں ”ولید“ کے دنیاوی عذاب کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ جیسا کہ تاریخ میں آیا ہے۔ وہ انفرادی و اجتماعی زندگی میں کامیابی کی چوٹی کی بندی پر پہنچنے کے بعد اس طرح گرا کہ آخر عمر تک مسلسل اپنے مال اور اولاد کو ماتھے سے دیتا رہا، کہ بے حد مجبور اور دلیالیہ ہو گیا۔

۱۸۔ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۙ

۱۹۔ فَقَتَلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۙ

۲۰۔ ثُمَّ قَتَلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۙ

۲۱۔ ثُمَّ نَظَرَ ۙ

۲۲۔ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۙ

۲۳۔ ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۙ

۲۴۔ فَقَالَ اِنَّ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ يُؤْتٰوْهُ ۙ

۲۵۔ اِنَّ هٰذَا اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۙ

ترجمہ

۱۸۔ اس نے (قرآن سے مبارزہ کرنے کے لیے) غور و فکر کی ، اور ایک مطلب تیار کر لیا ۔

۱۹۔ وہ ہلاک ہو جائے ، کس طرح (حق سے مبارزہ کرنے کے لیے) اس نے مطلب تیار کیا ۔

۲۰۔ پھر وہ مرے ، اس نے کس طرح سے مطلب (اور اپنے شیطانی منصوبہ) کو آمادہ کیا ۔

۲۱۔ پھر اس نے نگاہ ڈالی ۔

۲۲۔ پھر اس نے اپنا منہ چڑایا اور جلدی سے کام میں لگ گیا ۔

۲۳۔ پھر اس نے (حق کی طرف) پشت کی اور تکبر کیا ۔

۲۴۔ اور آخر کار اس نے کہا یہ (قرآن) گزشتہ لوگوں کے جادو کی طرح ، ایک پرشش اور پڑتا تاثیر جادو کے سوا

اور کچھ نہیں ہے ۔

۲۵۔ یہ انسان کے قول کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے ۔

تفسیر ہلاک ہو جائے وہ، اس نے کتابرا منصوبہ بنایا

ان آیات میں اس شخص کے بارے میں، جسے خدا نے فراوان مال و اولاد دی تھی اور وہ پیغمبر اسلام کی مخالفت کرنے لگا۔ یعنی "ولید بن مغیرہ" مخزومی کی۔ — مزید وضاحتیں آئی ہیں۔
فرماتا ہے: "اس نے سوچا کہ پیغمبر اور قرآن کو کس چیز کے ساتھ منہم کرے؟ اور اس نے ایک منصوبہ اپنے ذہن میں تیار کر لیا (آیات فکر و قدر)۔

واضح رہے کہ غور و فکر کرنا اپنی ذات سے ایک اچھا کام ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ حق کی راہ میں ہو۔ بعض اوقات اس کی ایک سالہ ایک سال کی عبادت، بلکہ عمر بھر کی عبادت کی فضیلت رکھتی ہے، کیونکہ وہی ایک لمحہ ہو سکتا ہے کہ انسان کی سرفروخت کو دگرگوں کر دے، لیکن اگر غور و فکر کو کفر و فساد اور شیطنت کی راہ میں استعمال کیا جائے تو وہ مذموم اور قبیح ہے اور ولید کی فکر اور سوچ اسی قسم کی تھی۔
"قدر" "تقدیر" کے مادہ سے، یہاں مطلب کو ذہن میں آمادہ کرنے اور اس قبیح منصوبہ کے اجراء کے لیے منہم ارادہ کرنے کے معنی میں ہے۔

پھر اس کی مذمت کے لیے مزید کہتا ہے: "وہ ہلاک ہو جائے" اس نے حق سے مبارزہ کرنے کے لیے کیسا منصوبہ بنایا ہے (فقتل کیف قدر)۔

اس کے بعد تا نیکہ کے عنوان سے مزید کہتا ہے: "پھر بھی وہ مارا جائے، اس نے حق سے مقابلہ کرنے کے لیے، کس قسم کا منصوبہ تیار کیا ہے" (ثم قتل کیف قدر)۔

اور یہ اسی چیز کی طرف اشارہ ہے جو شانِ نزول میں آئی ہے کہ وہ یہ چاہتا تھا کہ مشرکین کے افکار کو متحد کرے اور انہیں ایک ہی جہت دے، تاکہ ایک زبان ہو کر پیغمبر کے خلاف ایک ہی طرح کا پروپیگنڈا کریں اور جب انہوں نے یہ پیش نہاد کی کہ حضرت کو "شاعر" کا لقب دیں تو اس نے قبول نہ کیا،

اس کے بعد انہوں نے "کابن" کے عنوان کی پیش کش کی تو اس نے اس سے بھی موافقت نہ کی، پھر "مجنون" کے عنوان کو پیش کیا تو اس نے اسے بھی پسند نہ کیا۔ آخر میں انہوں نے یہ پیش کش کی کہ پیغمبر کو "ساحر" کہہ کر پکاریں تو اس نے ان کے ساتھ موافقت کی، کیونکہ اس کے خیال میں جادو کا اثر دو دوستوں کے درمیان جدائی ڈالنا اور دو مخالف افراد کے درمیان دوستی پیدا کرنا تھا اور یہ بات اسلام اور قرآن کے ظہور کے بعد پیدا ہو گئی تھی، اور چونکہ یہ نقشہ اور منصوبہ مطالعہ کرنے اور سوچ بچار کرنے کے بعد تیار کیا گیا تھا لہذا قرآن انہیں "مکر و قدر" کی تعبیر کے ساتھ جو بہت ہی مختصر اور پر معنی ہے، پیش کرتا ہے۔ اس طرح اگرچہ پیش نہاد دو سروں کی طرف سے ہوئی تھی، لیکن نور و فکر اور انتخاب "ولید" کی طرف

سے ہوا تھا۔

بہر حال یہ جلد — خصوصاً اس کے تکراروں کی طرف توجہ کرتے ہوئے — اس بات کی دلیل ہے کہ اسے اپنے شیطانی افکار و نظریات میں پوری مہارت تھی، اس طرح سے کہ اس کی فکر اور سوچ باعثِ تعجب ہے۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”اس نے دوبارہ نظر کی“ (شمر نظر)۔ اور اس نے اپنی ساختہ و پرداختہ فکر کی نئے سرے سے جانچ پڑتال کی، تاکہ اس کے ضروری استحکام و انجام اور مختلف پہلوؤں سے آگاہ و مطمئن ہو جائے۔

”پھر اس نے اپنا منہ چڑایا اور جلد بازی سے کام لیا“ (ثم عبس و بسر)۔
 ”پھر اس نے حق کی طرف سے پشت پھیری اور تکبر کیا“ (ثم ادبر واستکبر)۔

اور آخر کار اس نے کہا: ”یہ چیز ایک عمدہ اور پرکشش جادو کے سوا — جیسا کہ گزشتہ لوگوں سے نقل ہوا ہے — کچھ نہیں ہے“ (فقال ان هذا الا سحر بیوتر)۔

یہ صرف انسان کا قول ہے اور اس کا وحی ا انی کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے“ (ان هذا الا قول البشر)۔ اس طرح سے اس نے اپنی آخری بات، قرآن سے مبارزہ اور مقابلہ کرنے کے لیے، بار بار کے مطالعہ اور شیطانی سوچ کے بعد کہی، اور زائدِ جاہلیت و شرک کے اس متفکر دماغ نے اپنی پوری شیطنت خرچ کرنے کے باوجود اپنی اس بات سے قرآن کی حد سے زیادہ مدح و ثنا اور تعریف و تجنیہ کر ڈالی، حالانکہ وہ خود اس بات کو نہیں سمجھا، اس نے اس بات کی نشاندہی کی کہ قرآن ایسی کشش اور حد سے زیادہ قوتِ جاذبہ رکھتا ہے، جو ہر انسان کے دل کو مستحضر کرتا ہے اور اس کے قول کے مطابق اس میں ایسی سحرانگیز تاثیر ہے جو دلوں کو مسحور کر دیتی ہے اور چونکہ قرآن میں جادو گروں کے جادو سے کسی قسم کی مشابہت نہیں ہے، بلکہ وہ منطقی، موزوں اور سچے تلمے اقوال اور باتوں کا مجموعہ ہے، لہذا یہ بات خود اس چیز کی دلیل ہے کہ وہ انسان کا کلام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک آسمانی وحی ہے اور اس نے ماوراء طبعیت عالم اور خدا کے بے پایاں علم سے سرچشمہ حاصل کیا ہے جس میں پورے نظم و انجام اور استحکام کے ساتھ تمام خوبیاں اور زیبائیاں جمع ہیں۔

”عبس“ ”عبسوس“ (بروزن عبوس) کے مادہ سے، منہ چڑانے کے معنی میں ہے اور ”عبسوس“ (بروزن عبوس) اس شخص کے معنی میں ہے جو اس صفت کا حامل ہو۔

”بسر“ ”بسوس“ کے مادہ سے اور ”بسر“ (بروزن بسر) بعض اوقات تو کسی کام کے وقت آنے سے پہلے اس میں جلدی کرنے کے معنی میں آتا ہے اور کبھی منہ چڑانے اور چہرہ کو دگرگوں کرنے کے معنی میں ہے۔

زینب بنت آیت میں اگر دوسرا معنی مراد ہو تو یہ ”عبس“ کے جملہ سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور اگر یہ پہلے معنی میں ہو، تو یہ قرآن کے لیے ایک غلط عنوان چسپاں کرنے میں، لہذا گھبراہٹ اور سراسیمگی کے ساتھ جلد بازی سے تسمیم گیری کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

”یوشن“ کا جملہ ”اثر“ کے مادہ سے، اس روایت کے معنی میں ہے، جو گزشتہ لوگوں سے نقل ہوئی ہو، اور وہ آثارِ جوآن سے باقی گئے ہوں اور بعض نے اسے ”اثر“ کے مادہ سے، انتخاب کرنے، مقدم رکھنے اور ترجیح دینے کے معنی میں سمجھا ہے۔

پہلے معنی کے مطابق ”ولید“ کہتا ہے، یہ گزشتہ لوگوں سے نقل شدہ جادو کی مانند، ایک جادو ہے اور دوسرے معنی کے مطابق وہ یہ کہتا ہے یہ ایک ایسا جادو ہے جو اپنی صلاحیت اور کشش کی بناء پر دلوں میں اثر کرتا ہے، اور لوگ اس کو ہر چیز پر مقدم رکھتے ہیں۔

بہر حال یہ قرآن کے اعجاز کا ایک معنی اعتراف ہے، کیونکہ قرآن جادو گروں کے فارق العادہ کاموں کے ساتھ کوئی مشابہت نہیں رکھتا، یہ ایک ایسا سنجیدہ و محکم کلام ہے، جو معنویت سے پر ہے اور بے مثل و نظیر قوتِ جاذِبہ و نفوذ رکھتا ہے۔ اگر یہ ”ولید“ کے قول کے مطابق بشر کا کلام ہو گا، پھر دوسرے بھی اس کی مثل و نظیر لا سکتے تھے، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن نے بار بار مقابلہ کی دعوت دی ہے، لیکن اس کے ان سخت ترین دشمنوں میں سے — جو عربی زبان میں حد سے زیادہ مہارت رکھتے تھے — کوئی بھی اس جیسی چیز نہ لاسکے، بلکہ وہ اس سے کتر بھی نہ لاسکے اور کجترہ کا معنی یہ ہے۔

- ۲۶۔ سَاَصْلِيْهِ سَقْرًا
 ۲۷۔ وَمَا اَدْرَاكَ مَا سَقْرًا
 ۲۸۔ لَا تَبْقَىٰ وَلَا تَذَرُ
 ۲۹۔ لَوْ اَحَدًا لِلْبَشَرِ
 ۳۰۔ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشْرًا

ترجمہ

- ۲۶۔ (لیکن) ہم عنقریب اس کو جہنم میں داخل کریں گے۔
 ۲۷۔ اور تو نہیں جانتا کہ دوزخ کیا چیز ہے؟
 ۲۸۔ (وہ ایک ایسی آگ ہے جو) نہ کسی چیز کو باقی رہنے دیتی ہے اور نہ ہی کسی چیز کو چھوڑتی ہے۔
 ۲۹۔ وہ بدن کی جلد کو کلی طور پر دگرگوں کر دیتی ہے۔
 ۳۰۔ انیس (عذاب کے فرشتے) اس پر مقرر کیے گئے ہیں۔

تفسیر

اس کی سرنوشتِ شوم

گزشتہ آیات کو جاری رکھتے ہوئے، جو شرک کے بعض سرمنوں کی وضع و کیفیت، اور قرآن مجید اور پیغمبر اسلام کی رسالت کی نفی و انکار کی بات کرتی تھیں، ان آیات میں قیامت میں ان کے وحشت ناک عذاب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔
 فرماتا ہے: "ہم عنقریب اس کو جہنم میں داخل کریں گے، اور دوزخ کی آگ میں جلا دیں گے" (ساصلیہ سقرا)۔
 "سقرا" اصل میں "سقرا" (بروزن فقر) کے مادہ سے دگرگوں ہونے اور سورج کی گرمی کے اثر سے پگھل جانے کے معنی میں ہے۔
 اس کے بعد جہنم کے ناموں میں سے ایک نام کے عنوان سے انتخاب ہوا ہے اور بار بار قرآنی آیات میں آیا ہے اور اس نام کا انتخاب دوزخ کے ہونا عذابوں کی طرف اشارہ ہے، جو اہل دوزخ کو دامن گیر ہوں گے، اور بعض نے جہنم کے ہول انگیز طبقات و درجات میں سے ایک کا

نام سمجھا ہے۔

اس کے بعد عذابِ دوزخ کی عظمت و شدت کے بیان کے لیے کہتا ہے: "تو کیا جانتا ہے کہ سقر کیا ہے" (وما ادبر اذک ما سقر)۔ یعنی اس کا عذاب اس قدر شدید ہے جو دائرہ تصور سے باہر ہے اور کسی شخص کے فکر و خیال میں نہیں سماتا جیسا کہ جنت کی نعمتوں کی اہمیت و عظمت کسی کی فکر و خیال میں نہیں سماتیں۔

"وہ نہ کسی چیز کو باقی رہنے دیتی ہے اور نہ ہی کسی چیز کو چھوڑتی ہے" (لا تبقی ولا تذر)۔

یہ جملہ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ جہنم کی آگ، دنیا کی آگ کے برخلاف — جو کبھی بدن کے ایک حصہ پر اثر انداز ہوتی ہے اور دوسرا حصہ صحیح و سالم رہ جاتا ہے اور کبھی جسم پر اثر کرتی ہے، لیکن روح اس سے امان میں رہتی ہے — ایک ایسی گھیرنے والی آگ ہے جو انسان کے پورے وجود کو اپنے احاطہ میں لے لی گی اور کسی چیز کو نہیں چھوڑے گی۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دوزخیوں کو نہ تو مارے گی اور نہ ہی زندہ رہنے دے گی، بلکہ وہ ہمیشہ موت و حیات کے درمیان گرفتار رہیں گے، جیسا کہ سورۃ اعلیٰ کی آیہ ۱۲ میں آیا ہے "لا یموت فیہا ولا یحییٰ" "نہ وہ اس میں مرے گی اور نہ ہی وہ زندہ رہیں گے"۔

یابہ ہے کہ نہ تو جلد اور گوشت بدن پر رہنے دے گی اور نہ ہی ہڈیوں کو صحیح و سالم چھوڑے گی، اس بناء پر آیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کلی طور پر جلادے گی اور نابود کر دے گی، کیونکہ یہ معنی اس چیز سے، جو سورۃ نساء کی آیہ ۵۶ میں آئی ہے، سازگار نہیں ہے، جہاں فرماتا ہے: (کلما نضجت جلودہم یدلنا ہم جلوداً غیرہا لیزوقوا العذاب) جس وقت ان کے بدن کی جلدیں جل جائیں گی تو ہم ان پر دوسری جلدیں تبدیل کر دیں گے، تاکہ وہ خدا کے عذاب کا مزہ چکھیں۔

اس کے بعد قبر الہی کی اس جملانے والی آگ کی دوسری صفت کو بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ بدن کی جلد کو کامل طور پر بدل کر رکھ دے گی، جو بہت دور کے فاصلہ سے انسانوں کے لیے نمایاں ہوگی" (لواحۃ للبشر)۔
وہ چہرے کو اس طرح سے سیاہ اور تاریک بنا دے گی کہ وہ شبِ تاریک سے زیادہ سیاہ نظر آئے گا۔
"بشر" یہاں "بشرہ" کی جمع ہے، جو بدن کی ظاہری جلد کے معنی میں ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ انسانوں کے معنی میں ہو، "لواحۃ" "لوح" کے مادہ سے، کبھی تو ظاہر و آشکار ہونے کے معنی میں آتا ہے، اور کبھی تغیر دینے اور درگروں کرنے کے معنی میں۔

پہلے معنی کی بناء پر آیت کی تفسیر اس طرح ہوگی: دوزخ دور کے فاصلہ سے انسانوں کے لیے نمایاں ہوگی، جیسا کہ سورۃ نازعات کی آیہ ۲۶ میں آیا ہے، وبتنات الجحیم لمن یرامی "دوزخ دیکھنے والوں کے لیے ظاہر و آشکار ہوگی"۔

لہ "لواحۃ" بتلانے مزدوں کی خبر ہے اور تقدیر میں "ھی لواحۃ" ہے۔

اور دوسرے معنی کی بناء پر آیت کی تفسیر اس طرح ہے: "دوزخ بدن کی جلد کے رنگ کو کئی طور پر دیگر لوگوں کو دے گی۔"

اور آخری زیر بحث آیت میں فرماتا ہے: "انیس عذاب کے فرشتے جہنم پر مقرر کیے گئے ہیں (علیہا تسعة عشر)۔"

وہ فرشتے جو قطعی طور سے ترحم، شفقت اور مہربانی پر مامور نہیں ہیں، بلکہ سزا دینے، عذاب اور سختی پر مامور ہیں۔ اگرچہ اوپر والی آیت میں صرف انیس کے عدد کا ذکر ہوا ہے اور عذاب پر مامور ملائکہ کی تصریح نہیں ہوئی، لیکن بعد والی آیت سے اسی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تعداد عذاب پر مامور فرشتوں کی تعداد کی طرف اشارہ ہے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ فرشتوں کے انیس گروہوں کی طرف اشارہ ہے، نہ کہ انیس افراد کی طرف، اور "وما یعلم جنودہم سبک الاھو" (تیرے پروردگار کے لشکروں کو اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا) کا جملہ، جو بعد والی آیت میں آیا ہے، اس کو اس معنی پر قرینہ سمجھتے ہیں۔

لیکن مامورین عذاب الہی کے لیے اعداد میں سے صرف انیس کا عدد ہی کیوں انتخاب کیا گیا، کوئی بھی شخص دقت کے ساتھ ٹھیک ٹھیک نہیں جانتا، لیکن کچھ لوگوں نے یہ احتمال دیا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انیس کے عدد میں، اکائیوں میں سب سے بڑا عدد (نو کا عدد) اور دہائیوں میں سے سب سے چھوٹا عدد (دس کا عدد) جمع ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاقِ رذیلی کی جڑیں انیس ظاہری و باطنی اخلاق کی طرف لٹتی ہیں اور چونکہ اخلاقِ رذیلہ میں سے ہر ایک عذاب الہی کا ایک عامل ہے، اس لیے دوزخ کے انیس طبقے ہیں، جو ان کی تعداد کے مطابق ہیں اور ہر طبقہ پر ایک فرشتہ یا فرشتوں کا ایک گروہ عذاب پر مامور ہے۔

اصولی طور پر قیامت، بہشت و دوزخ اور ان کے جزئیات و خصوصیات سے مربوط مسائل ہم لوگوں کے لیے، جو محدود دنیا کے محیط میں اسیر ہیں، پورے طور پر واضح نہیں ہیں، جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ ان کے کلیات ہیں۔ اسی لیے روایات میں یہ آیا ہے کہ ان انیس فرشتوں میں سے ہر ایک بہت بڑی قدرت رکھتا ہے، جس کی وجہ سے وہ ایک بہت بڑے قبیلہ کو آسانی کے ساتھ جہنم میں پھینک سکتا ہے۔

اور یہاں سے ان لوگوں کے افکار کا ضعف و ناتوانی واضح ہو جاتا ہے، جو ابوجہل کی طرح سوچتے ہیں، اس نے جب یہ آیت سنی تو اس نے قبیلہ قریش سے بطور استہزاء کے یہ کہا کہ تمھاری مائیں تمھاری عزا میں بیٹھیں، کیا تم سنتے نہیں ہو کہ "ابن ابی کبشہ" (پہنچ کر تم کی طرف اشارہ ہے)۔

اس جملہ میں "علیہا" خبر مقدم ہے اور "تسعة عشر" مبتدأ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ لفظ جنی پر نکتہ ہے۔ اس لیے ظاہر میں اس پر رفع نہیں آسکتا اور اس کی وجہ نحو میں یہ بتائی ہے کہ وہ واو ماطفہ کے معنی کو معنی ہے۔

اس بارے میں کہ قریش قبیلہ کو اس عنوان سے کیوں پکارتے تھے، بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ قبیلہ "خزاعہ" کا ایک شخص "ابوکبشہ" نامی تھا جو زمانہ جاہلیت میں بزل کی عبادت سے دست بردار ہو گیا تھا اور چونکہ قبیلہ پرستی کے شدید مخالف تھے لہذا وہ آپ کو "ابوکبشہ" کے بیٹے کے نام سے پکارتے تھے اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ابوکبشہ قبیلہ کے ماہری اہل دین سے تھا لیکن ہر حال اس میں شک نہیں کہ ان کا مقلد اس نام کے انتخاب کرنے میں تخریص اٹھاتا تھا، کیونکہ عربی زبان میں "کبش" "میںڈ" کے معنی میں ہے۔ اگرچہ یہ نام مدح کے طور پر بھی آیا ہے اور لشکر کے بہادری اور کمانڈروں کو بھی کہتے ہیں۔

کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ دوزخ کے خازن انیس افراد ہیں، لیکن تم بہادروں کا ایک بہت بڑا گروہ ہو، کیا تم میں سے ہر دس آدمی بھی ان میں سے ایک کو مغلوب نہیں کر سکتا؟ ” ابوالاسدی جمعی ” (قریش میں سے ایک طاقتور شخص) نے کہا: میں ان میں سے سترہ کے لیے کافی ہوں، باقی کے دوزخ کا حساب چکالینا رسلہ

بیلیت دماغ کے لوگ یہ چاہتے تھے کہ اس تمسخر اور استہزاء کے ذریعہ، نور حق کا راستہ روک دیں، اور اپنے آپ کو حتمی اور یقینی نابودی سے نجات دیں۔

ایک نکتہ

انیس کا عدد، عذاب کے فرشتوں کا عدد ہے

اد پر والی آیات میں، جنہم کے خازنوں کی تعداد واضح طور پر انیس افراد یا انیس گروہ اور شکر تبتائی گئی ہے اور بعد والی آیات میں اسی مطلب پر تکریم ہوا ہے، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض منحرف فرقے اس عدد کے مقدس ہونے پر اصرار کرتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی کوشش یہ ہے کہ سال کے مہینوں کی تعداد اور مہینوں کے دنوں کی تعداد ————— تمام طبعی اور فلکی موازین کے برخلاف ————— اسی انیس کے محور پر منظم کریں، اور اپنے علمی احکام بھی اسی کے مطابق قرار دیں۔

اور اس سے بھی بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ ایک مؤلف جو شایانہ کے نظریات کے ساتھ ارتباط رکھتا ہے، ایک مہسانے والا، اور عجیب اصرار رکھتا ہے کہ وہ قرآن کی ہر چیز کی انیس کی بنیاد پر توجہ کرے، اور بہت سے ایسے موارد میں، جہاں یہ عدد اس کی دلی خواہش کے مطابق، آیات قرآنی میں موجود واقعاتوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ وہاں وہ اپنی مرضی سے کچھ کم اور کچھ زیادہ کرتا ہے تاکہ وہ انیس کے عدد یا انیس کے عدد کی ضرورتوں سے ہم آہنگ ہو جائے اور ان کے مطالب کو ذکر کرنے میں وقت صرف کرنا، یا ان کے جواب دینا شاید اہماتِ وقت میں محسوب ہوگا۔

ہاں! ایک ”دوزخی مذہب“ کو ”دوزخی عدد“ کے محور پر ہی گردش کرنا چاہیے اور ایک دوزخی گروہ کو عذاب کے فرشتوں کے عدد کے ساتھ ہی ہم آہنگ ہونا چاہیے۔

۳۱۔ وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِلَّذِينَ كَفَرُوا لِيَسْتَيَقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَيُزِدَادَ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا وَلَا يَرْتَابَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ وَلِيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْكَافِرُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا كَذَلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ وَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرَى لِلْبَشَرِ

ترجمہ

۲۱۔ ہم نے جہنم کے مامورین (عذاب کے) فرشتوں کے سوا اور کسی کو قرار نہیں دیا، اور ان کی تعداد بھی کافروں کی آزمائش کے علاوہ اور کسی بات کے لیے معین نہیں کی، تاکہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) یقین کر لیں اور مومنین کے ایمان میں اضافہ ہو اور اہل کتاب اور مومنین (اس آسمانی کتاب کی حقانیت میں) شک و تردد نہ کریں، وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور کافر یہ کہیں: خدا کا اس تعریف سے کیا مقصد ہے؟ ہاں! خدا جسے چاہتا ہے، اسی طرح سے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور تیرے پروردگار کے لشکروں کو اس کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا، اور یہ انسانوں کی تنبیہ اور تذکر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

تفسیر

دوزخ کے مامورین کی یہ تعداد کس لیے ہے؟

جیسا کہ گزشتہ آیات میں بیان ہو چکا ہے کہ خدا نے دوزخ کے خازنوں اور مامورین کی تعداد انیس افراد (یا انیس گروہ) بیان کی ہے، اور یہ بھی بیان ہوا ہے کہ اس عدد کا ذکر مشرکین اور کفار کے درمیان گفتگو کا سبب بنا، اور ایک گروہ نے اس کا مذاق اڑایا اور ان کی تعداد کے کم ہونے کو

اس بات کی دلیل خیال کیا کہ ان پر غلبہ حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

زیر بحث آیت جو اس سورہ کی طویل ترین آیت ہے انھیں جواب دیتی ہے، اور اس سلسلہ میں بہت سے حقائق کو واضح کرتی ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: "ہم نے جہنم کے مامورین (عذاب کے) فرشتوں کے سوا اور کسی کو قرار نہیں دیا" (وما جعلنا اصحاب النار الا ملائکة)۔

طاقت وراور قدرت والے فرشتے اور قرآن کی تعبیر میں، "غلاظ" و "شداد" بہت شدید اور سخت گیر، جن کے سامنے تمام گنہگار ضعیف و ناتواں ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ہم نے ان کی تعداد کا فزوں کی آزمائش کے سوا اور کسی بات کے لیے قرار نہیں دی ہے" (وما جعلنا عدتہم الا فتنة للذین کفروا)۔

یہ آزمائش دو لحاظ سے تھی، ایک تو یہ کہ وہ استہزاء اور تمسخر کرتے تھے کہ تمام اعداد میں سے انیس (۱۹) کا عدد ہی کیوں انتخاب کیا گیا، حالانکہ دوسرا جو بھی عدد انتخاب ہوتا، اسی میں یہ سوال پیدا ہوتا۔

اور دوسری طرف وہ اس تعداد کو بہت کم سمجھتے تھے، اور بطور تمسخر اور استہزاء کہتے تھے، کہ ہم ان میں سے ہر ایک کے مقابلہ کے لیے دس دس افراد کھڑے کر دیں گے اور انھیں درہم درہم کر کے رکھ دیں گے۔

حالانکہ خدا کے فرشتے ایسے ہیں کہ قرآن کے قول کے مطابق ان میں سے چند افراد ہی قوم لوط کی ہلاکت پر مامور ہوئے تھے، اور انھوں نے ان کے آباء و شہر و کوزنیں سے اٹھا کر زیر زبر کر دیا تھا اور اس سے قطع نظر، جہنم کے خازنوں کے لیے انیس کے عدد کا انتخاب، دوسرے معانی بھی رکھتا ہے، جو گزشتہ آیات کے ضمن میں بیان ہو چکے ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اس سے مقصد یہ تھا کہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) یقین پیدا کر لیں" (لیستیقن الذین اوتوا الکتاب)۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ یہودیوں کے ایک گروہ نے بعض اصحاب پیغمبرؐ سے خازن جہنم کی تعداد کے بارے میں سوال کیا تو اس نے کہا کہ خدا اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ اسی وقت جبرئیل نازل ہوئے اور پیغمبر کو خبر دی: "علیہا تسعة عشر" "انیس افراد (یا انیس گروہ) اس پر مقرر کیے گئے ہیں"۔

اور چونکہ انھوں نے اس موضوع پر کوئی اعتراض نہیں کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اسے اپنی کتب کے ساتھ ہم آہنگ پایا، اور پیغمبرؐ سلام کی نبوت پر ان کے یقین میں اضافہ ہوا، اور یہی چیز اس بات کا سبب بنی کہ مومنین بھی اپنے عقیدہ اور ایمان میں زیادہ راسخ ہو جائیں۔

۱۰ "اصحاب النار" کی تفسیر قرآن مجید کی آیات میں بہت زیادہ ذکر ہوئی ہے، اور ہر جگہ "ذخیر" کے معنی میں ہے۔ سوائے اس جگہ کے کہ یہاں "خازن" کے معنی میں ہے۔

صنعتی طور پر ان کے بارے میں اس تفسیر کا ذکر یہ بتاتا ہے کہ گزشتہ آیات میں "سفر" کا معنی سارا جہنم ہے، نہ کہ اس کا ایک حصہ۔

۱۱ اس حدیث کو "بیہقی"، "ابن ابی حاتم" اور "ابن مردیہ" نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے۔ (تفسیر مراغی، جلد ۲۹ ص ۱۲۳)

اس لیے بعد والے جملہ میں مزید کہتا ہے: "اس سے مقصد یہ تھا کہ مومنین کے ایمان میں اضافہ ہو جائے" (ويزداد الذين امنوا ايماثاً)۔

اور اس جملہ کے ذکر کے بعد بلافاصلہ انھی تین اہداف و مقاصد کی طرف، تاکید کے عنوان سے لوٹتا ہے اور نئے سرے سے اہل کتاب کے ایمان، اس کے بعد مومنین کے ایمان اور پھر کفار و مشرکین کی آزمائش پر تکیہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "اور مقصد یہ تھا اور اہل کتاب اور مومنین قرآن کی حقانیت میں شک اور تردید نہ کریں اور کافر اور وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں بیماری ہے یہ کہیں کہ خدا کا اس تعریف سے کیا ارادہ ہے اور اس کا کیا مقصد ہے؟ (ولا یرتاب الذین اوتوا الکتاب والمؤمنون و ليقول الذین فی قلوبہم مرض و الکافرون ما اذا اراد اللہ بھذا مثلاً)۔"

اس بارے میں کہ "الذین فی قلوبہم مرض" (وہ لوگ کہ جن کے دل میں بیماری ہے) سے کون لوگ مراد ہیں؟ ایک گروہ نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد "منافقین" ہیں، کیونکہ قرآنی آیات میں یہ تعبیر ان کے بارے میں آئی ہے، جیسا کہ سورۃ بقرہ کی آیت ۱۰ میں آیا ہے، جو قبل و بعد کی آیات کے قرینہ سے منافقین کے بارے میں گفتگو کرتی ہے: فی قلوبہم مرض فوادھم اللہ مرضاً؛ ان کے دلوں میں ایک قسم کی بیماری ہے اور خدا ان کی بیماری کو مزید بڑھاتا ہے اور اسی بات کو وہ آیت کے مدنی ہونے کی دلیل قرار دیتے ہیں کیونکہ گروہ منافقین اسلام کی قدرت کے موقع پر مدینہ میں پیدا ہوا تھا نہ کہ مکہ میں۔

لیکن آیات قرآنی میں اس تعبیر کے ذکر کا مطالبہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ تعبیر منافقین میں منحصر نہیں ہے، بلکہ یہ ان تمام کفار کے لیے جو حق تعالیٰ کی آیات کے بارے میں عناد، ہٹ دھرمی اور دشمنی رکھتے تھے، ————— اطلاق ہوئی ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات اس کا منافقین پر عطف ہوا ہے، جو ممکن ہے کہ ان کی دوگانگی اور الگ الگ ہونے پر دلیل ہو، مثلاً سورۃ انفال کی آیت ۲۹ میں آیا ہے۔

اذ یقول المنافقون والذین فی قلوبہم مرض سترھو لاء دینہم

"جس وقت منافقین اور ان لوگوں نے جن کے دلوں میں بیماری تھی یہ کہا کہ مسلمانوں کو ان کے دین نے

مغزور کر دیا ہے"

اور اسی طرح اور دوسری آیات۔

اس بنا پر اس آیت کے کئی ہونے کی نفی پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے، خصوصاً جبکہ یہ ما قبل کی آیات کے ساتھ مکمل ہم آہنگی اور ارتباط رکھتی ہے۔ جن میں کئی ہونے کی نشانیاں مکمل طور پر نمایاں ہیں۔ (غور کیجیے)

پھر ان باتوں کے بعد، جو مومنین اور بیمار دل کافروں کی ارشادات الہی سے فائدہ اٹھانے کی کیفیت کے بارے میں تھیں، مزید کہتا ہے اس طرح سے خدا جسے چاہتا ہے، گمراہ کر دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے، (کذالک یضلل اللہ من یشاء

۱۰ اس بات پر توجہ رہے کہ "لیستیقن" کا "لام" تو "لام علت" ہے اور "لیقول" میں "لام ناسبت" اور شاید اسی بناء پر تکرار ہوا ہے۔ حالانکہ اگر دونوں کا ایک ہی معنی ہوتا تو پھر تکرار کی ضرورت نہیں تھی اور دوسرے لفظوں میں مومنین میں یقین پیدا کرنا، خدا کی مشیت اور اس کا حکم تھا، لیکن کافروں کی کفر آمیز باتیں اس کی مشیت اور حکم نہیں ہیں، بلکہ وہ ان کے اس کام کا انجام اور نتیجہ تھیں۔

ویہدی من یشاء)۔

گزشتہ جملے، اس بات کی اچھی طرح سے نشاندہی کرتے ہیں کہ بعض کی ہدایت اور بعض دوسرے کی گمراہی کے بارے میں یہ مشیتِ ارادۃ الہی، بے حساب نہیں ہے، وہ لوگ جو معاند، بہت دھرم اور دل کے پیار ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی حق نہیں رکھتے، اور وہ لوگ جو خدا کے فرمان کے آگے تسلیمِ خم کرتے ہیں اور وہ مومن ہیں وہ اسی قسم کی ہدایت کے مستحق ہیں۔

امیت کے آخر میں فرماتا ہے: ”ہر حال تیرے پروردگار کے لشکر کو اس کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا، اور یہ چیز انسانوں کو تنبیہ کرنے اور تذکرے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے (و ما یعلم جنود ربک الا هو و ما ہی الا ذکرہی للبشر)۔

اس بنا پر اگر دوزخ کے انیس خازنین کا ذکر درمیان میں آیا ہے تو اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ خدا کے لشکر انھیں میں محدود ہیں، بلکہ پروردگار کے لشکر اس قدر زیادہ ہیں کہ بعض روایات کی تعبیر کے مطابق تمام زمین اور آسمانوں کو انھوں نے بھر رکھا ہے، یہاں تک کہ تمام عالمِ ہستی میں پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں ہے مگر یہ کہ وہاں خدا کا ایک فرشتہ تسبیح میں مشغول ہے۔

اس بارے میں کہ ”و ما ہی الا ذکرہی للبشر“ (اور یہ انسانوں کے لیے تذکرے کے علاوہ کچھ نہیں) کے جملہ میں ”ہی“ کی ضمیر کس چیز کی طرف لٹتی ہے، مفسرین نے مختلف احتمال دیئے ہیں۔

کبھی تو یہ کہا ہے کہ: یہ جنود اور خدا کے لشکروں کی طرف لٹتی ہے، جن میں سے ایک گروہ خازنینِ دوزخ ہیں۔

اور کبھی یہ کہا ہے کہ: ”سفر“ یعنی خود دوزخ کی طرف لٹتی ہے۔

اور کبھی یہ کہا ہے کہ: قرآن مجید کی آیات کی طرف اشارہ ہے۔

اگرچہ یہ سب چیزیں تذکر، بیداری اور آگاہی کا سبب ہیں، لیکن آیات کے لب و لہجہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے کیونکہ مقصد اس حقیقت کو بیان کرنا ہے کہ اگر خدا نے اپنے لیے لشکروں کا انتخاب کیا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ خود معاندین اور گنہگاروں کو کینفر کر داریاں نہیں پہنچا سکتا، اور عذاب نہیں دے سکتا، بلکہ یہ سب کچھ تذکر و بیداری اور عذابِ الہی کے مسئلہ کے حقیقت ہونے کی طرف توجہ کے لیے ہے۔

ایک نکتہ

پروردگار کے لشکروں کی تعداد

ہر جگہ خدا کا حضور اور اس کی قدرت کی وسعت، تمام عالمِ ہستی میں، اس کی پاک ذات کو ہر قسم کے یار و مددگار اور شکر سے بے نیاز کر دیتی ہے لیکن اس کے باوجود مخلوقات کو اپنی عظمت بنانے، اور ان کے تذکر اور یاد دہانی کے لیے اس نے فراوان لشکروں کا انتخاب کیا ہے، جو سارے عالم میں اس کے فرمان کو اجراء کرنے والے ہیں۔

اسلامی روایات میں پروردگار کے لشکروں کی کثرت و عظمت اور قدرت کے لیے عجیب و غریب تعبیریں وارد ہوئی ہیں، چونکہ وہ ان موازین کے ساتھ، جن سے ہم سروکار رکھتے ہیں سازگار نہیں ہیں، اسی لیے ان کا سننا ہمارے لیے بہت تعجب آور ہے۔

یہاں پر ہم علی کے اس عظمت والے کلام پر، جو اس سلسلہ میں نبی البلاغہ کے پہلے خطبہ میں نقل ہوا ہے، قناعت کرتے ہیں، اور چونکہ عبادت طولانی ہے، لہذا ہم اس کا صرف ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

اس وقت اوپر والے آسمانوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا، اور ان کو فرشتوں کی مختلف اصناف و اقسام سے پُر کر دیا۔ ان میں سے ایک گروہ ہمیشہ سجدہ میں رہتا ہے اور وہ رکوع میں نہیں جاتا۔

اور ایک گروہ ہمیشہ رکوع میں رہتا ہے اور وہ رکوع سے سر نہیں اٹھاتا۔

اور ایک گروہ ہمیشہ قیام میں رہتا ہے اور عبادت میں مشغول رہتا ہے اور وہ اپنی جگہ کو نہیں بدلتا۔

ایک گروہ ہمیشہ تسبیح کرتا ہے اور ٹھکتا نہیں۔

کبھی نیندان کی آنکھوں کو بند نہیں کرتی اور سہو و نسیان ان کی عقل پر غالب نہیں آتے۔

ان کے جسم سستی کی طرف مائل نہیں ہوتے اور غفلت اور فراموشی انھیں لاحق نہیں ہوتی۔

اور ایک دوسرا گروہ اس کی وحی کا امین ہے اور اس کے پیغمبروں کی طرف اس کی زبان ہے اور یہ گروہ اس کے فرمان اور امر کی تبلیغ کے

یہ سلسلہ آتا جاتا رہتا ہے۔

کچھ اور اس کے بندوں کے محافظ ہیں اور بہشت بریں کے دربان ہیں۔

ان میں سے بعض کے پاؤں زمین کے نچلے طبقات میں ثابت اور ان کی گردنیں آسمان بریں سے آگے نکل گئی ہیں اور ان کے وجود کے ارکان

اباد و اطراف جہان سے خارج ہو گئے ہیں اور ان کے کندھے عرضِ خدا کے پایوں کی حفاظت کے لیے آمادہ ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں (ملک) ایک وسیع و عریض مفہوم رکھتا ہے جو ان فرشتوں کو بھی شامل ہے جو عقل و شعور اور اطاعت و

تسبیح کے حامل ہیں اور عالم سستی کی بہت سی قوتوں اور توانائیوں کو بھی۔

ہم نے اس موضوع کے بارے میں سورۃ فاطر کے آغاز کی آیات میں (جلد ۱۰ ص ۱۶۲ سے آگے) مزید تفصیل بیان کی ہے۔

۳۲۔ کَلَّا وَالْقَمَرَ

۳۳۔ وَاللَّيْلِ إِذَا أَدْبَرَ

۳۴۔ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ

۳۵۔ إِنَّهَا لِأَحَدَى الْكُبَرِ

۳۶۔ نَذِيرًا لِلْبَشَرِ

۳۷۔ لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ

ترجمہ

۳۲۔ جیسا کہ وہ خیال کرتے ہیں، ایسا نہیں ہے، چاند کی قسم۔

۳۳۔ اور رات کی قسم جب (وہ دامن سمیٹے اور) پشت پھیرے۔

۳۴۔ اور صبح کی قسم جب وہ چہرہ کھولے۔

۳۵۔ کہ وہ (قیامت کے ہولناک حوادث) اہم مسائل میں سے ہیں۔

۳۶۔ تمام انسانوں کے لیے تنبیہ اور انداز ہے۔

۳۷۔ تم میں سے ان لوگوں کے لیے جو یہ چاہتے ہیں کہ آگے بڑھ جائیں یا پیچھے رہ جائیں (یعنی نیکیوں کی بددلیلی

کے لیے آگے بڑھ جائیں یا آگے نہ بڑھیں)

تفسیر

پیشبر اسلام کی نبوت کے منکرین اور قیامت کے انکار کی بحث کو جاری رکھتے ہوئے، ان آیات میں کئی ایک قسمیں کھائی ہیں، اور قیامت، قبول سے اٹھنے اور دوزخ و عذاب کے مسئلہ پر تاکید ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "جیسا کہ وہ خیال کرتے ہیں، ایسا نہیں ہے، چاند کی قسم (کَلَّا وَالْقَمَرَ)۔"

"کَلَّا" حرف "دفع" ہے اور عام طور پر ان باتوں کی نفی کے لیے آتا ہے جنہیں طرف مقابلے نے پہلے ذکر کیا ہو اور کبھی کبھی والی باتوں کی نفی کے لیے بھی ہوتا ہے اور یہاں گزشتہ آیات کے قرینہ سے ان منکرین کے گمان کی جو دوزخ اور اس کے عذاب کے منکر تھے، اور

کے خازن فرشتوں کا مذاق اڑاتے اور مسخر کرتے تھے، نفی کرتا ہے۔

”چاند“ کی قسم کا ذکر اس بناء پر ہے کہ وہ خدا کی عظیم نشانیوں میں سے ایک ہے۔ خلقت کے لحاظ سے بھی اور منظم دور اور گردش کرنے کے لحاظ سے بھی، اور روشنی و خوبصورتی اور تدریجی تغیرات کے لحاظ سے بھی، جو دنوں کی تشخیص کے لیے خود ایک زندہ تقویم اور خبری ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”اور قسم ہے رات کی جس وقت وہ پشت پھیرے اور راتیں سمیٹے (واللیل اذا ادبر)۔“

”اور قسم ہے صبح کی جس وقت وہ اپنے چہرے سے نقاب اٹھائے“ (والصبح اذا اسفر)۔

حقیقت میں یہ تینوں قسمیں ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ چاند کی جلوہ گری راتوں میں ہے اور دن کے وقت چاند کی روشنی، سورج کی روشنی کے تحت الشعاع میں ہوتی ہے اور وہ مطلقاً جلوہ نہیں دکھاتا۔ رات بھی اگرچہ آرام بخش ہوتی ہے اور خاموش اور حق تعالیٰ کے ماضیوں کے راز دنیا کا وقت ہوتا ہے، لیکن یہ شب تاریک اس وقت بہت ہی عمدہ دکھائی دیتی ہے جب وہ پشت پھرتی ہے اور صبح روشن کی طرف رخ کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے اور آخر سحر کا وقت ہوتا ہے اور صبح کا طلوع کرنا، جو شب تاریک کا اختتام ہے، سب سے زیادہ دل آویز ہوتا ہے، جو ہر انسان کو دھرو و نشاط میں لاتا ہے اور نور و صفائی فرق کر دیتا ہے۔

معنی طور پر یہ تینوں قسمیں ”قرآن“ کے نور ہدایت، اور ”شکر و بت پرستی“ کی تاریکیوں کے پشت پھیرنے اور ”توحید“ کی صبح کی سفیدی کے پھوٹنے کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں۔

ان قسموں کو بیان کرنے کے بعد اس چیز کی طرف رخ کرتا ہے، جس کے لیے یہ قسمیں کھائی گئی ہیں، فرماتا ہے: ”یقیناً قیامت کے ہولناک حوادث، دوزخ اور عذاب کے فرشتے اہم مسائل میں سے ہیں۔“ (انہا لاحدی العکبر)۔
”انہا“ کی ضمیر یا تو ”سقر“ (دوزخ) کی طرف لٹتی ہے یا ”جنود“ اور پروردگار کے لشکروں کی طرف، یا قیامت کے تمام حوادث کی طرف اور ان میں سے جو بھی ہو، اس کی عظمت واضح ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”دوزخ کی خلقت کا مقصد اتمام جوئی ہرگز نہیں ہے، بلکہ یہ تو انسانوں کو ڈرانے کا ایک ذریعہ ہے (فذیرا للبشر)۔“

۱۔ ”اسفر“ ”سفر“ (بروزن فقر) کے مادہ سے ڈھکن کھولنا اور حجاب کو دور کرنے کے معنی میں ہے۔ اسی لیے بے پردہ عورتوں کو ”سافرت“ کہا جاتا ہے اور یہ تعبیر طلوع صبح کے لیے ایک خوبصورت اور عمدہ تشبیہ ہے۔

۲۔ ”کبر“ کبریٰ کی صیغہ ہے جو بزرگ اور بڑی چیز کے معنی میں ہے، جن نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ”سقر“ دوزخ کا ایک بہت بڑا طبقہ ہے۔ لیکن یہ تفسیر اس چیز کے ساتھ جس کی طرف ہم نے پہلا اشارہ کیا ہے اور آیات سے معلوم ہوتا ہے، سازگار نہیں ہے۔

۳۔ ”ذیرا“ ”انہا“ کی ضمیر کا حال ہے جو ”سقر“ کی طرف لٹتی ہے اور بعض نے اسے تفسیر سمجھا ہے اور یہ اس صورت میں ہے کہ ”ذیرا“ مصدری معنی رکھتا ہوا اور ”انہا“ کے معنی دیتا ہو لیکن یہاں احتمال زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔

تاکہ سب کو ڈرائے اور انداز کرے اور اس وحشت ناک عذاب سے، جو کافروں اور حق کے دشمنوں کے انتظار میں ہے،

آخر میں زیادہ تاکید کے لیے مزید کہتا ہے، ”یہ انداز کسی معین گروہ کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ یہ تو تمام افراد بشر کے لیے ہے، تم میں ان سب لوگوں کے لیے، جو آگے بڑھنا چاہتے ہیں اور نیکیوں اور فرمانِ خدا کی اطاعت کی طرف پیش رفت کرنا چاہتے ہیں اور چاہے وہ لوگ ہوں اس قافلے سے پیچھے رہ جانے کی طرف مائل ہوں“ (للمن شاء منکم ان یتقدم او یتأخر)۔

جو شخص آگے بڑھنے کی راہ پر چل پڑے، تو اس کا کیا ہی کہنا ہے اور جو تاخیر کی راہ اپنائے اور پیچھے کو بٹھے تو اس کا بُرا حال ہوگا۔ بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہاں تقدم و تاخر سے مراد جہنم کی آگ کی طرف تقدم اور اسی سے پیچھے ہٹنا ہے۔ اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد، نفسِ انسانی کا تقدم اور تکامل و ارتقاء ہے یا اس کا انحطاط اور تاخر ہے۔ پہلا اور تیسرا معنی زیادہ مناسب ہے، اور دوسری تفسیر چنداں مناسب نہیں ہے۔

- ۳۸۔ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۝
 ۳۹۔ اِلَّا اَصْحَابَ الْيَمِيْنِ ۝
 ۴۰۔ فِيْ جَنَّتٍ يُتَسَاءَلُوْنَ ۝
 ۴۱۔ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝
 ۴۲۔ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرٍ ۝
 ۴۳۔ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمَصْلِيْنَ ۝
 ۴۴۔ وَلَمْ نَكُ نَطْعُمُ الْمَسْكِيْنَ ۝
 ۴۵۔ وَكُنَّا نَحْوُضَ مَعَ الْخَائِيْضِيْنَ ۝
 ۴۶۔ وَكُنَّا نَكْذِبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝
 ۴۷۔ حَتّٰى اٰتٰنَا الْيَقِيْنَ ۝
 ۴۸۔ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشُّفَعٰى ۝

ترجمہ

- ۲۸۔ ہر شخص اپنے اعمال کے لیے گروہ ہے۔
 ۲۹۔ مگر "اصحابِ یمن" (جن کا اعمال نامہ ایمان و تقویٰ کی نشانی کے طور پر ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا)۔
 ۴۰۔ وہ جنت کے باغات میں ہوں گے اور وہ سوال کریں گے۔
 ۴۱۔ مجرموں سے
 ۴۲۔ تمہیں دوزخ کی طرف کس چیز نے بھیجا۔
 ۴۳۔ وہ کہیں گے: ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔

- ۴۴۔ اور سیکنوں اور محتاجوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔
 ۴۵۔ اور ہمیشہ اہل باطل کے ہم نشین و ہم صدر رہتے تھے۔
 ۴۶۔ اور ہمیشہ روزِ جزا کا انکار کرتے تھے۔
 ۴۷۔ یہاں تک کہ ہمیں موت آگئی۔
 ۴۸۔ لہذا شفاعت کرنے والوں کی شفاعت ان کے لیے سود مند نہیں ہوگی۔

تفسیر تم اہل دوزخ کیوں ہو گئے؟

اسی بحث کو جاری رکھتے ہوئے جو گذشتہ آیات میں دوزخ اور دوزخیوں کے بارے میں آئی ہے۔ ان آیات میں مزید کہتا ہے: ”ہر شخص اپنے اعمال کے لیے گرو ہے“ (کل نفس بما کسبت رھینۃ)۔
 ”رھینۃ“ ”سہن“ کے مادہ سے (گرو) کے معنی میں ہے اور یہ وہ وثیقہ ہے جو عام طور پر ”قرض“ کے مقابل میں دیتے ہیں گویا انسان کا تمام وجود اس کے وظائف، تکالیف اور ذمہ داریوں کے انجام دینے میں گرو ہے، جس وقت انھیں انجام دے لیتا ہے، آزاد ہو جاتا ہے، ورنہ قیدِ اسارت میں رہے گا۔
 اہل لغت کے بعض کلمات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ”رہن“ کے معانی میں سے ایک ملازمت و ہمراہی ہے۔ اس معنی کے مطابق آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا، کہ سب لوگ اپنے اعمال کے ہمراہ ہوں گے چاہے نیکو کار ہوں یا بدکار۔
 لیکن بعد والی آیات کے قرینہ سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

لہذا بلافاصلہ فرماتا ہے: ”مگر اصحابِ یمن، جو اس اسارت کی قید سے آزاد ہیں“۔ (الاصحاب الیمین)۔
 انھوں نے ایمان اور عمل صالح کے سلسلے میں، اسارت کے طوق اور زنجیروں کو توڑ دیا ہے، لہذا وہ بے حساب جنت میں داخل ہو گئے۔
 اس بارے میں کہ یہاں ”اصحاب الیمین“ سے کون لوگ مراد ہیں، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

۱۵ لے ”سان العرب“ مادہ ”رہن“

۱۵ لے اس بارے میں کہ یہاں استثناء ”متصل“ ہے یا ”منقطع“ بعض نے مثلاً مرحوم شیخ طوسی نے ”تبیان“ میں لے ”منقطع“ قرار دیا ہے اور بعض نے مثلاً روح البیان نے لے متصل جانا ہے۔ یہ فرق ان مختلف تفسیروں کے ساتھ مربوط ہے جو ہم نے ”رھینۃ“ کے مفہوم کے بارے میں ذکر کی ہیں۔ جس تفسیر کو ہم نے انتخاب کیا ہے، اس کے مطابق استثناء ”منقطع“ ہے اور دوسری تفسیر کے مطابق استثناء ”متصل“ ہوگا۔ (غور کیجیے)

بعض نے تو اس کی ایسے افراد کے ساتھ تفسیر کی ہے جن کا نامہ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں ہوگا۔ اور بعض انہیں ایسے مومنین سمجھتے ہیں، جنہوں نے بالکل گناہ نہ کیا ہو، اور بعض فرشتوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں اور دوسرے احتمالات بھی ہیں۔

لیکن جو کچھ قرآن کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے اور اس پر قرآن گواہ ہے، وہی پہلا معنی ہے وہ ایسے لوگ ہیں جو ایمان اور عمل صالح کے حامل ہیں اور اگر ان سے کوئی چھوٹے موٹے گناہ ہوئے بھی ہوں، تو وہ ان کی نیکیوں کے تحت الشعاع میں ہیں اور ان الحسنات یذہبن السيئات)۔ (مائدہ ۱۱۴) کے حکم میں ہیں۔

ان کے نیک اعمال ان کے اعمال بد کو چھپالیں گے، یا تو وہ بلا حساب کے جنت میں وارد ہو جائیں گے، اور اگر ان کا حساب ہو بھی، تو وہ سہل، سادہ اور آسان ہوگا۔ جیسا کہ سورہ انشقاق کی آیت میں آیا ہے: فاما من اوتى كتابه بيمينه فسوف يحاسب حسابا يسيرا۔ لیکن وہ شخص جس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں ہوگا، اس کا حساب آسان ہوگا۔

اہل سنت کے مشہور مفسر ”قرطبی“ نے امام باقر سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

فحن وشيعتنا اصحاب اليمين، وكل من ابغضنا اهل البيت فهم

المرتہنون

”ہم اور ہمارے شیعوں اصحاب الیمین ہیں اور جو شخص ہم اہل بیت کو دشمن رکھتا ہے، تو وہ اپنے اعمال کی

قید میں ہے“۔

اس حدیث کو دوسرے مفسرین، معجمہ ”مجمع البیان“ اور تفسیر ”نور الثقلین“ کے مؤلف اور بعض دوسروں نے بھی زیر بحث آیت

کے ذیل میں نقل کیا ہے۔

اس کے بعد ”اصحاب الیمین“ اور ان کے مقابل گروہ کے حالات کے ایک گوشہ کی تشریح کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: ”وہ جنت کے پر نعمت اور با عظمت باغوں میں ہوں گے اور اس حال میں وہ سوال کریں گے“ (فی جنات یتساءلون)۔

”گنہ گاروں سے“ (عن المجرمین)۔

۱۰ ص ۶۸۷

”یتساءلون“ اگرچہ باب ”تفاعل“ سے ہے، جو عام طور پر دو افراد یا چند افراد کے درمیان ہونے والے کام کے لیے آتا ہے۔ لیکن یہاں بعض دوسرے مقامات کے مانند ہی معنی نہیں دیتا اور یہاں ”یسألون“ کے معنی دیتا ہے ”ضمنی طور پر“ جنات“ کا نکرہ ہونا اس کی عظمت کے بیان کے لیے ہے۔ اور یہ حال ”فی جنات“ ایک مفرد مبتدا کی خبر ہے اور تقدیر میں ”ہم فی جنات“ ہے۔

وہ کہیں گے، ”تھیں دوزخ میں کس چیز نے پہنچا دیا“ (ماسدک کفر فی سقر)۔
ان آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ہشتیوں اور دوزخیوں کے درمیان کلی طور پر رابطہ منقطع نہیں ہوگا، جنتی اپنے عالم سے دوزخیوں کی آمد کا مشاہدہ کر سکیں گے اور ان سے گفتگو کر سکیں گے۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مجتہدین ”اصحاب الیمین“ کے اس سوال کا کیا جواب دیتے ہیں؟ وہ اس سلسلہ میں اپنے چار گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔

پہلا یہ کہ ”وہ کہیں گے: ”ہم نماز گزاروں میں سے نہیں تھے۔“ (قالوا لِمَ لَمْ تَكُ مِنَ الْمَصَلِّينَ)۔
اگر ہم نماز پڑھتے، تو نماز میں خدا کی یاد دلاتی اور فحشاء اور منکر سے روکتی، اور ہمیں خدا کی صراطِ مستقیم کی دعوت دیتی۔“

دوسرا یہ کہ ”ہم مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے“ (ولم نؤتِکُمْ نَظْمًا مِّنَ الْمَسْکِینِ)۔
”اطعام مسکین“ کا معنی اگرچہ غریبوں، مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے، لیکن ظاہراً اس سے مراد، ضرورت مندوں کی ہر ضرورت کی حاجت میں مدد کرنا ہے، چاہے وہ خوراک ہو یا پوشاک، مسکن وغیرہ۔

اور جیسا کہ مفسرین نے تصریح کی ہے، اس سے مراد ”زکات واجب“ ہے، کیونکہ سبھی اتفاقات کو ترک کرنا جہنم میں داخل ہونے کا سبب نہیں بنتا، اور یہ آیت دوبارہ اس مطلب کی تاکید کرتی ہے کہ زکات کا حکم اجمالی طور پر لکھتے ہیں ہی نازل ہوا تھا، اگرچہ جزئیات کی تشریح اور حدود کی خصوصیات کا تعین، خصوصاً اس کا بیت المال میں مرکوز ہونا، مدینہ میں ہوا تھا۔

تیسرا یہ کہ ”ہم ہمیشہ اہل باطل کے ساتھ ہم نشین اور ہم صدا ہو جاتے ہیں“ (وکنا نَخْوِضُ مَعَ الْخَائِضِیْنَ)۔
حق کے خلاف جس گوشہ سے بھی کوئی صدا بند ہوتی اور جو مجلس بھی باطل کی ترویج کے لیے برپا ہوتی، اور ہم اس سے باخبر ہو جاتے تو ہم ان کا ساتھ دیتے۔ اور جماعت کے رنگ میں رنگے جاتے، ان کی باتوں کی تصدیق کرتے اور ان کے تکذیب اور انکار کرنے کو صحیح قرار دیتے اور حق کا استہزاء کرنے اور متحیر اڑانے سے لذت حاصل کرتے تھے۔

”نخوض“ ”خوض“ (بروزن حوض) کے مادہ سے، اصل میں پانی میں داخل ہونے اور اس میں حرکت کرنے کے معنی میں ہے، اس کے بعد تمام امور میں داخل ہونے اور ان میں آلودہ ہونے کے لیے بھی بولا جانے لگا، لیکن قرآن مجید میں اکثر باطل اور بے بنیاد مطالب میں وارد ہونے کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔

”باطن میں خوض“ ایک وسیع و عریض معنی رکھتا ہے، جو ان لوگوں کی مجالس میں داخل ہونے کو بھی شامل ہے، جو آیاتِ خدا کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسلام کے خلاف پردہ پیگنڈ کرتے ہیں، یا بدعت کی ترویج کرتے ہیں، یا پست اور چھپوری باتیں کرتے ہیں، یا ان گناہوں کو جنہیں انہوں نے انجام دیا ہے، فخریہ اور مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں، اسی طرح غیبت، بہمت اور لہو و لوب وغیرہ کی مجالس میں شرکت کرنا، لیکن زیر بحث آیت میں زیادہ تر ان مجالس کے بارے میں بیان کیا گیا ہے، جو خدا کے دین کو کمزور کرنے اور اس کے مقدمات کا استہزاء اور مذاق اڑانے اور کفر و شرک و

بے دینی کی ترویج کے لیے قائم کی جاتی ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”اور ہم ہمیشہ روز جزا کا انکار کیا کرتے تھے“ (و کنا نکذب بیوم الدین)۔

یہاں تک کہ ہماری موت کا وقت آپہنچا“ (حتیٰ اتانا الیقین)۔

یہ بات واضح ہے کہ معاد و قیامت اور حساب و جزا کے دن کا انکار تمام الہی اور اخلاقی قدروں کو متزلزل کر دیتا ہے اور انسان کو گناہ کے ارتکاب کی جرأت دلاتا ہے اور اس راستے کی رکاوٹوں کو دور کر دیتا ہے، خصوصاً اگر یہ مسئلہ آخر عمر تک ایک مسلسل عمل کی صورت اختیار کر لے۔

ہر حال ان آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اولاً کفار بھی، اصول دین کی طرح سے، فرد دین کے بھی مکلف ہیں اور اس سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ چاروں امور یعنی نماز، زکوٰۃ، اہل باطل کی مجالس کو ترک کرنا اور قیامت پر ایمان رکھنا، ایمان کی ہدایت اور تربیت میں حد سے زیادہ اثر رکھتے ہیں اور اس طرح سے جہنم، واقعی نماز گزاروں، زکوٰۃ دینے والوں، باطل کو ترک کرنے والوں اور قیامت پر ایمان رکھنے والوں کی جگہ نہیں ہے۔

البتہ نماز اس لحاظ سے کہ وہ خدا کی عبادت ہے لہذا وہ خدا پر ایمان کے بغیر اسے حاصل نہیں ہو سکتی، اس بناء پر اس کا ذکر، خدا پر ایمان و اعتقاد اور اس کے فرمان کے سامنے تسلیم خم کرنے کی ایک رمز ہے۔ لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ چاروں امور توحید سے شروع ہوتے ہیں اور معاد و قیامت پر ختم ہوتے ہیں اور خالق و مخلوق اور انسان کے خود اپنے آپ سے ربط کو اپنے اندر سمونے ہوئے ہے۔

مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ ”یقین“ سے مراد یہاں موت ہے، کیونکہ یہ مومن و کافر دونوں کے لیے ایک یقینی امر شمار ہوتی ہے اور انسان ہر چیز میں شک کر سکتا ہے لیکن موت میں شک نہیں کر سکتا، سورہ حجرت کی آیت ۹۹ میں بھی آیا ہے و اعبدوا ربکم حتیٰ یاتیک الیقین ”اپنے خدا کی عبادت کر یہاں تک کہ تجھے یقین (موت) آجائے“

لیکن بعض نے یہاں یقین کی، انسان کی موت کے بعد، برزخ و قیامت کے مسائل کے بارے میں آگاہی حاصل ہونے کے معنی کے ساتھ تفسیر کی ہے جو پہلی تفسیر کے ساتھ ایک جہت سے ہم آہنگ ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں اس گروہ کے بڑے انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے، ”لہذا شفاعت کرنے والوں میں سے کسی شفاعت کرنے والوں کی شفاعت ان کی حالت کو کوئی فائدہ نہیں دے گی“ (فما تنفعہم شفاعۃ الشافعیین)۔

نہ تو خدا کے انبیاء، رسولوں اور ائمہ معصومین کی شفاعت اور نہ ہی فرشتوں، صدیقین، شہداء اور صالحین کی شفاعت، کیونکہ شفاعت کے لیے مناسب حالات کی ضرورت ہے اور انھوں نے تمام اسباب کو کلی طور پر ختم کر دیا ہے۔ شفاعت اس شفاف پانی کے مانند ہے، جسے کسی کمزور پودے کی جڑ پر ڈالا جائے، لیکن یہ بات واضح ہے کہ اگر پودا کلی طور پر مر چکا ہو تو یہ صاف سٹھرا پانی اسے زندہ نہیں کر سکتا، دوسرے نفلوں میں جیسا کہ ہم شفاعت کی بحث میں بیان کر چکے ہیں۔ ”شفاعت“ شفع کے مادہ سے ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ منمبہ کرنے کے معنی میں ہے اور

اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس کی شفاعت کی جا رہی ہے اس نے راستہ کا کچھ حصہ اپنے پاؤں سے طے کیا ہے اور سخت قسم کے نشیب و فراز میں رہ گیا ہے، شفاعت کرنے والا اس کا ضمیمہ بن کر اس کی مدد کرتا ہے تاکہ وہ باقی راستہ طے کر لے۔
 ضمنی طور پر یہ آیت، دوبارہ مسئلہ شفاعت اور بارگاہِ خداوندی میں شفاعت کرنے والوں کے تنوع اور تعدد کی تاکید کرتی ہے اور ان لوگوں کے لیے جو اصل شفاعت کے منکر ہیں، ایک دندان شکن جواب ہے۔ اسی طرح یہ اس بات کے لیے ایک تاکید بھی ہے کہ شفاعت بے شرط کے نہیں ہوگی اور گناہ کے لیے ہر جہنمی کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ یہ انسان کی تربیت کا ایک ایسا عامل ہے جو اسے کم از کم اس مرحلہ تک پہنچا دے، کہ اس میں شفاعت کرانے کی قابلیت پیدا ہو جائے، اور خدا اور اس کے اولیاء سے اس کا رابطہ کلی طور پر منقطع نہ ہو جائے۔

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ اوپر والی آیت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ شفاعت کرنے والے اس قسم کے لوگوں کی شفاعت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ چونکہ شفاعت ان کی حالت کے لیے سود مند نہیں ہوگی، لہذا وہ ان کی شفاعت نہیں کریں گے، کیونکہ اولیاءِ خدا لغو و بیہودہ کاموں کے مرتکب نہیں ہوتے۔

ایک نکتہ

روز جزا کے شفاعت کرنے والے

زیر بحث آیات اور اسی طرح قرآن مجید کی بعض اور دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں شفاعت کرنے والے متعدد ہوں گے (اور ان کے شفاعت کا دائرہ مختلف ہوگا) ان تمام روایات سے جو شیعہ اور اہل سنت کے منابع سے نقل ہوئی ہیں۔ اور یہ روایات بہت زیادہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شفاعت کرنے والے قیامت کے دن ان گنت گاروں کے لیے، جن میں شفاعت کی استعداد موجود ہے، شفاعت کریں گے۔

۱۔ سب سے پہلی شفاعت کرنے والی ہستی پیغمبر اسلام کی ذات مقدس ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا:۔

انا اول شافع فی الجنة

”جنت کے بارے میں سب سے پہلا شفاعت کرنے والا میں ہوں گا۔“

۲۔ تمام انبیاء قیامت کے دن شفاعت کریں گے، جیسا کہ ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

يشفع الانبياء في كل من يشهد ان لا اله الا الله منخلصا فيخرجونهم منها

۱۔ تفسیر نمونہ جلد اول، سورہ بقرہ کی آیت ۲۸ کے ذیل میں

۲۔ صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۳۰

” انبیاء ان تمام افراد کے بارے میں شفاعت کریں گے جو خلوص نیت کے ساتھ خدا کی وحدانیت کی گواہی دیں گے اور وہ انھیں دوزخ سے باہر نکال لیں گے“ ۱۱

۲۔ فرشتے بھی روزِ محشر شفاعت کریں گے، جیسا کہ رسولِ خدا سے نقل ہوا ہے:

يُؤذِنُ لِلْعُمَّالِ تَكْفِةً وَالنَّبِيِّينَ وَالشَّهَدَاءِ اَنْ يَشْفَعُوا

” اس دن فرشتوں، انبیاء اور شہداء کو اجازت دی جائے گی کہ وہ شفاعت کریں“ ۱۲

۳۔ ۵۔ آئمہ معصومین اور ان کے شیعہ بھی شفاعت کریں گے، جیسا کہ علیؑ فرماتے ہیں:

لِنَاشْفَاعَةِ وَاَهْلِ مَوَدَّتِنَا شَفَاعَةٌ

” ہمارے لیے حق شفاعت ہے اور ہمارے شیعہ اور دوستوں کے لیے بھی مقام شفاعت ہے“ ۱۳

۶۔ ۷۔ علماء اور دانش ور اور اسی طرح شہداء اور خدا شفاعت کرنے والوں میں سے ہوں گے، جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ سے ایک

حدیث میں آیا ہے:

يَشْفَعُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الْاَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْعُلَمَاءُ ثُمَّ الشَّهَدَاءُ

روزِ قیامت پہلے انبیاء شفاعت کریں گے، پھر علماء اور اس کے بعد شہداء“ ۱۴

یہاں تک کہ ایک حدیث میں آنحضرتؐ سے آیا ہے:

يَشْفَعُ الشَّهِيدُ فِي سَبْعِينَ اَلْفًا مِّنْ اَهْلِ بَيْتِهِ

” شہید کی شفاعت اس کے خاندان کے ستر افراد تک قابلِ قبول ہوگی“ ۱۵

ایک اور دوسری حدیث میں جسے مرحوم ”علامہ مجلسی“ نے ”بجاری النوار“ میں نقل کیا ہے:

” ان کی شفاعت ستر ہزار افراد کے لیے قابلِ قبول ہوگی“ ۱۶

اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ستر اور ستر ہزار کا عدد دونوں اعداد تکثیر میں سے ہیں، لہذا ان دونوں روایات میں کوئی منافقت

نہیں ہے۔

۸۔ قرآن بھی قیامت کے دن شفاعت کرے گا، جیسا کہ علیؑ فرماتے ہیں:

۱۔ ”مسند احمد“ جلد ۲ ص ۱۲

۲۔ ”مسند احمد“ جلد ۵ ص ۴۲

۳۔ ”خصال الصدوق“ ص ۶۲۴

۴۔ ”سنن ابی ماجہ“ جلد ۲ ص ۱۴۴۲

۵۔ ”سنن ابی داؤد“ جلد ۲ ص ۱۵

۶۔ ”بجاری النوار“ جلد ۱ ص ۱۴

واعلموا انہ (القرآن) شافع وشفع

”جان لو کہ قرآن شفاعت کرنے والا ہے اور مقبول الشفاعۃ ہے یہ

۹۔ وہ لوگ جنہوں نے ایک عمر اسلام میں صرف کی ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں بغیر اکرم سے آیا ہے:

اذا بلغ الرجل التسعين غفرا الله ما تقدم من ذنبه وما تأخر وشفع في اهله
”جب انسان نوے سال کا ہو جاتا ہے (اور ایمان کے راستے پر چل رہا ہوتا ہے) تو خدا اس کے گزشتہ اور آئندہ کے

گناہوں کو بخش دیتا ہے اور اس کے گھر والوں کے لیے اس کی شفاعت قبول کی جاتی ہے یہ

۱۰۔ عبادات بھی شفاعت کریں گی، جیسا کہ ایک حدیث میں رسول خدا سے آیا ہے:

الصيام والقرآن يشفعان للعبد يوم القيامة

”روزہ اور قرآن قیامت کے دن بندوں کی شفاعت کریں گے“ یہ

۱۱۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک اعمال بھی مثلاً وہ امانت جس کی حفاظت کرنے میں انسان نے کوشش کی ہو، قیامت میں

انسان کی شفاعت کریں گے یہ

۱۲۔ سب سے عمدہ بات یہ ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود خداوند عالم بھی گناہ گاروں کی شفاعت کرے گا، جیسا کہ ایک

حدیث میں رسول اکرم سے آیا ہے:

يشفع النبيون والعلائكة والمؤمنون فيقول الجبار بقيت شفاعتي

”قیامت میں نبیاء، فرشتے اور مؤمنین شفاعت کریں گے اور خدا کہے گا، خود میری شفاعت باقی رہ گئی ہے“ یہ

اس بارے میں روایات بہت زیادہ ہیں اور جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے وہ ان کا ایک گوشہ ہے یہ

ہم دوبارہ اس بات کو دہراتے ہیں کہ شفاعت کے کچھ شرائط دیتے ہیں، جن کے بغیر شفاعت ممکن نہیں ہے، جیسا کہ ذریعہ بحث آیات میں معنی

صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ جبرمیں کے ایک گروہ کے بارے میں تمام شفاعت کرنے والوں کی شفاعت بے اثر ہوگی۔ اہم بات یہ ہے کہ قابل میں

قابلیت بھی ہو، کیونکہ قابل کی فاعلیت کسی کافی نہیں ہے (ہم اس سلسلے میں مزید تشریح جلد اول میں شفاعت کی بحث میں پیش کر چکے ہیں)۔

۱۰ ”نبی البلاغہ“ خطبہ ۱۶۶

۱۱ ”مسند احمد“ جلد ۲ ص ۸۹

۱۲ ”مسند احمد“ جلد ۲ ص ۱۰۴

۱۳ ”مناقب ابن شہر آشوب“ جلد ۲ ص ۱۴

۱۴ ”صحیح بخاری“ جلد ۹ ص ۱۴۹

۱۵ مزید وضاحت کے لیے کتاب ”مفاتیح القرآن“ جلد ۲ ص ۲۸۸ تا ۳۱۱ کی طرف رجوع کریں۔

- ۴۹۔ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكَرَةِ مُعْرِضِينَ ۝
 ۵۰۔ كَانَهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ۝
 ۵۱۔ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ۝
 ۵۲۔ بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَنْ يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنشَرَةً ۝
 ۵۳۔ كَلَّا ۚ بَلْ لَا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ۝
 ۵۴۔ كَلَّا إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ ۝
 ۵۵۔ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرْهُ ۝
 ۵۶۔ وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۚ هُوَ أَهْلُ التَّقْوَىٰ وَأَهْلُ
 الْمَغْفِرَةِ ۝

ترجمہ

- ۴۹۔ وہ اس تذکرہ سے گریزاں کیوں ہیں ؟
 ۵۰۔ گویا وہ وحشت زدہ گدھے ہیں۔
 ۵۱۔ جو شیر سے بھاگ رہے ہیں۔
 ۵۲۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک اس بات کا منتظر ہے (کہ خدا کی طرف سے) ایک علیحدہ خط اسے بھیجا جائے۔
 ۵۳۔ جیسا وہ کہتے ہیں ایسا نہیں ہے، بلکہ وہ آخرت سے نہیں ڈرتے۔
 ۵۴۔ جیسا وہ کہتے ہیں ایسا نہیں ہے، وہ (قرآن) تو ایک تذکرہ اور یاد آوری ہے۔
 ۵۵۔ جو شخص چاہتا ہے اس سے نصیحت حاصل کرتا ہے۔
 ۵۶۔ اور کوئی شخص نصیحت نہیں لیتا مگر یہ کہ خدا چاہے وہ اہل تقویٰ اور اہل مغفرت ہے۔

تفسیر

حق سے اس طرح بھاگتے ہیں جس طرح شیر سے گدھے

اسی بحث کو جاری رکھتے ہوئے جو گذشتہ آیات میں مجرموں اور روزنیوں کے بارے میں آئی تھی، زیر بحث آیات میں اس معاذ اور بہت گدھے گردہ کی حق بات سننے، اور ہر قسم کی پند و نصیحت سے وحشت کرنے کو، واضح ترین صورت میں بیان کرتا ہے۔
پہلے لکھتا ہے: ”وہ اس تذکر اور یاد آوری سے روگرداں کیوں ہیں؟ (فما الھم عن التذکرۃ معرضین)۔
وہ قرآن جیسی شفا بخش دوا سے فرار کیوں کرتے ہیں؟ وہ مہر و طبیب کی بات کو رد کیوں کرتے ہیں؟ واقعاً تعجب کا کام ہے۔

”گو یا وہ وحشت زدہ ہو کر بھاگنے والے گدھے ہیں۔“ (کانھم حمر مستفرۃ)۔

”جنھوں نے شیر یا شکاری سے فرار کیا ہے“ (فرّت من قسورۃ)۔

”حمر“ ”حمار“ کی جمع ہے، گدھے کے معنی میں، البتہ یہاں شیر یا شکاری کے چنگل سے فرار کے قرینے سے، وحشی گدھا

یا ”گورخر“ مراد ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ لفظ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو وحشی اور اہلی دونوں قسم کے گدھے کو شامل ہے۔

”قسورۃ“ ”قسر“ کے مادہ سے۔ (جو قمر وغلبہ کے معنی میں ہے)۔ لیا گیا ہے، اور وہ شیر کے ناموں

میں سے ایک نام ہے اور بعض نے اس کی تیر انداز یا شکاری کے معنی میں تفسیر کی ہے، لیکن یہاں پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

مشہور ہے کہ ”وحشی گدھا“ ”شیر“ سے عجیب و غریب وحشت رکھتا ہے، یہاں تک کہ وہ شیر کی آواز کو سنتا ہے تو اس طرح کی وحشت اس پر

طاری ہو جاتی ہے کہ وہ دیوانہ وار ہر طرف کو بھاگتا ہے، خاص طور پر اس وقت جب شیر ان کے گلہ میں پہنچ جائے تو وہ اس طرح سے پراگندہ ہو کر ہر

طرف کو دوڑتے ہیں کہ یہ نظارہ عجیب و غریب کی طرف توجہ دینا چاہتا ہے۔ (آج کل فلموں میں شیر کو جانوروں کا شکار کرتے ہوئے عام دکھایا جاتا ہے)

بہر حال یہ آیت، مشرکین کے قرآن کی روح پرور آیات سے وحشت کرنے اور ان سے فرار کرنے کی ایک بہت ہی رسا، گویا اور ناطق

تعبیر ہے، ان کو گورخر کے ساتھ تشبیہ دی ہے جس میں عقل و شعور بھی نہیں ہے اور وحشی ہونے کی بنا پر ہر چیز سے گریزاں بھی ہے، حالانکہ ان کے

سامنے ”تذکرہ“ (یاد آوری، بیداری اور ہوشیاری کے ایک وسیلہ کے) سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔

اس جملہ میں ”ما“ ”مبتدا“ ہے اور ”لھم“ ”خبر“ اور ”معرضین“ ”لھم“ کی ضمیر کے لیے مال ہے اور ”عن التذکرۃ“ ”جار مجرور“ ”معرضین“ سے متعلق ہے

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ ”عن التذکرۃ“ کا ”معرضین سے مقدم ہونا حصر پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی وہ صرف مفید تم کی یاد آوریوں سے منہ پھیرتے ہیں، بہر حال یہاں ”تذکرہ“

سے مراد، ہر قسم کی مفید و سود مند یاد آوری ہے، جن کا اس درمیں قرآن مجید ہے۔

”گورخر“ ”گور“ بمعنی ”صحرا“ اور ”خر“ بمعنی ”گدھا“ سے مرکب ہے، اسی لیے اس کو ”وحشی اور خروائی بھی کہتے ہیں۔

لیکن اس نادانی اور بے خبری کے باوجود وہ ایسے مغرور اور تکبر میں کہ ان میں سے ہر ایک یہ توقع رکھتا ہے کہ خدا کی طرف سے اسے ایک علیحدہ خط دیا جائے۔ (بل یرید کل امریٰ منہم ان یوثیٰ صحفًا منشورۃ)۔
 یہ اس چیز کے مشابہ ہے، جو سورۃ اسراء کی آیہ ۹۳ میں آئی ہے: (ولن نؤمن لرقیقک حتی تنزل علینا کتابًا نقرؤہ) "اگر تو آسمان پر بھی چڑھ جائے تو بھی ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے، مگر یہ کہ (خدا کی طرف سے) ہم پر تو کوئی خط نازل کرے، یا سورۃ انفام کی آیہ ۲۴ کی طرح ہے جو یہ کہتی ہے: (قالوا لن نؤمن حتی نوثیٰ مثل ما اوتیٰ رسل اللہ) وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان نہیں لائیں گے، جب تک کہ وہی چیز جو اللہ کے رسولوں پر نازل ہوتی ہے، ہمیں ندری جائے۔"

اور اس طرح سے ان میں سے ہر ایک یہ توقع رکھتا تھا کہ وہ اولوالعزم پیغمبر ہو اور خدا کی طرف سے اس کے نام کا خصوصی خط آسمان سے نازل ہو، اور اگر اس قسم کی چیز ان پر نازل ہو بھی جاتی تب بھی منعم نہیں تھا کہ وہ ایمان لے آئیں گے۔
 بعض روایات میں آیا ہے کہ ابو جہل اور قریش کی ایک جماعت نے کہا: اے محمد! ہم تجھ پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے، جب تک کہ تو آسمان سے ایسا ایک خط نہ لے آئے جس کا عنوان یہ ہو: "خداوند رب العالمین کی طرف سے فلاں بن فلاں کے نام، اور اس میں یہی طور پر یہ حکم دیا جائے کہ ہم تجھ پر ایمان لے آئیں گے۔"

اس لیے بعد والی آیت میں مزید لکھا ہے: "جس طرح سے وہ کہتے ہیں ایسا نہیں ہے"۔ (کلا)۔
 ان پر آسمانی کتاب کا نازل ہونا اور اسی قسم کے دوسرے مطالب یہ سب بہانے ہیں۔
 "حقیقت میں وہ آخرت سے نہیں ڈرتے" (بل لایخافون الاخرة)۔
 اگر وہ آخرت سے ڈرتے ہوتے، تو یہ سب بہانے نہ کرتے، رسول خدا کی تکذیب نہ کرتے، آیات الہی کا مذاق نہ اڑاتے اور عذاب پر مامور فرشتوں کی تعداد کو استہزاء کا ذریعہ نہ بناتے۔
 اور یہاں سے تقویٰ، گناہ سے پرہیز اور انواع و اقسام کے گناہان کبیرہ سے پاک ہونے میں، معاد پر ایمان کا اثر واضح ہو جاتا ہے۔

حق بات یہ ہے کہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ عالم محشر پر ایمان اور قیامت میں جزا و سزا ملنے کا عقیدہ، انسان کو ایک نئی شخصیت عطا کرتا ہے اور بے قید و بند، متکبر، خود خواہ اور ظالم افراد کو، عہد کی پابندی کرنے والے، متقی، متواضع اور عدالت پیشہ انسان میں تبدیل کر سکتا ہے۔

۱ "صحف" صحیفہ کی جمع ہے، جو اس درج کے معنی میں ہے، جسے اس طرف اور اس طرف کرتے ہیں، (چونکہ "صحف" اور "صحیفہ" کا اصل مادہ چہرہ کی مانند پھیلی ہوئی چیز کے معنی میں ہے، اس لیے خط اور کتاب پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔
 ۲ "تفسیر قرطبی" و "تفسیر مراغی" اور دوسری تفاسیر

اس کے بعد ایک مرتبہ اور تاکید کرتا ہے کہ جس طرح وہ قرآن کے بارے میں سوچتے ہیں ایسا نہیں ہے " (کلا)۔
یقیناً قرآن تو تذکر اور یادآوری ہے، " (انہ تذکرہ)۔

" اور جو شخص چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے " (فمن شاء ذکرہ)۔

قرآن نے راستے کی نشاندہی کر دی ہے، اور دیکھنے والی آنکھوں کو بھی اختیار دے دیا ہے اور نوراً آفتاب بھی ہے تاکہ انسان اپنے آگے دیکھ کر چلے۔

اس کے باوجود اس سے پند و نصیحت حاصل کرنا، خدا کی مشیت اور توفیق کے بغیر ممکن نہیں ہے؛ اور وہ نصیحت نہیں لیتے مگر یہ کہ خدا چاہے (وما یدکرون الا ان یشاء اللہ)۔

اس جملہ کی کئی تفسیریں ہیں، ایک تو وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے، یعنی انسان پروردگار کی عنایت کے واسطے سے متحمل ہونے بغیر ہدایت کی راہ کو طے نہیں کر سکتا، اور نہ ہی اس کی توفیق و امداد کے بغیر ہدایت پاسکتا ہے۔ یہ تاکہ از جانب معشوق نباشد کوششی

کوشش عاشق بے چارہ بہ جائے نرسد

"جب تک محبوب کی طرف سے کوشش نہ ہو

بے چارے عاشق کی کوشش کچھ کام نہیں دیتی"

البتہ یہ خدائی امداد و استعداد رکھنے والوں پر نازل ہوتی ہے۔

دوسری یہ کہ: "فمن شاء ذکرہ" کا جملہ جو گذشتہ آیت میں آیا ہے، ممکن ہے یہ تو ہم پیدا کرے کہ ہر چیز خود انسان کے ارادہ کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کا ارادہ ہر لحاظ سے استقلال رکھتا ہے، تو یہ آیت اس اشتباہ کو دور کرنے کے لیے کہتی ہے کہ انسان مختار و آزاد ہونے کے باوجود مشیت الہی کے ساتھ وابستہ ہے، وہ مشیت جو ہمارے عالم ہستی اور جہان آفرینش پر حکم فرماتا ہے، دوسرے لفظوں میں انسان کا یہی اختیار و آزادی بھی، اس کی مشیت کے ساتھ ہے اور وہ جس لمحہ چاہے، اس کو اس سے لے لے۔
تیسری یہ کہ کتاب ہے، وہ کسی قیمت پر ایمان نہیں لائیں گے، مگر یہ کہ خدا چاہے اور انھیں مجبور کر دے، اور ہم جانتے ہیں کہ خدا کسی کو ایمان یا کفر پر مجبور نہیں کرتا۔

البتہ پہلی اور دوسری تفسیر بہتر اور زیادہ مناسب ہے۔

اور آیت کے آخر میں کتاب ہے: "وہ اہل تقویٰ اور اہل مغفرت ہیں،" (ہو اہل التقویٰ و اہل المغفرت)۔

مناسب یہی ہے کہ اس کے کتاب سے ڈریں اور کسی چیز کو اس کا شریک قرار نہ دیں، اور یہی ثابت ہے کہ اس کی مغفرت

کے امیدوار ہیں۔

حقیقت میں یہ جملہ "خوف" و "رجاء" کے مقام اور "غذاب" و "مغفرت" الہی کی طرف اشارہ ہے، اور یہ حقیقت میں پہلی

آیت کے لیے ایک علت کو بیان کرتی ہے۔

اسی لیے ایک حدیث میں امام صادق سے آیا ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: خدا فرماتا ہے: انا اهل ان اتقى، ولا يشرك بي عبدى شيئاً وانا اهل ان لا يشرك بي شيئاً ان ادخله الجنة

”میں اس لائق ہوں کہ مجھ سے ڈرا جائے اور میرا بندہ کسی چیز کو میرا شریک قرار نہ دے اور میں اس کا اہل ہوں کہ اگر میرا بندہ کسی چیز کو میرا شریک قرار نہ دے تو میں اسے جنت میں داخل کروں“۔ سلسلہ

اگرچہ تمام معشرین نے جہاں تک ہم نے دیکھا ہے۔ ”تقویٰ“ کی یہاں مفعول کے معنی میں تفسیر کی ہے، اور یہ کہا ہے کہ خدا اس کا اہل ہے کہ اس سے (اس کے شرک اور نافرمانی سے) پرہیز کریں، لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ فاعل کے معنی میں اس کی تفسیر ہو۔ یعنی خدا اہل تقویٰ ہے اور وہ ہر قسم کے ظلم، قبیح فعل اور ہر قسم کے خلاف حکمت کام سے پرہیز کرتا ہے، اور حقیقت میں تقویٰ کا بالاترین مقام خدا ہی کے لیے ہے، اور بندوں میں جو کچھ ہے وہ اس نیرتنبہ تقویٰ کی ایک ضعیف سی چنگاری ہے، اگرچہ خدا کے بارے میں اہم فاعل کے معنی میں ”تقویٰ“ کی تعبیر بہت کم ہوتی ہے۔

بہر حال یہ سورہ ”انذار“ اور ”وظائف اور ذمہ داریوں“ کے حکم سے شروع ہوا اور ”تقویٰ“ کی دعوت اور مغفرت کے وعدے پر ختم ہوا، یہ وہ مقام ہے جہاں ہم انتہائی مضبوط اور تضرع کے ساتھ اس کی مقدس بارگاہ میں عرض کرتے ہیں:

پروردگارا! ہمیں تقویٰ اور اپنی مغفرت کے مستحق افراد میں قرار دے۔

خداوند! جب تک تیری توفیق اور تیرا لطف ہماری دستگیری نہیں کرے گا ہم کچھ نہیں کر سکتے، ہمیں اس عنایت کا مشمول فرما۔ بارالہ! حال سخت ہے اور راستہ پر پیچ و خم ہے اور شیطان گمراہ کرنے پر آمادہ ہے، اس راستہ کو تیری مدد کے بغیر طے نہیں کیا جاسکتا، ہماری مدد فرما۔

آمین یا رب العالمین

سورۃ مذثر کا اختتام ۱۹ ماہ و صفر ۱۴۰۷ھ

اختتام ترجمہ

پونے پانچ بجے سدپر بروز پیر ۱۱ صفر ۱۴۰۸ ہجری

مطابق ۵ ستمبر ۱۹۸۷ء - ۸۱ ماڈل ٹائون لاہور

صفر حسین نجفی

سُورَةُ قِيَامَتٍ

یہ سُورَةُ مَكَّةَ میں نازل ہوئی

اور

اس کی ۴۰ آیات ہیں

تاریخ شروع

۱۹ صفر ۱۲۰۶ھ

سورۃ قیامت کے مضامین

جیسا کہ اس سورہ کے نام سے واضح ہے یہ قیامت کے دن اور معاد سے مربوط مسائل کے محور کے گرد گردش کرتی ہے، سوائے چند آیات کے، جو قرآن مجید اور اس کی تفسیر کرنے والوں کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں اور وہ مباحث جو اس سورہ میں قیامت کے بارے میں آئے ہیں وہ مجموعی طور پر چار قسم پر ہیں :

- ۱- اشراط الساعۃ (وہ عجیب و غریب اور بہت ہی ہولناک حوادث، جو اس جہان کے اختتام اور قیامت کے آغاز کے وقت رونما ہوں گے) سے مربوط مسائل۔
- ۲- اس دن نیکو کاروں اور بدکاروں کی حالت سے مربوط مسائل۔
- ۳- موت کے پُر اضطراب لمحوں اور اس جہان سے دوسرے جہان کی طرف انتقال سے مربوط مسائل
- ۴- انسان کی خلقت کے مقصد سے مربوط مسائل اور اس کا مسئلہ معاد سے ربط

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے :

من قرأ سورة القيامة شهدت انا وجبرئیل له یوم القیامة انه کان مؤمناً بیوم القیامة، وجاء وجهه مسفر علی وجوه الخلائق یوم القیامة

”جو شخص سورۃ قیامت کو پڑھے گا، تو میں اور جبرئیل اس کے لیے قیامت کے دن گواہی دیں گے، کہ وہ قیامت کے دن پر ایمان رکھتا تھا، اور اس دن اس کا چہرہ تمام لوگوں سے زیادہ درخشندہ ہوگا۔“

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے :

من ادمن قرائة "لا اقسام" وكان يعمل بها، بعثها الله يوم
القيامة معه في قبره، في احسن صورة تبشره وتضحك في وجهه،
حتى يجوز الصراط والميزان
"جو شخص سورہ "لا اقسام" (قیامت) کو پابندی کے ساتھ پڑھے گا اور اس پر عمل کرے گا، تو
خدا اس سورہ کو قیامت کے دن اس کے ہمراہ، اس کی قبر سے بہترین چہرے کے ساتھ اٹھائے گا، اور یہ سلسل
اس کو بشارت دیتی رہے گی اور اس کے سامنے ہنستی رہے گی، یہاں تک کہ وہ پل صراط اور میزان سے
گزر جائے گا۔" لہ

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کی سورتوں کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں دوسرے مقامات پر جو کچھ ہم نے قرآن سے معلوم کیا تھا
وہ یہاں متن روایت میں صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے، کیونکہ آپ نے فرمایا ہے: جو شخص اس کو پابندی کے ساتھ پڑھے گا "اور اس پر
عمل کرے گا" اس بنا پر یہ سب کچھ اس کے مضمون کا پابند ہونے اور اس پر عمل کرنے کا ایک مقتدر ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

- ۱۔ لَا اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیَامَةِ ۝
- ۲۔ وَلَا اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللّٰوَامَةِ ۝
- ۳۔ اَیْحَسِبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعْ عِظَامَهُ ۝
- ۴۔ بَلٰی قَدْرِیْنِ عَلٰی اَنْ تُسَوِّیَ بَنَانَهُ ۝
- ۵۔ بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لَیْفُجِّرَا مَامَهُ ۝
- ۶۔ یَسْئَلُ اٰتَانَ یَوْمِ الْقِیَامَةِ ۝

ترجمہ

رحمن ورحیم خدا کے نام سے

- ۱۔ قیامت کے دن کی قسم
- ۲۔ اور نفسِ لوامہ، بیدار اور ملامت کرنے والے وجدان کی قسم (کہ قیامت حق ہے)۔
- ۳۔ کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے۔
- ۴۔ ہاں! ہاں! ہم اس بات پر قادر ہیں کہ ہم اس کی انگلیوں (کے سرے کی لکیروں) کو بھی ٹھیک اسی طرح بنادیں۔
- ۵۔ (انسان قیامت کے بارے میں شک نہیں رکھتا) بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ (آزاد رہے اور) زندگی بھر گناہ کرتا رہے۔
- ۶۔ (اسی لیے) پوچھتا ہے کہ قیامت کب ہوگی۔

تفسیر قیامت کے دن کی اور ملامت کرنیوالے وجدان کی قسم

یہ سورہ دو پر معنی قسموں کے ساتھ شروع ہو رہا ہے، فرماتا ہے: ”قیامت کے دن کی قسم“۔ (لا أقسم بیوم القیامت)۔

”اور قسم ہے انسان کے بیدار وجدان اور ملامت کرنے والے نفس کی“۔ (ولا أقسم بالنفس اللوامة)۔ اس بارے میں کہ ”لا“ ان دونوں آیات میں ”زائدہ“ اور تاکید کے لیے ہے (اس بنا پر قسم کی نفی نہیں کرتا، بلکہ اس کی اور زیادہ تاکید کرتا ہے)۔ یا ”لا“ نافیہ ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ کہے کہ یہ موضوع اس قدر اہم ہے کہ میں اس کی قسم نہیں کھاتا، (جیسا کہ لوگ ایک دوسرے سے کہتے ہیں، میں تیری جان کی قسم نہیں کھاتا کہ وہ قسم سے بڑتر ہے) مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ اکثر مفسرین نے پہلے احتمال کو انتخاب کیا ہے، جبکہ بعض دوسری تفسیر کے طرفدار ہیں اور ان کا نظریہ یہ ہے کہ ”لا“ زائدہ ابتدائے کلام میں نہیں آتا، بلکہ اسے وسط کلام میں ہونا چاہیے۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے، کیونکہ قرآن نے قیامت سے زیادہ اہم امور مثلاً خدا کی پاک ذات کی قسم کھائی ہے، اس بناء پر کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہاں قیامت کے دن کی قسم نہ کھائی جائے اور ”لا“ زائدہ کے آغاز کلام میں ہونے کی کئی مثالیں موجود ہیں، جیسا کہ امرء القیس کے اشعار میں آیا ہے کہ اس نے اپنے قصائد کے آغاز میں لاء زائدہ کا استعمال کیا ہے۔ لیکن ہمارے نظریہ کے مطابق ”لا“ کے زائدہ ہونے یا نافیہ ہونے کے بارے میں بحث کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، کیونکہ دونوں کا آخری نتیجہ ایک ہی ہے، اور وہ اس موضوع کی اہمیت ہے، جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ ان دونوں قسموں (قیامت کے دن کی قسم اور بیدار وجدان کی قسم) کے درمیان کیا رابطہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معاد کے وجود کی ایک دلیل، انسان کی روح کے اندر ”حکمہ وجدان“ کا وجود ہے، جو نیک کام کو انجام دینے کے وقت، انسان کی روح کو خوشی اور نشاط سے پر کر دیتا ہے، اور اس طریقہ سے اسے جزا دیتا ہے اور بُرے کام کے انجام دینے یا کسی جسم کا ارتکاب کرنے کے موقع پر، اس کی روح پر سخت دباؤ ڈال کر اسے سزا دیتا ہے اور شکر بخیز میں جھڑتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض روایات وجدان کے عذاب سے نجات پانے کے لیے انسان خود کشی تک کا اقدام کر لیتا ہے۔

لا وایک ابنة العامر

لا یدعی القوم انی اضر

”اے دختر عامر تیرے باپ کی قسم ہے، قوم ہرگز یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ میں بھاگ جاؤں گا“

یعنی حقیقت میں وجدان نے اس کے قتل کرنے کا حکم صادر کیا ہے اور وہ اسے اپنے ماتھے سے اجڑا کرتا ہے۔
 "نفس لوامہ" کا رد عمل اور اثر انسانوں کے وجود میں بہت ہی وسیع و عریض ہے اور ہر لحاظ سے قابل غور و مطالعہ ہے، اور ہم نکات کی
 بحث میں اس کی طرف مزید اشارہ کریں گے۔

جب "عالم صغیر" یعنی انسان کا وجود اپنے اندر ایک چھوٹا سا حکمہ اور عدالت رکھتا ہے تو "عالم کبیر" اپنی اس عظمت کے باوجود ایک عظیم
 حکمہ عدل کیوں نہ رکھتا ہوگا۔

اور یہ وہ مقام ہے جہاں سے ہم "وجدان اخلاقی" کے وجود سے "قیامت اور معاد" کے وجود کی ٹوہ لگاتے ہیں اور ہمیں سے ان دونوں
 قسموں کا ایک عمدہ رابطہ واضح ہو جاتا ہے اور دوسرے لفظوں میں دوسری قسم پہلی قسم کی ایک دلیل ہے۔
 اس بارے میں کہ "نفس لوامہ" سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے اس کی بہت سی تفسیریں بیان کی ہیں، ان میں سے ایک مشہور تفسیر تو وہی ہے
 جو ہم نے بیان کی ہے۔ یعنی "اخلاقی وجدان" جو انسان کو غلط اعمال کے وقت اسی دنیا میں ملامت کرتا ہے اور تلافی و تجدید نظر پر اسے
 اجبار کرتا ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد تمام انسانوں کا قیامت میں اپنی خود ملامت کرنا ہے، مؤمنین اس لیے اپنے آپ کو ملامت کریں گے کہ
 کہ ہم نے نیک اعمال تھوڑے کیوں کیے؟ اور کفار اس وجہ سے کہ انہوں نے کفر و شرک اور گناہ کی راہ کیوں اختیار کی؟
 ایک اور تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد صرف کافروں کا نفس ہے، جو قیامت میں ان کی، ان کے بُرے اعمال کی وجہ سے بہت زیادہ ملامت
 اور سزا پیش کرے گا۔

لیکن قبل و بعد کی آیت کے ساتھ مناسب وہی پہلی تفسیر ہی ہے۔
 ہاں! یہ عدالت وجدان اتنی عظمت و احترام کی حامل ہے کہ خدا اس کی قسم کھا رہا ہے اور اس کو عظیم شمار کرتا ہے اور وہ اتنا عظیم و بزرگ ہے
 کیونکہ وہ انسان کی نجات کا ایک اہم عامل شمار ہوتی ہے، بشرطیکہ وجدان بیدار ہو اور کثرت گناہ کی وجہ سے ضعیف و ناتوان نہ ہو جائے۔
 یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ان دو پراچینیت اور پر معنی قسموں کے بعد یہ بیان نہیں ہوا کہ یہ کس چیز کے لیے قسم کھائی گئی ہے اور اصطلاح کے
 مطابق "مقسم لہ" مخدوف ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بعد والی آیات کے سیاق سے مطلب بالکل واضح ہے۔ اس بناء پر اوپر
 والی آیات اس طرح کا معنی دیتی ہیں "قیامت کے دن اور نفس لوامہ کی قسم ہے کہ تم سب قیامت میں اٹھائے جاؤ گے اور اپنے اعمال کا
 بدلہ پاؤ گے۔"

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قیامت کے دن کی قسم کھائی گئی ہے جو قیامت، اور قبروں سے اٹھے کا دن ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قبروں سے
 اٹھنے کا مسند اتنا مسلم شمار کیا گیا ہے کہ منکرین کے مقابلہ میں اس کی قسم تک کھائی جاسکتی ہے۔
 اس کے بعد ایک استفہام انکاری کے عنوان سے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی بڑیوں کو

لہ "لوامہ" بانذ کا صیغہ ہے، اور بہت زیادہ ملامت کرنے والے کے معنی میں ہے۔

لہ تقدیر میں لتبعثن یوم القیامۃ "یا" انکم تبعثون "ہے۔

جمع نہیں کریں گے" (ایحسب الانسان ان لن نجعل عظامه)۔

ہاں! ہم اس بات پر قادر ہیں، کہ اس کی انگلیوں (کے سروں کی لگیروں) تک کو بھی ٹھیک اسی طرح بنا دیں (یعنی قادر ہیں)۔
علیٰ ان نستویٰ بنانہ)۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ مشرکین میں سے ایک شخص جو پیغمبر کی ہمتاگی میں رہتا تھا اور اس کا نام "علی بن ربیعہ" تھا، آنحضرت کی خدمت میں آیا اور اس نے روز قیامت کے بارے میں سوال کیا کہ وہ کس طرح ہے؟ اور کب آئے گی؟ اس کے بعد اس نے مزید کہا: اگر میں اس دن کو اپنی آنکھ سے دیکھ لوں تو پھر بھی تیری تصدیق نہیں کروں گا اور تجھ پر ایمان نہیں لاؤں گا، کیا یہ ممکن ہے کہ خدا ان ہڈیوں کو جمع کرے؟ یہ بات قابل یقین نہیں ہے۔

اس موقع پر اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور اس کو جواب دیا، لہذا پیغمبر نے اس ہڈی دھرم اور مناد رکھنے والے شخص کے بارے میں فرمایا:

اللھم اکنفی شرجاری السوء

خداوند! اس بُرے ہمایے کے شر کو مجھ سے دور کر لے

اس معنی و مفہوم کی نظیر قرآن کی دوسری آیات میں بھی نظر آتی ہے، منجملہ ان کے سورہ یس کی آیہ ۷۸ میں آیا ہے کہ معاد کے منکرین میں سے ایک شخص ایک بوسیدہ ہڈی کا ٹکڑا اٹاٹھ میں لیے ہوئے تھا اور پیغمبر سے یہ کہہ رہا تھا: (من یحیی العظام وہی س میس) ان ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا، دراصل حالیکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہیں؟

ضمنی طور پر "یحسب" کی تعبیر ("حسان" کے مادہ سے گمان کے معنی میں) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پیغمبر اپنی کسی ہوئی بات پر ہرگز ایمان نہیں رکھتے تھے بلکہ صرف بے ہودہ اور بے بنیاد خیال اور گمانوں پر تکیہ کرتے تھے۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے خصوصیت کے ساتھ ہڈیوں پر ہی کیوں تکیہ کیا ہے۔

اولاً تو ہڈیاں باقی اعضاء کی نسبت زیادہ دیر تک قائم رہتی ہیں، لہذا جب یہ ہی بوسیدہ اور خاک ہو جائیں اور ان کے بنار کے ذرات پر لگنے ہو جائیں تو ان کی بازگشت کی امیدگی افراد کی نظر میں کم ہو جاتی ہے۔

ثانیاً ہڈی انسانی بدن کا اہم ترین رکن ہے کیونکہ بدن کا ہر ستون ہڈیوں سے مل کر بنتا ہے اور تمام حرکات اور گھومنا پھرنا اور بدن کی اہم کارکردگیاں ہڈیوں کے ذریعہ ہی انجام پاتی ہیں اور انسان کے بدن میں ہڈیوں کی کثرت اور مختلف اشکال اور انداز سے، خدا کی خلقت کے عجائبات میں شمار ہوتے ہیں اور انسان کی پشت کے ایک ہی مہرے کی قدر و قیمت کا اس وقت پتہ چلتا ہے جب وہ بیکار ہو جائے اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کا سارا بدن منفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔

"بتان" لغت میں "انگلیوں" کے معنی میں بھی آتا ہے اور "انگلیوں کے سروں" (پوروں) کے معنی میں بھی، اور دونوں صورتوں میں

اس روایت کو "مراخی" نے اور اسی طرح "روح المعانی" اور "تفسیر صافی" نے مختصر سے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔

ایک ہی نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نہ صرف ہڈیوں کو جمع کرے گا اور انھیں پہلی حالت کی طرف پٹائے گا بلکہ انگلیوں کی تھوڑی پٹی اور باریک ہڈیوں کو بھی ان کی اپنی جگہ پر قرار دے گا، اور ان سے بھی بالائے تربات یہ ہے کہ انگلیوں کے پوروں تک کو موزوں صورت میں پہلی حالت میں پٹا دے گا۔

یہ تعبیر ممکن ہے، انسانی پوروں کی کھیروں کی طرف، ایک لطیف اشارہ ہو، کہتے ہیں کہ بہت کم انسان روئے زمین میں ایسے پیدا ہوتے ہیں، جن کے پوروں کی کھیریں ایک دوسرے کے ساتھ ملتی ہوں یا دوسرے لفظوں میں باریک اور پیچیدہ کھیریں جو ہر انسان کے پوروں میں نقش ہوتی ہیں، اس شخص کے تعارف کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ اس لیے ہمارے زمانہ میں ”انگشت نگاری“ (پوروں کی کھیروں کے آثار کو ضبط کرنے) کا شعبہ ایک مستقل علم کی صورت اختیار کر گیا ہے اور اس کے ذریعہ بہت سے مجرم پہچانے جاتے ہیں اور بہت سے مجرموں کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ایک چور کمرے یا کسی گھر میں داخل ہوتا ہے تو وہ اپنا ہاتھ دروازے کے قبضہ یا کمرے کے شیشے یا تالے اور صندوق پر رکھتا ہے تو اس کی انگلی کی کھیریں اس پر رہ جاتی ہیں، تو فوراً اس کا نمونہ حاصل کر کے، چوروں اور مجرموں کے سابقہ ریکارڈ کے ساتھ مطابقت کر کے، مجرم کو ڈھونڈ لیا جاتا ہے۔

نہروالی آیت میں معاد کے انکار کی ایک حقیقی علت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”ایسا نہیں ہے کہ انسان ہڈیوں کے جمع کرنے اور مردوں کو زندہ کرنے پر خدا کی قدرت کے بارے میں شک رکھتا ہو، بلکہ ان کا مقصد انکار کرنے سے یہ ہے کہ وہ ساری زندگی گناہ کرتا رہے“ (بل یرید الا انسان لیفجر امامہ)۔

وہ چاہتا ہے کہ انکار معاد کے ذریعہ ہر قسم کی ہوس رانی ظلم و سبب اور گناہ کے لیے آزادی حاصل کرے اور اس طریقہ سے جھوٹے طور سے سیر کرے، اور مخلوق خدا کے مقابلے میں بھی اپنے لیے کسی جوابدہی کا قائل نہ ہو، کیونکہ معاد قیامت پر ایمان رکھتا اور داد گاہ عدل الہی کا قائل ہونا، ہر قسم کے عصیان و گناہ کے مقابلے میں ایک عظیم رکاوٹ ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس لگام کو پھٹے اور اس بند کو توڑ دے اور آزادانہ طور پر جو عمل چاہے وہ کرتا پھرے۔

یہ بات گذشتہ زمانوں کے ساتھ ہی منحصر نہیں تھی آج بھی مادیت کی طرف میلان اور مبداء و معاد کے انکار کا ایک سبب، فسق و فجور اور دارلوی سے گریز اور ہر قسم کے خدائی قانون کو توڑنے کے لیے آزادی حاصل کرنا ہے، ورنہ مبداء و معاد کے دلائل واضح و آشکار ہیں۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں آیا ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

يقدم الذنب ويؤخر التوبة و يقول سوف اتوب

”آیت میں ایسے شخص کی طرف اشارہ ہے جو گناہ کو آگے رکھتا ہے اور توبہ کو تاخیر میں ڈالتا ہے، اور کہتا ہے،

”میں بعد میں توبہ کروں گا۔“

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آیت میں ”فجور“ سے مراد ”جھٹلانا“ ہے، اس طرح سے آیت کا معنی یہ ہے: انسان چاہتا ہے کہ معاد قیامت کو جو اس کے سامنے ہے جھٹلائے، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

اور اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اس لیے پوچھتا ہے قیامت کب آئے گی؟ (یستل ایان یوم القیامۃ)۔

ہاں! وہ ذمہ داریوں سے گریز کے لیے قیامت کے وقت کے بارے میں، استفہام انکاری کے طور پر پوچھتا ہے، تاکہ

فسق و فجور کے لیے راستہ ہموار کرے۔

اس نکتہ کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ قیامت کے وقت کے بارے میں ان کا سوال کرنا، اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ اصل قیامت

قبول کرتے ہیں اور صرف اس کے وقت کے بارے میں سوال کرتے ہیں، بلکہ یہ سوال اصل قیامت کے انکار کے لیے ایک مقدمہ اور تہید

ٹھیک اس طرح سے جیسا کہ کوئی کہے "غلاں شخص سفر سے آئے گا" اور جب اس کے آنے میں طول ہو اور وہ نہ آئے تو دوسرا شخص جو اس مسافر

آنے کا منکر ہو، یہ کہتا ہے: وہ مسافر کب آئے گا؟

چند نکات

۱۔ عدالت و جہان اور قیامت صغریٰ

قرآن مجید سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ روح اور نفس انسانی تین مراحل رکھتی ہے،

۱۔ "نفس امارہ" یعنی سرکش نفس، جو انسان کو ہمیشہ برائیوں اور بدیوں کی دعوت دیتا ہے اور شہوات اور فحور کو اس کے سامنے زینت

بخشتا ہے، یہ وہی چیز ہے کہ جب اس ہوس باز عورت، عزیز مصر کی بیوی نے اپنے بڑے کام کے انجام کا مشاہدہ کیا تو کہا: وما ابرحی

نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء "میں ہرگز اپنے نفس کو بری قرار نہیں دیتی، کیونکہ سرکش نفس ہمیشہ برائیوں کا حکم دیتا ہے"

(یوسف — ۵۲)

۲۔ "نفس لوامہ" جس کی طرف زیر بحث آیات میں اشارہ ہوا ہے، وہ بیدار اور نسبتاً آگاہ و باخبر نفس ہے، اگرچہ اس نے گناہ کے

مقابلہ میں مصونیت حاصل نہیں کی ہے لہذا اس سے بعض اوقات لغزش ہو جاتی ہے۔

اور وہ گناہ کر بیٹھتا ہے لیکن غٹھوڑی دیر کے بعد بیدار ہو جاتا ہے اور توبہ کر لیتا ہے اور سعادت کی راہ کی طرف لوٹ آتا ہے، اس کی طرف

سے انحراف کامل طور پر ممکن ہے لیکن وہ وقتی ہوتا ہے، دائمی نہیں، اس سے گناہ تو سرزد ہو جاتا ہے لیکن زیادہ دیر نہیں گزرنے پائی کہ وہ اپنے

طور پر طاعت، سزائش اور توبہ کا آغاز کر دیتا ہے۔

یہ وہی چیز ہے کہ جسے "اخلاقی و جہان" کے عنوان سے یاد کرتے ہیں اور بعض انسانوں میں بہت قوی اور طاقتور ہوتا ہے، بعض میں بہت

ضعیف و ناتواں، لیکن اس کے باوجود یہ ہر انسان میں موجود ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ کثرت گناہ کی وجہ سے اسے بیکار بنا دیا جائے۔

۳۔ "نفس مطمئنہ" یعنی تکامل و ارتقا کو پہنچی ہوئی روح، جو اطمینان کے مرحلہ تک پہنچی ہوئی ہو، جس نے سرکش نفس کو رام کر لیا۔

ہو اور تقوائے کامل اور احساسِ مسؤلیت کے مقام پر پہنچ گئی ہو کہ اب اس کے لیے آسانی کے ساتھ لغزش کرنا ناممکن نہ رہے۔

بھڑکتے ہیں اور وہاں سے باہر کی طرف سرایت کرتے ہیں، پہلے وہ انسان کی روح کو تکلیف و آزار پہنچاتے ہیں، اس کے بعد اس کے آثار و چہرہ میں اور اس کے خواب و خوراک کے دیگر گوں اور تبدیل ہونے میں ظاہر و آشکار ہوتے ہیں، جیسا کہ قیامت کی عدالت کے بارے میں بھی بیان ہے (نار الله الموقدة التي تطلع على الافئدة)۔ خدا کی روشن کی ہوئی آگ دلوں سے شعلے نکالتی ہے۔

(مُجَزَّه ————— ۷۶۶)

۵۔ اس وجہ ان کی عدالت کو، دیکھنے والوں اور گواہوں کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ خود متم انسان کی معلومات اور آگاہیوں کو، اس کے نفع میں، یا اس کے برخلاف ”گواہیوں“ کے عنوان سے قبول کرتا ہے، جیسا کہ قیامت کی عدالت میں بھی، انسان کے وجود کے ذرات، یہاں تک کہ اس کے ہاتھ پاؤں اور اس کے بدن کی جلد اس کے اعمال کے گواہ ہوں گے، جیسا کہ فرماتا ہے:

حتى اذا ما جاءوهما شهده عليهم سمعهم و ابصارهم و جلودهم
”جب وہ جہنم کی آگ کے پاس پہنچیں گے تو ان کے کان، آنکھیں اور بدن کی جلد ان کے خلاف گواہی
دیں گے۔“ (خم السجدة ————— ۲۰)

ان دونوں عدالتوں کے درمیان، یہ عجیب و غریب مشابہت سلسلہ معاد کے فطری ہونے کی ایک اور نشانی ہے۔ کیونکہ یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ ایک انسان کے وجود میں تو ————— جو اس عالم ہستی کے عظیم سمندر میں ایک چھوٹا سا قطرہ ہے ————— اس قسم کا حساب و کتاب اور رموز و اسرار آئینہ عدالت موجود ہو، لیکن اس عظیم عالم کے اندر بالکل کوئی حساب و کتاب، عدالت و محکمہ موجود نہ ہو، بھلا یہ چیز باور کرنے کے قابل ہے؟ سہ

۲۔ قرآن مجید میں قیامت کے نام

ہم جانتے ہیں کہ قرآن کے معارف، اور اس کے اعتقادی مسائل کا ایک اہم حصہ، قیامت و معاد سے مربوط مسائل کے محور کے گرد گردش کرتا ہے، کیونکہ وہ انسان کی تربیت اور تکامل و ارتقاء کی طرف بڑھنے میں اہم ترین تاثیر رکھتے ہیں۔

قرآن میں اس عظیم دن کے لیے جو نام انتخاب کیے گئے ہیں وہ بھی بہت ہیں، جن میں سے ہر ایک اس دن کے مختلف جہات و ابعاد میں سے ایک جہت و بعد کو بیان کرتا ہے اور اس سلسلہ میں بہت سے مسائل کو اکیلا ہی واضح کر دیتا ہے۔

”فیض کاشانی“ کے قول کے مطابق، جو انھوں نے ”محجۃ الی بیضاء“ میں لکھا ہے۔ ان ناموں میں سے ہر ایک کے پیچھے کوئی نہ کوئی راز چھپا ہوا ہے اور ہر توصیف میں کوئی نہ کوئی اہم معنی بیان ہوا ہے، لہذا کوشش سے ان معانی کا ادراک کرنا چاہیے، اور ان اسرار کو معلوم کرنا چاہیے۔

انھوں نے قیامت کے ایک سو سے زیادہ نام ذکر کیے ہیں، ان تمام کو یا ان میں سے اکثر کو قرآن مجید سے معلوم کیا جاسکتا ہے مثلاً ”یوم الحسرة“، ”یوم الندامة“، ”یوم المحاسبة“، ”یوم المسألة“، ”یوم الواقعة“

سہ۔ محکمہ ود جان کے سلسلہ مزید وضاحت کے لیے کتاب ”زمبران بزرگ“ (بحث ود جان) اور کتاب ”معاود عالم پس از مرگ“ (بحث دلائل) کی طرف رجوع کریں۔

”یوم القارعة“ ”یوم الراجفة“ ”یوم الرادفة“ ”یوم الطلاق“ ”یوم الفراق“ ”یوم الحساب“
 ”یوم التناد“ ”یوم العذاب“ ”یوم الفرار“ ”یوم الحق“ ”یوم الحکم“ ”یوم الفصل“ ”یوم الجمع“ ”یوم
 الدین“ ”یوم تبلی السرائر“ ”یوم لا یغنی مولی عن مولی شیئا“ ”یوم یفر المرء من اخیه“ ”یوم لا
 ینفع مال ولا بنون“ ”یوم التغابن“ و.....

لیکن اس کا زیادہ مشہور نام ”یوم القیامۃ“ ہی ہے جس کا قرآن مجید میں ستر بار ذکر ہوا ہے اور وہ بندوں کے عمومی قیام اور
 انسانوں کے عظیم معاد کی ترقی جانی کرتا ہے اور اس کی طرف توجہ کرنا بھی، انسان کو اس دنیا میں، اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے قیام کی
 دعوت دیتا ہے۔

ہمارے نظریہ کے مطابق، خواب غفلت اور فریب سے بیدار ہونے اور کمرش نفس کو لگام دینے اور انسان کی تعلیم و تربیت کے لیے
 یہی کافی ہے کہ ہم ان ناموں میں غور و فکر کریں اور اس عظیم دن میں — جس میں ہم سب خدا کی عظیم بارگاہ میں حاضر ہوں گے اور پر دے
 بہٹ جائیں گے اور اندرونی بھید کھل جائیں گے اور بہشت کو مزین کیا جائے گا اور جہنم کو بھڑکایا جائے گا۔ اور سب کے سب میزانِ بدلِ الہی کے
 پاس حاضر ہوں گے — ہم اپنی حالت کو نظر میں رکھیں۔ (خداوند! ہمیں اس دن اپنی پناہ میں جگہ دے دے)۔

- ۷۔ فَإِذَا بَرِقَ الْبَصْرُ ۝
 ۸۔ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝
 ۹۔ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝
 ۱۰۔ يَقُولُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفْرُجُ ۝
 ۱۱۔ كَلَّا لَا وَزَرَ ۝
 ۱۲۔ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ ۝
 ۱۳۔ يُنَبِّئُ الْإِنْسَانَ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ ۝
 ۱۴۔ بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بِصِيرَةٌ ۝
 ۱۵۔ وَلَئِن لَّمْ يَظْهَرِ لَهُ ۝

ترجمہ

- ۷۔ اس وقت آنکھیں شدت و حسرت سے پھرنے لگیں گی۔
 ۸۔ اور چاند بے نور ہو جائے گا۔
 ۹۔ اور سورج اور چاند ایک جگہ جمع ہو جائیں گے۔
 ۱۰۔ اس دن انسان کہے گا: بھاگنے کی جگہ کہاں ہے؟
 ۱۱۔ ہرگز ایسا نہیں ہے، کوئی راہ فرار اور پناہ گاہ نہیں ہے۔
 ۱۲۔ اصلی پناہ گاہ تو تیرے پروردگار کی طرف ہی ہے۔
 ۱۳۔ اس دن انسان کو ان تمام کاموں سے جو آگے یا پیچھے کیے ہیں، آگاہ کیا جائے گا۔
 ۱۴۔ بلکہ انسان تو خود اپنی حالت سے آگاہ ہے۔
 ۱۵۔ اگرچہ (ظاہر میں) وہ اپنے لیے عذر (اور بہانے) تراشے۔

تفسیر

انسان خود اپنے لیے بہترین فیصلہ کرنے والا ہے

گزشتہ آیات میں گفتگو اس سوال پر کہ ————— جو منکرین قیامت اور معاد کے بارے میں کرتے تھے ————— ختم ہوئی تھی، وہ کہتے تھے کہ اگر قیامت پتہ ہے تو وہ کب آئے گی، زیر بحث آیات گویا اس سوال کا ایک واضح جواب ہیں۔ پہلے قیامت کے قبل کے حادثہ کی طرف ————— یعنی اس انقلابِ عظیم کے سلسلہ میں جو دنیا میں پیدا ہوگا، اور اس دنیا کا نظام متلاطم اور خراب ہو جائے گا، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”جب آنکھیں خوف اور وحشت کی شدت سے گردش کر رہی ہوں گی اور مضرب ہوں گی“ (فاذا برق البصر) ۱۵

”اور جس وقت چاند بے نور اور منخف ہو جائے گا“ (وخصف القمر)۔

”اور جب سورج اور چاند ایک جگہ جمع ہو جائیں گے (وجمع الشمس والقمر)۔ اس بارے میں کہ ”چاند اور سورج“ کے جمع ہونے سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے مختلف تفاسیر بیان کی ہیں۔ کبھی کہا ہے: دونوں ایک ساتھ اکٹھے ہو جائیں گے یا دونوں اکٹھے مشرق سے طلوع کر کے مغرب میں غروب ہوں گے۔ اور کبھی کہا ہے: دونوں اس صفت میں کہ اپنا نور کھو بیٹھیں گے، جمع ہوں گے ۱۶۔ یہ احتمال بھی ہے کہ چاند بتدریج سورج کی قوتِ جاذبہ کے زیر اثر اس کے نزدیک اور انجام کار اس میں جذب ہو جائے گا اور پھر دونوں بے نور ہو جائیں گے۔

بہر حال یہاں دنیا کے آخر میں ظاہر ہونے والے انقلابوں میں سے دو اہم ترین حصوں، یعنی چاند کے بے نور ہو جانے اور سورج اور چاند کے

۱۵ ”برق“ ”برق“ کے مادہ سے (بردن فرق) اصل میں روشنی اور اس بجلی کے معنی میں ہے جو بادلوں کے درمیان ظاہر ہوتی ہے، اس کے بعد ہر قسم کی روشنی پر اطلاق مجھے لگا، آنکھوں کا چمک مانا، جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے، شدید اور اضطراب آمیز حرکت کے معنی میں ہے جو ہول اور خوف کی شدت سے ہوتی ہے، بعض اے آنکھ کے ڈھیلے کے رک جانے اور ٹنگلی بانڈھ کر ایک ہی کتہ کی طرف نگاہ کرنے کے معنی میں ————— جو عام طور پر وحشت کی نشانی ہے ————— تفسیر کرتے ہیں اور اس معنی پر کہ آنکھ کا چمک مانا، تحیر کے معنی میں ہے، اشارہ عرب سے کچھ شواہد لائے ہیں لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

۱۶ مرحوم ”طبری“ جمع البیان میں فرماتے ہیں کہ جمع تین قسم کی ہوتی ہے: ایک مکان میں جمع ہونا، ایک کیفیت میں جمع ہونا اور ایک چیز میں کئی اوصاف کا جمع ہونا۔ (مثلاً علم و دانت کا ایک شخص میں جمع ہونا) لیکن دو چیزوں کے ایک صفت میں اشتراک کے معنی میں جمع ہونا، مثلاً چاند اور سورج کا بے نور ہونا، ایک قسم کی مجازی تعبیر ہے (جیسے قرینہ سے معلوم ہونا چاہیے)

ایک دوسرے کے ساتھ جمع ہو جانے کی طرف اشارہ ہوا ہے، جن کی طرف قرآن کی دوسری آیات میں بھی کم دیش اشارے ہوئے ہیں، مثلاً سورہ تنکویر کی آیہ میں فرماتا ہے: "اذا الشمس کسرت" "جس وقت سورج تاریک ہو جائے گا" اور ہم جانتے ہیں کہ چاند کا سورج سے ہے، تو جب سورج تاریک ہوگا تو پھر چاند بھی تاریک ہو جائے گا اور نتیجہ میں گڑبگڑ زمین ایک وحشت ناک ظلمت اور تاریکی میں ڈوب جائے گا۔

اس طرح سے یہ دنیا ایک عظیم تحول اور انقلاب کے ساتھ ختم ہو جائے گی، اس کے بعد ایک دوسرے انقلاب سے (دوسرے نفع منور جو نفع حیات ہے) انسانوں کا قبروں سے اٹھنا شروع ہوگا، "اور اس دن انسان کے گا کہ فرار کی راہ کہاں ہے؟" (یقول الانسان یومئذ ابن المقتدر)۔

ہاں کا فرار گناہ گار انسان، جو قیامت کے دن کی تکذیب کیا کرتے تھے، اس دن شدت خجالت اور شرم سے کوئی پناہ گاہ تلاش کریں گے اور گناہ کی آواز کی سنگینی اور عذاب کے خوف سے فرار کی راہ ڈھونڈیں گے، بالکل اسی دنیا کی طرح کہ جب وہ کسی خطرناک حادثہ کا سامنا کرتے تھے تو بھاگنے کی سوچتے تھے، لہذا وہ اس جگہ کا بھی اس جگہ سے قیاس کریں گے۔

لیکن بہت جلد ان سے کہہ دیا جائے گا، "ہرگز ایسا نہیں ہے، یہاں راہ فرار اور کوئی پناہ گاہ نہیں ہے" (کلا لا وذر)۔

"بلکہ سب سے اصلی قرار گاہ پر درگاہ کی طرف ہے" اور اس کے علاوہ کوئی اور پناہ گاہ نہیں ہے (الحیٰ ذبک یومئذ المستقر)۔

اس آیت کے لیے اوپر والی تفسیر کے علاوہ دوسری تفسیریں بھی بیان کی گئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ: اس دن آخری حکم خدا کے ہاتھ میں ہے۔

یاد رہے کہ آخری قرار گاہ، جنت اور دوزخ میں اس کے حکم سے ہوگی۔

یاد رہے کہ محاکمہ اور حساب کے لیے اسی کی بارگاہ میں ٹھہرنا ہوگا۔

لیکن بعد والی آیت کی طرف توجہ کرتے ہوئے، وہ تفسیر جو ہم نے انتخاب کی ہے سب سے زیادہ مناسب ہے۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ آیت ان آیات میں سے ایک ہے جو انسان کے ابدی تکال و ارتقاء کے راستے کو بیان کرتی ہیں اور یہ آیت ان آیات کے زمرے میں ہے جو کہتی ہیں "والیہ العصیر" سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے" (تغابن — ۲) اور

۱۰ "مض" "فرار" سے اہم مکان ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مصدر ہے، لیکن یہ احتمال یہاں بعید نظر آتا ہے۔

۱۱ "وزر" (بروزن قر) اصل میں پہاڑی پناہ گاہ وغیرہ کے معنی میں ہے اور "ذیر" کو اس لیے "ذیر" کہتے ہیں، کہ لوگ اپنے کاموں میں اس کی پناہ لیتے ہیں

۱۲ ہر حال زیر بحث آیت میں ہر قسم کی پناہ گاہ کے معنی میں ہے۔

ربا ایہا الانسان انک کادح الی سربک کد حًا فملا قیہ) اے انسان تو سعی و کوشش اور زحمت و مشقت کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف بڑھ رہا ہے، اور تو اس سے ملاقات کرے گا“ (انشقاق — ۶) وان الی سربک المنتھی“ اور یہ کہ سب تیرے پروردگار کی طرف پلٹ جائیں گے“ (نجم — ۴۲) سہ

زیادہ واضح تفسیر میں انسان ایسے رہ رہا ہے جو عدم کی سرحد سے چلے ہیں اور انھوں نے سلطنت وجود کا یہ سارا راستہ طے کیا ہے، اور اس سلطنت وجود میں بھی وہ خدا کے وجود مطلق اور بے پایاں ہستی کی طرف چلے جا رہے ہیں، اور اگر وہ اصل راستے اور صراطِ مستقیم سے منحرف نہ ہوں، تو یہ ارتقائی حرکت اب تک جاری رہے گی اور وہ ہر روز قربِ خدا کے ایک نئے مرحلہ میں داخل ہوں گے، لیکن اگر وہ اپنی راہ سے منحرف ہو جائیں تو لڑک تباہ ہو جائیں گے۔

اس کے بعد اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے: ”اس دن انسان کو ان تمام کاموں سے جنہیں اس نے ”مقدم“ رکھا تھا یا ”مؤخر“ کیا تھا، آگاہ کیا جائے گا: (رینبؤا الانسان یومئذ بما قدم و اتخر)۔

اس بارے میں کہ ان دونوں تفسیروں سے کیا مراد ہے؟ بہت سی تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔

پہلی تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد وہ اعمال ہیں جو اس نے اپنی زندگی میں آگے پیچھے ہیں، یا وہ آثار جو موت کے بعد اس سے باقی رہ گئے ہیں، چاہے وہ نیک سنت ہو یا بد، جو اس نے لوگوں میں پھوڑی ہے اور وہ اس پر عمل کرتے ہیں اور اس کی نیکیاں اور برائیاں اس کو پہنچی رہتی ہیں، یا کتاب اور تحریریں اور غیر شرکی بنیادیں، یا نیک و بد اولاد، جن کے آثار آراہت پہنچیں گے۔

دوسری تفسیر سے مراد وہ اعمال ہیں جو وہ پہلے، بجایا یا تھا اور وہ آخری اعمال جنہیں اس نے اپنی تمام عمر میں انجام دیئے، دوسرے لفظوں میں وہ اپنے تمام اعمال سے باخبر ہو جائے گا۔

تیسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے وہ مال مراد ہے جو اس نے آگے بھیجا ہے اور وہ مال جو اس نے وارثوں کے لیے چھوڑا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد وہ گناہ ہیں، جنہیں اس نے مقدم رکھا، اور وہ اطاعتیں ہیں جنہیں اس نے مؤخر رکھا تھا، یا اس کے برعکس۔

لیکن سب سے مناسب پہلی تفسیر ہے، خاص طور پر جبکہ ایک حدیث میں امام باقرؑ سے اس آیت کی تفسیر میں آیا ہے، کہ آپ نے فرمایا:

(رینبؤ) بما قدم من خیر و شر و ما اخر من سنة لیس بہا من بعدہ فان کان شرًا کان علیہ مثل و زرہم ولا ینقص من و زرہم شیئًا وان کان خیرًا کان لہ مثل اجورہم، ولا ینقص من اجورہم شیئًا

سہ البتہ ان آیات کی تفسیر میں کچھ دوسرے نظریات بھی ہیں جو ہم نے انھیں آیات کے ذیل میں بیان کیے ہیں۔

” اس دن انسان کو اس خیر اور شر سے باخبر کیا جائے گا جسے اس نے مقدم رکھا تھا، یا مؤخر کیا تھا۔ ان سنتوں کے طور پر چھین اس نے یا دگار کے طور پر چھوڑا تھا، تاکہ وہ لوگ جو اس کے بعد آئیں گے اس پر عمل کریں اور اگر وہ بڑی سنت تھی تو عمل کرنے والوں کے گناہوں کے برابر اس کے گناہ میں اضافہ ہوگا اور ان کے گناہوں میں کشم کی کمی نہیں ہوگی، اور اگر وہ اچھی سنت تھی تو ان ہی جیسے اجر و ثواب اس کے لیے بھی ہوں گے اور ان کے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہ ہوگی“۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: اگرچہ خدا اور اس کے فرشتے انسان کو اس کے تمام اعمال سے آگاہ کریں گے، لیکن اس اطلاع کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ انسان خود اپنی حالت سے آگاہ ہے اور اس عظیم دن میں وہ خود اور اس کے اعضاء اس کی گواہی دیں گے: (بل الانسان علی نفسه بصيرة)۔

”چاہے وہ ظاہر میں اپنے لیے کتنے ہی عذر تراشتا رہے“ (ولو القی معاذیرہ)۔ یہ آیات حقیقت میں وہی چیز بیان کر رہی ہیں جو قرآن کی دوسری آیات میں، انسان کے اعمال پر اس کے اعضاء کی گواہی کے بارے میں آیا ہے، مثلاً سورہ طہ ص ۲۰ میں آیا ہے: (شهد علیہم سمعہم وابصارہم وجلودہم بما کانوا یعملون) ”ان کے کان اور آنکھیں اور بدن کی جلد ان کے اعمال کی گواہی دیں گے“ اور سورہ لیس کی آیت ۶۵ میں آیا ہے (وتکلمنا ید میہم و تشهد ارجلہم بما کانوا یكسبون) ”ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے، اور ان کے پاؤں ان کے اعمال کی گواہی دیتے تھے گواہی دیں گے“

اس بناء پر قیامت کی اس عظیم عدالت میں انسان کے اعمال کا بہترین گواہ وہ خود ہی ہے، کیونکہ وہ اپنی حالت سے سب سے زیادہ آگاہ ہے، اگرچہ خدا نے تمام جنت کے طور پر بہت سے دوسرے گواہ بھی اس کے لیے تیار کیے ہیں۔ ”بصیرۃ“ مصدری معنی بھی رکھتا ہے (بنیائی و آگاہی) اور وصفی معنی بھی (آگاہ شخص) اس لیے بعض نے اس کی ”جنت“ دلیل اور برہان کے معنی میں جو آگاہی بخش ہوتی ہے تفسیر کی ہے۔

”معاذیر“ ”مغذرت“ کی جمع ہے، جو اصل میں ایسی چیز کے پیدا کرنے کے معنی میں ہے، جو گناہ کے آثار کو ختم کر دے، جو کبھی تو واقعی عذر ہوتا ہے اور کبھی ظاہری، اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ”معاذیر“ ”مغذرت“ کی جمع ہے، جو پردہ اور پوشش کے معنی میں ہے۔ اس تفسیر کے مطابق آیت کا معنی اس طرح ہوتا ہے۔ انسان اپنے اوپر آگاہی رکھتا ہے، چاہے وہ اپنے اعمال پر کتنے ہی پردے ڈالے اور اپنے کاموں کو

۱۔ تفسیر برہان جلد ۴ ص ۴۰۶۔ اسی حدیث کے مانند تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۸۹۱ میں بھی آیا ہے۔

۲۔ پہلے احتمال کی بناء پر اس کی ”تا“ مصدری ہے اور دوسرے احتمال کی بناء پر ”تا“ تانیث ہے کیونکہ انسان یہاں اعضاء و جوارح کے معنی میں ہے یا ”فعل“ کے معنی میں ہے جو تانیث مجازی ہے اور بعض نے ”تا“ مبالغہ سمجھے ہیں، جو انسان کی اپنے بارے میں شدت آگاہی کی خبر دیتی ہے۔

پوشیدہ رکھے لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

بہر حال اس عظیم دن حساب و جزا پر حاکم وہ ہستی ہے جو ظاہر و باطن کے بھیدوں سے آگاہ ہے اور خود انسان کو بھی اس کے اعمال پر حساب کرنے والا قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ اسراء کی آیت ۱۴ میں آیا ہے: اقرأ کتابک کفی بنفسک الیوم علیک حسیباً“ اپنے نامہ اعمال کو پڑھ، آج تو اپنے حساب کے لیے خود بھی کافی ہے۔

اگرچہ زیر بحث آیات سب کی سب معاد اور قیامت کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں لیکن ان کا مفہوم وسیع ہے، اس دنیا کو بھی شامل ہے یہاں بھی لوگ اپنے حال سے آگاہ ہیں، اگرچہ کچھ لوگ جھوٹ موٹ لے سہ پشت ڈال کر، ظاہر سازی اور ریا کاری سے اپنے حقیقی چہرے کو چھپا لیتے ہیں۔

اسی لیے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

ما یصنع احدکم ان یظہر حسناً و یسر سئیئاً الیس اذارجع الی نفسه یعلم انہ لیس كذلك، واللہ سبحانہ یقول: بل الانسان علی نفسه بصیرة، ان السریرة اذا صلحت قویت العلانیة۔

”جب تم میں سے کوئی شخص اپنے ظاہر کو آراستہ کرے، لیکن پوشیدہ طور پر بدکار ہو تو وہ کہہ سکتا ہے کیا جبت اپنے نفس کی طرف ٹوٹتا ہے تو وہ نہیں جانتا کہ وہ ایسا نہیں ہے؟ جیسا کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے: بلکہ اپنی حالت سے آگاہ ہے جب انسان کا باطن صالح اور درست ہو جائے تو اس کے ظاہر کو بھی تقویت بخشتی ہے۔“

بیمار کے روزہ کی احادیث میں بھی آیا ہے کہ امام صادقؑ کے ایک صحابی نے آپ سے سوال کیا ما حد المرض الذی یفطر صاحبہ؟ اس بیماری کا معیار کیا ہے جس سے افطار جائز ہو جاتا ہے تو امام نے اس کے جواب میں فرمایا:

”بل الانسان علی نفسه بصیرة، هو اعلم بما یطیق“
انسان اپنی حالت پر سب سے زیادہ آگاہ ہے اور وہی بہتر طور پر جانتا ہے کہ اس میں کس قدر توانائی ہے۔“

۱۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۲۹۶

۲۔ دہی مدرک (اس حدیث کو مرحوم صدوق نے ”من لا یحضر“ کی کتاب صیام میں بھی نقل کیا ہے۔ جلد ۲ ص ۱۲۲۔ باب

حد المرض الذی یفطر صاحبہ حدیث ۱۹۴۱

- ۱۶۔ لَا تَحْرِكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۝
 ۱۷۔ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝
 ۱۸۔ فَإِذَا قَرَأَهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۝
 ۱۹۔ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۝

ترجمہ

- ۱۶۔ اس قرآن کو پڑھنے میں جلدی کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دے۔
 ۱۷۔ کیونکہ اس کو جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔
 ۱۸۔ اور جب ہم اسے پڑھ چکیں تو پھر اس کی پیروی کر۔
 ۱۹۔ پھر اس کو بیان کرنا (اور اس کی وضاحت کرنا بھی) ہمارے ہی ذمہ ہے۔

تفسیر

قرآن کا جمع کرنا اور اس کی حفاظت ہمارے ذمہ ہے

یہ آیات حقیقت میں جملہ معترضہ کے طور پر آئی ہیں، جسے گفتگو کرنے والا اپنی گفتگو کے درمیان میں لاتا ہے، مثلاً کوئی شخص تقریر کر رہا ہے اور وہ یہ دیکھتا ہے کہ مجلس کا آخری حصہ لوگوں سے پڑ ہو گیا ہے جبکہ اس کا اگلا حصہ خالی ہے تو وہ وقتی طور پر اپنی تقریر روک کر حاضرین کو آگے آنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ بعد میں آنے والوں کے لیے جگہ کھلی ہو جائے اور پھر اپنی تقریر کو شروع کر دیتا ہے یا کوئی استاد درس کے دوران اپنے کسی شاگرد کو غافل دیکھتا ہے تو وہ اپنی گفتگو کو توڑ کر اسے تنبیہ کرتا ہے اور پھر درس کو جاری کر دیتا ہے۔

اگر کوئی بے خبر آدمی اس تقریر یا درس کو ٹیپ سے سنے تو ممکن ہے وہ اشتباہ میں پڑ جائے اور ان جملوں کے قبل و بعد کے جملوں سے غیر مربوط ہونے پر تعجب کرے، لیکن مجلس کے مخصوص حالات ہیں وقت اور غور کرنے سے ان معترضہ جملوں کا فلسفہ واضح ہو جاتا ہے۔

اس مادہ سے مقدمہ کی طرف توجہ کرنے کے بعد ہم زیر بحث آیات کی تفسیر پیش کرتے ہیں

خدا نے قیامت، مومنین اور کفار کے حالات کے بارے میں جو سلسلہ گفتگو تھا، اسے وقتی طور پر چھوڑ دیا ہے اور اپنے پیغمبر کو قرآن کے بارے میں، ایک مختصر سی یاد دہانی کراتا ہے، اور فرماتا ہے، ”اپنی زبان کو اس کے پڑھنے میں جلدی کرنے کے لیے حرکت نہ دے“ (لا تحرك به لسانك لتعجل به)۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے بہت زیادہ اختلاف کیا ہے اور مجموعی طور پر اس کے لیے تین تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔ پہلی تفسیر تو وہی معروف تفسیر ہے جو ان عباس سے کتب حدیث و تفسیر میں بیان ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ پیغمبر اس شدید عیشی اور لگاؤ کی بنا پر جو آپ قرآن کو حاصل کرنے اور اسے حفظ کرنے کے بارے میں رکھتے تھے، جب وحی لانے والا فرشتہ آپ کے سامنے قرآنی آیات کو پڑھتا تھا، تو آپ اس کے ساتھ ساتھ اپنی زبان کو حرکت دیتے تھے اور جلدی کرتے تھے، خدا نے آپ کو منع کیا کہ یہ کام نہ کیجیے ہم خود اسے تیرے لیے جمع کر رہے ہیں۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ: قرآن کے دو نزول ہیں: "نزولِ دفعی" یعنی وہ سارا کا سارا یکجا اسی طور پر "شب قدر" میں پیغمبر کے پاک دل پر نازل ہوا اور "نزول تدریجی" جو ۲۳ سال کے عرصہ میں صورت پذیر ہوا، پیغمبر اس جلدی کی بنا پر جو انھیں دعوت کی تبلیغ کے بارے میں تھی، بعض اوقات نزول تدریجی سے پہلے یا اس کے ہمراہ آیات کی تلاوت کرتے تھے، تو انھیں حکم دیا گیا کہ یہ کام نہ کریں اور ہر آیت کی اپنے موقع پر ہی تلاوت اور تبلیغ کریں۔

اس طرح سے اس آیت کا مضمون سورہ طہ کی آیت ۱۱۴ کے مانند ہے۔ (ولا تعجل بالقرآن من قبل ان یقضی الیک وحیہ)۔ "وحی کے مکمل ہونے سے پہلے قرآن کے بارے میں جلدی نہ کرو"۔ یہ دونوں تفاسیر ایک دوسرے سے کوئی زیادہ فرق نہیں رکھتی اور مجموعی طور پر ان کی بازگشت اس معنی کی طرف ہے کہ پیغمبر کو وحی کے حاصل کرنے کے لیے بھی عجلت، اور جلد بازی نہیں کرنا چاہیے۔

تیسری تفسیر جس کے طرفدار بہت ہی کم ہیں، یہ ہے کہ ان آیات میں مخاطب، قیامت میں گنہگار ہیں، جنہیں حکم دیا جائے گا کہ اپنے نامہ اعمال کو پڑھیں اور اپنا حساب خود کریں اور انھیں کہا جائے گا کہ اس کے پڑھنے میں جلدی نہ کریں۔ یہ نظری بات ہے کہ وہ اپنا نامہ اعمال پڑھتے وقت جب اپنی "برائیوں" سمجھیں گے تو پریشان ہو جائیں گے اور ان سے جلدی کے ساتھ گزر جانا چاہیں گے تو یہ حکم انھیں دیا جائے گا اور انھیں جلد بازی سے روکا جائے گا اور ان کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ جس وقت خدا کے فرشتے ان کے اعمال نامے پڑھیں تو وہ ان کی پیروی کریں اس تفسیر کے مطابق، یہ آیات جملہ معترضہ کی صورت میں نہیں ہیں بلکہ یہ گزشتہ اور آئندہ کی آیات کے ساتھ مربوط ہیں اور سب کی سب ایک دوسرے کے ساتھ ربط رکھتی ہیں، کیونکہ یہ سب ہی قیامت و معاد کے حالات کے ساتھ مربوط ہیں، لیکن پہلی اور دوسری تفسیر کے مطابق جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ آیات جنہ معترضہ رکھتی ہیں۔

لیکن بہر حال تیسری تفسیر۔۔۔۔۔۔ خصوصاً قرآن کے نام کے ذکر کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو بعد کی آیات میں آیا ہے۔۔۔۔۔۔ بہت بعید نظر آتی ہے اور اصولی طور پر آیات کالب و لہجہ بخوبی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ گزشتہ دو تفسیروں میں سے کوئی سی ایک مراد ہے اور ان دونوں کے جمع کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے اگرچہ بعد والی آیات کالب و لہجہ پہلی تفسیر یعنی مشہور تفسیر کے موافق ہے (غور کیجیے)

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اس کو جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے" (ان علینا جمعہ وقتہ)۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کے جمع کرنے کے سلسلہ میں تو پریشان نہ ہو، ہم اس کی آیات کو جمع بھی کریں گے اور وحی لانے والے کے ذریعہ تیرے سامنے پڑھیں گے بھی۔

”اور جب ہم اسے پڑھ چکیں پھر تو اس کی پیروی کرو اور اسے پڑھو“ (فاذا قرأناہ فاتبع قرآنہ)۔

”پھر اس کو بیان کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے“ (شمات علینا بیانہ)۔
 اس بناء پر قرآن کا جمع کرنا، اور اس کی تیرے سامنے تلاوت کرنا اور اس کے معانی کی توضیح و تفصیل بتانا، یہ تینوں امور ہمارے ذمہ ہیں۔ لہذا تو کسی طرح بھی اس سلسلہ میں پریشان نہ ہو، جس ہستی نے اس وحی کو نازل کیا ہے، وہی تمام مراحل میں اس کا محافظ ہے۔ تیسری ذمہ داری تو صرف ایک طرف تو وحی لانے والے فرشتے کی تلاوت کی پیروی کرنا ہے اور دوسری طرف عامۃ الناس کو اس رسالت کی تبلیغ کرنا ہے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ جمع کرنے سے مراد وحی کی زبان میں جمع کرنا نہیں ہے، بلکہ پیغمبر کے سینہ میں جمع کرنا اور آنحضرت کی زبان سے اس کی تلاوت ہے، یعنی جلدی نہ کرو۔ ہم ان تمام آیات کو تیرے سینہ میں جمع کر دیں گے اور پھر اس کی قرأت تیری زبان پر جاری کریں گے۔

بہر حال یہ تمام تعبیریں پہلی تفسیر کی تائید کرتی ہیں کہ پیغمبر جبرئیل کے ذریعہ نزول وحی کے وقت، ہمیشہ جلدی کرتے تھے کہ آیات کو جلدی کے ساتھ ٹھکار کریں کہ کہیں ان کے محافظ سے نکل نہ جائیں اور اس موقع پر خدا کی طرف سے انھیں یہ بتایا گیا کہ آپ مطمئن رہیں کہ نہ صرف آیات جمع کرنے اور ان کے پڑھنے بلکہ ان کے معانی کی توضیح و تشریح کی بھی، خدا کی طرف سے ضمانت دی جاتی ہے۔
 ضمنی طور پر یہ آیات قرآن کی اصالت اور اس کی ہر قسم کی تحریف اور تبدیلی سے حفاظت کو بیان کرتی ہیں، کیونکہ خدا نے اس کے جمع کرنے اس کی تلاوت کرنے اور اس کی معانی کی وضاحت و تشریح کرنے کا وعدہ دیا ہے۔
 حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم ان آیات کے نزول کے بعد، جب جبرئیل آپ پر نازل ہوتے تو آپ مکمل طور سے سکوت اختیار کرتے اور جب جبرئیل چلے جاتے، تو پھر آپ آیات کی تلاوت شروع کرتے تھے۔

۲۰۔ كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ۝

۲۱۔ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ۝

۲۲۔ وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاصِرَةٌ ۝

۲۳۔ اِلَىٰ رَبِّهَا نَاطِرَةٌ ۝

۲۴۔ وَوُجُوهٌُ يَوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ۝

۲۵۔ تَظُنُّ اَنْ يَّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۝

ترجمہ

۲۰۔ جیسا کہ تم خیال کرتے ہو ایسا نہیں ہے (تم معاد کے دلائل کو مخفی شمار کرتے ہو) بلکہ تم جلدی گزر جانے والی دنیا کو دوست رکھتے ہو (اور بے قید و شرط کی ہوس رانی کو چاہتے ہو)۔

۲۱۔ اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔

۲۲۔ اس دن کچھ چہرے تو شاداب و مسرور ہوں گے۔

۲۳۔ اور اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے۔

۲۴۔ اور اس دن کچھ چہرے بگڑے ہوئے ہوں گے۔

۲۵۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کے بارے میں ایسا عذاب انجام پائے گا، جو کمر کو توڑ کر رکھ دے گا۔

تفسیر

میدانِ محشر میں کچھ چہرے ہنستے ہوئے، اور کچھ بگڑے ہوئے ہوں گے

ان آیات میں پھر دوبارہ معاد و قیامت سے مربوط مباحث کو شروع کرتا ہے قیامت کی کچھ خصوصیات اسی طرح معاد کے انکار کے علل و اسباب کو بیان کرتا ہے، فرماتا ہے: اس طرح نہیں ہے کہ معاد و قیامت کے دلائل مخفی ہوں اور تم اس کی حقانیت تک

روحانی اور ناقابل بیان لذت انھیں حاصل ہوگی، جس کا ایک ایک لمحہ دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اس سے برتر و بالاتر ہے۔ اس بات پر تجربہ ہے کہ ”الٰہی سربہا“ کا ”ناظرۃ“ پر مقدم ہونا حصر کا فائدہ دیتا ہے۔ یعنی اسی کی طرف دیکھیں گے، نہ کہ اس کے غیر کی طرف۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ بہشتی یقینی طور پر اس کے غیر کی طرف بھی نگاہ کریں گے تو ہم کہتے ہیں: اگر وہ اس کے غیر کی طرف نگاہ کریں گے تو ان سب کو اس کے آثار میں سے سمجھیں گے اور اشرک کی طرف نگاہ کرنا مؤثر کی طرف نگاہ کرنا ہے، دوسرے لفظوں میں وہ ہر جگہ اسی کو دیکھیں گے اور ہر چیز میں اسی کی قدرت اور جمال و کمال کا مشاہدہ کریں گے، لہذا جنت کی نعمتوں کی طرف تجربہ بھی انھیں خدا کی ذات کی طرف نظر کرنے سے غافل نہیں کرے گی۔

اسی وجہ سے بعض روایات میں جو اس آیت کی تفسیر میں بیان کی گئی ہیں — آیا ہے کہ: وہ خدا کی رحمت، اس کی نعمت اور اس کے ثواب کی طرف نظر کریں گے، اسلئے کیونکہ ان چیزوں کی طرف دیکھنا بھی، اس ذات مقدس کی طرف ہی دیکھنا ہے۔ بعض بے خبروں نے اوپر والی آیت کو قیامت میں خدا کے حسی مشاہدہ کی طرف اشارہ سمجھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس دن خدا کو اسی ظاہری آنکھ کے ساتھ دیکھیں گے۔

حالانکہ اس قسم کے مشاہدہ کا لازمہ، خدا کا جسمانی ہونا، اور کسی خاص مکان، کیفیت اور حالتِ جسمانی میں ہونا ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ اس کی پاک ذات ان آلودگیوں سے منزہ ہے، جیسا کہ قرآن کی مختلف آیات میں بار بار اس پر تکیہ ہوا ہے۔ منجملہ ان کے سورۃ انعام کی آیہ ۱۰۲ میں آیا ہے: لا تدركہ الابصار وهو یدرک الابصار: ”اس کو آنکھیں نہیں دیکھتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھتا ہے، یہ آیت مطلق ہے اور دنیا کے ساتھ کسی قسم کا اختصاص نہیں رکھتی۔

بہر حال خدا کے حسی مشاہدہ کا نہ ہونا، اس سے کہیں زیادہ واضح ہے کہ ہم اس پر مزید بحث کرنا چاہیں، جو شخص قرآن اور معارفِ اسلامی سے معمولی سی بھی آشنائی رکھتا ہے وہ اس حقیقت کا اعتراف کرے گا۔

بعض نے ”ناظرۃ“ کی ایک اور تفسیر بیان کی ہے اور یہ کہا ہے کہ وہ ”انتظار“ کے مادہ سے ہے۔ یعنی اس دن مومنین صرف خدا کی ذات پاک سے توقع رکھتے ہوں گے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے نیک اعمال پر بھی تکیہ نہیں کریں گے۔ اور ہمیشہ اس کی رحمت اور نعمت کے منتظر رہیں گے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ اس انتظار میں ایک قسم کی پریشانی آمیختہ ہوگی حالانکہ وہاں مومنین کے لیے کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ تو وہ جواب میں یہ کہتے ہیں: اس انتظار میں پریشانی ہوتی ہے جس کے انجام کے بارے میں اطمینان نہ ہو، لیکن جب اطمینان حاصل ہو، تو پھر ایسا انتظار آرام و سکون کے ساتھ آمیختہ ہوتا ہے۔

۱۵ نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۶۴، ۴۶۵

۱۵ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ ”نظر“ جو انتظار کے معنی میں ہے وہ ”الٰہی“ کے ساتھ متدی نہیں ہوتا، بلکہ وہ حرفِ جبر کے غیر متدی ہوگا، لیکن اشارہ عرب میں سے کچھ ایسے شواہد موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ”نظر“ جو انتظار کے معنی میں ہے وہ ”الٰہی“ کے ساتھ بھی متدی ہوتا ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

” نظر کرنے“ اور ”انتظار کرنے“ کے معنی کے درمیان جمع کرنا بھی بعید نظر آتا ہے۔ کیونکہ ایک لفظ کا استعمال متعدد معانی میں
لیکن اگر بناء یہ ہو کہ ان دو معانی میں سے صرف ایک ہی مراد ہو تو ترجیح پہلے معنی کو ہے۔

ہم اس گفتگو کو پیغمبر اکرمؐ کی ایک پر معنی حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں، آپ نے فرمایا:
” اذ ادخل اهل الجنة الجنة يقول الله تعالى تريدون شيئاً ازیدکم؟
فيقولون المر تبیض وجوهنا؛ المر تدخلنا الجنة و تنجیننا من النار؛
قال فيكشف الله تعالى الحجاب فما اعطوا شيئاً احب اليهم من النظر الى ربهم؛“
” جب اہل جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے تو خداوندِ عالم فرمائے گا، کیا تم کوئی اور چیز چاہتے ہو، جس کا
میں تمہارے لیے اضافہ کروں؟“

وہ کہیں گے: (پروردگارا! تو نے ہمیں سب کچھ دیا ہے) کیا تو نے ہمارے چہروں کو سفید نہیں کیا؟ کیا تو نے
میں جنت میں داخل نہیں کیا؟ اور جہنم سے رانی نہیں بخشی؟
اس وقت تمام پروردے ہٹ جائیں گے (اور وہ خدا کا چشم دل سے مشاہدہ کریں گے) اور اس حالت میں ان کے نزدیک
کوئی چیز اپنے پروردگار کی طرف نگاہ کرنے سے زیادہ محبوب نہیں ہوگی۔
قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں ”انس بن مالک“ کے واسطے سے آنحضرتؐ سے آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:
” ينظرون الى ربهم بلا کیفیت ولا حد محدود ولا صفة معلومة؛
” وہ اپنے پروردگار کو دیکھیں گے، لیکن کسی کیفیت کو نہیں اور نہ ہی کسی محدود اور مشخص صفت کو“۔
اور یہ حدیث شہود باطنی پر ایک تاکید ہے، نہ کہ آنکھ سے مشاہدہ کرنے پر۔

”مؤمنین کے اس گروہ کے مقابل میں ایک ایسا گروہ بھی ہوگا جن کے چہرے بگڑے ہوئے ہوں گے“ (و وجود یومئذ باسرة)۔
” باسرة“ ”بسر“ (بروزن نصر) کے ماٹھ سے، نا پختہ چیز اور وعدہ سے پہلے کام کرنے کے معنی میں ہے، اسی لیے کھجور کے کچے
پھل کو ”بسر“ (بروزن عسر) کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد چہرے کے بگڑنے اور تشرد ہونے پر بولا جانے لگا، کیونکہ یہ وہ عکس العمل ہے، جس کا
انسان رنج، تکلیف اور پریشانی کے آنے سے پہلے اظہار کرتا ہے۔
بہر حال جس وقت وہ لوگ عذاب کی نشانیوں کو دیکھیں گے اور اپنے نامہ اعمال کو نیکیوں سے خالی اور برائیوں سے بھرا ہوا پائیں گے تو سخت
پریشان، رنجیدہ اور ٹمگین ہوں گے اور منہ چڑھائیں گے۔

(دقیقہ تائید پچھلے صفحہ کا) مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۲۹۸، اور تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۹۰۰ کی طرف رجوع کریں۔

۱۳۵ ”روح المعانی“ جلد ۲۹ ص ۱۳۵

۱۳۶ ”تفسیر المیزان“ جلد ۲۰ ص ۲۰۴

انہیں معلوم ہے کہ وہ سخت عذاب جو ان کی کمزوریوں کو توڑنے والے گا ان پر واقع ہو کر رہے گا (تظن ان يفعل بها فاقرة)۔
 بہت سے مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہاں ”ظن“ علم کے معنی میں ہے یعنی انہیں اس قسم کے عذاب کے بارے میں یقین ہو جائے گا جبکہ
 بعض نے یہ کہا ہے کہ یہاں ”ظن“ اپنے اصلی معنی یعنی گمان میں ہے البتہ وہ اجمالی طور پر یقین رکھتے ہیں کہ انہیں عذاب ہوگا، البتہ اس قسم کے
 کمزور عذاب کے بارے میں وہ گمان کرتے ہیں بلکہ
 ”فاقرة“ ”فقرة (بروزن ضربہ) کے مادہ سے ہے اور اس کی جمع فقار ہے جو پشت کے مہروں کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر
 ”فاقرة“ اس سنگین حادثہ کو کہتے ہیں جو کمزور مہروں کو توڑ دیتا ہے اور ”فقیر“ کو اس وجہ سے فقیر کہا گیا ہے کہ گویا اس کی کڑوٹی ہوئی ہے بلکہ
 بہر حال یہ تعبیر ان سنگین اور سخت سزاؤں سے کنایہ ہے جو دوزخ میں اس گروہ کے انتظار میں ہیں، یہ گروہ کمزور مہروں کا منتظر ہے
 جبکہ سابقہ گروہ پروردگار کی رحمت کے انتظار میں ہے اور محبوب کی ملاقات کے لیے آمادہ ہے۔ ان کے لیے بدترین عذاب ہے اور ان کے لیے
 بدترین جہاننی رحمت، نعمت اور روحانی لذت ہے۔

۱۔ بخدا ان شواہد کے جو اس موضوع کے سلسلہ میں انہوں نے نقل کیے ہیں، یہ ہے کہ اگر ”ظن“ علم کے معنی میں ہو تو اس کے بعد ”ان“ ہے اسے ”متفکر“ نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ
 متفکر ہونا چاہیے۔ حالانکہ زیر بحث آیت میں ”ان“ مصدر ہے اور اس میں قرینہ یہ ہے کہ اس نے نصب دی ہے۔
 ۲۔ ”فاقرة“ ایک مزدوف موصوف کی صفت ہے اور تقدیر میں ”داہیۃ فاقرة“ ہے اور ”تظن“ نعل ہے جس کا فاعل
 ”وجہ“ ہے اور تقدیر میں ”ارباب الوجہ“ یا ”ذوات الوجہ“ ہے۔

- ۲۶۔ كَلَّا اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۙ
 ۲۷۔ وَقِيلَ مَنْ مَكَّنَّهٗ رَاقٍ ۙ
 ۲۸۔ وَظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۙ
 ۲۹۔ وَالتَّقَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۙ
 ۳۰۔ اِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ ۙ

ترجمہ

- ۲۶۔ اس طرح نہیں ہے، جب تک اس کی جان گلے تک نہ پہنچے، وہ ایمان نہیں لائے گا۔
 ۲۷۔ اور یہ کہا جائے گا: کیا کوئی ہے جو اس بیمار کو موت سے نجات دے؟
 ۲۸۔ اور دنیا سے فراق کا یقین پیدا کرے۔
 ۲۹۔ اور پاؤں کی پنڈلیاں (جان کنی کی شدت سے) ایک دوسرے کے ساتھ پیچ کھائیں۔
 ۳۰۔ (ہاں) اس دن سب کا راستہ تیرے پروردگار (کی داؤگاہ) کی طرف ہی ہوگا۔

تفسیر

دوسرے عالم اور مومنین و کفار کی سرنوشت سے مربوط مباحث کو جاری رکھتے ہوئے، ان آیات میں، موت کے دردناک لمحے کے بارے میں گفتگو ہے جو دوسرے جہان کا ایک دریچہ ہے۔

فرماتا ہے: "اس طرح نہیں ہے، جب تک اس کی جان اس کے گلے تک نہ پہنچ جائے، وہ ایمان نہیں لائے گا" (کَلَّا اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ)۔

اس دن اس کی برزخی آنکھ کھل جائے گی، جاب اور پرجے ہٹ جائیں گے اور وہ عذاب و کیفر کردار کی نشانیاں دیکھیں گے اور اپنے اعمال سے واقف ہو جائیں گے اور اس لمحے میں وہ ایمان لے آئیں گے لیکن وہ ایسا ایمان ہوگا جو ان کی حالت کے لیے ہرگز مفید نہیں ہوگا۔

۱۔ یہاں "اذا" شرطیہ ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے "اذا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ انكشف له حقيقة الامر ووجد ما عمله ضمناً" بلغت "کا فاعل" نفس" ہے جو محذوف ہے اور قرینہ کلام سے معلوم ہوجاتا ہے۔

”تراقی“ ”ترقوہ“ کی جمع ہے جو خلق اور گلے کے گرد کی ہڈیوں کے معنی میں ہے اور روح کا گلے تک پہنچنا، عمر کے آخری لمحوں کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جس وقت روح بدن سے نکلتی ہے تو وہ اعضاء جو دل سے زیادہ ناصلا رکھتے ہیں (مثلاً ہاتھ پاؤں) وہ جلدی بیکار ہو جاتے ہیں، گویا روح خود کو بدن سے تذبذب مٹاتی ہے۔ یہاں تک کہ گلے تک پہنچ جاتی ہے۔

اس موقع پر اس کے ارد گرد کے لوگ سرا سیمہ اور پریشان ہو جاتے ہیں اور اس کی نجات کی تدبیریں کرتے ہیں ”اور یہ کہا جاتا ہے کہ کوئی ہے جو اگر اس بیمار کو نجات دے“ (وقیل من راق)۔
یہ بات عجز، ناامیدی اور بے چارگی کی بنا پر کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ اب کام بس سے باہر ہو گیا ہے۔ اور طبیب سے بھی اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

”راق“ ”سرقی“ (بروزن نہی) کے مادہ سے اور ”رقیہ“ (بروزن خفیہ) ”اوپر جانے“ کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ ”رقیہ“ ان اوراد اور دعاؤں پر بولا جاتا ہے جو بیمار کے لیے موجب نجات ہیں، خود طبیب کو بھی اسی وجہ سے کہ وہ بیمار کو رٹائی بخشتا ہے اور اسے نجات دیتا ہے ”راقی“ کہا جاتا ہے، اس بناء پر آیت کا مفہوم اس طرح ہے کہ مریض کے ارد گرد کے لوگ اور کبھی وہ خود تکلیف کی شدت کی وجہ سے پکارتا ہے، کیا کوئی طبیب مل جائے گا؟ کیا کوئی ہے جو دعا پڑھے اور بیمار رٹائی پائے؟
بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے، کفرشتوں میں سے کون اس کی روح کو قبض کرے گا اور اوپر لے جائے گا؟ کیا عزاب کے فرشتے، یا رحمت کے فرشتے؟
اور بعض نے یہ اضافہ کیا ہے کہ چونکہ خدائی فرشتے اس قسم کے بے ایمان انسان کی روح کو قبض کرنا اور اوپر لے جانا پسند نہیں کرتے، تو ملک الموت کہتا ہے، کون ہے جو اس کی روح کو اوپر لے کر جائے؟
لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ صحیح اور سب سے زیادہ مناسب ہے۔

بعد والی آیت میں ”محقر“ کی مکمل مایوسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ”اس حالت میں وہ زندگی سے مطلق طور پر مایوس ہو جائیگا اور اسے دنیا کے فراق اور جہلائی کا یقین ہو جائے گا“ (وظن انه الفراق)۔

”اور پاؤں کی پٹریاں ایک دوسرے کے ساتھ پیچ کھائیں گی اور موت کا لمحہ آن پہنچے گا“ (والتفت الساق بالساق)۔
ان کا ایک دوسرے کے ساتھ پیچ کھانا یا تو جان کنی کی تکلیف کی شدت کی وجہ سے ہوگا، یا ہاتھ پاؤں کے بیکار ہو جانے اور ان سے روح کے نکل جانے کے نتیجہ میں ہوگا۔
اس آیت کے لیے اور تفسیریں بھی نقل کی گئی ہیں مجملد ان کے ایک حدیث میں امام باقر سے آیا ہے۔
التفت الدنيا بالآخرة

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرون ملک مقیم ہیں
مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔

منجانب۔

سبیل سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدرآباد پاکستان